جلد 27 ❖ شمارہ 08 ❖ ستمبر 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر
پرویز بلگرامی

شعبۂ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup a hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

قارئین کرام!
السلام علیکم!

میں سال بھر کے اخبارات کی کاپی بنا کر ایک جگہ رکھ لیتا ہوں۔ آج تعطیل تھی اس لیے میں نے ایک پر ایک رکھے بنڈلوں میں سے ایک بنڈل نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ صرف سرخیاں دیکھ کر دوسرے دن کا اخبار نکال لیتا۔ تقریباً دو گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ اس ایک سال کے اخبارات میں لگی خبروں کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ملکِ عزیز میں بریلوی غیر محفوظ ہیں، شیعہ غیر محفوظ ہیں، دیوبندی غیر محفوظ ہیں، بلوچ غیر محفوظ ہیں، کشمیری غیر محفوظ ہیں، سندھی غیر محفوظ ہیں، پنجابی غیر محفوظ ہیں، پٹھان غیر محفوظ ہیں۔ یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے دہلا دیا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا کہ ارضِ پاک میں محفوظ کون ہے۔ ذہن نے جواب دیا، VIP۔ اور میری نظر دیوار پر آویزاں قائداعظم کی تصویر پر پڑی۔ ان کی آواز کانوں میں گونج اٹھی۔ ''میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔'' 69 سال قبل کہا گیا جملہ تازہ محسوس ہوا تو میں نے نظر گھمائی، کمرے کے کونے میں بنے شیلف پر رکھے قرآن پاک پر نظر ٹھہر گئی۔ جزدان میں لپٹا قرآن فریاد کر رہا تھا کہ ''کبھی مجھے کھول کر سمجھنے کی کوشش تو کر لیتے۔''

اس افسانچے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ کاش ہم احکام قرآن پر عمل کر لیتے تو قائداعظم کا پاکستان آج جنت نظیر ہوتا۔ اداروں سے تصادم ہوتا نہ کسی کے مردہ باد کے نعرے لگ رہے ہوتے۔

معراج رسول

یگانہ شاعر

صوبہ بنگالہ کو تقسیم کر کے ایک نیا صوبہ بہار بنایا جاچکا تھا۔ اسی صوبہ بہار کا صدر مقام عظیم آباد تھا۔ عظیم آباد جو اب پٹنہ کہلاتا ہے۔ اسی پٹنہ کے محلے مغل پورہ میں ایک معروف مغل خاندان آباد تھا جس کا سلسلہ نسب چنگیز خان سے جاملتا تھا، اس خاندان میں 1301 کے ذی الحجہ (1884ء) میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس بچے کا نام واجد حسین رکھا گیا۔ اس کا ننھیالی سلسلہ مرزا آغا جان تک پہنچتا تھا جو لکھنو سے عظیم آباد آئے تھے۔ ان کی رشتے داری مرشد آباد سے بھی تھی۔ گویا کہ دونوں جانب سے وہ نواب خاندان تھا۔ اس بچے کو ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے ملی پھر اسے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل کرایا گیا۔ بچہ ذہین تھا۔ ایک کے بعد ایک کلاس پاس کرتا چلا گیا۔ ہر کلاس میں وظیفے، تمغے اور انعام حاصل کرتا رہا۔ پھر اسے مزید تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے اس نے 1903ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران اسے ماحول کی وجہ سے شاعری کا شوق ہوا اور اس نے سخن فہمی کے لیے سید علی جان بیتاب عظیم آبادی کا دامن تھام لیا۔ بیتاب عظیم آبادی اچھا کہتے تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ابتدائی تربیت کے بعد انہوں نے اسے اپنے استاد سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ شاد عظیم آبادی کا سکہ بہار و بنگال پر جما ہوا تھا۔ ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔ ان کے فیض نے اس کے ذہن رسا کو مزید قوی کیا۔ پھر وہ کلکتہ چلا آیا۔ کچھ دنوں تک کلکتہ میں رہنے کے بعد وہ مٹیا برج منتقل ہوگیا۔ مٹیا برج میں مرزا محمد مقیم بہادر (سلطان عالم میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشدزادوں محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا معلم مقرر کیا گیا۔ مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بیمار ہوگیا۔ بحالت مجبوری اس نے مٹیا برج چھوڑ دیا اور عظیم آباد منتقل ہوگیا، یہاں بھی صحت صحیح نہ رہی تو لکھنو چلا آیا۔ یہ واقعہ 1905ء کا ہے۔ لکھنو کی فضا نے جادو اثر دکھایا اور اس کی صحت بحال ہوگئی۔ وقتاً فوقتاً وہ عظیم آباد جاتے اور جائداد کا کچھ حصہ فروخت کرتے اور لکھنو لوٹ آتے۔ بے فکری والی زندگی تھی۔ حسن اتفاق کہ نواب بنا صاحب موج عظیم آبادی اپنے علاج کے سلسلے میں لکھنو آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی لاابالی زندگی دیکھی تو انہیں فکر ہوئی اور انہوں نے لکھنو کے ایک معزز گھرانے میں حکیم مرزا محمد شفیع کی صاحب زادی سے نسبت ٹھہرادی۔ یہ واقع 1913ء کا ہے۔ اس وقت تک واجد حسین کی شاعری لکھنو میں اپنا مقام بنا چکی تھی اور یاس تخلص کرنے لگے۔ ان کی شاعری ہی نے ”باہر“ کا ہوتے ہوئے بھی لکھنوئیوں پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ لکھنو میں رہتے ہوئے ہی عظیم آباد میں واقع ایک بڑی جائداد بک چکی تھی۔ اب شادی ہوئی تو کمانے کی فکر ہوئی۔ لکھنو تو پہلے ہی اجڑا ہوا تھا یہاں دال روٹی کا انتظام بھی مشکل تھا۔ اس وقت ہر ایک کی نظر دکن کی سلطنت کی طرف لگی ہوئی تھی کیونکہ اس پرآشوب دور میں دکن ہی ایک ایسی ریاست تھی جو اہل علم کی قدر کر رہی تھی۔ میرزا واجد حسین نے بھی دکن کی طرف کوچ کر جانا اہم سمجھا۔ وہ دکن پہنچے تو انہیں رجسٹرار کا عہدہ مل گیا لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ سکے اور 45-1944ء میں واپس لکھنو آ گئے۔ تب تک ان کا پہلا دیوان نشتر یاس آچکا تھا۔ عروض و قوافی پر ”چراغ سخن“ بھی آچکی تھی۔ وہ شعراء میں اہم شمار ہونے لگے تھے۔ اسی سرزمین لکھنو میں 2 فروری 1956ء کو انہوں نے دنیا سے منہ موڑا۔ میرزا واجد حسین جیسے یگانہ شاعر کو ہم سب یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆
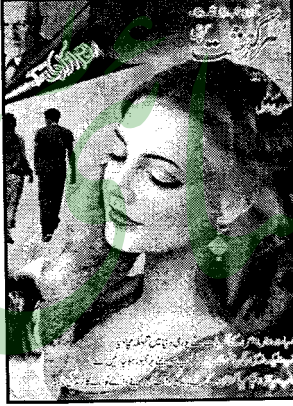
☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا کورنگی کراچی سے خلوص نامہ۔ ''برصغیر کی ادبی تاریخ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ ہمارے حصے میں آئے اس کے بعد شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کے بعد غالب اور فانی بدایونی کے تذکرے کے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوتی لیکن فانی بدایونی کو اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے فوقیت حاصل رہے گی۔ ہمارا ماننا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی اضافی نوازشات کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا۔ چیف صاحب نرمی، شائستگی، رواداری اور تحمل کیونکر ہماری قومی زندگی کا حصہ بن سکتا ہے۔ ماضی میں اگر یہ میراث ہماری تھی تو ہماری تربیت کے لیے ہمارے رہبروں میں قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ، راجا محمود آباد نواب زادہ لیاقت علی خاں اور ان کے رفقاء شامل تھے۔ آج ہماری تقدیروں کے مالک آپ کے سامنے ہیں جو رہنمائی تو کجا رونمائی کے بھی قابل نہیں ہیں۔ یہ انہی کی کارگزاریاں ہیں کہ آج ہم بحیثیت قوم زبان درازی، بدتمیزی، خودغرضی اور جارحیت کا سمبل بن چکے ہیں۔ محترم آپ ہی انصاف کریں جس شخص کو ایٹمی پاکستان کی خوش خبری دے کر اس کے گھروں میں بجلی کا ایک بلب بھی لوڈشیڈنگ کے عوض نہ جلے اور بل ایسا آئے کہ جیسے وہ روشنیوں سے نہایا ہو تو تحمل کہاں سے لائے گا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم نہ ہو، اسپتالوں میں ڈھنگ کا علاج نہ ہو، دل کے مریضوں کو فوری آپریشن کی بجائے ایک ایک سال کی تاریخیں دی جائیں تو اس کے لہجے میں نرمی، شائستگی کیسے باقی رہے گی۔ عام آدمی کی رواداری کس طرح روا رہ سکتی ہے جب اسے اپنے ہر جائز کام کے لیے ناجائز ذریعہ اپنانے کو کہا جائے۔ ''شہرِ خیال'' میں رانا محمد شاہد کا ادبی خطبہ بہت بھایا۔ سید امتیاز حسین بخاری کا دل ہی رکھ لیتے، آپ تو انہیں ڈاکو اور حریت پسند کا فرق سمجھانے لگے۔ منشی محمد عزیز ہم نے تو بچپن میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، ابن صفی، نسیم حجازی کے ساتھ ساتھ شیخ چلی اور ٹارزن کو بھی بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ آپ کو بھی بڑا مزہ آتا اگر آپ بھی پڑھتے، بہاولپور کے کلیم اللہ ایڈووکیٹ کا خط سب سے شاندار تھا۔ تاریخ کی درستگی پر شکریہ۔ ''سر چھاگل'' اور ''نام'' اپنے اندر موسیقیت لیے ہوئے تھیں نور جہاں کا تذکرہ تو کہیں اور کبھی بھی آئے بھلا لگتا ہے۔ ایاز راہی ہمیشہ کی طرح مختصر لیکن جامع انداز میں چھاگلہ صاحب کی قومی ترانے کی دھن پر دھیان دے رہے تھے۔ جب ہم نے بھی دھیان دیا تو یاد آیا کہ کسی شاعری کے بغیر قومی ترانے کی دھن کا بن جانا اور جالندھری صاحب کی شاعری کا کسی دھن کا مرہون منت ہونا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ خدا کی تخلیق کیسی کیسی تخلیقات کو جنم دیتی ہے۔ ندیم اقبال صاحب امریکا کی رنگینیوں میں قمار بازی سے حظ اٹھا رہے تھے۔ سفرنامے کی شان ہی یہ ہے کہ داستان گو مسافر اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف بھی کرے اور ندیم صاحب اپنی کہی ہوئی ہر بات سے انصاف کر رہے ہیں۔ ''دلچسپ دریافت'' میں مذکور ایسے قلم کار کم ہی ہوتے ہیں۔ روزنامہ پیسہ، ازم، اوندھی بستی تحقیقی حق ادا کر رہی تھیں اور فلم ساز، حسن مزاح، زندگی کی جیت، باپ کے بغیر اپنے اپنے کھوجیوں کی محنت پر داد طلب تھیں۔ نواب سپاہی انتہائی جاندار اور شاندار تحریر تھی۔ قائداعظم کی محبت اور پاکستان سے عشق نواب بہادر یار جنگ کی گھٹی میں تھا، ہم ایسے، کتنے ہی انسان دوستوں کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ ''ناسور'' کا علاج بروقت ہو گیا اب بہتری کی طرف گامزن ہے۔ اداکار ندیم کی بے شمار گولڈن جوبلی فلموں کی طرح بحیثیت اداکار بھی وہ اپنی نصف صدی مکمل کر چکے۔ خدا انہیں مزید صحت و لمبی عمر عطا فرمائے۔ ہم ان سے کئی مرتبہ مل چکے ہیں۔ ندیم صاحب کی زندگی ان کی اہلیہ فرزانہ کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر ہیں لیکن اداکار ندیم بھی پوری زندگی ایک باوفا شوہر رہے۔ کوئی اسکینڈل ان کی زندگی میں نہیں ہے، انہوں نے خلوص کی قیمت اپنی وفا سے چکا دی۔ دل لگی میں ندیم کی اداکاری ان کے فن کا نقطۂ عروج ہے۔ ''لازوال'' میں ایک ولن کے روپ میں انہوں نے بتا دیا کہ عہد حاضر میں انہیں صف اوّل سے نکالنا ناممکن ہے۔ جناب ساجد امجد نے پچھلے ماہ کی غیر حاضری کی کسر پوری کر دی نفسیات دان سے ملا کر، فرائیڈ نے فطرت کے اسرار و رموز کی تحقیقات میں اگر اسلام نہیں تو اپنے یہودی مذہب کا مطالعہ ہی کر لیا ہوتا تو اسے اپنے بہت سے نظریات کی تصحیح کرنے کا موقع اپنی زندگی میں ہی مل جاتا۔ سچ بیانیوں میں نقب، مقتول، ساتھی، رانگ

نمبر شریک سفر اور نجات زیادہ پسند آئی۔"

☆ فقیر غلام حسین ضیاء کی آمد بھکر سے۔ "محمد عمران خان ڈیلی نامدار بھکر، محمد عارف بھکر سے، رضا احمد خان اعوان دریا خان بھکر سے، انور عباس شاہ بھکر کے خطوط "مشہر خیال" میں پڑھے اور لطف آیا۔ دنیا داری سے فرصت ملے تو یاد کرلیا کرو۔ سید امتیاز حسین بخاری نے طورا اور ممدو، دو مشہور کردار پر تبصرہ کیا ہے۔ بخاری صاحب نے لکھا ہے کہ طورا خان اعوان چار فٹ قد کے تھے بلکہ ان کا ساتھی ممدو مضبوط جسم کا مالک چھ فٹ قد رکھتے تھے۔ امتیاز بخاری صاحب بات الٹ کرگئے ہیں۔ میں نے ممدو لوہار جو طورا خان کا ساتھی تھا۔ داؤد خیل ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ وہ چار فٹ قد اور انتہائی نحیف و نزار جسم اور کمر جھکی ہوئی عینک لگا کر کسمپرسی کی حالت میں دیکھا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا تھا کہ ممدو چاندی والے کتنے روپے تم منہ میں رکھتے تھے تو اس نے کہا کہ بیس روپے۔ طورا خان پہلے مارا گیا تھا انگریز ایس پی نے مارا تھا۔ طورا خان ایک کوٹھے میں بند تھا۔ ایس پی نے للکارا طورا ہتھیار ڈال دو مارے جاؤ گے۔ وہ مقابلہ کرتا رہا جب کارتوس ختم ہوگئے تب طورا خان نے بندوق باہر پھینکی لیکن گولیوں کی بوچھاڑ میں گر گیا اور کھیل ختم ہوگیا۔ ممدو کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جس کے نام سے لوگ ڈرتے تھے۔ آج کیا حالت ہے۔ "نفسیات دان" کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد نے ماہر نفسیات ڈاکٹر سیگمنڈ فرائیڈ کے حالات زندگی تحریر فرمائی ہے جس کی نفسیاتی دریافتوں نے یورپ کے اخلاقی و عملی نظریات میں عظیم انقلاب برپا کردیا۔ فرائیڈ نے سب سے پہلے لاشعور کو دریافت کرکے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی بنیاد جنس کو قرار دیا اور یوں اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے ذہنی بیماریوں کے علاج میں انقلاب پیدا کردیا۔ "نواب بہادر یار جنگ" میرے ہم نام غلام حسین (میمن) کی تحریر ہے یہ ایک ایسے محب وطن کا تذکرہ ہے جس نے وطن عزیز کے حصول اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ یہ حیدرآباد دکن کے جاگیردار نواب یاور جنگ کے بیٹے تھے۔ "خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را" عائشہ انور صاحبہ نے گلوکارہ نورجہاں کی یاد تازہ کردی ہے۔ ایک مشہور ادیب نے تو نورجہاں کو سرور جاں کے نام سے یاد کیا ہے۔ بہرحال اپنے وقت کی مشہور مغنیہ تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلہ وار کہانی "ناسور" کی ساتویں قسط جاری ہے۔ بھٹی صاحب بلاشبہ داد کے مستحق ہیں۔ ہر موڑ پر ایک نئی کہانی ہے۔ نعمان کی بہن عاصمہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی۔ سسپنس اب بھی قائم ہے۔ "نقب" انیلہ صاحبہ کی تحریر ہے۔ کہانی ایک انتہائی گھٹیا ذہن کے انسان کے گرد گھومتی ہے جو شادی شدہ ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کا رسیا تھا۔ انجام بے عزت ہوکر اپنے گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ "مقتول ساتھی" زرین قمر کی فکر و سوچ کا عکس ہے۔ چوری کرنا بھی ایک پیشہ ہے اور اگر واردات سے کچھ حاصل نہ ہو تو پھر اپنی بدقسمتی کو کوستے ہیں۔ "انسان کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار" موضوع کے اعتبار سے بہت اچھا عنوان ہے اور جیل میں قیدیوں سے اپنے جرم کی وضاحت کا کھوج لگانا ایک خاتون کے لیے بڑی جرأت اور حوصلہ مندی کی نشانی ہے پھر ایک بے گناہ کو قید سے آزاد کرانا بڑی بات ہے۔ مقبول اور اکرم کے ڈائیلاگ بہت جاندار ہیں۔ "رانگ نمبر" ڈاکٹر ظفر احمد خان کی تحریر ہے۔ ظفر صاحب نے بڑی اچھی نصیحت کی ہے۔ موبائل فون پر محبت نہ کریں۔ فون اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا۔ غلط استعمال کا انجام نقصان دہ ہے۔ برے کام کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ والدین تو بچوں کو اسکول یا کالج تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں ان کو خبر رکھنی چاہیے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ "بدگمان" دردہ خان کی تحریر ہے۔ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ شک نہ کرو کہ بعض شک گناہ ہیں۔ اس کہانی کا نتیجہ بھی بدگمانی ہے اسی شک اور بدگمانی پر کتنے گھر روزانہ اجڑ رہے ہیں اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ "سونا ڈبل" عاطر شاہین کی ایک نصیحت آموز کہانی ہے۔ آج کل اس موضوع کے مطابق عام وارداتیں ہو رہی ہیں۔ سونا ڈبل ہونے کے لالچ میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھنا عام سی بات ہے۔ "ادھورا رشتہ" وسیم بن اشرف کی تحریر ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس دیس سے جوڑ کر دیکھیں جہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ "شریک سفر" غلام رضا جعفری کی تحریر نہایت اچھی ہے۔ ایک بھولے بھٹکے انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ بالکل بدل گئی اور پھر نیک سیرت ساتھی ثابت ہوئی۔ "نجات" زویا اعجاز کی سچ بیانی ایک حقیقت ہے۔ اندھی عقیدت کا شکار لڑکیوں کو ڈرا دھمکا کر عزت لوٹی جاتی ہے۔ بدمعاشوں نے بزرگی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور پارسائی کا ڈھونگ رچا کر شریف زادیوں کی عزت سے کھیلنا یہ شیطانی کام ایک آدمی کا نہیں بلکہ یہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ حکومت چاہے تو اس برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے مگر اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری ملیر کراچی سے لکھتی ہیں۔ "یوم آزادی مبارک کے خوب صورت لفظوں سے جگمگاتے سرورق کے ساتھ سرگزشت اس دفعہ جلد ہی مل گیا۔ اداریہ کی کہانی منفرد اور الگ ہی لگی۔ محترم بزرگ نے اچھی نصیحت کی۔ "مشہر خیال" پر نظر دوڑائی تو رانا شاہد صدارت کی کرسی پر دکھائی دیئے، مبارک ہو اور ساتھ میں بیٹی کی سالگرہ کی بھی بہت بہت مبارک باد۔ آفتاب احمد اشرفی صاحب معراج انکل کو دل جلانے سے منع کرتے کرتے اپنا ہی دل جلا رہے تھے۔ بھئی ایسا کیوں؟ دیکھ لیجیے سب کچھ نہ سہی مگر کچھ تو بدلا ہے، نئے پاکستان کا خواب دکھانے والے پرانے پاکستان میں بڑی زبردست تبدیلی لائے ہیں۔ بہت سے چہروں کے نقاب سرکے ہیں تو بہت سی حقیقتیں بھی سامنے آئی ہیں جنہیں دیکھ کر دکھ بھی ہوا ہے کہ پاکستان سے محبت کا ڈراما رچانے والوں نے پاکستان کو کن حالات میں پہنچا دیا ہے۔ دل جلانے سے اچھا ہے کہ دعا کیا کریں، وطن کے لیے بھی اور وطن میں بسنے والوں کے لیے بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری تاریخ بڑھانے میں ہمیشہ کی طرح اپنا کردار بخوبی

ادا کیا۔ ''نفسیات دان'' لکھی اور بہت خوب لکھی باپ کے بغیر اچھی تحریر ہے لیکن ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں باپ کو وہ خراج نہیں ملتا جس کا وہ مستحق ہے اس کی قربانیاں ہمیشہ پس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو باپ کی محبتوں کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ شاعروں کی شاعری ہو یا ادیبوں کا ادب ہمیشہ ماں ہی کو نمایاں رکھا جاتا ہے۔ قلم ساز پڑھ کر بانو قدسیہ کے ایک جملے کی یاد آگئی کہ ''محبت مرد کی زندگی کا محض ایک واقعہ مگر عورت کی پوری زندگی کی داستان ہوتی ہے۔'' ربیکا اس جملے پر پوری اترتی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ سامر اگر کڑے حالات کا مقابلہ دیدہ دلیری سے کر سکتا ہے تو محبت کا بھرم رکھنا اسے بھی آتا ہے ''روزنامہ پیسہ'' پڑھ کر حیرت ہوئی اخبار کو تو پیسہ کمانے کا ذریعہ جانا جاتا ہے لیکن کسی اخبار کا نام پیسہ ہونا واقعی حیرت انگیز ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال کہاں پھنس گئے۔ اچھا بھلا سفرنامہ جاری تھا ان گوروں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ ندیم بھائی آپ گوروں کے چنگل سے تو بچ کر نکل ہی جائیں گے مگر اتنا بتا دیجیے کہ امریکا یا کینیڈا کی شہریت لینے کے لیے جو حلف نامہ لیا جاتا ہے اس حلف نامے میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب ذرا تفصیل سے بتائیے گا۔ ندیم صاحب نے فلم انڈسٹری میں اپنے کردار کو عمدگی سے نبھایا کچھ فلموں کے بارے میں امی سے پوچھا اور کچھ معلومات ہمیں انور فرہاد کی زبانی ملیں۔ انور فرہاد ہو سکے تو اگلی تحریر روحی بانو پر لکھیے پلیز۔ ''ناسور'' میں کتنے ہی موڑ کاٹتے کاٹتے نعمان ایسے موڑ پر آکھڑا ہوا ہے کہ ایک طرف تو اس کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے تو دوسری طرف ان گنت دشمنوں کی سازشیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ ہیرو کیسے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملاتا ہے۔ پہلی سچ بیانی ''نقب'' پڑھی۔ دوسروں کے گھروں میں نقب لگانے والے کے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔ اگر نقب لگانے والے نقب لگانے سے پہلے یہ سب سوچ لیں تو بہت سے گھر نقب زنی سے بچ جائیں۔ زویا اعجاز کی ''نجات'' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دین اسلام جعلی پیروں فقیروں کے پاس جانے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ مصیبت آتی ہے تو سچے خدا کو بھول کر نام نہاد خداؤں میں خدا کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ غلاظت کی دلدل میں دھنسے یہ پیر فقیر تو خود محتاج ہیں، کوئی سوچتا کیوں نہیں ہے کہ یہ محتاجوں کی محتاجی کیسے دور کریں گے۔ زمانہ بدل گیا لیکن نظریے نہ بدلے اور اسی نہ بدلنے کے عمل نے کیا کچھ بدل ڈالا کہ سکون کی تلاش میں بھٹکنے والے بے سکونی کو ہی اپنا مقدر بنا بیٹھے۔''

☆ مقدس جہاں کراچی کا اختصاریہ۔ ''ہمیں رسالہ 25 تاریخ کو ہی مل گیا۔ اس بار سرگزشت میں ''اوندھی بستی'' سب سے زیادہ پسند آئی کیونکہ اس میں شاہد لطیف نے بالکل نئی معلومات دیں۔ سچ بیانیوں میں ''سونا ڈبل'' ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ باقیوں میں نقب، شریکِ سفر اور مقتول ساتھی بہترین لگی۔''

☆ محمد ابراہیم درانی نے ڈی جی خان سے لکھا ہے۔ ''میں 1998ء سے آپ کا خاموش قاری ہوں۔ آپ کی تمام تحریریں زبردست ہوتی ہیں۔ آپ نے دلیپ کمار کے متعلق بہت لکھا۔ میرے خیال میں یہ باقی نئے فنکاروں کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی اور ناانصافی ہے (دلیپ کمار پر صرف ایک تحریر شائع ہوئی ہے) آپ نشانِ حیدر پانے والے تمام شہداء کے متعلق تحریر کریں۔ گلوکار مکیش کے متعلق اگر شائع کیا ہے تو بتائیں (مکیش پر علی سفیان آفاقی نے الف لیلہ میں کافی لکھا ہے)۔ پاکستانی اداکارہ آسیہ کے متعلق بھی تحریر ضرور کریں۔ آخر میں میری طرف سے تمام سرگزشت اسٹاف کو اور قارئین کو دلی عید مبارک۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے آئے ہیں۔ ''یوم آزادی کی مناسبت سے سرورق بہترین رہا۔ تصویر الم کی شاعری کرنے والے فانی بدایونی نے آخر میں اپنی موت کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ اداریے میں حسب روایت ہمارے رویوں کے حوالے سے اہم پہلو کی نشاندہی تھی۔ انفرادی ہو یا اجتماعی، وہی لوگ اور قومیں ترقی کرتی ہیں جنہوں نے نرمی، شائستگی اور تحمل سے کام لیا۔ ''مشہر خیال'' میں سب سے پہلے ہمارا ہی خط تھا، شکریہ۔ سید امتیاز حسین آپ تو خود ادبی و ثقافتی کام کر رہے ہیں۔ آپ میانوالی کے ان حریت پسندوں پر لکھیں تو بہت سے قارئین کو ان کے کارناموں سے آگاہی ہوگی۔ منشی محمد عزیز کا خط بھی اچھا تھا۔ آفتاب احمد نصیر آپ نے صحیح لکھا۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ قانون صرف عام اور غریب آدمی کے لیے ہے۔ نزاہت انشال سب سے پہلے تو جاب کی مبارک باد قبول کریں۔ دوسرا نسیم حجازی کے بڑے ناول نگار ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تاہم ان کے ناولوں میں خاصی حد تک مبالغہ آرائی اور رومانوی قصوں پر تحفظات ضرور ہیں۔ سدرہ بانو حاضر تھیں۔ البتہ طاہرہ گلزار اور بشریٰ افضل تو کافی عرصے سے غائب ہیں۔ کلیم اللہ ایڈووکیٹ نے جماعت اسلامی کے میاں طفیل کے حوالے سے کچھ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ ان سے بھی گزارش ہے کہ اس حوالے سے کوئی تفصیلی آرٹیکل لکھیں تاکہ قارئین بھی ان حقائق کے متعلق جان سکیں۔ محمد عارف اعزاز یہ تو ایک رائٹر کا بنیادی حق ہوتا ہے جو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ غضنفر عباس مرزا جیسے بزرگ بھی ذوق و شوق سے سرگزشت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ مختلف ڈائجسٹوں کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ بتاتے چلیں کہ عنایت اللہ صاحب کا حکایت رسالہ تھا سیاہ ڈائجسٹ نہیں۔ وحید ریاست بھٹی کافی دنوں بعد نظر آئے۔ ان کے سالانہ تجزیے کا سبھی کو انتظار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو صحت کے ساتھ عمر عطا فرمائے (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ صدی کے ایک بڑے نفسیات دان سگمنڈ فرائیڈ

کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آگاہ کررہے تھے۔ سگمنڈ فرائیڈ کی اپنی زندگی بھی نفسیات کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتی نظر آئی۔ غلام حسین میمن کی ''نواب سپاہی'' اگست کے مہینے کی مناسبت سے بہترین تحریر تھی۔ میمن صاحب نے نواب بہادر یار جنگ کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا جو دل کو بھایا۔ دانیہ صدیقی کی دلچسپ دریافتیں ایک مختصر معلوماتی تحریر تھی۔ انور فرہاد اس دفعہ پاکستان فلم انڈسٹری کے سپر اسٹار ندیم کا زندگی نامہ لائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے بچپن میں جس پاکستانی ہیرو کی سب سے زیادہ فلمیں دیکھیں وہ ندیم ہی ہے۔ پی ٹی وی کے اچھے دنوں میں جب ہر ہفتے فلم لگا کرتی تھی تو اس کا بے چینی سے انتظار ہوتا تھا۔ اپنے وقت کے مشہور و معروف اخبارات کے حوالے سے معلوماتی سلسلہ بھی سرگزشت کا ہی خاصا ہے۔ اس دفعہ روزنامہ ''پیسہ'' پر شکیل صدیقی کی معلوماتی و دلچسپ تحریر پڑھنے کو ملی۔ منظر امام کی ''ازم'' بھی منفرد موضوع پر تھی۔ شاہد لطیف اور شاہ ثاقب کی تحریریں بھی دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ حسب روایت بہترین جارہا ہے۔ کاشف زبیر کی ہالی ووڈ کے ایک بڑے فلم ساز کی جدوجہد سے بھرپور کہانی اچھی لگی۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ کشمالہ حسن کی ''باپ کے بغیر'' مختصر مگر منفرد موضوع پر تھی۔ قومی ترانے کی دھن تخلیق کرنے والے احمد چھاگلہ پر ایاز راہی کی تحقیق قابلِ ستائش ہے۔ ان کا یہ کام انہیں تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھے گا۔''

☆ قیصر خان کا خط بھکر سے۔ ''اداریہ میں انکل نے فرض کی طرف توجہ دی ہے جو کہ ہمارے اسلامی معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے لیکن پورے ملک میں سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں چپڑاسی سے لے کر افسروں تک نرمی سے خالی ہیں جو کہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس بار سب کے تبصرے شاندار تھے۔ نئے دوست بھی حاضر تھے سب کو خوش آمدید۔ سید امتیاز صاحب معلوم نہیں ڈاکوؤں کو کیوں ہیرو بنا گئے۔ کلیم صاحب کا خط تاریخی نقطہ نظر سے بہت اچھا تھا، آپ آتے رہا کریں۔ بہت سے دوست غیر حاضر ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین، ڈاکٹر روبینہ، محمد عامر ساحل، معظم علی، خالد صاحب، ناصر رند، آپا طاہرہ گلزار، جونانی صاحب وغیرہ لوگ وقفہ وقفہ سے حاضری ضرور دیا کریں۔ یک صفحہ پر فانی بدایونی صاحب تھے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بہت اچھے طریقے سے فرائیڈ کی آپ بیتی بیان کی۔ قلم کا جادو ڈاکٹر صاحب کا کمال ہے۔ پرچے میں تمام مضمون بہت اچھے تھے۔ دلچسپ دریافتیں، نواب سپاہی، گولڈ اسٹار، روزنامہ پیسہ، ازم، اوندھی بستی، فلم ساز، نام، باپ کے بغیر، سرچھاگل، اداکار ندیم کے بارے میں جاننے کو ملا اور امریکا کے فلم ساز سے ملے۔ ازم کے بارے میں جانا، قومی ترانہ کے ... خالق کے بارے میں پڑھا اور افسوس ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس محسن کو بھلا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قدیر خان کو لوگ آہستہ آہستہ بھولتے جارہے ہیں۔ ہم پاکستانی محسن کش قوم بنتے جارہے ہیں۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی خوشہ چینی قصور سے۔ ''خدانہ واشت'' عظیم شاعر فانی بدایونی اپنی سن وفات بتا کر وقت کے مطابق رخصت ہوگئے۔ اللہ کے پیارے بندوں کو کہیں نہ کہیں الہام ہوجایا کرتا ہے اور ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بہرحال پُراثر اور جامع سرگزشت بہت اچھی لگی۔ انکل معراج کے مطابق ہمیں انفرادی اور معاشرتی طور پر نرم بننا ہوگا نہیں تو میں نہ مانو کی طرح ساری اکڑ دھڑن تختہ ہو جائے گی اور پژمردہ معاشرے کے چہرے کھل اٹھیں گے۔ اس کی شروعات ہوگئی ہیں، بس پیاری عوام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں رانا محمد شاہد کو صدارت مبارک معروفیات اچانک اتنی بڑھ گئی ہیں کہ بھی سے رابطہ کٹ گیا ہے۔ منشی عزیز، محمد عمران خان، آفتاب احمد نصیر اشرفی، نزاہت افشال، سعید احمد چاند، کلیم اللہ ایڈووکیٹ، غضنفر عباس مرزا اور وحید ریاست بھٹی کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ نفسیات کے محدود دائروں سے نکل کر انقلاب برپا کرنے والے نفسیات دان، سگمنڈ فرائیڈ کی سرگزشت لاجواب رہی، دلچسپ دریافتیں، اوندھی بستی اور روزنامہ پیسہ معلومات افزا تحریریں تھیں۔ حسِ مزاح نارمل رہی جب کہ ازم نے سوچنے پر لگا دیا۔ ''باپ کے بغیر'' بھی اچھی رہی اور ''نام'' کی نامور نور جہاں کے شہر میں تو میں اس وقت موجود ہوں۔ مختصراً عمدہ تحریر۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اچھی جارہی ہے۔ ''ناسور'' میں ناسوروں نے بے چاری عاصمہ کو اغوا کرلیا جو بازیاب ہونے کے قریب ہے مگر فہیم غم سے ہی بے پتا ہوگیا۔ ''مقتول ساتھی'' دلچسپ تھی۔ زریں قمر رہائی کا ذریعہ بن گئیں، زبردست۔ غلط حرکتوں کی ماجد کو سزا ملی اور شائلہ کا صبر رنگ لایا۔ یوں ساجد کو نقب تو لگی مگر شائلہ کی زندگی بن گئی۔ مودے چکری نے تو مراد خان کو چکرا کے رکھ دیا آخر اسے بھی اپنی ''ناگن'' بیوی کی سمجھ آہی گئی۔ بھٹکی ہوئی تحریر کو اچھا سہارا ملا تو وہ بھی سدھر گئی۔ یوں شریک سفر کی کتھا بھی سلجھ گئی۔ منشیات فروش پیر سرکار پر ہر کوئی آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا رہا اور ہر کوئی سکون حاصل کرنے کی غرض سے آستانے سے جڑتا چلا گیا مگر ایک دن بھی اس سیاہ کار بدبخت ڈھونگی پیر کی بھینٹ چڑھ گئے۔ معصوم لوگ دنیا سے تو نجات پاگئے لیکن ایسے انسانیت دشمنوں سے نجات کب ملے گی؟ ''بیت بازی'' سے عفت کریم، نیاز ملکھانی اور نائلہ منصور کے شعر عمدہ رہے۔''

☆ ڈاکٹر عبدالغفور شکیل کا تبصرہ ملتان سے۔ ''سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ ''خاص نمبر'' کا اشتہار دیکھا۔ آپ اس اشتہار کے ذریعے جو کہنا چاہتے ہیں وہ بات سمجھ آگئی ہے کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں خاص نمبر شائع کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مختصری زندگی میں بہت نمایاں منفرد اور بڑے کام کیے۔ میرے خیال میں اس فہرست میں ایک نمایاں نام ممتاز فلمی اداکار ٹاپ اسٹار چاکلیٹی ہیرو، لیڈی کلر وحید

مرادکا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک تحریر افسانے کی شکل میں تیار کی ہے جس میں ان کی تمام فلموں کے نام آجاتے ہیں اگر آپ حکم کریں تو میں وہ تحریر آپ کی خدمت میں ارسال کردوں یا ان کے بارے میں مزید بہت کچھ لکھ سکتا ہوں وہ لکھ کر بھیج دوں (آپ نے دیر کردی، لیڈی کلر کی سوانح پڑھ لیں)۔''

☆ سیف اللہ ملک وال کا اظہاریہ۔ ''سگمنڈ فرائیڈ'' ڈاکٹر ساجد کی تحریر نفسیات دان پسند آئی۔ تحریر میں صاحب مضمون کی محنت نظر آرہی ہے۔ ''نواب سپاہی'' تحریر سے پتا چلا کہ قائداعظم کے ساتھیوں میں کیسے کیسے جاں نثار تھے۔ اس لیے تو کمزور جسم والے آدمی نے دنیا کو وہ کر دکھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ دانیہ صدیقی کی تحریر ''دلچسپ دریافتیں'' واقعی دلچسپ ہے اور ثابت ہوا کہ جو کچھ بھی ہونا ہوتا ہے قدرت اس کا سبب بنا دیتی ہے۔ لیجیے انور فرہاد صاحب نے ''گولڈن اسٹار'' میں اتنی زیادہ معلومات (ندیم کی فلمیں، ہیروئنوں کے نام، اعزازات گانے وغیرہ) لکھ کر حیران کر دیا ہے۔ ایک آدمی کے پاس اتنی معلومات!! اللہ نظر بد سے بچائے۔ روزنامہ ''پیسہ'' اخبار میں شکیل صدیقی صاحب نے پیسہ اخبار کی تفصیل سے تاریخ تو بتا دی ساتھ ہی منشی محبوب عالم صاحب کے حالات زندگی سے بھی آگاہی ہوئی۔ ازم منظر امام صاحب کا اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ ''اوندھی بستی'' شاہد لطیف صاحب کی اور ''نئی دریافت'' بھلی لگی۔ لیں جی اب باری ہے ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک کی۔ ہر قسط پر ندیم اقبال کی تعریف نہ بھی لکھیں لیکن ہر قسط ہوتی قابل تعریف ہے۔ اس دفعہ قسط میں ڈرامائی انداز بھی نظر آیا اور پسند آیا۔ فلم ساز میں سام کی کہانی پڑھی۔ لکھنے والے کاشف زبیر صاحب ہیں تو کیا یہ ان کی کوئی پرانی تحریر ہے (جی ہاں، یہ لگ نہیں پائی تھی) ویسے جس مزاح بغیر باپ کے زندگی جیت گئی۔ ''سرچھاگل'' چھوٹی چھوٹی مگر معلوماتی تحریریں ہیں۔ اچھی ہیں لیکن ''زندگی جیت گئی'' میں لکھا ہے کہ درجہ حرارت منفی 18 ہے لیکن سمندر کی سطح جمتی نہیں بلکہ کشتی رانی کے لیے ٹھیک ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ صفر درجہ حرارت پر پانی برف بن جاتا ہے۔ ''نام والی تحریر میں لکھا ہے کہ آج سے 80 برس پہلے یعنی 1926ء ستمبر میں قصور میں ایک بچی پیدا ہوئی یعنی جب تحریر لکھی گئی اس وقت 2006ء تھا (بالکل صحیح اندازہ ہے۔ یہ 2006ء کی تحریر ہے جو رکھی ہوئی تھی)۔ سدرہ بانو ناگوری، اختر علی، اختر شاہ کے شعر اچھے لگے۔ ''پیش گو'' میں فانی بدایونی صاحب کے مختصر مگر جامع حالات زندگی کا پتا چلا۔ معراج رسول صاحب کی دانت، زبان والی مثال گہرے معانی رکھتی ہے۔''

☆ جبینا کا شکوہ کراچی سے۔ ''کافی عرصے سے آپ کے رسالے کی قاری ہوں۔ خود بھی شوقیہ لکھتی تھی پھر کچھ حالات کی وجہ سے کافی عرصہ سے لکھنے سے دور ہوں۔ اب بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ لکھ کر ادیبوں کی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑلوں سو ایک کوشش کی ہے یہ کہانی حرف بہ حرف سچی ہے (کہانی پڑھ کر فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا)۔''

☆ شاہد نقوی کا تبصرہ کراچی سے۔ ''پہلے تو میری طرف سے ہدیہ تہنیت قبول فرمائیے کہ آپ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ڈائجسٹ مختلف موضوعات اور دلچسپی کا سامان لیے ہوتے ہیں جو یقیناً اس دور میں کہ جہاں کتب بینی قصہ پارینہ ہوتی جارہی ہے۔ رغبت کا سامان ہیں۔ توجہ اس امر کی طرف دلانا مقصود ہے کہ جہاں عمدہ تحاریر بہترین اشاعت لیے قاری پر اپنا اعتماد قائم کرتی ہیں وہیں ذرا سی غلطی، ایک آدھ سقم قاری اور ادارے کے درمیان رشتے میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔ اس ایک آدھ سال میں کئی مواقع ایسے تھے کہ جی چاہتا تھا احساس دلاتا چلوں لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات میں ممکن نہ ہوسکا۔ آج جسارت کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ اسے تنقید نہیں توجہ کے مترادف سمجھیں گے۔ مئی 2017ء کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ مضمون بعنوان ''کیا تیرا بگڑتا'' میں جناب محمد شیراز رقم طراز ہیں۔ ''ایک اور جوان موت ثنا خان کی ہوئی تھی۔ بابر نام کے ایک نوجوان سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ کراچی سے حیدرآباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس حادثے میں دونوں ہی کا انتقال ہوگیا۔'' جناب کی توجہ چاہتا ہوں کہ بابر خان ایک اداکار ہے اور وہ اس حادثے میں بچ گیا تھا۔ وہ بقید حیات ہے (جی ہاں صحیح کہا، سہواً بابر کا نام چلا گیا تھا)۔ اسی طرح عبدالروف خالد ایک بیوروکریٹ تھے اور حادثاتی موت کے وقت ان کی عمر تقریباً 50 سال تھی جب کہ مضمون نگار نے نہ صرف ان کی عمر غلط لکھی بلکہ مرحوم کی شہرہ آفاق سیریل ''انگار وادی'' کا ذکر بھول گئے جس نے کشمیریوں اور غاصب بھارتیوں کا پول کھول کر دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ اسی طرح اس اہم مضمون میں چند اہم نام ذکر سے محروم رہے جنہوں نے اگلے جہان میں منتقلی سے قبل بہت تھوڑے عرصے میں دھوم مچائی۔ مثال کے طور پر آنس معین کے جسے جوش صاحب نے کیٹس کا خطاب دیا تھا۔ آنس نے کم عمری میں خودکشی کرلی تھی۔ رزاق راجو کہ جس کی ٹائمنگ نے تھیٹر اور ٹی وی کے بڑے بڑے فنکاروں کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔ ڈائیلاگس کی بروقت ادائیگی پھر دیکھنے میں نہ آئی۔ اداکارہ طاہرہ نقوی جس نے سنجیدہ اداکاری کو نیا رنگ دیا اداکارہ خالدہ ریاست کہ روحی بانو کے ساتھ اس کی ویڈیو کلپس پونا انسٹی ٹیوٹ کے کورس کا حصہ ہے۔ اداکار حسام قاضی کم عمری میں انتقال کر گئے۔ نامور فلمی کامیڈین منور ظریف بھی زیادہ عرصے زندہ نہ رہے اور بھی شخصیات ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم مضمون کے لیے مفصل تحقیق کی ضرورت تھی۔''

☆ شاہد اقبال شاہد کا تجزیہ کراچی سے۔ ''ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد 'مشہر خیال' میں داخل ہو رہا ہوں۔ یک صفحی سرگزشت میں اردو کے عظیم شاعر فانی بدایونی کے بارے میں پڑھا۔ غالباً ان کی مکمل سرگزشت ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا محترم

ساجد امجد سے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ فانی بدایونی کے بارے میں مفصل تحریر کریں (ہو چکی ہے)۔ اداریے میں آپ نے زبان اور دانت کے تعلق کو بڑے فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے نفسیات دان سگمنڈ فرائیڈ کی شخصیت پر محترم ڈاکٹر ساجد امجد نے اپنے دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے جو کہ انہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ غلام حسین میمن نے تحریک پاکستان کے شعلہ بیان مقرر محمد بہادر خان کی سرگزشت تحریر کی جو کہ تاریخ پاکستان میں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے جانے جاتے ہیں اور جن کی تقریر کی فرمائش بانی پاکستان قائداعظم بطور خاص کیا کرتے تھے۔ انور فرہاد نے گولڈن اسٹار ندیم کی داستان لکھ کر ثابت کر دیا کہ ندیم واقعی سنہری ستارہ یعنی گولڈن اسٹار کے لقب کے قابل ہیں گو کہ اس سے قبل محترم انور فرہاد نے دسمبر 1993ء میں ہنگامہ شادی کے نام سے نذیر بیگ اور فرزانہ کی خفیہ شادی کا احوال بیان کیا تھا اور جولائی 1992ء میں علی سفیان آفاقی مرحوم نے انوکھا اداکار میں نذیر بیگ کی حالات زندگی بیان کی تھی اور اب زیر نظر شمارے میں اس انوکھے اداکار کے بارے میں ایک بار پھر پڑھ کر کافی لطف آ گیا۔ ایسی کوشش آئندہ بھی ہوتی رہنا چاہیے۔ ''فلمی الف لیلہ'' کی کمی انور فرہاد احسن طریقے سے پوری کر رہے ہیں جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ ٹیلی ویژن کے مقبول معلوماتی پروگرام نیلام گھر کے میزبان کے بارے میں بھی تفصیلاً لکھیں، جی ہاں میرا اشارہ طارق عزیز کی طرف ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے اناؤنسر بھی تھے اور میری پسندیدہ ترین شخصیت بھی۔ میں نے ان کے متعدد پروگراموں میں شرکت کی جن کی ریکارڈنگز اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ منشی محبوب عالم کے پیسہ اخبار کے بارے میں شکیل صدیقی کی خوب صورت تحریر پسند آئی اور برصغیر کے اس منفرد اخبار کے بارے میں معلومات سے بہرہ مند ہوئے۔ دنیا کے مختلف مذاہب کے بارے میں منظر امام نے دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی جس سے ہمیں مختلف ازم کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ ''باپ کے بغیر'' میں کشمالہ حسن نے ان لوگوں کے متعلق بتایا جن کے سر سے باپ کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا مگر ان کے کارنامے رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے جن میں سرفہرست محسنِ انسانیت حضور اکرمؐ ہیں جن کی عظمت سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ایاز راہی نے ''سر چھاگل'' میں قومی ترانے کی دھن کے خالق کے بارے میں گراں قدر معلومات بہم پہنچائیں۔ ''ناسور'' کو نظرانداز کر کے سچ بیانیوں کی جانب بڑھ گیا کیونکہ قسط وار سلسلے سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ میرے خیال میں اس مرتبہ سچ بیانیوں میں پہلے نمبر پر مقتول ساتھی، دوسرے نمبر پر نقب اور تیسرے نمبر پر بدگمان رہی۔ ویسے اپنا اپنا خیال ہے میری اس ترتیب سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ موجودہ شمارے میں آپ نے ''خاص نمبر کا'' شائع کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے۔ میں اس شمارے کے لیے جان کیٹس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ جس نے صرف 26 سال کی عمر پائی اور انگریزی ادب میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا (ان پر تحریر موصول ہو گئی ہے)۔ مجھے امید ہے کہ سرگزشت کے دیگر خاص نمبروں کی طرح ''یہ نمبر'' بھی ایک یادگار دستاویز ثابت ہوگا۔''

☆ محمد ایاز راہی کی خیال آفرینی مانسہرہ سے۔ ''اِک عرصے بعد دوستوں نے یاد کیا تو حاضر ہوں۔ پہلے سرگزشت کا ذکر ہو جائے۔ ماہ نامہ سرگزشت اُس گھنے سایہ دار پیپل کی مانند ہے جہاں ہر ماہ گاؤں (Global, Village) کی چوپال جمتی ہے اور جس کے سائے تلے خاص و عام سبھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ سر بیچ مدیرِ سرگزشت ہی ہوتے ہیں جو سب کو برابر توجہ دیتے ہیں خواہ وہ مردِ کہستانی ہو یا بندہ صحرائی و میدانی۔ یقیناً سرگزشت اِک علمی اور عوامی پرچہ ہے جو ہر خاص و عام کا محبوب ہے، وہ محبوب جس کا باقاعدہ انتظار کیا جاتا ہے جس کی ہر ہر ادا (تحریر) کو سراہا جاتا ہے، نہ صرف عوامی سطح پر بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی اِسے بھرپور پذیرائی ملتی ہے اور یہ سب مدیرِ سرگزشت کی کوہ کنی اور تیشہ آزمائی کا کمال ہے کہ سرگزشت جوئے شیریں کی مانند ہر پیاسے کو سیراب کرتا ہے۔ اس علمی، ادبی اور عوامی چوپال میں مجھ جیسا اناڑی بھی کچھ نہ کچھ کہہ کے داد پاتا اور جوش و جذبے سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس بار شہرِ خیال کے جن دوستوں نے مجھ ناچیز کو یاد کیا اللہ انہیں تا دیر سلامت اور خوش حال رکھے (آمین)۔

☆ کورنگی (کراچی) کے آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب! یاد آوری کا از حد شکریہ۔ میں تو اب بھی شہرِ خیال کا مستقل باشندہ ہوں۔ عرض کیا نا کہ کبھی کبھار ہی کوئی بات کر جاتا ہوں ورنہ تو میرے مضامین مدیرِ سرگزشت کی کمال توجہ سے لگتے ہی رہتے ہیں۔ میں اِک مزدور آدمی ہوں غم روزگار اور غم جاناں دونوں ہی کندھوں پہ سوار رہتے ہیں۔ ایک سے انکار تو دوسرے سے راہِ فرار نہیں۔ اُمید ہے آپ سب اپنی دُعاؤں میں مجھے یاد رکھیں گے کہ یہی حاصل ہے۔ مہورہ (فتح جنگ) کے نزاہت افشاں صاحب! آپ کی مثبت تنقید نے دل میں ٹھنڈک سی ڈال دی۔ یقیناً مضمون کے بہاؤ میں جملہ غلط بندھ گیا۔ فیض احمد فیض مرحوم یاد آ گئے ایک بار مشاعرے میں انہوں نے اپنا شعر پڑھا کہ اب بہار آئی ہے اس طرح کہ جیسے قاصد۔ کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے۔ تو سامعین میں سے کسی نے اٹھ کے کہا کہ حضرت! درست ترکیب، بے نیلِ مرام ہے۔ فیض نے مسکرا کے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ نزاہت جی! اُردو سے مجھے عشق ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''آتی ہے اُردو زباں آتے آتے'' پٹھان ہوں ناں معاف کر دیجیے گا۔ راحت وفا راجپوت صاحبہ! یادش بہ خیر۔ آپ غالباً ماہ نامہ، نازنین (کراچی) میں میرا پہلا افسانہ۔ نین سکھ۔ پڑھ کے تبصرہ بھی کر چکی ہیں۔ کراچی کی بہن سدرہ بانو ناگوری بھی یاد کر لیتی ہیں۔ پشاور کے انور اعجاز صاحب، بورے والا کے رانا محمد شاہد صاحب، بہاولپور کی بشریٰ افضل صاحبہ اور خصوصاً وحید ریاست بھٹی صاحب سب

کا شکر گزار اور دعا گو ہوں۔ ہاں البتہ میرے علاقے شہر مانسہرہ کے علی زمان مغل، وزیر خان (بٹل) ذوالفقار احمد دانش اور دیگر ساتھی عرصہ سے مسلسل چپ ہیں شاید دُنیا کے بکھیڑوں نے جکڑ رکھا ہے اُنہیں۔ بہ ہر حال کسی سے کوئی گلا نہیں۔ سرگزشت کی بانہیں سب کے لیے وا ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔"

☆ سعید احمد چاند کراچی سے رقمطراز ہیں۔ "پرچہ ملا۔ سرورق پسند آیا۔ شاعر شاہی امیر خسرو کے بارے میں پڑھا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا۔ ایک بات میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے دنوں ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے میرا سیدھا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اس لیے تحریر میں صفائی نہیں ہے، معذرت خواہ ہوں۔ "مشہر خیال" کے جن دوستوں کے تبصرے پسند آئے ان میں اعجاز احمد سٹھار، عبدالجبار رومی، ملک شاد تنولی، غلام حسین ضیاء، رانا محمد شاہد، انور عباس شاہ، محمد عمران خان، عریشہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی عزیز مئے، انجم فاروق ساحلی، فیض ادیب شامل ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہوں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے، (آمین)۔ (ابھی ابھی سعید احمد چاند کے صاحبزادے محمد انیس اختر نے فون پر اطلاع دی ہے کہ سعید چاند اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ تمام احباب سے درخواست ہے کہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر انہیں بخش دیں)۔"

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ "ایک بار پھر محکمہ ڈاک نے روایتی کارکردگی سے دوستوں کی محفل سے دور کر دیا۔ تمام پابندیوں سے بالاتر ہو کر تفصیل سے تبصرہ لکھا تھا۔ اب رونے پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، دوبارہ کمر باندھ کر سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری مدت بعد تشریف لائے ہیں۔ منشی محمد عزیز مئے، عمران ڈیلی نامدار اور بھکر کے تمام شرکا کو پڑوسی ہونے کے ناطے خوش آمدید کہوں گا۔ بس روبینہ نفیس انصاری کی کمی رہ گئی ہے۔ "گولڈن اسٹار" میں ندیم کے مرزا نذیر بیگ سے شروع کیے گئے سفر کا احوال پڑھا جس میں محنت کے ساتھ ان کی خوش قسمتی کا بڑا حصہ رہا اور وہ سدا بہار ہیرو بن کر پاکستانی عوام کے لیے قابل فخر بن گئے۔ "اوندھی بستی" کا شاکر لطیف کا سفر دشوار گزار اور خطرات سے پُر تھا لیکن مجھے خاص دلچسپ نہ لگا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں ندیم اقبال کیپسول کی وجہ سے پھنسے اور پریشانی الگ اٹھانا پڑی لیکن مجھے یہ معاملہ خاصا دل لبھانے والا لگا۔ انہوں نے خود اعتمادی سے سامنا کیا ہے۔ اس لیے صاف نکل آئیں گے لیکن کبھی بے خبری میں کتنی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔ "ناسور" اب مکمل توجہ حاصل کر چکی ہے تمام کردار اپنے چہروں کے ساتھ سامنے آچکے ہیں۔ سچ بیانیوں میں "نقب" میں ماجد کو اس کی بیوی نے جیسی چوٹ دی ہے امید ہے وہ باقی زندگی سنبھل کر اور تلملاتے ہوئے گزارے گا لیکن جیسا سبق انیلا دینا چاہتی تھی یہ راستہ ہی غلط تھا۔ ایسے معاملات پر مرد دامن بچا کر صاف بچ جاتا ہے اور عورت کی ذات شک کی زد میں آجاتی ہے۔ "مقتول ساتھی" میں کئی جھول ہیں واقعات حقیقت اور قانون سے متصادم ہیں۔ مقبول کو چھ سال سزا ہوئی حالانکہ چوری کی دفعات میں انتہائی سزا کم ہے جب وہ عدالت سے سزا یافتہ ہو کر اپنی سزا بھگت رہے تھے تو مقدمات، الزامات اور دفعات کیسے بدل گئیں اور سزا میں کمی بیشی ہوئی ایسے میں تو وکیل کیس کی بنیادیں ہی ہلا دے اور اپنے موکل کو صاف بری کرالے۔ یہاں عدالتی کارروائی کو بچوں کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ "رانگ نمبر" میں کاشف کا قسمت نے ساتھ نہ دیا وہ زندگی بھر کے لیے سزاوار بن گیا۔ "بدگمان" میں وردہ خان ذرہ برابر قصوروار نہیں ہیں ایسے پُراسرار حالات میں ہر ذہن میں شک کا کیڑا کلبلانے لگتا ہے اور ایسا منظر باپ، بھائی اور شوہر دیکھ لے تو نوبت مار کٹائی بلکہ قتل تک آجاتی ہے۔ طیش کے وقت عقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے لوگ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی پر اعتبار کر کے اپنی اور دوسروں کی زندگی جہنم بنا دیتے ہیں۔ "ناگن" کے واقعات افسوس ناک ہیں لیکن پیش کرنے کا انداز مضحکہ خیز ہے اگر بیانیہ طرز پر لکھی جاتی تو دردناک حالات اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آکر ہمدردی کے جذبات کو جگا دیتے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت ناگن ہے تو کبھی مرد بھی ایسا کوبرا بن جاتا ہے کہ ڈس لے تو دوسرا سانس بھی لینا نصیب میں نہیں ہوتا۔ بس یوں کہیے کہ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے پوری صنف کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ "سونا ڈبل" میں عذرا کو لالچ اور بھولپن میں نقصان اٹھانا پڑا حالانکہ کئی سالوں سے ایسے واقعات اخبارات، رسائل اور میڈیا کی زینت بنتے رہے ہیں۔ پھر بھی کوئی ایسے حالات کا شکار ہوگا تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ "ادھورا رشتہ" میں شاہین کو میں قصوروار نہیں سمجھتا۔ سارا کھیل ہی قسمت کا ہے اس نے گھر کی چخ چخ سے تنگ آکر عافیت کا گوشہ تلاش کیا۔ دنیاوی اور شرعی تقاضے نبھائے اگر سکندر نے دھوکا کیا ہے تو اللہ کی عدالت میں وہی جواب دہ ہے۔ شاہین گھر بسانے والی اور وفادار عورت ہے۔ سکندر کے بعد کسی دوسرے مرد کی طرف نہ دیکھا لیکن اگر مرد کے دل میں چور ہو تو عورت کیسے کھوج لگا سکتی ہے اب اس کا مذہبی رجحان اور سکندر سے پہلوتہی نیک فطرت ہونے کی دلالت کرتی ہے۔ "شریک سفر" میں مدثر عظیم انسان ہے جس نے تحریم کا کردار سامنے ہونے کے باوجود شریک سفر بنا لیا۔ وہ جوان، قبول صورت اور با روزگار تھا بھلا لڑکیوں کی کیا کمی تھی والدین کا بھرم رکھنے اور احسان اتارنے والے اعلیٰ ظرف جوان کم ہی ملیں گے۔ "نجات" میں ہمارے اندھے اعتقاد، کمزور ایمان اور بشری کمزوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے اردگرد کے مناظر ہیں ہم بھی کہیں کم کہیں زیادہ کردار

رکھتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں زہر پھیں اور تباہی کا سامان آپ مہیا کریں تو کسی کی طرف شکوہ بھری نظر سے دیکھنا انصاف کے زمرے میں نہیں آتا۔ زویا اعجاز نے بھلائی کا حق ادا کر دیا ہے لیکن ہم نے سانحات سے بچنا ہے تو آج سے غور وفکر کرنی ہوگی۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے۔ ''بڑی خوشی ہوئی کہ میرا خط شائع ہوا۔ شوکت علی فانی بدایونی پیش گو کا یک صفحی تعارف خوب سے خوب تر تھا۔ 'مشہرِ خیال' میں سب خطوط اچھے تھے اور تبصرہ خوب تھا۔ نفسیات دان ڈاکٹر ساجد امجد لکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان کے قلم میں دریا کی سی روانی ہے اور خوب جادو بیانی ہے۔ ''نواب سپاہی'' غلام حسین میمن کی ایک معلومات افزا اور یادگار تحریر ہے۔ ماہ اگست کے شمارے میں یہ مضمون یوم آزادی کا انمول تحفہ ہے۔ ''دلچسپ دریافتیں'' دانیہ صدیقی کی منفرد پیشکش تھی، پسند آئی۔ قلم نگری میں ''گولڈن اسٹار'' انور فرہاد کی تحریر سب سے زیادہ منفرد اور دلکش تھی جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ انور فرہاد نے اداکار ندیم کی زندگی کا گوشہ گوشہ بے نقاب کر دیا اور دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ''روزنامہ پیسہ'' اخبار شکیل صدیقی کا ایک تاریخی اور معلوماتی مضمون ہے۔ منشی محبوب عالم کے نام سے تو ساری دنیا متعارف ہے اور ان کی صحافتی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ''ازم'' منظر امام کی مزاح سے لبریز عمدہ تحریر ہے اور کافی حد تک معلوماتی ہے۔ ''اوندھی بستی'' شاہد لطیف کی بھرپور تحریر ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال کی ہر قسط لاجواب ہے پڑھنے میں بے حد لطف آتا ہے۔ ''زندگی جیت گئی'' فرزانہ نکہت کی زبردست تحریر تھی، پڑھ کر بہت لطف آیا۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان مقدس ہے ''موت زندگی کی محافظ ہے'' لاکھوں ایٹم بم پھٹیں، لاکھوں زلزلے آئیں، لاکھوں گولیاں چلیں، جب تک زندگی ہے کوئی حادثہ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ''نام'' عائشہ انور کی خوب صورت اور معلوماتی تحریر ہے۔ آغا حشر کاشمیری نے ٹھیک کہا تھا اور نام نور جہاں رکھ دیا جو آج ملکہ ترنم نور جہاں کے نام سے عالمی سطح پر معروف ہے۔ ''سرچھاگل'' ایاز راہی کی تحریر بھی سب سے منفرد اور بے مثل تھی احمد علی چھاگلہ ایک منفرد عظیم موسیقار تھے۔ جس طرح خواجہ خورشید انور تھے۔ ''نقب'' انیلہ کی واقعی عمدہ تحریر تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دوسروں کو بھی غور وفکر کرنا چاہیے۔ کہانیوں میں سب سے زیادہ موثر اور بہترین کہانی ''نجات'' زویا اعجاز کی تھی۔ اس میں جعلی پیروں کا پردہ فاش کیا گیا جو تصوف کی آڑ میں اپنا ناپاک دھندا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ''بیت بازی'' میں اشعار معیاری تھے۔ اقتباسات بھی کافی معلوماتی اور حوصلہ افزا تھے۔ میری طرف سے آپ کو خصوصی دعا وسلام، انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گے۔''

☆ بشریٰ افضل کی تشریف آوری بہاولپور سے۔ ''کچھ عرصے کے لیے ہم سرگزشت سے بچھڑ گئے تھے۔ مصروفیت نے لکھنے کی فرصت نہ دی گو کہ ہم اس کو پڑھتے ضرور رہے مگر لکھ نہ سکے۔ دیر سے حاضری کی معافی کی طلب گار ہوں۔ انکل نے بڑی خوب صورت بات کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اب ہم 'مشہرِ خیال' میں داخل ہو چکے ہیں۔ السلام علیکم تمام ساتھیوں کو سوائے ایک ساتھی کے جس نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ وہ ساتھی ہیں محمد سلیم قیصر۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ رانا محمد شاہد کرسی صدارت پر براجمان تھے، مبارکاں۔ تبصرہ واقعی قابلِ تحسین تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ بھی خوب صورت تھا۔ اریشہ، محمد عمران خان، سید امتیاز حسین، منشی محمد عزیز مئے، واہ جی واہ ہمارے شہر کے وکیل کلیم اللہ بھی اس محفل میں براجمان ہیں۔ ہمارے شہر کو اللہ نظرِ بد سے بچائے (آمین)۔ پہلی کہانی 'نقیب' پڑھی کہانی خوب صورت انداز لیے ہوئے تھی۔ انیلہ نے اپنی دوست کا ساتھ دیا اور خود کو بھی بچائے رکھا۔ خدا نے اس کا مان رکھ لیا۔ نور جہاں کا ''نام'' ہمیں اس مختصر صفحے پر معلوم ہوا۔ ''سونا ڈبل'' اس طرح کے واقعات بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آئے۔''

☆ حنیف ادیب لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''سرگزشت لے کر آیا تو سب سے پہلا کام جو کیا وہ رسالے کی ورق گردانی کا تھا اور سب سے پہلی ترجیح وہی پہلا صفحہ تھا جس پر آپ کسی نہ کسی شخصیت کے تعلق بیان کرتے ہیں اور پھر وہی جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے ٹورنٹو کا سفرنامہ کہ جس نے قارئین کو ایک مسحور کن سحر میں جکڑ رکھا ہے کہ پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ اس بار بھی ماشاء اللہ ندیم صاحب کے قلم نے وہ جوہر دکھائے کہ رہے نام اللہ کا۔ ''سرجی'' کا دلچسپ اور دلکش کردار کیا بھلا لگتا تھا کہ اب مطیع اللہ خان نے بھی اپنی جانب قارئین کی آنکھوں کا رخ کر رکھا ہے اور آنکھیں ہیں کہ اس چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ مذکر کو مونث بنا کر پیش کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہمارے اکثر خان بھائیوں کی بول چال ایسی ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اردو زبان کی ایسی سرجری کر دیتے ہیں کہ سننے والے کے کان میں رس گھول دیں اور مسکراہٹ بے اختیار لبوں پر آجائے۔ شہباز کا ''سیاپا'' بھی کچھ کم مزیدار نہیں اور چٹخاروں سے بھرا ہوتا ہے۔ اقبال ندیم کا یہ سفرنامہ ان کے دلکش اور دلچسپ انداز بیان اور الفاظ کی سج دھج کے باعث کسی منجھے ہوئے انشاء پرداز کی تحریر لگتی ہے۔ اس کا پڑھنے والا اس وقت دم لیتا ہے جب قسط ختم ہوتی ہے۔''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

احمد علی، کوثر پروین، اختر اجمیری، نشاط خان، کراچی۔ ناہید یاسمین، عباس چنیوٹی، لاہور۔ زاہد حسین، فیصل آباد۔ خورشید نیازی، جہلم۔ افشاں علی سید، ملتان۔

متنبّی

ضیاء تسنیم بلگرامی

حضور اکرمؐ نے صاف لفظوں میں احکام خداوندی سنا دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن اس شاعر نے جو خطۂ عرب میں یکتا تھا، جس کے اشعار زبان زد عام تھے جسے امرا و حاکم سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جس کے اشعار کے دلدادہ اک دنیا تھی، بادشاہان بھی اس کے اشعار سے لرزتے تھے کہ کہیں وہ اس کی ہجو نہ کہہ دے وہی ایک معمولی ڈاکو سے شکست کھا گیا۔ لوگوں نے سنا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ اس کی موت خدا کا عذاب ہے، اس کے گناہوں کی سزا ہے۔

عرب کے ایک بہت بڑے شاعر کے عبرت ناک انجام کی کتھا

کوفے میں کِندہ نامی ایک محلّہ تھا۔ یہاں 303ھ (915 عیسوی) میں حسین نامی ایک بہشتی کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام احمد رکھا۔

یہ کوئی خوش حال گھرانا نہیں تھا لیکن حسین کا تعلق عرب خاندان سے تھا اور اسے شرفاء میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو اس کو بڑی خوشی ہوئی۔

اسی محلے میں ایک مکتب تھا اور اس مکتب میں شرفاء کے

کوفہ کی اولاد تعلیم پاتی تھیں۔

بچہ محبت وشفقت سے پرورش پاتا رہا اور جیسے ہی اس نے شعور سنبھالا باپ نے اس کو محلے کے اسی مکتب میں داخل کروادیا۔ یہ بچہ انتہائی لگن اور محنت سے تعلیم پانے لگا۔

اس زمانے کے مدرسوں میں عموماً ادب شاعری اور لغت کی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ احمد نامی اس بچے نے بھی مذکورہ موضوعات میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردی بعد میں اس بچے نے اپنے اصل نام کے بجائے اپنے تخلص سے شہرت حاصل کی اور آگے چل کر اس بچے نے کنیت ابوطیب اور تخلص متنبی اختیار کیا اور اپنے اسی تخلص سے شہرت پائی۔

عربوں میں یہ رسم تھی کہ جب ان کا بیٹا لائق تربیت ہوجاتا تھا تو وہ اسے خانہ بدوشوں میں پہنچادیتے اور وہ ان کی دلیری، آزادی اور زور تقریر جیسی خصوصیات اور اوصاف حاصل کرلیتے۔ زبان دانی بھی انہی بدوی قبائل میں رہنے سے آجاتی تھی۔

متنبی نے چند سال اپنے محلے کے مکتب میں تعلیم پائی تھی اور مکتب سے اسے بہت کچھ حاصل ہوا تھا مگر متنبی کا باپ مکتب کی تعلیم سے زیادہ مطمئن نہیں تھا وہ اپنے بیٹے کو خانہ بدوشوں میں چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن بیٹے کی محبت اسے کچھ عرصہ روکے رہی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے متنبی کے ساتھ خود بھی خانہ بدوشوں میں رہے گا چنانچہ وہ بیٹے کو لے کر خانہ بدوشوں میں پہنچ گیا۔

یہ خانہ بدوش عرب بھی ایسے لڑکوں سے بہت خوش ہوتے تھے اور نہایت محبت اور لگن سے ایسے بچوں کی تربیت کرتے تھے چنانچہ متنبی کو ان لوگوں نے نہایت خوشی سے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یہ لوگ کبھی یہاں ہوتے کبھی وہاں، ان کا زیادہ وقت سفر ہی میں گزرتا تھا۔

متنبی کا باپ اس کو بدوؤں میں آزادی اور دلیری کی تربیت میں مشغول دیکھتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی ایسا لگتا جیسے متنبی کو بدوؤں کی روش اختیار کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ خانہ بدوشوں میں جو بچے پہلے سے زیر تربیت تھے متنبی ان پر آسانی سے حاوی ہوجاتا۔ یہیں اس نے شاعری بھی شروع کردی اور خانہ بدوش اس کی شاعری سے بہت لطف اندوز ہوتے۔

آہستہ آہستہ اس کی شاعری کا چرچا خانہ بدوشوں سے نکل کر شہروں تک جا پہنچا۔

متنبی بہت خود پسند اور جاہ طلب واقع ہوا تھا جبکہ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے غریب گھرانے کو دیکھا تھا اس کا باپ سقا گیری کرتا تھا حالانکہ ان کے معاشرے میں پیشے کی وجہ سے عزت یا ذلت نہیں ملتی تھی بلکہ انہیں اگر خاندانی نجابت اور شرافت میسر ہوتی تو وہ شریف گھرانا سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح معمولی حقیر سا پیشہ ان کی شرافت کو داغ دار نہیں کرسکتا تھا۔

متنبی نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کی غربت اور افلاس کو دیکھ کر اسے شرمندگی اور ندامت محسوس ہوتی رہی۔ متنبی کو اپنے باپ کا اس طرح محلے کے گھروں میں جانا پسند نہیں تھا۔ وہ لوگوں پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔

خانہ بدوشوں میں بھی وہ حکومت کرنے کا قائل رہا اور یہی چاہتا تھا کہ لوگ اس کا حکم مانیں اور وہ اپنے آس پاس کے لوگوں اور اپنے ماحول پر حکومت کرے۔

ساوہ کے صحرا میں جو قبیلے آباد تھے۔ متنبی ان میں خاصا مشہور ہو چکا تھا اور لوگ اس کے کلام کو بڑے بڑے شاعروں کے کلام پر ترجیح دیتے تھے اور وہ متنبی سے اس لیے بھی خوش رہتے تھے کہ متنبی ان میں رہتا تھا اور اس کی وجہ سے یہاں کے قبائل کو بڑی عزت اور فضیلت حاصل ہوگئی تھی۔

متنبی اپنی شاعری پر بھرپور توجہ دیتا رہا۔ مضمون آفرینی پر اس کی خاص توجہ رہتی اور وہ دوسرے شاعروں کو کمتر سمجھنے لگا تھا۔

اس کے دل ودماغ شب وروز اسی غور وفکر میں لگے رہتے کہ ایک نامور انسان بہتوں کو اپنی پیروی کرنے پر کس طرح آمادہ کرلیتا ہے اور ایک بڑا آدمی خود کو کس طرح بڑا قرار دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کے سامنے خلفا تھے اور نبیوں کے بارے میں بھی وہ غور وفکر میں لگا رہتا اور ان دونوں میں جو خصوصیات اور اوصاف متنبی کو نظر آئے ان میں سے ایک یہ وصف اور خوبی پائی جاتی تھی کہ ان کا تعلق عرب کے مشہور خاندانوں سے تھا۔ خلفائے بنوامیہ بھی اپنی خاندانی سیادت کی وجہ سے دوسروں پر حاوی آگئے تھے اور ان کے نامی گرامی عامل اور بڑے عہدے دار بھی اس لیے کامیاب ہوگئے تھے کہ وہ بہترین انشا پرداز ہونے کے ساتھ بہت اچھے شاعر یا بہت اچھے مقرر یا خطیب ہوتے تھے۔

متنبی میں شاعرانہ برتری اور عظمت موجود تھی اور وہ اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرسکتا تھا۔

خلیفہ کے علاوہ نبیوں کے احوال پر غور کیا تو وہاں بھی اسے یہی خوبی نمایاں نظر آئی کہ نبی اپنے دلکش کلام کی وجہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے تھے۔ اسے اپنی شاعری پر ناز تھا اور ساوہ کے قبائل نے بھی متنبی کی شاعرانہ عظمت اور برتری کو دل سے تسلیم کرلیا تھا۔

متنبی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ خانہ بدوشوں کو جمع کرکے اپنے کلام سے محظوظ کرتا اور سننے والے بھی اس کے کلام کی دل کی گہرائیوں سے داد دیتے۔ اس کے جو ارادے تھے۔ ان سے وہ خود تو واقف تھا لیکن ساوہ کے قبیلے والے متنبی کے ارادوں سے واقف نہیں تھے۔ ذہین اور چالاک متنبی سادہ لوح قبائلیوں کے مزاج اور دل و دماغ کا اپنی عمیق نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا جو عظیم تر منصوبہ ہے اگر وہ ان قبیلے والوں پر ظاہر کردے تو کیا یہ سادہ لوح لوگ اس کے دعوے کو مان لیں گے۔

اس نے کچھ عرصے بعد یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی شاعری نے ساوہ کے قبائلیوں کے دل و دماغ کو مسخر کرلیا ہے، اب اگر وہ ان سب کے سامنے کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ لوگ اسے دل و جان سے قبول کرلیں گے۔

شام ہوتی اور قبیلے کے ہر عمر کے لوگ اسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور اس سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور متنبی نہایت جوش و خروش سے اپنا کلام سناتا اور سننے والوں سے داد اور تحسین وصول کرتا۔

اب متنبی کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ اپنے ان عقیدت مندوں میں کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ بھولے بھالے سادہ لوح قبائلی اسے قبول کرلیں گے لیکن اس کے دعوے کو صرف قبول کرلینا اس کے لیے سودمند بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جاہ طلب اور ثروت پسند شاعر تھا جس نے غربت، حسرت اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی اس کا باپ لوگوں کے گھروں میں پانی پہنچا کے روزی کماتا تھا اسی لیے اس کے باپ کی کوفے میں عزت نہیں تھی۔ خاندانی نجابت اس کے کبھی کام نہیں آئی اب وہ زمانے بھر کے لوگوں میں نمایاں رہ کے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر ڈالنا چاہتا تھا کہ اس کے ماننے والے اس کے لیے جانیں قربان کردینے پر آمادہ ہوجائیں۔

وہ کچھ عرصہ لوگوں کو اپنی شاعری سے متاثر کرتا رہا اور آخر کار ایک دن اس نے غیر معمولی حوصلے سے کام لے کر لوگوں کو بتایا۔ ’’میری شاعری اتنی غیر معمولی ہے کہ آج میرا اس معاملے میں کوئی مدمقابل نہیں، لوگو کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔‘‘

لوگوں نے یہی جواب دیا کہ وہ عرب ہے اور اس کا باپ بہشتی تھا اور اب متنبی عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

متنبی نے کہا۔ ’’مجھے اپنی شاعری کے بارے میں تم سے زیادہ معلوم ہے۔ میں شاعر ہوں اور جو کچھ میں اپنے اشعار میں کہتا ہوں وہ میرا کلام نہیں کلام ربانی ہے۔‘‘

سننے والوں نے اقرار کیا کہ بے شک متنبی کا کلام، کلام ربانی ہے کیونکہ اسے یہ غیر معمولی شاعرانہ لیاقت، قابلیت اور صلاحیت رب کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اس عہد میں دوسرا کوئی شاعر متنبی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

متنبی اپنے سننے والوں کو جو باور کرانا چاہتا تھا یا ان کے دل و دماغ میں جو بات بٹھا دینا چاہتا تھا وہ اس میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ جانتا تھا کہ یہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی غیر معمولی عزت اور آسائش کے خواہش مند ہوں گے، یہ بھی اپنے زمانے میں نمایاں رہنا پسند کریں گے۔

متنبی نے کہا۔ ’’تم لوگ ساوہ میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہو جب کہ شہروں میں تمہارے ہی جیسے لوگ انتہائی خوش حالی، آسودگی اور ناموری کی زندگی بسر کررہے ہیں کیا تمہارے دلوں میں یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ تم بھی اس زمانے میں بلند مرتبہ حاصل کرلو۔‘‘

ان لوگوں نے کہا، ہم یہیں بہت خوش ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ہمیں دربار خلافت سے کوئی نمایاں مقام نہیں مل سکتا۔ ہم خلافت کے ماحول کے پروردہ لوگ بھی نہیں ہیں۔ ہمارا دربار خلافت تک پہنچنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔‘‘

متنبی نے کہا۔ ’’آج جنہیں خلافت اور خلیفہ سے اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل ہیں یہ ماضی میں تمہارے ہی جیسے لوگ تھے اور یہ بھی تمہاری طرح خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے مگر ان میں ان کی خوش قسمتی سے ایک نبی پیدا ہوگیا اور اس نبی نے اپنے بہت سے ماننے والے پیدا کرلیے اور آہستہ آہستہ نبی کے قریب رہنے والوں نے اور

پھر اس کے خاندان نے نبی کی رشتے داری سے فائدے اٹھائے اور عباسی خلیفہ وجود میں آنے لگے۔ وہ کوئی خاص لوگ نہیں تھے مگر نبی سے ان کی رشتے داری ان کے کام آئی اور ان چالاک لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے خلیفہ نے اپنی برتری بڑھانے اور قائم رکھنے کے لیے دنیا بھر کے لائق لوگوں سے کام لینا شروع کر دیا اور ان کی طاقت اور ضرورت میں اضافہ ہوتا رہا، تو چاہو تو تم بھی اسی طرح ترقی کر سکتے ہو تم بھی ایک نئی حکومت کو وجود میں لا سکتے ہو۔''

متنبی کی یہ عجیب وغریب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرتی رہیں اور انہوں نے متنبی سے پوچھا۔ ''ہماری سمجھ میں تیری صرف اتنی سی بات آئی ہے کہ آج جو لوگ خلیفہ بنے بیٹھے ہیں، ان کا تعلق نبی کے خاندان سے ہے لیکن آج ہمارے زمانے میں تو کوئی نبی بھی نہیں جس کی ہم خدمت کریں اور ہمیں بلند و بالا مقام حاصل ہو۔''

متنبی نے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ نبی کی 23 سالہ جدوجہد سے واقف ہو؟''

کئی بزرگوں نے جواب دیا۔ ''بہت اچھی طرح۔''

متنبی نے کہا۔ ''میں بھی تمہیں اسی راستے پر ڈال سکتا ہوں اور تم بھی ایک طاقت ور حکومت کے قیام میں میری مدد کر سکتے ہو مگر ابھی میں اپنے ارادے اپنے مقصد اور اپنے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں کھل کے تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

سننے والوں نے کہا۔ ''واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تو جو کہے گا ہم وہ کریں گے اور اگر ہم سے طاقت ور حکومت وجود میں آسکتی ہے تو ہم اسے وجود میں لانے کے لیے بے قرار ہیں۔''

متنبی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''دوستو، بھائیو اور بزرگوں میں تم سے جاں فروشی کا مطالبہ کروں گا، تمہیں اپنا عظیم الشان مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینا ہوں گی۔ تم عصر حاضر کی طاقت ور ترین حکومت سے ٹکر لو گے، اگر تم نے میری پیروی کی اور میری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔''

قبائلی بزرگوں میں سے ایک نے جھنجلائے لہجے میں کہا۔ ''اے متنبی! ہم سے اشاروں اور کنایوں میں باتیں مت کر کیونکہ جب تک ہم تیرا پورا منصوبہ سن کر سمجھ نہ لیں اور یہ اندازہ نہ لگالیں کہ اس سے ہم قبائلیوں کو کتنا فائدہ پہنچے گا ہم تیری پیروی کس طرح کریں گے، میں تو اے متنبی تجھ کو مشورہ دیتا ہوں کہ تو سماوہ کے جملہ قبائل کو یہاں کے بڑے میدان میں جمع کر ہم تجھ کو ان سب سے اونچی جگہ پر بٹھا دیں گے اور تو ان سب کو بلندی سے مخاطب کرے گا اور ان سب کو بتائے گا کہ تو کیا چاہتا ہے اور اگر ہم تیری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو ہم بھی عباسی خلافت کی طرح ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دیں گے۔''

متنبی نے اس بزرگ کا یہ مشورہ قبول کیا اور کہا۔ ''اب یہ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ تم مجھے جس طرح چاہو کسی اونچی جگہ پر بٹھا دو یا کھڑا کر دو، میں وہاں سے تم سب کو بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں اور تم کس طرح اپنے زمانے میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، لوگو تم یقین نہیں کرو گے کہ میں تمہیں کتنی بلندی تک لے جانا چاہتا ہوں۔''

متنبی کی باتوں نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ اس عظیم شاعر سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے اور مزید سیکھنا چاہتے تھے انہیں عباسی خلافت کے دبدبے کا جتنا حال معلوم تھا اس سے انہیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ دنیا بھر میں ان سے زیادہ طاقت ور کوئی دوسری حکومت نہیں تھی اب اگر متنبی ان کے مقابلے پر سماوہ والوں کے تعاون اور جاں نثاری سے کوئی بڑی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہے تو سماوہ والوں کو اس کا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔

اس ہجوم میں یہ بات تو طے پا گئی کہ اب اسی میدان میں سماوہ کے تمام قبائل جمع ہوں گے اور متنبی کے لیے ایک اونچا تخت بنوایا جائے گا۔ اس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر متنبی اپنے دل کی باتیں کہے گا اور پھر اگر اس کی باتیں سب کی سمجھ میں آگئیں تو متنبی عباسیوں کے مقابلے میں ایک نئی طاقت ور حکومت کی بنیاد ڈال دے گا۔

سامعین نے یہ ساری باتیں سماوہ بھر میں پھیلا دیں اور متنبی کی عزت اور توقیر میں بہت اضافہ ہو گیا۔

اب لوگوں نے متنبی کو گھیرنا شروع کر دیا اور وہ اس کی دلچسپ اور خرد افروز باتیں سن کے دل و دماغ میں محفوظ کر لیتے اور انہیں دوسروں تک پہنچا دیتے۔

وقت مقررہ پر سماوہ کے قبائلی میدان میں پہنچ گئے۔ انہوں نے متنبی کے لیے ایک اونچا تخت بچھا دیا تھا اور اس

تخت پر قیمتی قالین اور شاہانہ انداز کے گاؤ تکیے رکھ دیئے گئے۔

وہ متنبی تخت پر چڑھنے کے بعد بیٹھنے کے بجائے کھڑا رہا اور دیر تک عباسی خلیفہ کی جاہ وحشم پر تقریر کرتا رہا۔ اس نے اب قبائلیوں کو بتایا کہ یہ عباسی بھی تمہارے ہی جیسے خانہ بدوش ہوا کرتے تھے مگر نبی کی قرابت داری نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا۔ اب اگر تم لوگ عباسی خلافت جیسی حکومت قائم کرنے کے متمنی ہو اور چاہتے ہو کہ تم بھی دنیا بھر میں نمایاں رہ کر زندگی گزارو تو تم میری پیروی کرو میں تم سب کو خلیفہ بننے کے بعد اعلیٰ عہدے اور مناصب دوں گا تم بھی عباسی خلفاء کی طرح عیش کرو گے۔''

سامعین نے متنبی کی یہ تقریر بہت پسند کی مگر انہیں متنبی کا منصوبہ کوئی خاص اس لیے نہیں لگا کہ اگر ساوہ والے اس کی خلافت کے لیے بیعت کرلیں گے تو ایک نئی خلافت فوراً وجود میں آجائے گی مگر متنبی کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عباسی خلافت اس نئی خلافت کو کس طرح گوارہ کرے گی۔

خانہ بدوش قبائلی ان الجھنوں اور مصیبتوں کا خیال اپنے دلوں میں نہیں لاسکے جو آگے چل کے انہیں پیش آنے والی تھیں۔

اس میدان میں جو کچھ طے پایا اس کی جزائیات پر عمل کرنے کی منصوبہ بندی متنبی کو کرنا تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے خلافت سے ٹکرانے کے لیے ایک زبردست عسکری قوت درکار ہوگی۔ اس کے علاوہ اس عسکری قوت کے لیے ایک اعلیٰ پائے کا ذہین، ہوشیار رہنما بھی ہونا چاہیے مگر اب اسے یہ سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ رہنمائی کے فرائض متنبی خود انجام دے گا اور وہ اپنی نوجوانی ہی میں ساوہ کے قبائلیوں پر حکومت کرے گا۔

جلسے کے خاتمے کے بعد متنبی نے سبھی سے اپنی خلافت کے لیے بیعت لی اور ان سب کو یہ یقین دلایا کہ اگر ساوہ کے لوگوں نے اس کی جاں نثاری کے ساتھ پیروی کی اور اس کے احکامات مانتے رہے تو وہ ان سب کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دے گا۔

کئی دن تک متنبی ان سب سے بیعت لیتا رہا اور یہاں کی خبریں اس علاقے کے عامل تک پہنچتی رہیں اور خلیفہ کو بھی اس نئے فتنے سے خبردار کردیا گیا اور اوپر سے اس علاقے کے عامل کو حکم دیا گیا کہ اس فتنے کو عسکری قوت سے کچل دیا جائے اور متنبی کو قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

ساوہ والوں کو اس وقت بڑی پریشانی پیش آئی جب ساوہ کا چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا گیا اور جنگ وجدل کی نوبت تک نہیں آئی۔ متنبی کو کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کرلیا گیا جب اسے پکڑا گیا تو وہ ساوہ والوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن ساوہ کا ایک شخص بھی متنبی کی مدد نہیں کرسکا۔ ان کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ ان لوگوں نے خلیفہ کی عسکری قوت سے ٹکرانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

متنبی کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور ساوہ کے لوگ معمول کی زندگی بسر کرنے لگے۔

قید خانے میں متنبی کئی دن تک صرف یہی سوچتا رہا کہ ساوہ کے لوگ تو اس پر جان قربان کردینے کا وعدہ کرچکے تھے اور اس کے ہاتھ پر نئی خلافت کی بیعت بھی کی گئی تھی پھر عین وقت پر لوگ اس کا ساتھ کیوں چھوڑ گئے اور وہ خود تنہا اور بے سہارا کیوں رہ گیا۔

عباسی عامل نے متنبی پر کوئی سختی نہیں کی اور صرف قید تنہائی کی سزا پر قائم رہا۔ متنبی جو کل تک ساوہ کی کھلی فضا میں لوگوں کو اپنا کلام سنا کے داد و تحسین وصول کیا کرتا تھا۔ اب وہ قید خانے کی دیواروں کے درمیان سننے والوں سے محروم خاموشی کے شب و روز گزار رہا تھا وہ دیواروں کو اپنا کلام سناتا اور ان سے داد نہ پا کے بے چین ہو جاتا۔

اسے اس قید خانے میں قید تنہائی میں پہلا تجربہ یہ ہوا کہ اسے بیعت لینے سے پہلے ساوہ کے قبائلیوں کو فوجی تربیت دلوانی چاہیے تھی اور ان کے لیے اعلیٰ ہتھیار بھی فراہم کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور اسے اپنا منصوبہ ابھی راز میں رکھنا چاہیے تھا۔

مگر اب قید خانے میں اسے یہ فکر پریشان کررہی تھی کہ یہاں سے اسے نجات کس طرح ملے گی اسے یہاں سے نکالنے کے لیے باہر کوئی طاقت بھی موجود نہیں تھی۔ ساوہ کے لوگ بھی اسے اس لیے بھول جائیں گے کہ وہ خلافت کے طاقت ور نظام سے ٹکرانے کی ذہنی، فکری اور عسکری قوت سے محروم تھے۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا تھا اسے غیر معمولی شعری قوت جو خدا کی طرف سے ملی ہوئی تھی میں اسی سے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

یہاں تو اسے بالکل بھلا دیا گیا تھا قید خانے کے لوگ بھی اسے دو وقت کا کھانا اور پانی پہنچا دیتے تھے ان سے لیکن وہ اپنے دل کی بات نہیں کرسکتا تھا۔

آخر کار اس نے رہائی کا ایک طریقہ سوچا مگر اسے اپنے اس طریقے کے سودمند ہونے کا یقین نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا بس وہ کافی غور وخوض کے بعد یہی سمجھ سکا تھا کہ اس کی شاعری کا چرچا یہاں کے عامل تک ضرور پہنچا ہوگا اور اب اس کی شاعری ہی اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

قید خانے میں جو مختلف خدمات پر مامور لوگ تھے ان سے کام لینے کا اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے ان آنے جانے والوں کو اپنا کلام سنایا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اس کی شاعرانہ عظمت سے واقف تھے مگر وہ متنبی سے اس لیے لاتعلق اور بے گانہ رہتے تھے کہ انہیں خوف تھا کہ اگر وہ متنبی میں دلچسپی لیں گے تو عامل ان پر عتاب نازل کرے گا مگر جب متنبی نے ان کو اپنا کلام سنا کے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ متنبی کے پاس ڈرتے ڈرتے بیٹھنے لگے اور اس کے کلام سے محظوظ ہونے لگے۔

متنبی نے کچھ دنوں بعد جب یہ سمجھ لیا کہ اب ان خدمت گاروں سے کام لیا جاسکتا ہے تو اس نے ایک خدمت گار سے رازداری سے پوچھا۔ ''دوست! تم دیکھ رہے ہو کہ وقت اور زمانہ مجھ جیسے یگانہ شاعر پر کیسے ستم توڑ رہا ہے اور لوگ مجھ سے کس طرح بے مروتی سے پیش آرہے ہیں۔''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''اے متنبی! ہم تو تجھے اپنے سر پر بٹھالیں مگر تو خلیفہ کا معتوب ہے اب اگر ہم تجھ سے اچھی طرح پیش آئیں گے تو خلیفہ ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ خلیفہ کی ملازمت نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے۔''

متنبی نے پوچھا۔ ''میں تجھ سے ایک انتہائی معمولی کام لینا چاہتا ہوں وہ اگر کردو گے تو مجھے اس قید خانے سے رہائی مل سکتی ہے اور اگر رہائی نہ ملی تو میں اپنی قسمت پر صبر کر کے تمہارا شکر گزار رہوں گا۔''

خدمت گار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ شاعر قید خانے سے فرار ہونے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہا ہے اور اسے اس منصوبے میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔

خدمت گار نے صاف صاف بات کرلی اور کہا۔ ''میں تیرا ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے میں خود مصیبت میں پڑ جاؤں۔''

متنبی نے کہا۔ ''میں نے یہاں کے عامل کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے تو اس قصیدے کو عامل تک پہنچا دے اگر میرا کام بن گیا تو تجھ کو کچھ فائدے ضرور پہنچیں گے۔''

خدمت گار کچھ دیر سوچتا رہا کہ شاعر کا قصیدہ عامل کو پہنچانا چاہیے یا نہیں۔

اس نے پوچھا۔ ''اے متنبی! پہلے میں اس قصیدے کو خود پڑھوں گا اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھ کو تیرا یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔''

متنبی نے اس کو اپنے سامنے بٹھالیا اور قصیدہ اس کو پڑھنے کے لیے دینے کی بجائے خود پڑھ کے سنانے لگا۔

یہ قصیدہ عامل کی شان میں لکھا گیا تھا اور اگر اسے عامل تک پہنچا دیا جائے تو اس کے خدمت گار کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

خدمت گار نے وعدہ کرلیا کہ وہ متنبی کا یہ کام کردے گا۔

متنبی نے اپنا قصیدہ اس کے حوالے کردیا اور کہا۔ ''رات جب عامل بالکل تنہا ہو تو میرا نام لیے بغیر میرا یہ قصیدہ اس کے حوالے کردینا اور خود سامنے سے ہٹ جانا، امید ہے کہ اس قصیدے کا خوشگوار اثر پڑے گا اور عامل تجھ کو ضرور بلوائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو مجھے اس سے آگاہ کردینا۔''

خدمت گار قصیدہ لے کر چلا گیا اور اس بار متنبی کو قبل از وقت یہ بھی سوچنا پڑا کہ قبضہ خانے سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔

قصیدہ عشاء کی نماز کے بعد عامل کے حوالے کردیا گیا اور عامل نے اسے پڑھا اور بہت متاثر ہوا پھر خدمت گار سے پوچھا۔ ''متنبی نے اس قصیدے کے علاوہ تجھے کوئی پیغام بھی دیا ہے؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! وہ اسی سے خوش ہوجائے گا کہ آپ نے اس کا قصیدہ پڑھا، پسند کیا اور اسے احتیاط سے محفوظ کرلیا۔''

اس قصیدے میں متنبی نے خوشامدانہ روش اختیار کی تھی۔ ''اے میرے آقا! آپ کا کام ہی دولت بخشنا اور غلاموں کو آزاد کرنا ہے۔ میں آپ سے اُمید منقطع ہونے کے بعد اور اپنا گلا موت کے ہاتھ میں پہنچ جانے کے وقت آپ سے مدد کی درخواست کرتا ہوں میری حالت خستہ ہو چکی ہے اور میری ٹانگوں کو بیڑیوں کے بوجھ نے کمزور کردیا ہے۔ ابھی سے مجھ پر حدود قائم کی جارہی ہیں حالانکہ ابھی تو مجھ پر نماز بھی فرض نہیں ہوئی ہے۔''

عامل کے لیے یہ بڑی عزت افزائی کی بات تھی کہ متنبی نے اس کی شان میں کئی اشعار لکھے تھے اور اس سے رحم کی

درخواست کی تھی چنانچہ عامل نے اسے معاف کردیا اور اسے رہا کردینے کے بعد اپنے ساتھ رکھا۔

قید خانے سے نکلنے کے بعد متنبی کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی کیونکہ جس جرم میں اسے قید کیا گیا تھا اس کی وجہ سے لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے اور احتیاط کرتے تھے کہ متنبی سے دور رہو کہیں ساوہ والوں کی طرح متنبی انہیں بھی کسی مصیبت میں نہ پھنسادے۔

متنبی کی معاشی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ عامل نے بھی اس پر زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ کہیں متنبی کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائے۔

متنبی دولت مندوں کی شان میں قصائد لکھتا اور ان سے انعام حاصل کر کے گزر بسر کرتا رہا۔ یہ انعام واکرام بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ اغنیا بہت زیادہ سخی اور فضول خرچ نہیں ہوتے۔

اسی دوران متنبی کی شہرت ہوتی چلی گئی اور قسمت نے یاوری کی، شام کا فرمانروا سیف الدولہ، متنبی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ عربی النسل حکمران تھا۔

ان دنوں ایشیائے کوچک میں قیصر روم کی حکومت تھی اور سیف الدولہ اس پر حملہ آور ہوتا رہتا تھا اور اسے ان حملوں میں مسلسل کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔

سیف الدولہ علم وفضل کا بھی بڑا قدردان تھا۔ خود بھی نکتہ سنج تھا اس کے بارے میں مؤرخین کا متفقہ فیصلہ یہ رہا ہے کہ اس عہد کے شعراء اور مصنفین اس کے دربار میں جمع ہوگئے تھے۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے سوا کسی اور کے دربار میں اتنا مجمع نظر نہیں آئے گا ابو نصر فارابی اور حکایات آغانی کا مصنف اسی کے دربار سے فیض یاب ہوئے۔ سیف الدولہ کے امراء میں ابوالعشائر نامی ایک قدردان امیر تھا۔ متنبی نے اس کی مدح میں چند قصیدے لکھے اور اس کو اپنا گرویدہ کرلیا۔

ابوالعشائر سیف الدولہ کی طرف سے انطاکیہ میں عامل کے فرائض انجام دے رہا تھا اور خود سیف الدولہ حلب میں رہتا تھا۔ لوگوں نے سیف الدولہ کو متنبی کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور پریشان حالی کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی حکمران اس کی سرپرستی کرے اور اسے اپنے دربار سے وابستہ کرلے تاکہ یہ حکمران بھی متنبی کے قصیدوں میں موجود رہے اور اسی کی طرح شہرت دوام حاصل کرے۔

سیف الدولہ نے پوچھا۔ ''یہ وہی متنبی ہے جس نے نجف کے جنوب میں ساوہ والوں میں رہ کے ایک نئی خلافت کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر اپنے ارادوں کی تکمیل سے پہلے ہی وہ گرفتار ہوا اور مدتوں قید خانے میں پڑا رہا۔''

لوگوں نے اقرار کیا کہ ہاں یہ وہی متنبی ہے۔

سیف الدولہ نے خطرہ ظاہر کیا۔ ''یہ شخص یہاں بھی کوئی خرابی نہ پیدا کردے۔''

لوگوں نے سیف الدولہ کے اثر واقتدار کے حوالے سے بتایا۔ ''متنبی اس دربار سے وابستہ ہونے کے بعد سرکشی اور بغاوت کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ اس کے علاوہ قید خانے میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اسے سبق مل گیا کہ وہ کبھی بھی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

سیف الدولہ نے انطاکیہ کے عامل ابوالعشائر کو لکھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ متنبی تیرے دربار سے وابستہ ہوگیا ہے میں نے اس کا کلام دیکھا اسے میرے دربار میں ہونا چاہیے اس سے بات کر اور اس کو بتا کہ میں اسے اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ یہاں آنے کے بعد من مانی کرنے کے ارادوں سے باز رہے۔''

ابوالعشائر نے متنبی کو خوش خبری سنائی۔ ''اے متنبی! تیری خوش قسمتی تجھے بہت بلندی کی طرف لے جارہی ہے خوش ہو جا کہ سیف الدولہ کو تیری ضرورت محسوس ہوئی اور تجھے حلب طلب کیا گیا ہے۔''

متنبی نے خود پسندی اور اپنی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ابوالعشائر سے کہا۔ ''تو نے جسے میری خوش قسمتی کہا ہے میں اس وقت تک اسے اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھوں گا جب تک سیف الدولہ سے میری بات نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ مجھے اپنے دربار سے وابستہ کرے۔''

ابوالعشائر نے پوچھا۔ ''تو سیف الدولہ سے کیا بات کرے گا تیرے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تجھے سیف الدولہ تیری خواہش اور درخواست کے بغیر اپنے دربار سے وابستہ کررہا ہے۔''

متنبی نے جواب دیا۔ ''میں ایک خاص شرط سیف الدولہ کے سامنے رکھوں گا، اگر وہ اسے مان لے گا تو میں اس کے دربار سے وابستہ ہو جاؤں گا نہیں مانے گا تو میں تیرے ہی دربار سے وابستہ رہوں گا۔''

ابوالعشائر فکر مند ہوگیا کہ یہ عجیب وغریب شاعر معلوم نہیں کیوں ناز نخرے دکھا رہا ہے حالانکہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کو ہی اپنی عزت افزائی سمجھتا۔

ابوالعشائر نے پوچھا۔ ''تو اپنی شرائط بتا میں سیف الدولہ کو وہ شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اگر سیف الدولہ نے انہیں مان لیا تو میں تجھ کو خود اپنے ساتھ حلب لے جاؤں گا اور اگر امیر نے تیری شرائط درخور اعتنا نہ سمجھیں تو تو میرے پاس ہی پڑا رہے گا۔''

متنبی نے کئی شرطیں لکھ کر دے دیں ان میں ایک شرط ایسی تھی جو ابوالعشائر کے خیال میں سیف الدولہ کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ درباری شعراء اپنے قصائد اور اشعار دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے اور متنبی اسے اپنے لیے بے عزتی کی بات سمجھتا تھا وہ اپنی جگہ بیٹھ کے ہی قصیدہ یا اشعار سنانے کا خواہش مند تھا۔

ابوالعشائر نے جملہ شرائط سرسری نظر سے دیکھیں مگر بیٹھے بیٹھے قصیدے اور اشعار سنانے کی شرط پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''اے متنبی! تیری تمام شرائط قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن بیٹھ کے اشعار سنانے والی شرط امیر سیف الدولہ نہیں مانے گا۔''

متنبی نے کہا۔ ''مگر میں اس شرط کو مانے بغیر امیر کے دربار سے وابستگی کو قبول نہیں کروں گا۔''

ابوالعشائر نے مایوسی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے! میں تیری شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اور وہاں سے جو جواب آئے گا اس سے تجھ کو آگاہ کر دوں گا۔''

ابوالعشائر نے متنبی کی شرائط لکھ کر امیر سیف الدولہ کو بھیج دیں اور یہ بھی لکھا کہ متنبی کو اپنی شاعرانہ عظمت اور فضیلت کا اتنا زیادہ احساس ہے کہ اگر اسے بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ آپ کے دربار سے وابستگی کو گوارہ نہیں کرے گا۔''

کچھ عرصہ بعد امیر سیف الدولہ کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس نے ابوالعشائر کو لکھا تھا۔ ''تو متنبی کو اپنے ساتھ میرے پاس لے آ پہلے میں اس کا کلام سنوں گا اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ مجھے متنبی کی یہ شرط ماننا چاہیے یا نہیں۔''

ابوالعشائر نے امیر کا جواب متنبی کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ ''اب تو کیا کہتا ہے کیا تو میرے ساتھ حلب جانا پسند کرے گا۔''

متنبی نے جواب دیا۔ ''ہاں! میں امیر سیف الدولہ سے ملوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا کلام امیر کو میری شرط ماننے پر مجبور کر دے گا۔''

ابوالعشائر نے حلب جانے کی تیاریاں کیں اور متنبی کو لے کر حلب چلا گیا۔

امیر سیف الدولہ کو خبر کر دی گئی کہ ابوالعشائر متنبی کو لے کر پہنچ چکا ہے اور باریابی کا امیدوار ہے۔

اس وقت امیر کے دربار میں کئی لائق لوگ موجود تھے۔ ان سب کو متنبی سے ملنے، دیکھنے، باتیں کرنے اور اس سے اس کا کلام سننے کی آرزو تھی۔

ان دونوں کو امیر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ درباریوں کی نظریں متنبی کی طرف تھیں۔ امیر نے بھی نیچے سے اوپر تک متنبی کو دیکھا اور اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر متنبی کو حکم دیا۔ ''اپنا کلام سنا تاکہ میں فوراً فیصلہ کروں تجھے دربار میں بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت دی جائے یا فوراً رخصت کر دیا جائے۔''

متنبی نے اس دربار کے لیے جو اشعار کہہ رکھے تھے انہیں امیر کے سامنے کھڑے ہو کر سنا دیا۔

اس کے کلام نے امیر کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کچھ دیر گم صم رہا درباری بھی سحر زدہ معلوم ہوتے تھے۔

ابوالعشائر نے اس کیفیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ متنبی کا کام ہو گیا۔

سبھی کو امیر سیف الدولہ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا انتظار تھا۔

امیر سیف الدولہ نے ہوش میں آتے ہی متنبی کی تعریفیں کیں اور ابوالعشائر کو بطور خاص مخاطب کیا۔ ''اے امیر ابوالعشائر! متنبی کا کلام اتنا پُر فضیلت ہے کہ اسے شرائط پیش کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا اور اسے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنا کلام سنانے کی اجازت دی گئی۔''

ابوالعشائر نے اطمینان کی سانس لی اور متنبی اپنی جگہ بے حد خوش تھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔

امیر سیف الدولہ نے سماوہ اور وہاں کے قبیلے بنی کلب کا بطور خاص ذکر کیا اور پوچھا۔ ''اے متنبی! سماوہ کا قبیلہ بنو کلب تو اپنی جرأت، شجاعت اور بہادری میں ثانی نہیں رکھتا تو نے ان سب کو جو عجیب وغریب دعوت دی تھی تو اس میں تجھے ناکامی کی وجہ کیا نظر آئی؟''

متنبی نے ساوہ کے ذکر سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''امیر اس خوشی کے موقع پر میرے تکلیف دہ ماضی کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔''

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ''اگر تم ناتجربے کار نہ ہوتے اور بنو کلب میں لائق اور دوربیں چند افراد بھی ہوتے تو تم خلافت عباسیہ کے لیے مصیبت بن جاتے تم لوگوں نے اتنا بڑا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے کے پیچھے تجربے اور فکرو تدبر کی کمی تھی جس سے تم ناکام رہے اور تجھے حمص کے عامل امیر لولو نے قید خانے میں ڈال دیا۔''

متنبی نے دوبارہ درخواست کی۔ ''امیر محترم! مجھے اپنی اس حماقت پر آج بھی ندامت محسوس ہورہی ہے۔''

امیر سیف الدولہ نے متنبی کی رشک آمیز صحت نمایاں قدوقامت اور شاندار ڈیل ڈول کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔ ''تجھے تو بہت اچھا سپاہی بھی ہونا چاہیے تھا، کیا تجھے فنونِ سپاہ گری بھی آتے ہیں؟''

متنبی نے جواب دیا۔ ''نہیں! خانہ بدوشوں میں رہ کر مار دھاڑ کی عادت تو پڑ گئی مگر فنونِ سپاہ گری باقاعدہ سیکھنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ وہاں کوئی ایسا ماہرِ فن تھا جس سے میں فنون سپاہ گری سیکھتا۔''

امیر سیف الدولہ نے پوچھا۔ ''اگر تجھے نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کے ماہرین کے حوالے کردیا جائے کہ تو ان سے سپاہ گری سیکھ لے تو تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

متنبی نے جواب دیا۔ ''یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں فنون سپاہ گری سیکھ کر مردِ میدان بن جاؤں لیکن اے امیر! مجھے تو اس دربار میں بحیثیت ایک شاعر جگہ دی گئی ہے پھر یہ آپ کے دل میں مجھے فنونِ سپاہ گری سکھانے کا خیال کیوں آیا۔''

امیر سیف الدولہ نے جواب دیا۔ ''تجھے نہیں معلوم کہ میں کبھی کبھی جہاد کے لیے ایشیائے کوچک پہنچ جاتا ہوں اور وہاں مجھے کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میں تجھے سفروحضر میں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔''

متنبی کے لیے یہ اور زیادہ خوشی کی بات تھی کہ امیر اس سے اتنا خوش اور متاثر ہوا تھا کہ اسے سفروحضر میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

امیر نے متنبی کو فنون سپاہ گری کے ماہرین کے سپرد کردیا کہ وہ اسے فنونِ سپاہ گری سکھائیں۔

متنبی اتنا ذہین تھا کہ اس نے ان فنون میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ امیر سیف الدولہ، متنبی کے استادوں سے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا اور وہ لوگ یہی بتاتے تھے کہ متنبی میں سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔

متنبی دربار میں بیٹھے بیٹھے اپنے اشعار اور قصائد سناتا رہا اس وقت بھی امیر کا ذہن کہیں اور ہوتا۔ وہ دیکھنے میں یوں لگتا جیسے شاعری میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور کھچڑی پک رہی ہوتی۔ متنبی امیر سیف الدولہ کے دل و دماغ پر بری طرح چھا گیا تھا۔

امیر نے ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا اور متنبی سے پوچھا۔ ''اب تو تو بھی میرے ساتھ جہادوں میں حصہ لے سکتا ہے۔''

متنبی نے کہا۔ ''ہاں! امیر محترم اب میں بھی جہاد میں حصہ لینے کے لائق ہوچکا ہوں۔''

امیر سیف الدولہ نے ایشیائے کوچک پر حملہ آوری کی تیاریاں کیں تو متنبی کو پیش پیش رکھا۔ اس سے مشورے بھی کیے تو متنبی نے جواب دیا۔ ''میں اپنے اشعار سے سپاہیوں میں گرمی اور جوش وخروش پیدا کردوں گا۔''

امیر سیف الدولہ، متنبی کی مالی مدد کرتا رہا اور اسے اب اتنی آسودگی میسر آگئی تھی کہ وہ اس کا اپنے شعروں میں ذکر کرنے لگا تھا۔ اس کے کئی اشعار خاصے مقبول ہوئے اور ان شعروں کو دوسروں کی زبانوں سے بھی سنا گیا تو امیر سیف الدولہ کو بڑی خوشی ہوئی کہ متنبی اس کے دربار سے وابستگی کے بعد خوش حال زندگی بسر کررہا ہے۔

کسی درباری نے بھی یہ شعر امیر سیف الدولہ کو سنائے۔ ''میں نے راتوں کا سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے پاس مال کی کمی ہے اور میں نے تیرے (امیر سیف الدولہ) کے احسانات کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو سونے کی نالیں لگوا دیں اور میں نے تیرے لطف وکرم کی وجہ سے اپنے آپ کو تیری محبت میں محصور اور مقید کردیا اور جو بھی خود کو احسان کی بیڑی میں پاتا ہے وہ قید ہوجاتا ہے۔''

دربار میں متنبی کے پہنچنے سے پہلے ابوالعباس نامی شاعر بڑا رسوخ رکھتا تھا لیکن متنبی کی شاعرانہ سحرکاریوں نے اس کا رنگ پھیکا کردیا۔

ابوالعباس کو جب بھی موقع ملتا متنبی کی عدم موجودگی میں امیر سے اس کی شکایت کرتا۔ ابوالعباس کو سب سے

بڑی شکایت یہ تھی کہ متنبی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتا اور اس کو مخاطب کیے بغور طنز کرتا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔

ابوالعباس یہ اذیت کچھ عرصہ جھیلتا رہا اسے جب بھی موقع ملتا وہ متنبی کی امیر سے شکایتیں کرتا اور کہتا۔ ”متنبی خود کو معلوم نہیں کیا سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کی بالکل عزت نہیں کرتا۔ آپ اس کو سمجھائیں کہ جب ہم اس کی عزت کرتے ہیں تو اسے بھی ہماری عزت کرنا چاہیے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں متنبی کو کیا سمجھاؤں جب کہ مجھے خود بھی یہ احساس ہے کہ وہ اپنے عہد کا بے مثال شاعر ہے لیکن افسوس کہ اس کی خودستائی اور اس کے بے جا غرور نے مجھے کبھی کبھی کو شکوہ شکایت پر مجبور کر دیا ہے، میں اسے سمجھا بھی دوں گا تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”ہم اسے اتنا بڑا شاعر نہیں مانتے جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے ہم اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”اے ابوالعباس! اس قسم کی باتیں مت کرو وہ واقعی اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور تم میں سے کوئی بھی شعر و شاعری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

ابوالعباس نے زیادہ ہمت اور جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے اس کے کچھ اشعار سنائیں ہم اسی موضوع پر اس سے بہتر اشعار کہہ دیں گے۔“

امیر سیف الدولہ مسکرایا۔ ”نہیں ابوالعباس! ایسا دعویٰ نہ کر کیوں کہ اس کے جو اشعار میں تجھے سناؤں گا تو اس سے بہتر شعر نہیں کہہ سکے گا اور جب یہ تفصیل متنبی سنے گا تو تیرا بہت زیادہ مذاق اڑائے گا۔“

ابوالعباس کا اصرار جاری رہا۔ ”آپ اس کے کچھ اشعار سنائیں تو سہی میں ان سے بہتر شعر کہہ دوں گا۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”میں صرف ایک شعر سناتا ہوں اگر تو اس کے جواب میں اس سے بہتر شعر کہہ سکا تو میں تجھے اس سے بہتر شاعر سمجھوں گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”آپ مجھے وہ شعر سنائیں تو سہی۔“

امیر نے اس کو شعر سنایا۔ ”وہ فتح پر فتح حاصل کرتا ہے لیکن اس میں غرور نہیں پیدا ہوتا حالانکہ جب وہ لڑائی کے لیے چلا تھا تو کچھ تیاری بھی نہیں کی تھی۔“

سیف الدولہ نے یہ شعر سنانے کے بعد کہا۔ ”اس شعر میں لفظوں کی جو مناسب بندش کی گئی ہے اس سے شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور سننے والے کو عجیب سی کیفیت محسوس ہوتی ہے، تو بھی اقرار کرے گا کہ میں اس شعر کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کتنی صداقت موجود ہے۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”اے امیر! میں اس سے بہتر شعر کہوں گا اور آپ اس شعر کی بھی اسی طرح تعریفیں کریں گے۔“

لیکن امیر کے پاس سے اٹھنے کے بعد ابوالعباس کو یہ یقین ہو گیا کہ متنبی نے امیر کے دل و دماغ پر ایسا قبضہ جما رکھا ہے کہ اگر وہ متنبی کے اس شعر سے بہتر شعر کہے گا تب بھی امیر اس کے شعر کی تعریف نہیں کرے گا۔

کچھ دنوں بعد امیر سیف الدولہ بھی متنبی کے طور طریقوں سے اکتا گیا، اس کے دربار میں بدنظمی اور بے دلی پیدا ہو گئی اور اکثریت رشک و حسد میں مبتلا ہو گئی، کچھ تو متنبی کی باتیں گوارہ کر رہے تھے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے مگر اکثریت نے متنبی کے خلاف باتیں شروع کر دیں اور ان سب نے امیر سیف الدولہ کو مجبور کیا کہ وہ متنبی کی زبان کو لگام دے۔

امیر سیف الدولہ نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ بھی متنبی پر جوابی حملے کریں اور سب مل جل کے متنبی کو عاجز کر دیں۔

امیر کی اس اجازت کے بعد دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہو گئی ایک طرف متنبی تھا اور دوسری طرف متنبی کے حریف تھے اور ان سب نے اپنی مجموعی قوت سے متنبی کو عاجز کر دیا۔ وہ ان سب کا کب تک مقابلہ کرتا آخر متنبی نے سب کی امیر سے شکایت کی۔ ”اے امیر! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے درباری احمقوں اور زبان درازوں کی میری شان میں گستاخیاں برداشت کر لیں میں ذلیل و خوار ہوتا رہا اور آپ خاموشی سے میری ذلت گوارہ کرتے رہے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”تجھے اپنی عزت کروانے کا سلیقہ نہیں آتا تو نے کبھی اپنی ان حرکتوں کا جائزہ لیا۔ تیرے رویوں سے دوسروں کو شکایتیں پیدا ہوتی رہیں اور میرے درباری معزز لوگ تیری زیادتیاں برداشت کرتے رہے۔ میں نے جس طرح تجھے آزادی سے بولنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی تیرے خلاف بولنے کی اجازت دے دی گئی اگر وہ تیرے حملے برداشت کرتے ہیں

تو تجھے بھی ان کی باتیں سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔‘‘

متنبی نے امیر کے ساتھ بھی گستاخانہ رویہ رکھا اور کہا۔ ’’اے امیر! جب میں اس دربار میں بلایا گیا تھا تو میں نے آنے سے پہلے کچھ شرطیں رکھی تھیں اور آپ نے میری وہ شرطیں قبول کرلی تھیں، کیا اس دربار کا کوئی دوسرا شاعر میری جیسی آن بان سے اس دربار میں آیا تھا۔‘‘

امیر سیف الدولہ نے متنبی کو منع کیا کہ وہ ایسی گستاخانہ باتیں مت کرے، دربار میں دوسرے شاعروں کی بھی عزت کی جاتی ہے اور متنبی کو آیندہ ان شاعروں کے خلاف گستاخی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

متنبی نے کہا۔ ’’اے امیر! یہ میرے ساتھ زیادتی ہورہی ہے۔ آپ نے مجھے دوسرے درباری شاعروں کے مساوی قرار دے دیا اب مجھے اس دربار سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔‘‘

امیر سیف الدولہ کو متنبی کی یہ باتیں گراں گزرتی رہیں اور اس نے متنبی کے جانے کے بعد تمام دوسرے شاعروں کو اجازت دے دی کہ وہ بھی متنبی کے ساتھ رو رعایت سے کام نہ لیں اور اس کے اشعار کا جی بھر کے مذاق اڑائیں۔

اب امیر کے دربار میں متنبی کی وہ عزت نہیں رہی تھی جو کچھ دنوں پہلے پائی جاتی تھی۔

متنبی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اشعار سناتا تو دوسرے شاعر بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے شعر سنا دیتے گویا اب اس کے دربار میں سبھی شاعر مساویانہ درجہ رکھتے تھے۔

یہ صورتِ حال متنبی کے لیے کچھ دنوں تک گوارہ رہی مگر پھر وہ اتنا بے زار ہوا کہ دربار میں آنا جانا کم کردیا۔

امیر نے دفترِ مالیات کو ہدایت کی کہ اب تک متنبی کو انعام و اکرام میں جو کچھ دیا جاچکا ہے اس کی تفصیل سے امیر کو آگاہ کیا جائے۔

دفترِ مالیات نے حساب کتاب کرکے بتایا۔ ’’دفتری حساب کتاب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ متنبی کو چار برس کی مدت میں 35 ہزار اشرفیاں دی جاچکی ہیں۔‘‘

امیر سیف الدولہ نے دفترِ مالیات کو خفیہ حکم بھیجا کہ متنبی کو آیندہ کچھ بھی نہ دیا جائے۔

امیر سیف الدولہ کا بھائی امیر ابوفراس بھی متنبی کو ابھی تک اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود امیر سیف الدولہ کے بھائی کا مدِمقابل سمجھے۔ امیر کا بھائی ہونے کے علاوہ وہ خود کو بہت بڑا شاعر بھی سمجھتا تھا۔

امیر سیف الدولہ نے خود تو اپنے بھائی سے کچھ نہیں کہا مگر ابوالعباس کو مشورہ دیا کہ وہ ابوفراس کے ساتھ اس کی سرپرستی میں متنبی پر حملے کرے گا تو اس کا اثر ہوگا۔

جب ابوفراس کو متنبی کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا تو اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ متنبی انتہائی خود پسند اور مغرور شاعر ہے اسی لیے وہ ابوفراس کے مقابل آنے پر اس کی بھی بے عزتی کردے گا تو ابوالعباس نے اسے بتایا کہ اس کا بھائی امیر سیف الدولہ بھی متنبی سے عاجز آچکا ہے اور اس کی خواہش پر ابوفراس کو متنبی کے مقابل لایا جارہا ہے۔

متنبی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کچھ شعر سنائے تو ابوفراس اپنے بھائی امیر سیف الدولہ کے پاس جا بیٹھا اور وہیں سے شعر سنانے شروع کردیے۔ پورا دربار متنبی کے شعروں پر خاموش رہا تھا مگر ابوفراس کے شعروں پر مدح ستائش کے ڈونگرے برسے۔ متنبی کو اپنی بڑی بے عزتی محسوس ہوئی۔ وہ دربار میں تو بالکل خاموش رہا مگر باہر نکل کے وہ ابوفراس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ امیر کے بھائی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

دربار سے رخصت ہونے والے شاعروں نے متنبی کو راستے میں گھوڑے پر کسی کے انتظار میں دیکھا تو مسکراتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

کچھ دیر بعد ابوفراس بھی اس کے پاس سے گزرا۔

متنبی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا۔ ابوفراس کا گھوڑا اس کے برابر رک گیا۔

متنبی نے پوچھا۔ ’’اے ابوفراس! پہلے تو کبھی دربار میں تو نے آج کی طرح اپنے اشعار نہیں سنائے تھے۔ مجھے سچ سچ بتا کہ ایسا کس کی سازش سے ہوا۔‘‘

ابوفراس نے جواب دیا۔ ’’یہ سوال تو دوسرے شاعروں سے کرسکتا تھا۔ میں امیر سیف الدولہ کا بھائی ہوں۔ تجھے ہم دونوں کے اس رشتے کا احترام کرنا چاہیے۔‘‘

متنبی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ’’اے ابوفراس! دربار میں اگر تجھے امیر کے بھائی کی حیثیت سے آنا تھا تو تجھے اس کے پاس بیٹھ کے اپنے شعر نہیں سنانا چاہیے تھے تو کیا ہے اس عہد کے جملہ شاعر مل کے بھی میرا مقابلہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ آج میں نے امیر کے خیال سے

تیرا لحاظ کیا لیکن آیندہ میں اس رشتے کا بھی لحاظ نہیں کروں گا اور تجھ سے بھی دوسرے درباری شاعروں کی طرح پیش آؤں گا۔''

ابوفراس کو بے حد غصہ آیا اور اس نے جواب دیا۔

''تجھے دفتر مالیات سے تین ہزار اشرفیاں سالانہ مل رہی ہیں۔ میں نے اپنے بھائی کو بتا دیا ہے کہ یہ رقم بہت زیادہ ہے اتنی رقم میں بھائی کو بیس شاعر مل سکتے ہیں۔''

متنبی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تب پھر تیرے بھائی نے مجھے کیوں تین ہزار اشرفیاں سالانہ پر رکھا ہوا ہے تو بیس شاعروں کی بات کر رہا ہے وہ بیس شاعر تیرے جیسے ہوں گے بلکہ تیرے جیسے پینتیس شاعر میری جتنی قیمت میں مل سکتے ہیں۔''

ابوفراس غصے میں بے قابو ہو گیا اور کہا۔ ''اے متنبی! تجھے آسودگی اور عزت افزائی راس نہیں آ رہی ہے، کیا تجھے سماوہ کے قبائل یاد آ رہے ہیں جہاں لوگ تجھ سے تیرے شعر تو سنتے تھے مگر انعام میں کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ وہاں بھی تیری انا، غرور اور خود پسندی نے تیرا دماغ خراب کر دیا تھا اور تو ایک نئی خلافت وجود میں لانا چاہتا تھا اس کی ناکامی میں تجھے قید خانے کی ہوا کھانا پڑی اور تو ایک عرصے بیڑیاں پہنے قید خانے میں پڑا رہا۔''

متنبی نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہا۔ ''خدا کے لیے اب کچھ نہ کہنا میرے دماغ کی رگیں پھول رہی ہیں اور میں غصے سے پاگل ہو جاؤں گا، تم لوگ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا میں اس دربار کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں؟''

ابوفراس نے کہا۔ ''تو دوسروں کی عزت نہیں کرے گا تو دوسرے تیری عزت کیوں کریں گے میں تجھے یہی مشورہ دوں گا کہ تجھے اب کسی اور دربار کا رخ کرنا چاہیے تو نے مجھ سے جھگڑا کر کے اپنے لیے اچھا نہیں کیا میں تجھ سے کمزور شاعر نہیں ہوں اور میں تیری شاعرانہ عظمت کو خاک میں ملا دوں گا۔''

متنبی کے لیے اب یہ ماحول ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا اس نے ابوفراس سے باتیں کرنے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے پیچھے سیف الدولہ کی مرضی اور خواہش کار فرما نظر آ رہی ہے آخر ابوفراس کو یہ بات کس نے بتائی کہ متنبی کو سالانہ تین ہزار اشرفیاں مل رہی ہیں۔

متنبی نے دفتر مالیات سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہاں سے اسے جو کچھ ملتا رہا ہے اس کی درست تفصیل کا علم ابوفراس کو کیونکر ہو گیا۔

دفتر مالیات میں متنبی کے قدر دان موجود تھے اور وہیں سے اس کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ امیر سیف الدولہ نے کچھ دن پہلے اس محکمے سے پوچھا تھا کہ چار سالوں میں متنبی کو کتنی رقم دی جا چکی ہے۔

متنبی نے اپنے قدر دان سے اتنی تفصیل جاننے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔

سیف الدولہ کے دربار سے رخصت ہونے سے پہلے اس نے سیف الدولہ کی ناقدردانی، ناانصافی اور اپنی خودداری کا اپنے قصیدے میں نہایت آزادی اور دلیری سے نظم کر دیا۔

اے سب سے زیادہ عادل بجز میرے معاملے کے
تیرے ہی بارے میں نزاع ہے اور تو ہی دشمن تو ہی ثالث ہے

انسان کو آنکھ سے کیا حاصل اگر آنکھ تاریکی اور روشنی میں فرق نہ معلوم کر سکے (یعنی سیف الدولہ کو نیک و بد کی تمیز نہیں)

مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحرا، تلوار، نیزے، کاغذ اور قلم سب پہچانتے تھے۔

کاش یہ بادل (سیف الدولہ) جہاں برستا ہے وہیں جا کر گرجتا بھی۔

جب یہ قصیدہ دربار میں پڑھا گیا تو تمام درباری برہم ہو کر کھڑے ہو گئے۔

سیف الدولہ نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی لیکن انطاکیہ کے امیر ابوالعشائر کو متنبی کی شکایت لکھ بھیجی کہ متنبی گستاخیوں پر اتر آیا ہے۔

ابوالعشائر نے انطاکیہ سے دس آدمی متنبی کو سزا دینے کے لیے بھیج دیئے۔

سیف الدولہ کے محل کے باہر ان کی متنبی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک نے متنبی کی باگ پر ہاتھ ڈالا۔ متنبی نے تلوار کا بھرپور وار کیا جو کمان کو کاٹ کر ہاتھ تک جا پہنچا اور وہ زخمی ہو کر مر گیا بقیہ نو نے متنبی پر تیر برسائے لیکن متنبی صاف بچ کر نکل گیا۔

اب اس نے دمشق کا رخ کیا۔

دمشق میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد قاہرہ پہنچا اور کافور خواجہ سرا کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔

کافور اپنے مالک ابوبکر کے بعد یہاں کا حکمراں ہو

گیا تھا حالانکہ پہلے یہ اس کا غلام تھا۔
متنبی چاہتا تھا کہ کافور اسے کسی صوبے یا ضلع کی حکومت دے دے تو وہ آزادانہ زندگی بسر کرے اور اسی امید میں اس نے کافور کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا مگر اس قصیدے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔
کافور نے صلے میں گراں قدر انعام دے دیا۔
کچھ دنوں اسی طرح کام چلتا رہا مگر کافور کو انعام و اکرام کے علاوہ کسی قلعے یا صوبے کی حکومت دینے میں اس لیے تامل تھا کہ متنبی کی حوصلہ مندی کے قصے سن چکا تھا۔ اس لیے اب تک وہ اسے اپنے دربار میں صرف شاعر کی حیثیت سے رکھے ہوئے تھے۔
متنبی درباری یکسانیت سے عاجز آگیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اظہار ایک قصیدے میں کردیا۔
''جو خدمت چاہیں میرے سپرد کردیں کیونکہ میں آدمی کی صورت میں شیر ہوں۔ میرا دل بادشاہ کا دل ہے گو میری زبان شاعروں کی ہے۔''
ایک دوسرے قصیدے میں لکھا۔
''اے کافور! پیالے میں کچھ باقی بھی ہے جو میرے کام آئے۔
بڑی دیر سے میں گا رہا ہوں اور تو پی رہا ہے۔
تو نے جو دیا وہ زمانے کے ہاتھوں کے انداز سے دیا۔
لیکن میں تو تیرے ہاتھ کے اندازے سے چاہتا ہوں۔
اگر تو نے مجھ کو کوئی جاگیر یا کہیں کی حکومت نہ دی تو تیری سخاوت مجھ کو کپڑے پہنائے گی اور دربار کی حاضری اس کو مجھ سے چھین لے گی۔''
اس قصیدے نے بھی کافور کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور متنبی کو یقین ہوگیا کہ اسے اس دربار سے کوئی جاگیر نہیں ملے گی۔ اس نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور کافور سے تعلقات منقطع کرلیے۔
کافور کو یہ باتیں گراں گزریں اور اس نے متنبی پر پہرے بٹھادیئے کہ اسے کہیں جانے نہ دیا جائے۔
دربار میں متنبی کے خلاف کافور جو باتیں کرتا متنبی کے ہمدرد انہیں متنبی تک پہنچانا چاہتے مگر کافور کے خوف سے وہ متنبی کے پاس نہیں گئے۔
متنبی نے خود کو پہرے میں گھرا ہوا دیکھا تو اس نے

جدید سکھ مت

اگرچہ دنیا کے بیشتر حصوں میں سکھ برادریاں موجود ہیں۔ البتہ جدید سکھ مرکزی طور پر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ جدید سکھ مت کے مرکزی ڈھانچے میں تین فرقے ہیں۔ ہر فرقہ نانک کی مرکزی تعلیمات کو قبول کرتا ہے۔ گرنتھ کو مقدس مذہبی تحریر ماننا اور دس گروؤں کو الہام یافتہ سمجھتا ہے۔ پہلا فرقہ اداسی کہلاتا ہے اور یہ بنیادی طور پر مقدس افراد کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سکھ بہت سے ایسے اصولوں اور قواعد پر عمل کرتے ہیں جو ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے مرتاضوں کے ہاں بھی نافذ العمل ہیں۔ وہ بیشتر مجرد رہتے اور بدھ بھکشوؤں کی طرح کھردرے پیلے کپڑے پہنتے یا جین جوگیوں کی طرح برہنہ پھرتے ہیں۔ ان کی زیر ملکیت واحد شے کشکول ہے۔ عموماً وہ سرگرم مبلغین ہوتے ہیں اور دیگر عقائد رکھنے والوں کو اپنے مذہب سے متعارف کرانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اداسیوں کو نانک پتر بھی کہتے ہیں۔ گرونانک کا سب سے بڑا بیٹا ان کا جد امجد تھا جسے گرو امراداس نے برادری سے خارج کیا تھا۔ وہ گرو گوبند کے گرنتھ کو مسترد کرتے جب کہ گرونانک کے آدی گرنتھ کو مانتے تھے۔ سکھوں کا دوسرا فرقہ سہج دھاری سکھ (سست رو) ہے۔ بحیثیت سکھ ان کی ترقی گوبند سنگھ سے پہلے بعض مواقع پر ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جارحیت پسندی کو مسترد کرتے ہیں جو کہ زیادہ تر سکھ مت کی خصوصیت بن چکی ہے اور داڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا/لیوس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

کافور کی ہجو لکھ دی۔ ”یہاں ایک خواجہ سرا فراری غلاموں کا امام ہے۔ آزاد غلام بن گئے اور غلام معبود بن گیا ہے۔ میں یہ نہیں خیال کرتا تھا کہ میں ایسا زمانہ دیکھوں گا۔ جس میں ایک کتا مجھ کو ستائے اور پھر مجھ کو اس کی تعریف کرنی پڑے۔“

اب متنبی کو یقین ہو چکا تھا کہ اس ہجو کے بعد وہ مصر میں نہیں رہ سکے گا۔

اس نے یہاں سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے راستے میں جگہ جگہ ہتھیار دبوا دیئے۔

دس دن کی خوراک اپنے ساتھ لی اونٹوں پر پانی کے مشکیزے رکھوائے اور مسلح غلاموں کے ساتھ عید کے دن مصر سے فرار ہو گیا۔

کافور کو خبر ہوئی تو ہر طرف، ناکا بندیاں کروا دیں راستے میں آباد عرب قبائل کو قاصد دوڑا دیئے گئے کہ متنبی جہاں ملے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔

راستے میں غلاموں نے بے وفائی کی اور اس کا ساتھ چھوڑ گئے لیکن متنبی کوفے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ دن کوفے میں قیام کرنے کے بعد وہ بغداد چلا گیا اس زمانے میں بغداد دیلمیوں (ایرانیوں) کے زیر اثر تھا اور مہلبی، معزالدولہ کا وزیر تھا۔ متنبی نے اس کے دربار میں حاضری دی اور کئی دن تک مہلبی اس انتظار میں رہا کہ متنبی اس کی شان میں کوئی قصیدہ لکھے گا لیکن متنبی نے ایک شعر بھی اس کی مدح میں نہیں کہا۔

مہلبی نے دوسرے شاعروں کو متنبی کے پیچھے لگا دیا کہ وہ سب مل کے متنبی کا مذاق اڑائیں۔

متنبی اپنی ہجو میں دوسرے شاعروں کے اشعار سنتا رہا مگر کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے حامیوں نے کہا۔ ”اے متنبی! یہاں کے بہت سے شاعر تیری ہجو میں اشعار کہہ رہے ہیں تو ان کا جواب کیوں نہیں دیتا۔“

متنبی نے اپنا ایک شعر سنایا۔ ”اسے میں اپنے ایک شعر میں کہہ چکا ہوں۔ اب سب شاعروں کے ہجو یہ اشعار کا جواب میرے اس شعر میں موجود ہے۔“

”جب کم درجے کے لوگ میری برائیاں بیان کریں تو یہی دلیل ہے کہ میں کامل ہوں۔“

بغداد میں اپنی ناقدردانی دیکھ کر اس نے فارس اور شیراز جانے کا ارادہ کیا یہ عہدالدولہ کا پایۂ تخت تھا اور یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اس کے درباریوں میں محمد بن الحمید بذات خود صاحب علم وفن تھا اور علم وفن کا نہایت قدردان بھی۔

اسے بتایا گیا کہ متنبی مہلبی سے ناراض ہو کر اس کے پاس آرہا ہے اور متنبی نے مہلبی کی بہت بے عزتی کی ہے۔

ابن الحمید گھبرایا کہ کہیں یہ شاعر اس کے ساتھ بھی مہلبی کی طرح نہ پیش آئے۔

اس نے متنبی کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کا نام حقارت سے لینا شروع کر دیا۔ وہ متنبی کی برائیاں کرتا رہا لیکن ایک دن ابن الحمید کے درباریوں میں کسی نے اس کو نہایت مغموم اور اداس سر جھکائے بیٹھے ہوئے دیکھا۔

درباری نے پوچھا۔ ”حضور والا! بہت متفکر نظر آرہے ہیں خیریت تو ہے۔“

ابن الحمید نے جواب دیا۔ ”کئی دن پہلے میری بہن کا انتقال ہوا اور اب تک اس کی تعزیت میں میرے پاس ساٹھ خط آچکے ہیں اور ہر خط متنبی کے کسی شعر سے شروع ہوتا ہے ایسے شخص کی شہرت کو میں کس طرح مٹا سکتا ہوں۔“

ان دنوں ابن الحمید قزوین کے ارجان نامی قلعے میں مقیم تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ متنبی اس کے پاس آرہا ہے تو وہ قلعے سے نکل کر آبادی سے دور ایک جگہ قیام پذیر ہوا اور متنبی کا انتظار کرنے لگا۔

ابن الحمید کے قریب پہنچنے کے بعد متنبی نے اپنا ایک غلام ابن الحمید کے پاس بھیجا۔

اس وقت ابن الحمید سونے کی تیاری کر رہا تھا اور اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ متنبی آچکا ہے تو وہ کھڑا ہو گیا اور نہایت حیرت سے پوچھا۔ ”کیا واقعی متنبی یہاں تک آگیا؟“

متنبی کا غلام ابن الحمید کے سامنے پیش کر دیا گیا اور ابن الحمید نے اپنے خاص حاجب کو متنبی کے استقبال کے لیے بھیجا۔

یہ صاحب بھی خوب تھا کہ اسے راستے میں جو بھی ملا اس کو اپنے ساتھ لے لیا اور پھر متنبی اس کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے شہر میں داخل ہوا اسے فوراً ابن الحمید کے سامنے پہنچایا گیا اور ابن الحمید نے اس کی بے حد تعظیم کی اس نے پہلے سے اپنے قریب ہی متنبی کے لیے کرسی بچھوا دی تھی اس کرسی پر کمخواب کا گدا پڑا ہوا تھا۔

ابن الحمید نے بے ساختہ کہا۔ ''میں تجھ سے ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔''

متنبی نے ابن الحمید کے خلوص کا جواب چند اشعار میں دیا۔

بدوؤں سے میرا یہ پیغام کون جا کر کہے گا
کہ میں نے ارسطو اور سکندر دونوں کو دیکھا
میں نے بطلیموس کو درس دیتے سنا
جو فرماں روا بھی ہے بدوی بھی اور شہری بھی

دونوں گرم جوشی سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ابن الحمید نے متنبی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی شاگردی اختیار کی۔ متنبی نے خاص اپنی تحقیق اور چھان بین سے ایک مجموعہ لغت مرتب کیا تھا۔ ابن الحمید نے متنبی کے اس مجموعہ لغت کو پڑھا اسی دوران ابن الحمید کی طرف سے خدمت اور تحائف کے علاوہ پچاس ہزار اشرفیاں متنبی کی خدمت میں پیش کیں۔

فارس و شیراز کے بادشاہ عضدالدولہ کو یہ خبر پہنچی کہ متنبی نے ابن الحمید کی مصاحبت اختیار کرلی ہے تو اس نے ابن الحمید کو لکھا۔ ''متنبی کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔''

شاہی فرمان متنبی کے سامنے رکھ دیا گیا اور متنبی نے اسے پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔ ''عجمی میری کیا قدر کریں گے۔''

ابن الحمید نے جواب دیا۔ ''عضدالدولہ مجھ سے ہر بات میں بڑھا ہوا ہے۔''

متنبی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس شاہی فرمان سے خوش نہیں ہے۔

ابن الحمید نے اصرار کیا۔ ''اے متنبی تجھے اس فرمان کی تعمیل میں عضدالدولہ کے پاس جانا پڑے گا۔''

متنبی نے حقارت سے جواب دیا۔ ''میں بادشاہوں کی ملاقات سے تنگ آچکا ہوں۔ میں تو ان کو بقائے دوام کا تاج پہنا دیتا ہوں اور وہ مجھے صلے میں ایسی چیزیں دیتے ہیں جو میرے پاس چار دن بھی نہیں ٹھہرتیں اس کے علاوہ میں ایک جگہ جم کر قیام نہیں کرسکتا جب کہ سلاطین مجھ کو قیام پر مجبور کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجھے بڑی بے لطفی سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔''

ابن الحمید، متنبی کی باتوں پر کچھ دیر غور کرتا رہا اور اس کے بعد کہا۔ ''میں تیری یہ ساری باتیں اگر تو مجھے اجازت دے تو میں عضدالدولہ کو لکھ کر بھیج دوں۔''

متنبی نے اجازت دے دی اور ابن الحمید نے متنبی کی مجبوریاں اور شرائط عضدالدولہ کو لکھ کر بھیج دیں۔

چند دنوں بعد عضدالدولہ کا جواب آگیا۔ ''متنبی کو ہر بات کا پورا اختیار رہے گا۔''

اب متنبی کو ابن الحمید کی صحبت چھوڑ کر عضدالدولہ کے پاس جانا پڑا۔

ابھی شیراز بارہ میل دور تھا کہ عضدالدولہ کا ابوعمر صباغ نامی نمائندہ متنبی کے استقبال کو پہنچ گیا۔

دونوں ایک ساتھ شیراز کے لیے چل پڑے۔ راستے میں صباغ نے فرمائش کی۔ ''اے متنبی! تو نے مصر کے کافور سے متعلق حقیقت پر مبنی کوئی قصیدہ لکھا تھا اگر اس کے چند اشعار راستے میں مجھے سنا دیئے جائیں تو میرے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہوگی۔''

متنبی نے قصیدۂ مصر سنا دیا۔

شیراز میں متنبی کے لیے پہلے سے ایک آراستہ مکان تیار رکھا گیا تھا وہ کئی دن تک سفر کی تکان دور کرتا رہا۔ اس کے بعد عضدالدولہ کے دربار میں حاضری دی۔ یہاں دربار میں پیش ہونے والوں کو تخت شاہی کے متصل پا انداز کو بوسا دینا پڑتا تھا۔ متنبی نے بھی درباری قاعدے کے مطابق بوسا دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سواری کا ممنون ہوں جو مجھ کو یہاں تک لائی۔''

عضدالدولہ نے گرمجوشی سے سفر کے حالات پوچھے اور دونوں میں کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔

کچھ دنوں کے بعد متنبی قصیدہ لکھ کر لے گیا اور درباری قاعدے کے مطابق کھڑے ہو کر قصیدہ پڑھنا چاہا لیکن عضدالدولہ نے اس کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا۔ ''تو بیٹھ کے قصیدہ سنا سکتا ہے۔''

متنبی بے طلب ملنے والی عزت افزائی سے بہت خوش ہوا اور قصیدہ سناتا رہا۔

عضدالدولہ نے انعام میں عنبر، مشک، عود، اسپ خاصہ، کمخواب کے استر کی چادر، امامہ جس کی قیمت پانچ ہزار دینار تھی۔ ہندوستانی مرصع تلوار جس کا قبضہ سونے کا تھا ان سب کے علاوہ اشرفیوں کے توڑے صلے میں دیئے۔

متنبی کی یہ قدردانی سابقہ قدردانیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہاں متنبی کے کلام میں پہلے جیسا زور نہیں پایا جاتا تھا۔ عضدالدولہ نے بھی اسے محسوس کیا اور اس نے کسی سے کہا۔ ''جب تک متنبی عرب میں رہا اس کے

کلام میں بلا کا زور پایا جاتا تھا۔"

متنبی نے جب کسی سے عضد الدولہ کی یہ بات سنی تو کہا۔ "جیسے مخاطب ہوتے ہیں ویسا ہی شعر بھی کہا جاتا ہے۔"

اب متنبی کا دل یہاں سے بھی اچاٹ ہوگیا۔

عضد الدولہ کو معلوم ہوگیا کہ متنبی اس کی کسی بات سے ناخوش ہے۔ اس نے کسی کے ذریعے متنبی سے معلوم کیا۔ "اے متنبی! سچ بتا کہ تجھے عضد الدولہ سے جو بخشش اور انعام مل رہا ہے وہ گراں قدر ہے یا سیف الدولہ کا عطا کیا ہوا انعام واکرام۔"

متنبی نے جواب دیا۔ "یہ عضد الدولہ نے ابھی تک جو مجھے دیا ہے وہ نہایت گراں قدر اور عظیم تر ہے لیکن میں نے اس میں کچھ تکلف بھی محسوس کیا ہے جب کہ سیف الدولہ کی بخشش میں اس کا اندرونی جوش و جذبہ محسوس ہوتا تھا۔"

جب متنبی کا یہ جواب عضد الدولہ کے گوش گزار کیا گیا تو اسے بے حد غصہ آیا مگر اس نے اپنے وعدے کے مطابق متنبی کو شیراز میں قیام کیے رہنے پر مجبور نہیں کیا۔

متنبی نے ایک وداعی قصیدہ لکھا اور عضد الدولہ سے رخصت ہوکر کوفے روانہ ہوگیا۔

اہواز پہنچ کے قیام کیا راستے میں تیز بارش ہو جانے کی وجہ سے اس کا سامان بھیگ گیا تھا اور کپڑے بھی نم ہوگئے تھے۔

یہاں اس نے صندوق کھلوا کر کپڑے دھوپ میں پھیلا دیئے میدان میں رنگ برنگے بیش قیمت پھیلے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف چمن زار کھل گیا ہے۔

یہیں کہیں قریب ہی بدوؤں کا سردار فاتک اسدی اپنے قبیلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ متنبی بھی یہاں آرام کررہا ہے تو وہ متنبی سے ملنے کے لیے آیا۔

متنبی نے فاتک اسدی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

فاتک اسدی نے نہایت ادب سے درخواست کی۔ "اے متنبی! آگے راستہ پُر خطر ہے اگر آپ کہیں تو میں اپنے قبیلے کے کچھ آدمی آپ کے ساتھ کردوں آپ ان کو ان کی خدمت کے صلے میں کچھ انعام دے دیجیے گا۔"

متنبی کو اپنی بہادری اور سپاہ گری پر ناز تھا اس کے علاوہ وہ بخیل بھی تھا اس نے فاتک اسدی کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جب تک یہ میرے ہاتھ میں ہے میں آسمان کے نیچے کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔"

فاتک اسدی نے کوئی جواب دیئے بغیر واپسی اختیار کی اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "میں نے تو متنبی کو بہت عقل مند سمجھا تھا مگر وہ بخیل ہونے کی وجہ سے احمق بھی ہے۔"

فاتک اسدی اپنے ستر آدمیوں کے ساتھ چھپ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہی متنبی سامنے سے گزرا تو یہ سب اس پر حملہ آور ہوگئے۔

متنبی دیر تک لڑتا رہا اور جب اسے اپنی شکست نظر آئی تو جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

لیکن متنبی کے غلام نے اس وقت اس کا یہ شعر سنایا

"مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحرا، جنگ و جدل، کاغذ اور قلم سب پہچانتے ہیں۔"

یہ شعر سنا کر غلام نے کہا۔ "اب اگر آپ شکست اٹھا کے بھاگ کھڑے ہوئے تو اس سے آپ کی بڑی بے عزتی ہوگی۔"

وہ آخر تک لڑتا رہا اور مارا گیا۔

اس کی دولت پر فاتک اسدی کا قبضہ ہوگیا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ متنبی نے بھی اس کے قبیلے کی ہجو لکھی تھی۔

متنبی کے ساتھ اس کا بیٹا اور غلام بھی مارا گیا۔

متنبی کا لغوی معنی نبوت کے دعوے دار کے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ کبھی اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنالیا تھا۔ جب اس سے یہ کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ وآلہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "لانبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) پھر تو نبوت کا دعویٰ کیوں کررہا ہے؟"

"متنبی نے جواب دیا کہ میرا نام آسمان میں لا ہے اور آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد لا نامی شخص نبی ہوگا۔"

اس دعوے کے بعد اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور جب اس نے توبہ کرلی اور نبوت کے دعوے سے دستبردار ہوگیا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔

لیکن شبلی نعمانی اسے یاروں کا لطیفہ قرار دیتے ہیں۔

زین مہدی

برصغیر میں اردو شاعری کو اوج پر پہنچانے میں کوشاں شعراء میں ایسے کئی نام ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد انتھک کوشش کی اور اردو ادب کا دامن لبالب بھر دیا۔ انھی میں سے ایک بڑا نام علامہ جمیل مظہری کا بھی ہے جنھوں نے اپنا جہان خود پیدا کیا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کا تذکرۂ خاص

سادات موسوی مدینے سے نکل کر بغداد اور وہاں سے ایران کے علاقے سبزوار پہنچے۔ سبزہ وار سے ان کی اولادیں دوسرے ممالک میں پھیلیں ان میں سے کچھ ہندوستان آنکلے اور شاہان دہلی کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔

انھی میں سے ایک بزرگ سید سالار غازی تھے جن کی سرکردگی میں غازی پور کا علاقہ فتح ہوا جو آج بھی مشرقی یوپی میں ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ انھی سید سالار کی نسل میں ایک بزرگ سید تاج الدین گزرے ہیں جن کے نام سے قصبہ تاج

پورآباد ہوا جو غازی پور سے دو تین اسٹیشن کے فاصلے پر آباد ہے۔ سید تاج الدین کی اولادیں آس پاس کی بستیوں میں منتشر ہوئیں' نونہرہ' پارہ' کامون پور' زنگی پور وغیرہ چند ایسی بستیاں ہیں جہاں ان کی نسل کے سادات آباد ہیں۔ انہیں خاندان میں سے ایک خاندان مولانا سید ریاض الحسن کا تھا جو شہر غازی پور کے محلہ قاضی ٹولہ میں آباد ہوا۔ محلہ گلزار باغ پٹنہ کی مشہور مخیر خاتون امام باندی بیگم نے اپنے شوہر کی تربیت ذہنی اور مسجد کی امامت کے لیے منتخب کیا اور وہ تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے دو صاحب زادے سید فیاض حسن اور سید مظہر حسن اور ایک صاحب زادی تھیں۔ سید فیاض حسن بھی عرصہ تک عظیم آباد میں ملازم رہے۔ سید مظہر حسن نے اپنے والد مرحوم کا علم اور ذوق شعر وادب ورثہ میں پایا جسے زمانہ تعلیم میں لکھنو اور مٹیا برج (کلکتہ) کے قیام نے اور اس کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کی علم پرور فضا نے جلا بخشی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی جب وہ لکھنو میں تھے' ان کی قوت بصارت چھن گئی' صرف 32 سال کی عمر میں وہ نابینا ہو گئے۔

انہی مولانا سید مظہر حسن کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ حسین آباد شیخ پورہ ضلع مونگیر بہار کے نواب علی خان کی ریاست کے وہ مدار المہام تھے اور ان کی آنکھیں بے نور تھیں مگر نباضی میں ملکہ حاصل تھا۔ کبھی کبھی مریضوں کو بھی دیکھ لیتے اور زبانی نسخے بتا دیتے یا پھر مصاحبین واحباب سے خوش گپیوں میں وقت گزار دیتے۔ اس دن بھی وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب آئے کچھ دیر باتیں کیں اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایک ہم نشیں نے پوچھا ''مولانا! آپ کچھ متفکر ہو گئے تھے۔''

انہوں نے جواب دیا کہ ابھی جو صاحب اٹھ کر گئے ہیں' ان کی آواز کی نقاہت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ کے مہمان ہیں۔ سوال کرنے والے نے استہزاء کیا کہ مولانا' آپ کی بھی باتیں' وہ تو اچھے خاصے ہٹے کٹے ہیں۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی مگر دسویں دن خبر آئی کہ جن صاحب کے متعلق انہوں نے حکم لگایا تھا' ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ مولانا سید مظہر حسن قبلہ چھڑی ٹیکتے چلے جا رہے تھے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ ان کی آنکھوں کا کام حسیں کرتی ہیں اس لیے نابینا کو اکیلے جاتے دیکھ کر بھی کسی نے ٹوکا نہیں۔ راستے میں ایک میدان تھا' اس میدان میں دربار کے شہسوار جگن خان نیا خرید کردہ گھوڑا پھرا رہے تھے۔ مولانا رک کر بے بصیرت آنکھوں سے ادھر ہی دیکھنے لگے کچھ دیر تک گھوڑے کی ٹاپ سنتے رہے پھر پکار کر کہا ''خان صاحب' گھوڑے کا پچھلا پیر غلط پڑ رہا ہے۔'' خان صاحب نے دھیان نہ دیا' سمجھے کہ مولوی آدمی پھر اندھے' گھوڑے کی چال کیا سمجھیں گے خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ قصداً انہوں نے پاؤں ٹھیک کر کے اگلا پاؤں بگاڑ دیا۔ مولانا نے فوراً ٹوکا' اب اگلا پاؤں بگڑ رہا ہے۔ خان صاحب گھوڑے سے کودے اور مولانا کے پیر پکڑ کر بولے ''مولوی صاحب' ہم تو آپ کو نابینا سمجھے تھے مگر آپ تو روشن ضمیر ہیں۔''

مولانا نے مسکرا کر کہا ''میاں! خدا نے آنکھوں کے ساتھ کان بھی دیے ہیں۔ میں آنکھوں کا کام کان سے لے رہا ہوں!''

مولانا مظہر حسن کے بارے میں نواب علی خان کا کہنا تھا کہ اکبر کے پاس نورتن تھے' میرے پاس ایک اور یہ ایک رتن ہی نو کے برابر ہے۔ مولانا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ منشیوں سے حساب سنتے اور زبانی میزان کرکے حساب کی غلطی پکڑ لیتے' بیٹے کو خود پڑھاتے اور بتاتے جاتے دیکھو فلاں صفحہ کی فلاں سطر کے سامنے حاشیہ پر فلاں نوٹ لکھا ہوا ہے' پڑھو۔ حالانکہ کتابوں سے الگ ہوئے چالیس سال گزر گئے تھے۔ وہ حاشیہ کے الفاظ پڑھتے تو بعینہ وہی الفاظ ملتے۔

فن تاریخ گوئی میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا کہ مختلف صنعتوں کے ساتھ تاریخ نکالتے' ایک ایک فقرے سے اٹھارہ اٹھارہ طریقے سے مادہ ہائے تاریخ نکالتے۔ دیگر اصناف سخن میں قصیدے' مثنوی' مرثیے' رباعیاں' قطعے' سلام اور نوحے کہتے۔ ان کے بیٹے مولانا خورشید حسین خورشید کو بھی وراثت میں فکر وفن کا شوق ملا اور وہ اپنے بڑے بھائی سید اطہر علی اطہر کی طرح خوش گو شاعر ثابت ہوئے۔ مولانا خورشید حسین کی شادی ہادی علی خان ڈپٹی مجسٹریٹ مغلپورہ پٹنہ سٹی کی بیٹی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے یا تیسرے سال یکم جنوری 1905ء ان کے بطن سے مغلپورہ میں میر کاظم علی پیدا ہوئے۔ کاظم علی کی والدہ سب سے چھوٹی تھیں اس لیے اپنے گھر والوں کو زیادہ پیاری تھیں اور میکے میں ہی زیادہ وقت گزارتی تھیں لیکن جب کاظم علی چار سال کے ہو گئے تو انہیں ان کی دادی نے اپنے پاس بلا لیا۔ اب وہ دادی کے پاس ہی رہنے لگے۔ (کاظم علی کی سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ وفا راشدی نے ''شاعر'' آگرہ شمارہ اپریل 1946ء میں 1904ء جب کہ رضا مظہری نے ''سہیل'' گیا بھارت کے جمیل مظہری نمبر

جلد دوئم میں یکم جنوری 1960ء لکھا ہے۔ میر کاظم علی جوان کا تاریخی نام ہے اس سے تاریخ ولادت 1321ھ نکلتی ہے اور اسکول سرٹیفکیٹ پر غلطی سے یکم جنوری 1905ء درج ہوگیا تھا جس کا ذکر "جمیل مظہری" از مالک رام "آج کل دہلی" اگست 84ء اجتماع ضدین از رضا مظہری "آج کل دہلی" "نقوش" لاہور شخصیات نمبر۔ "بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء" از مشتاق احمد "مسلم شعرائے بہار" از حکیم سید احمد اللہ ندوی۔ "سہیل" گیا جمیل مظہری نمبر فروری مارچ 82ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سید محمد رضا کاظمی "جمیل مظہری' مختصر حالات زندگی میں" تحریر کرتے ہیں خاندانی روایت کے مطابق ان کی پیدائش ستمبر 1904ء میں ہوئی لیکن اسکول کے بابو نے سہولت کی خاطر یکم جنوری 1905ء کر دیا تھا اور یہی تاریخ ولادت ان کی تعلیمی اسناد میں نقل ہوئی۔

چھوٹے بھائی جناب رضا مظہری "آج کل" دہلی اگست 82ء کے جمیل مظہری نمبر میں لکھتے ہیں "بھیا (جمیل مظہری) جب چار سال کے ہوئے تو دادی نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور اتنے لاڈ پیار سے پرورش کرنے لگیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے الگ کھانا پکاتیں اور سب سے چھپا کر کھلاتیں۔ نماز روزے طہارت وغیرہ کی بے حد پابند تھیں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحب زادوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر یہ لاڈلے پوتے ضد میں آ کر آنگن میں لوٹ لگاتے اور آ کر بستر پر دراز ہو جاتے۔

جب بھیا نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو ان کا مکتب ہوا۔ موضع عشری کے مولوی سید طالب حسین ان کے معلم مقرر ہوئے۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ بھیا کبھی جانے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انہیں زبردستی بھیجنا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جانے لگتے تو دادی کہتیں' کیسا لڑکا ہے کہہ دے سر میں درد ہے جا کے لیٹ رہ۔ اس صورت حال کو دیکھتیں تو اماں جز بز ہو جاتیں مگر ساس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو پٹنہ کا گریجویٹ خاندان کہلاتا تھا اس لیے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ وہ موقع کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح بہ عنوان شائستہ دادی کو پوتے سے الگ کر دیں۔ حسن اتفاق سے یہ موقع انہیں 1910ء میں مل گیا۔ والد مرحوم کو علمی و ادبی ذوق بہت تھا۔ زمیندار خاندان سے تھے۔ اس لیے ملازمت کی ضرورت نہ تھی مگر منجھلے ماموں خان بہادر سید احمد علی خان علیم نے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو رائیگاں جاتے دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ پٹنہ اینگلو عربک اسکول میں اردو فارسی اور عربی کے معلم مقرر ہو جائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اب والدہ کو مستقل پٹنہ رہنے کا موقع ملا تو بھیا کو دادی سے جدا کر کے پٹنہ لے آئیں۔ مولوی صاحب جو بھیا کے معلم تھے وہ بھی ساتھ آئے تاکہ تعلیم کا حرج نہ ہو۔ وہ انہیں گھر میں پڑھاتے پھر بھیا کو مدرسہ سلیمانیہ پچھم دروازہ پٹنہ سٹی کی ابتدائی جماعت میں داخل کر دیا گیا مگر وہ زیادہ دن وہاں پڑھ نہ سکے کیونکہ والد صاحب کا تبادلہ موتیہاری ضلع اسکول میں ہوگیا۔ اسی دوران میں یعنی 1912ء میں دادی کا انتقال ہوگیا پھر مولوی طالب حسین نے بھی پٹنہ چھوڑ دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام عشروی کو رکھوا گئے۔ مجبوراً 1914ء میں والدہ صاحبہ کو بھی موتیہاری منتقل ہونا پڑا۔ وہیں کے ضلع اسکول میں بھیا کو پانچویں جماعت میں داخلہ دلوا دیا گیا مگر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور 1915ء میں ان کی والدہ صاحبہ سب کو لے کر پٹنہ لوٹ آئیں۔ بہانہ تھا ان کے میکے کی ایک شادی کا۔ 1916ء میں والد صاحب کا پھر ایک بار تبادلہ ہوگیا۔ اس بار انہیں ضلع مظفر پور اسکول میں مقرر کیا گیا تھا۔ بھیا کو بھی اسی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسی سال انہوں نے سالانہ امتحان میں اردو کے پرچے میں گھوڑے پر مضمون لکھا' اس مضمون میں انہوں نے میر انیس کے ایک مرثیے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف میں تھے۔ کاپی چیک کرتے ہوئے مولانا شعیب عربک ٹیچر نے اس مضمون کو پڑھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ پورے شہر میں اس کاپی کو فخریہ دکھاتے پھرے کہ یہ ایک بارہ سال کے بچے نے لکھا ہے' میری پیش گوئی ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر یقیناً بہت بڑا ادیب بنے گا۔

1916ء کی ہی بات ہے۔ شہر کے ایک رئیس جناب امام الدین خان نے اپنی امام منزل میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اس لیے منعقد ہوا تھا کہ رام پور کے ایک تاجر عطر ثابت رامپوری ان دنوں مظفر پور آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فخریہ کہا تھا کہ شاعری تو یوپی والوں کا حصہ ہے' بہار والے شاعری کیا جانیں۔ حالانکہ عظیم آباد (پٹنہ) جو دلی اور لکھنو کے بعد اردو شاعری کا تیسرا گہوارہ تربیت تھا شاد عظیم آبادی' مبارک عظیم آبادی' مولانا فضل حق آزاد' نواب امداد امام اثر' میر باقر حسن کے متعلق داغ نے مثنوی "فریاد داغ" میں لکھا ہے۔

میر باقر کے گھر قیام ہوا

خوب دعوت کا اہتمام ہوا
مذکوربالا شعرا کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی، صفیر بلگرامی، شہید اعظم آبادی وغیرہ جیسے مشہور شاعر بھی بہار کے تھے)
امام الدین صاحب کو یہ بات گراں گزری اور انہوں نے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ بہار کے اس چھوٹے سے شہر میں اردو کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی غزل طرح میں کہہ کر بھیا کو دے دی کہ وہ مشاعرہ میں پڑھ آئیں۔ اس غزل کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔
رو گئے گیے وہ زار زار میرا مزار دیکھ کر
بھیا نے اس غزل کو ایک خاص انداز سے لہک لہک کر پڑھی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ اس کے بعد تو بھیا کو ہر مشاعرے میں بلایا جانے لگا۔
مظفر پور میں بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ 1920ء تک چلتا رہا پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ چلے گئے۔"
اس کے بعد کا ذکر رضا مظہری "سہیل" گیا جمیل مظہری نمبر 1960ء میں اس طرح کرتے ہیں "1920ء میں بھیا نے کلکتہ کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے ہمارے ماموں زاد بھائی مولوی سید زاہد علی خان، اس زمانے میں مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں مدرس تھے۔ والد مرحوم نے بھیا کو انہیں کی نگرانی میں مدرستہ عالیہ میں داخل کردیا۔ 1921ء میں بھیا درجہ نہم سے درجہ دہم میں آئے۔ ان دنوں مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر خان بہادر مولوی محمد یوسف تھے۔ وہ "سینٹ اپ" کرنے کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ بھیا ہمیشہ سے ریاضی میں کمزور تھے۔ انہوں نے رعایت نہ ملنے کے خوف سے ٹیسٹ سے دو تین مہینے پہلے ہائی اسکول میں اپنا نام لکھوالیا۔ اسی اسکول سے انہوں نے 1922ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ (جبکہ وہ کلام حیدری کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میں نے مدرسہ عالیہ سے میٹرک پاس کیا؟)
مدرسہ عالیہ کے دوران تعلیم میں بھیا نے گویا شاعری شروع کی۔ ان کے ہم درس ایک صاحب اطہر قادری تھے جو جثہ وقد میں تو منحنی تھے مگر فتنہ انگیزی میں بلا کا سلیقہ رکھتے تھے چنانچہ بھیا نے ان کی ہجو لکھی۔
چلوائے گا کلاس میں تلوار قادری
مگر باضابطہ شعر گوئی انہوں نے اس کے دو تین سال بعد شروع کی، ہاں مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے ضرور شریک ہوتے۔"
1922ء میں دفتر عصر جدید سے ایک رسالہ "نشر" شائع ہوا اسی میں علامہ جمیل مظہری کی پہلی نظم "بادل کی بیٹی" چھپی۔ اسی رسالہ میں انہوں نے گلی ورس ٹریول کا ترجمہ "خوردک آباد کی سیر" کے عنوان سے کیا۔
مشہور ادیب مالک رام "آج کل" دہلی میں لکھتے ہیں۔
"اس کے بعد انہوں نے 1925ء میں سان زیویرس کالج کلکتہ سے انٹر اور 1928ء میں اسلامیہ کالج اور بنگ باشی کالج کلکتہ سے بی اے کیا۔ اسی دوران میں ان کی زندگی قوس قزح سے مزین ہوگئی۔ اب تک ان کی شاعری صرف اور صرف تخیل کے سہارے رواں دواں تھی مگر اب اس میں رنگ بھر گئے تھے جس نے ان کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کرنا شروع کردیے۔
بقول ماہ منیر "میرے بھیا (جمیل مظہری) بھی کبھی جوان تھے ان کی شاعری بھی جوان تھی، ان کے دل کی صدائیں بھی کبھی سہانے گیت بنا کرتی تھیں۔ ان کی تمنائیں بچپن کے گھروندوں میں خوب خوب کھیل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسو کسی کے آنچل میں موتی بن رہے تھے۔ دھانی سائے اور گلابی دھوپ میں انہوں نے بھی پنگھٹ کا نظارہ کیا۔ پازیب کی جھنکار سے انہوں نے ہوا کو جھومتے سنا، نشیلی دکھ بھری آنکھوں میں نیند کو کھیلتے بھی دیکھا۔ میرے بھیا کی زندگی شاید اسی جوانی کا سوگ ہے۔"
لیکن بدقسمتی سے یہ عشق پروان نہ چڑھ سکا اور 1938ء میں اس پر خط تنسیخ کھنچ گیا۔
اسی دوران میں جمیل مظہری کی مشہور نظم "ڈرو خدا سے ڈرو" سامنے آئی اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ شائقین ادب کے علاوہ عام لوگوں میں بھی اس نے جگہ بنالی اور فلمی گانوں کی کتابوں، ایسی دو ورقی کتاب کلکتہ کے ایک صاحب نے چھاپ کر ہاتھوں ہاتھ بیچی۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

سنو جمیل سنو تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اسے جنوں نہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
اِدھر اُدھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ! ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دیوانہ بناؤ' ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکستہ حالئ عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہو بتدریج اس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ' ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

54 مصرعوں کی اس نظم کے بارے میں جمیل مظہری خود کہتے ہیں ''لوگوں نے اسے میری آپ بیتی سمجھ لیا جو میرے خیال سے میری کامیابی کی دلیل ہے کیونکہ میرے خیال میں شاعری نام ہے اس شعور کا جو دوسروں کی بیتی ہوئی کو آپ بیتی بنا کر اس طرح پیش کرے کہ ہر سننے والا یہ سمجھے کہ کہنے والا اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ اس نظم کے پیچھے جو واقعہ ہے وہ میرا نہیں ہے' میرے ایک عزیز دوست کا ہے جسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی تھی مگر اپنے دل میں ایک امنگوں بھرے دل کے ساتھ ایک شدید احساس فرض بھی رکھتی تھی۔ عشق و فرض کہ یہ ذہنی کش مکش اس کے ان خطوط میں نمایاں ہوتی رہتی جو اپنے چاہنے والے کو لکھا کرتی۔''

جمیل مظہری کی اس بات کو اکثر نقادوں نے غلط ٹھہرایا ہے اور اس نظم کو انہی کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ جمیل مظہری نے اس نظم کا جواب بھی لکھا تھا جس میں محبوب جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کو سمجھاتا ہے۔

جوانی کی ایک چھاؤں تھی گزر گئی نکل گئی
ہمارا انتظار کر کے دوپہر بھی ڈھل گئی

لیکن ''عشق ناتمام'' نامی نظم کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جو پہلی نظم کو ملی۔ جمیل مظہری نے 1931ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں ''پہلے میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر بنگو باشی کالج میں۔ وہیں سے میں نے بی اے کیا۔ فارسی اور تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔''

ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ذہن ادبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انہیں کسی ایسی نوکری کی تلاش تھی جو روح کو بھی غذا فراہم کر سکے۔ کچھ دوستوں نے مدد دی اور کچھ اپنا شوق' وہ روزنامہ الہند

علامہ وحشت کلکتوی لکھتے ہیں

''جمیل مظہری کے کلام کی دلکشی کا راز ان کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ ان کا کہا ہوا پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں جمیل مظہری کی تخلیق ہوں۔ ان کے خیالات ایک خاص انداز کے لفظ طلب کرتے ہیں جو ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ خیالات کی ندرت اور الفاظ کی مناسبت اعجاز کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔'' پروفیسر مجنوں گورکھ پوری رقم طراز ہیں کہ وہ شاعر تھا اور شاعر کے عام تصور سے بلند تھا' وہ مفکر تھا اور مفکر کے عام تصور سے بلند تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اتنا وسیع تاریخی و ادبی علم رکھتے ہوں۔ گویا جمیل مظہری کی شخصیت شعر اور علمی فضیلت دونوں کا خوشگوار جوہر تھی۔''

علامہ نیاز فتح پوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''جمیل مظہری ملک کے ان مخصوص شعراء میں ہیں جو اردو شاعری میں اس وقت استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اظہار خیال کرتے ہیں ''مقبولیت حاصل کرنے والے شعراء میں کسی کی پرواز جمیل مظہری تک نہیں۔ فکر و فن کے اعتبار سے ان کا کوئی ہم عصر ان کے حریف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔'' جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ''لکھنو سے خط آیا تو وہاں کے گلی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے لیکن جمیل مظہری کے انتقال کی خبر پڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہو گیا۔ ہائے جمیل مظہری! کیا کہوں' کیا لکھوں کیا کروں؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آنسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی کوئی باقی ہو۔''

کے مدیر بن گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کے لیے وہ علامہ وحشت کلکتوی کے پاس جا چکے تھے۔ طوطی بنگال علامہ وحشت نے دو تین غزلوں پر اصلاح بھی دی مگر بعد میں انہوں نے کہہ دیا۔

''میاں جمیل! تمہاری زبان دانی مستند ہے، عروض وقواعد سے بھی واقف ہو تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔''

علامہ وحشت کا حکم تھا اس لیے وہ اپنے اشعار انہیں برائے اصلاح نہیں دیتے لیکن تہ دل سے انہیں اپنا استاد مانتے۔ صرف گنتی کی چند غزلیں اصلاح کروائی تھیں پھر بھی دل میں عقیدت رکھتے تھے۔

جمیل مظہری اس دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ایم اے کا امتحان دے کر کلکتہ کی صحافتی زندگی میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ کلکتہ کی ادبی اور علمی مجلسوں تک جا پہنچا۔ میری عمر کا وہی حصہ جس کی یاد آج بھی میرے دل کو ایک روشن کنول بنائے ہوئے ہے۔ ماضی کی تاریکی میں مجھے پہلا روشن چہرہ جو نظر آتا ہے وہ اپنے شفیق ترین استاد مولانا رضا علی وحشت کا سنجیدہ اور گھمبیر چہرہ ہے لیکن عام مولویوں کے چہرے کی طرح خشک اور سپاٹ نہیں بلکہ متبسم، محبت انگیز اور عقیدت آموز ان کے نام سے اس وقت سے واقف تھا جبکہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں ''تمدن'' اور ''مخزن'' کے رسالوں میں ان کی غزلیں پڑھا کرتا تھا بغیر سمجھے۔

چار پانچ سال بعد جب کلکتہ آیا تو میں نے انہیں ''مسلم انسٹی ٹیوٹ'' کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھا۔ پھر ویلسلی اسکوائر کی سڑکوں پر آتے جاتے دیکھتا رہا اور ادب سے سلام کرتا اور وہ شفقت سے جواب دیتے رہے لیکن گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ ہمت اس وقت ہوئی جب وہ کلکتہ کے نئے اسلامیہ کالج میں بحیثیت پروفیسر اور میں بحیثیت طالب علم کے داخل ہوا۔ اسی دوران میں ان کے شاگردان خاص ابوالحسن بسمل اور قمر صدیقی سے میری ملاقات بڑھی اور انہیں کے توسط سے میں کبھی کبھی اتوار کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہونے لگا۔ ہر اتوار کو ان کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی یہ نشست ادب اور فن کا ایسا مدرسہ ہوتی تھی جو دس بجے دن سے دو بجے دن تک کھلا رہتا۔ ارباب ذوق اور یاران ادب آتے رہتے اور بہترین زعفرانی چائے، کیک اور سموسے سے ان کی ضیافت ہوتی رہتی۔

مولانا رحمتہ اللہ علیہ اپنی ذات سے بقول نواب امداد امام اثر میخانہ غالب کے تنہا ساقی تھے میں اس میخانے کا جرعہ نوش بن کر کاظم سے جمیل مظہری بنا۔ استاد مرحوم بحیثیت شاعر کے ہندوستان کے ہر عظیم شاعر کے مقبول و مخدوم ہم عصر تھے۔ ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کے علاوہ آغا حشر کاشمیری اور نواب خیال نے میرے ذہن اور اس کی تعمیر میں مساوی حصہ لیا تھا۔ میں نے ہی ان دونوں (آخر الذکر) بزرگوں کی ملاقات کرائی تھی لیکن اس ملاقات کا سلسلہ بڑی تلخ کلامی پر ختم ہوا اور آغا حشر کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ کرانے کی جو تجویز تھی وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس کی داستان یوں ہے کہ داستان اردو (تاریخ ادب اردو) کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد نواب خیال نے ایک مقالہ فردوسی کی ڈرامائی رزمیہ نگاری پر لکھا اور تجویز یہ ہوئی کہ ایک بڑے جلسے میں وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔ چنانچہ جلسہ ہوا۔ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ نواب امام نے اپنے رسوخ سے کلکتہ میوزیم کا ایک بڑا ہال مخصوص کرا دیا۔ صدارت کے لیے نواب صاحب نے آغا حشر کو موزوں ترین سمجھا۔ حالانکہ میں نے دبی زبان سے اس کی مخالفت کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ آغا صاحب فردوسی (فارسی کا شاعر) کے قائل ہی نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ فردوسی شاعر نہیں بھانڈ تھا جو لوگ میر انیس کو فردوسی ہند کہتے ہیں وہ انیس کی توہین کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جلسے میں نواب صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ سامعین نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجائیں اور آغا حشر کرسی صدارت پر بیٹھے پیچ و تاب کھاتے رہے، صدارتی تقریر کے لیے اٹھے، آندھی کی طرح چنگھاڑے اور بادل کی طرح گرجنے، برسنے لگے۔ خطابت کے ساتھ ایکٹنگ کے کرشمے بھی دکھائے، فردوسی کو جی کھول کر کوسا، محمود غزنوی کی شرافت اور فردوسی کی ذلالت کی نئی نئی کہانیاں سنائیں اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ نواب صاحب کے مقالے کا ادبی حیثیت سے تعارف بھی نہیں کرایا جو بہ حیثیت صدر ان کا فرض منصبی تھا۔ ان کا غضب ناک چہرہ اور نواب خیال کی متحمل منفعل صورت وہ تصویریں تھیں جن کی عکاسی کی قوت میری زبان میں ہے اور نہ میرے قلم میں۔ بہر حال جلسہ بڑی ناگواری کے ساتھ ختم ہوا۔ نواب زادہ عبدالعلی اور علامہ وحشت بانیان جلسہ میں تھے، منہ لٹکائے ہوئے ہال سے باہر نکلے۔ آغا حشر، رزاق ملیح آبادی کے کاندھے پر ہاتھ دھرے کچھ مسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ تیسرے دن نواب خیال کا مراسلہ روزنامہ ''ہند'' میں شائع ہوا جس میں شرکائے جلسہ کی

شرکت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آغا حشر کی گرم گرفتاری کے سلسلے میں چبھتا ہوا جملہ لکھا تھا کہ تماشا اچھا تھا اور آپ لوگوں کی شام دلچسپی سے گزر گئی۔ آغا حشر نے جو اس مراسلے کو پڑھا تو آدمی سے سلگتا ہوا تنور بن گئے۔ آغا حشر جائیں تو جائیں کہاں۔ سیدھے عصر جدید کے دفتر پہنچے۔ شومئی تقدیر سے جناب خیال پہلے ہی سے میری میز کے سامنے ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ آغا صاحب انہیں دیکھتے ہی مرکھنے بٹیر کی طرح چونچیں مارنے لگے۔ لیکن نواب صاحب حلم مجسم بنے بیٹھے رہے۔ ادھر شعلگی ادھر خ بستگی ادھر خاموش اضطراب بڑی مشکل سے مولانا شائق احمد عثمانی نے آغا حشر کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انہیں رخصت کیا۔ حالات بدترین شکل اختیار کر چکے تھے کہ نواب زادہ عبدالعلی نے صلح کرادی۔“

جمیل مظہری نے ایم اے کرتے ہی صحافتی زندگی کی شروعات کردی تھیں۔ ملیح آبادی کے روزنامہ ”الہند“ کی ادارت سنبھال لی۔ نیا جوش تھا' ولولہ تھا' جوانی تھی خون میں گرمی تھی۔ حکومت برطانیہ کو خوب خوب لتاڑنا شروع کردیا۔ غلام ملک کا ایک معمولی اخبار اس حکومت پر تنقید کرے جس کے راج میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات حکومت برطانیہ کو بہت بری لگی اور اس بے باک اخبار کو صرف اداریوں کی وجہ سے ایک ماہ کے اندر بند کردیا گیا۔ اخبار بچانے کے لیے ملیح آبادی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی الہند سے نکلے تو فری لانسر کی حیثیت سے مختلف پرچوں میں لکھنے لگے۔ قلم میں تیکھا پن تھا' غضب کی کاٹ تھی۔ ان کے مضامین کو شائق احمد عثمانی بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی اسی خاصیت پر شائق احمد عثمانی نے انہیں جھپٹ لیا تاکہ ان کے روزنامے ”عصر جدید“ میں لکھیں حالانکہ شائق احمد عثمانی اور جمیل مظہری کے درمیان نظریاتی اختلافات کی گہری کھائی تھی پھر بھی دونوں میں خوب نبھنے لگی۔ اس اختلافات کی بنا پر جمیل مظہری نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں فکاہی حصہ لکھوں گا اور آپ سیاسی۔ چنانچہ وہ ”کوچہ گرد“ کے قلمی نام سے مہلات نامی کالم لکھنے لگے۔ اسی دوران میں ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا مگر وہ چل نہ سکا لیکن ان کا کالم بدستور چلتا رہا۔

مختلف اوقات میں زمانہ' ہمدرد' شفاعت اللہ خان نے جاری کیا ان میں بھی وہ بہ حیثیت جوائنٹ ایڈیٹر کے کام کرتے رہے جب صدیق انصاری نے ”پنچ“ شروع کیا تو انہوں نے اس اخبار کے ذریعے اپنا ایک الگ ”روپ“ قارئین کے سامنے پیش کیا۔ مشہور طنز نگار رضا نقوی واہی اس دور کا نقشہ

غزل

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

بس ایک احساس نارسائی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی' خرد پہ عالم غنودگی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں' یہی تو معنی ہے اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو' مکان جلتا ہو جب کسی کا

جمیل حیرت میں ہے زمانہ مرے تغزل کی مفلسی کا
نہ جذبہ اجتبائے رضوی نہ کیف پرویز شاہدی کا

☆☆☆

کچھ تو گرد راہ گرد کارواں بنتے رہے
کچھ غبار ایسے بھی تھے جو آسماں بنتے رہے

ہم نے یہ عالم بھی دیکھا اے جنون خود گری
کہ چمن اجڑا کیا اور آشیاں بنتے رہے

تارے سورج ہوگئے لمحات صدیاں بن گئے
اور خلا میں آسماں پر آسماں بنتے رہے

کارواں وقت آگے کی طرف بڑھتا رہا
اور ہم انسان گرد کارواں بنتے رہے

ہم نے اس دنیا میں آکر کیا بنایا' کیا بنے
ہاں مگر کچھ عالم وہم وگماں بنتے رہے

ایک وہ جو بے تپش کرتے رہے اظہار نور
ایک ہم جو سوز رکھ کر بے زباں بنتے رہے

ہم نہ سمجھے کچھ' چمن کا راز اچھالا کی نسیم
پھول کھل کھل کر مشیت کی زباں بنتے رہے

مظہری جلتا رہا یوں ہی میرے دل کا الاؤ
کوئی پاس آیا نہیں شعلے دھواں بنتے رہے

(جمیل مظہری)

کھینچتے ہیں۔ ”یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کی اردو صحافت پر زیادہ تر فلمی شخصیتوں کی چھاپ رہتی تھی۔ ہفتہ وار اخبارات تو خصوصی طور پر فلمی شخصیتوں ہی کے ذکرو افکار سے معمور رہتے تھے بعض فلمی صحافیوں نے صحافت کو ابتذال کی اس حد تک پہنچادیا تھا کہ فن کی قدردانی کے سلسلے میں فلمی ایکٹریسوں کو خانم اور بیگم بناڈالا۔ کسی نے کسی کو سیدانی ثابت کرنا چاہا تو کسی نے کسی کو جوشِ محبت میں اپنی بہن لکھ ڈالا۔ عام طور پر فلمی صحافی ایکٹریسوں کے مستقل دربار دار ہوگئے۔ جمیل مظہری نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اشارے پر اس طرف توجہ کی اوران کی طبیعت میں خود جو انقباض تھا وہ سب سے پہلے ایک قطعہ کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہی قطعہ جمیل مظہری کی ظرافت نگاری یا ہجو نگاری کی ابتدا ہے‘ فرماتے ہیں۔

کل ملنے آئے مجھ سے مرے ایک عزیز دوست
مشروب روف و بہ ایمان صابری
زیرِ بغل خطوط و تصاویر مہ رخاں
وردِ زباں حدیث سبیا و مادھری

قطعہ کے بعد غزل کی ابتدا اوراس ہزل کے چند شعر

لیکن خطا معاف مجھے پوچھنا ہے یہ
کس روگ کی دوا ہے یہ فلمی ایڈیٹری
آئینہ سامنے ہے ادھر دیکھیے ذرا
سجدوں کا داغ اور جبین ایڈیٹری

دس شعر کے سوال کے بعد دس شعر کا ہی جواب

کہنے لگے بگڑ کے کہ حاسد ہیں آپ لوگ
پوچھا ہے صاف صاف تو سنیے کھری کھری
عزت ہماری دیکھیے بازارِ حسن میں
مس مہ جبیں بڑھاتی ہیں پانوں کی طشتری

اسی دور میں جمیل مظہری نے مسدس ”شہر آشوب“ لکھا تھا۔ یہ مسدس‘ مسدس حالی کی پیروڈی تھی۔ اس دور میں صحافت کس درجے گرچکی تھی اس کا انہوں نے پورا نقشہ کھینچا تھا۔ مشہور ادیب وصحافی خواجہ حسن نظامی نے ایکٹریسوں کے فلمی چہرے لکھے تھے۔

وہ دلی کے مشہور پیر نظامی
تصوف میں رشکِ سنائی و جامی
ہے خواجہ حسن جن کا اسمِ گرامی
قلم ان کا دے ایکٹرسوں کو سلامی
لکھے فلمی چہرے ہوا اپنی کھودی
صحافت کی خواجہ نے لٹیا ڈبودی

فلمی صحافیوں کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑنے کی ایک وجہ اور تھی۔ 1933ء میں آغا حشر کاشمیری اور دانش کے درمیان مقدمہ بازی چھڑ گئی تھی۔ اس مقدمہ بازی کے نتیجے میں ادبی رسالوں اور فلمی رسالوں کے درمیان بھی ٹھن گئی۔ جمیل مظہری نے ادبی رسالوں کے ترجمان بن کر ہجو کے گولے داغنے شروع کردیے تھے۔

کلکتہ کئی معنوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے اس دور میں بھی سب سے بڑا شہر تھا۔ انگریزوں نے 1875ء کے بعد سے ہی دہلی کو پایہ تخت بنالیا تھا۔ دارالحکومت منتقل ہوجانے کی وجہ سے اس شہر کو اجڑ جانا چاہیے تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وجہ سے اب تک یہ شہر اہمیت کا حامل بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں اور کرسچوں کی مجموعی آبادی کے برابر مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ”چوبیس پرگنہ“ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے شہر میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ دیہاتیوں کی زبان بنگلا تھی اور شہریوں کی اردو اسی وجہ سے 1935ء میں خلافت کمیٹی نے مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کے ساتھ اردو لٹریری کانفرنس کی بھی داغ بیل ڈالی اور حسین شہید سہروردی وملا جان محمد نے اصرار کرکے مجلس استقبالیہ کی صدارت جمیل مظہری کو سونپ دی۔

اس کانفرنس میں انہوں نے ایک ایسا خطبہ پڑھا جو خاصا انقلابی تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا کہ ادب برائے ادب کے نظریہ سے انحراف ضروری ہے۔ اردو ادب اگر آزادی کی تحریک کے کام نہیں آسکتی تو اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ اپنا فرض پورا نہیں کرسکتا۔ اسے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا مقدس تاریخی فرض انجام دینا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اس خطبے پر سخت تنقید کی لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہر سطح پر کوشش ہو۔ ادب تو ہمارا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔

جس وقت جمیل مظہری اسٹیج سے اترے مولانا شوکت علی نے مجمع کے درمیان سے انہیں کھینچا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ انہیں بار بار چوم رہے تھے اور کہتے جارہے تھے۔ ”مظہری‘ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی‘ خدا تمہارے قلم اور زبان کو مزید تقویت دے۔“

اس کانفرنس نے انہیں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ

قریب کردیا اور بعد میں یہ قربت اتنی زیادہ مضبوط ہوگئی کہ انہوں نے بہار کے محکمہ نشرواشاعت میں بطور پبلسٹی افسر تقرر کے لیے پروفیسر عبدالباری کو ہدایت کردی۔ پٹنہ میں عبدالباری کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے فوراً جمیل مظہری کو پٹنہ بلوالیا۔ مولانا ابوالکلام بھی پٹنہ آگئے اور انہوں نے بھی سفارش کردی۔ اس طرح 2 دسمبر 1937ء سے وہ بطور پبلسٹی افسر مقرر ہوگئے لیکن 1939ء میں انگریز حکومت سے اختلاف کے باعث دیگر لوگوں کے ساتھ انہوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کردیا لیکن راجندر پرشاد سنگھ جو بہار کے تھے اور سبھاش چندر بوس کی مستعفی ہوجانے کی وجہ سے بہار صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بن چکے تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دینے سے منع کردیا کہ ابھی تمہارے ایسے نوجوان کی ملک کو ضرورت ہے تم یہ نہ سمجھو کہ حکومت برطانیہ کے لیے کام کررہے ہو بلکہ یہ سمجھ کر نوکری کرو کہ یہ ایک اہم محکمہ ہے جس سے آزادی کی تحریک کو سبوتاژ بھی کیا جاسکتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی غیر ذمے دار شخص آگیا تو تحریک کے لیے مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ جمیل مظہری نے ان کی بات مان لی۔

وقت گزرتا رہا اور پھر ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا سب سے اہم سال آگیا۔ دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ اتحادیوں کو ہر محاذ پر ہزیمت کا سامنا تھا۔ جاپان نے پرل ہاربر پر امریکی اور انگریزی بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور جرمنی' اٹلی کے محور کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کرکے اتحادیوں کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے سنگاپور' ملایا' برما کو برق رفتاری سے روندڈالا تھا اور اب کلکتہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مسلم لیگ کی کامیابی بہت نزدیک آچکی تھی کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے 8 اگست 1942ء کو اپنے اجلاس میں وہ مشہور قرارداد منظور کی جو اپنے مرکزی خیال کے باعث Quit India یا بھارت چھوڑو قرارداد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے ورکروں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ان حالات میں جمیل مظہری کے لیے ملازمت میں رہنا ناممکن ہوگیا اور انہوں نے استعفیٰ داغ دیا۔ اس استعفیٰ پر انہوں نے اپنے خون میں قلم ڈبو کر دستخط کیا تھا۔ یہ استعفیٰ کئی معنوں میں انوکھا تھا۔ اس میں نوکری چھوڑنے کی وجہ جو بتائی گئی تھی اس میں فنی اصطلاحات کی جگہ سخت و درشت الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ایک ماہ تک وہ قید رہے' رہائی ملتے ہی انہوں نے عظیم آباد (پٹنہ) سے باہر نکلنے کی ٹھان لی۔ کلکتہ کے دروازے پر جاپانی دستک دے رہے تھے۔ وہاں ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ کہاں جائیں' وہ بھی اسی الجھن میں تھے کہ بمبئی سے جوش ملیح آبادی کا بلاوا آگیا۔ انہوں نے جمیل مظہری کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کی خود اعتمادی مجروح نہیں ہوگی اور اس یقین دہانی پر وہ بمبئی روانہ ہوگئے۔ جوش پہلے انہیں فضلی برادرز کے پاس لے گئے لیکن وہاں کلکتے سے آرزو لکھنوی آکر ذمے داری سنبھال چکے تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں محبوب اور کاردار صاحب کے پاس لے گئے۔ محبوب صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ انہوں نے جمیل مظہری سے اپنی ایک فلم کے لیے معاہدہ بھی کرلیا لیکن ایک سین پر دونوں کا اختلاف ہوگیا اور وہ جوش کے ساتھ پونا چلے گئے۔ بمبئی آکر جمیل مظہری مشہور نقاد محمد رضا کاظمی کے والد موسیٰ رضا کاظمی کے گھر گوبائی ہاؤس بائی کلہ میں ٹھہرے تھے۔ پونا میں ان کا قیام جوش کے ساتھ ظاہر پیلس میں رہا۔ انہی دنوں جمیل مظہری کی ملاقات یونیٹی فلمز کے رنجیت شرما کے ساتھ ہوگئی اور وہ انہیں اپنے ساتھ واپس کلکتہ لے آئے۔ یہیں انہوں نے ''کروشیتر'' کے گانے لکھے جسے سہگل نے گایا اور کافی مقبول ہوئے۔ انہوں نے ''گھومتی دنیا'' کی کہانی لکھی مگر فلم مکمل نہ ہوسکی۔ بقول جمیل مظہری ''خاندان'' کا بوجھ تھا۔ بے کار رہ نہیں سکتا تھا۔ کلکتہ میں بھی اس لیے رہا اور بمبئی میں فکر معاش کھینچ لے گئی اور میں 43ء سے 47ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ فلم آرزو کے مکالمے اور کروشیتر کے گانے لکھے۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما لکھا مگر فلم بننے کے بعد کارکنان کا جھگڑا ہوگیا۔ مقدمہ تک بات پہنچی اور پھر پتا نہیں اس فلم کا کیا بنا۔ مجموعی طور پر فلمی دنیا مجھے پسند نہیں آئی اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرسکتی ہے مگر طمانیت نہیں دے سکتی۔ ظاہرداری' تصنع کے علاوہ مجھے پورا ماحول بڑا عامیانہ معلوم پڑا۔''

فلمی دنیا سے بےزاری کا اظہار وہ اپنی مشہور نظم ''بھاگ شاعر بھاگ'' میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے فلمی دنیا سے بھاگ آئے۔ اسی دور کا ذکر ہے' علامہ جمیل مظہری نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں اختلاج قلب کا عارضہ تھا۔ اسی اختلاج قلب کی وجہ سے ایم اے کے امتحان میں ایک پرچہ چھوڑ آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے فرسٹ کے سیکنڈ ڈویژن ملا حالانکہ جس دوست کو انہوں نے فارسی ادب پڑھایا تھا' وہ فرسٹ

ڈویژن میں پاس ہوا۔ اختلاج کی اس شدت کو بعض اعزا نے جنون سمجھا اور اسی غلط فہمی نے 1928ء میں بچپن سے منسوب پھوپی زاد کا رشتہ منقطع کروادیا۔ اسی سال چھوٹی بہن کی شادی ہوئی لیکن وہ کم نصیب صرف ساڑھے تین سال سہاگن رہی۔
ان دو حادثوں کا انہوں نے اتنا اثر لیا کہ شادی نہ کرنے کا عزم کرلیا۔ بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ 1938ء میں انہیں شادی کا خیال آگیا اور محمود طرزی سے استدعا کی کہ ان کے لیے دلھن دیکھی جائے۔ عمر پینتیس چھتیس ہونا چاہیے۔ محمود طرزی نے تلاش شروع کردی۔ کافی تلاش کے بعد انہیں ایسی ہی ایک عورت مل گئی۔ انہوں نے علامہ سے ذکر کیا۔ علامہ نے اب ایک نئی بات کردی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس عورت کو دیکھیں گے۔ 1945ء میں ایسی بات ناممکن تھی پھر بھی محمود طرزی نے اپنے طور پر کوشش کی اور اس عورت کو دکھادیا۔ اسے دیکھنے کے بعد علامہ نے مسترد کردیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ تلاش جاری رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ جلد شادی کرلوں ورنہ میری شاعرانہ صلاحتیں ماند پڑجائیں گی۔ محمود طرزی نے جھلا کر مگر مؤدب لہجے میں کہا کہ اب کیا میرا یہی کام رہ گیا ہے کہ ہر گھر میں گھس کر لڑکیاں دیکھوں اور پھر آپ کو دکھاؤں۔ یہ ناممکن ہے اس کا انجام یہ ہوگا کہ محلے والے میری اور آپ کی ایسی مرمت کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔
بات معقول تھی، علامہ خاموش ہوگئے۔ اور پھر اپنی تلاش کا رخ مٹیا برج کی جانب موڑ دیا اور کامیاب بھی ہوگئے۔ محمود طرزی نے جس خاتون کو دکھایا تھا وہ خود کو یوں مسترد کیے جانے کو اپنی ہتک سمجھنے لگیں مجبوراً ان سے محمود طرزی کو شادی کرنا پڑی۔
بمبئی سے 1947ء میں لوٹنے کے بعد ان کا تقرر بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر پبلٹی اینڈ فلم سیکشن گورنمنٹ آف بہار ہوگیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر صرف تین سال رہے اور پھر جنوری 1950ء میں پٹنہ کالج میں پروفیسر کی آسامی پر چلے گئے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے مہ جبیں لکھتی ہیں۔
''پروفیسروں میں عام طور پر علمی رکھ رکھاؤ، ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہمہ وقت لیے دیے رہنے کا انداز اپنایا جاتا ہے۔ علامہ جمیل مظہری میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ علم کے ایک بحر ذخائر تھے مگر ہمہ دانی کی شان اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ناممکن ہے،

کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ منہ پھاڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر چند منٹوں تک ادھر ادھر خلا میں دیکھتے مگر آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں، بعد ازاں ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز سے اپنی کرسی پر دراز ہوجاتے پھر جیب سے سگریٹ کا ڈبا نکال کر مرغولہ بناتے، اس دوران میں آنکھیں بند رہتیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہتا جب تک کوئی ان کے ہاتھوں میں رجسٹر دے کر چونکا نہ دیتا۔ اگر کسی روز لڑکے پڑھنے کے موڈ میں نہ ہوتے تو ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے ایسی حالت میں جب یکا یک علامہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے تو ایک خاص انداز سے کہتے، ہاں بھئی حاضری بنواؤ اور جب ان کو معلوم ہوتا کہ وقت ختم ہورہا ہے تو پیشانی پر شکن ڈال کر کہتے آپ لوگوں نے مجھے قبل ہی کیوں نہیں کہا اور پھر جلدی جلدی پڑھانا شروع کردیتے اور اس طرح ڈوب کر پڑھاتے کہ وقت ختم ہونے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ جب ہم میں سے کوئی ڈرتے ڈرتے کہتا کہ سر وقت ختم ہوگیا تو اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتے کہ آپ لوگوں نے قبل ہی کیوں نہیں کہا۔ علامہ چچا شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے، ان کی تعریف کرتے، ہمت افزائی کرتے، ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے۔ نہایت بے تکلفی سے اپنے شاگردوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر باتیں کرتے اور جب غصہ آتا تو مدرسہ کے مولوی صاحب کی طرح گوشمالی کرتے۔ کلاس میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوتا تو یکا یک ایسا محسوس ہونے لگتا گویا ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ علامہ چچا ہم میں ہر ایک سے فرداً فرداً باتیں کررہے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کررہے ہوں، الفاظ و معنی کا ایک سمندر سا امنڈ پڑتا۔ غور و فکر کی نئی شاہراہیں ابھرتی نظر آتیں۔ نیا شعور انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہوا نظر آنے لگتا۔ خرد و آگہی کے نقاروں پر چوٹ پڑتی سنائی دینے لگتی۔ لیکچر کے دوران میں گرج دار آواز، شاندار الفاظ، انوکھا انداز بیان، شاعرانہ تشبیہیں اور فنکارانہ استعارے استعمال کرتے۔ وہ اقوال اور اشعار کا حوالہ اس طرح دیا کرتے جیسے کسی مشہور اخبار میں شائع شدہ مضامین کو پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی ہوتی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ بیٹی، میں چاہتا ہوں کہ تیرے اندر علم کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ ڈگریاں تو سبھی حاصل کرلیتے ہیں لیکن طالب علم بہت کم

ہوتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں مجھ سے کہا تھا "بیٹی! میں علم کی دولت کو ودیعت کر رہا ہوں، تم اسے اپنے سینے میں دفن مت کر دینا بلکہ اس دولت کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنا، لیکچروں ہی میں نہیں بلکہ ٹیکسٹ بک پڑھاتے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا کہ طلبہ اور استاد ایک فطری سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے ہیں کوئی ایک قدم آگے ہی کوئی کچھ پیچھے۔ اس وقت علامہ ایک ایسے گائیڈ کی طرح نظر آتے جو خود بھی ہم سفر کی ٹولی میں گھل مل گیا ہو اور اپنے بیان سے لذت لے رہا ہو۔ یہ احساس اس وقت اور شدید ہو جاتا جب علامہ، غالب پر لیکچر دیتے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ وہ راہ کسی سمن پوش کناریوں اور جلوہ بار گلستانوں کو متعارف کراتے ہوئے بڑھے جا رہے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے اور گل گشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پڑھائے اشعار جمالیاتی تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ باریک نفسیاتی و جذباتی مسائل بھی حل کرتے جاتے۔ خواہ اس میں کتنا بھی وقت صرف ہو۔ اکثر محض ایک شعر کی تشریح کے لیے پورا ایک گھنٹا صرف کر دیتے۔"

1960ء میں وہ پٹنہ کالج سے سبکدوش ہو گئے تو انہیں پٹنہ یونیورسٹی نے شعبہ اردو کے لیے تقرر کر لیا۔ 1965ء تک علامہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے پھر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ اسکالر مقرر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مقالے کے لیے "اردو مرثیے کا تاریخی پس منظر" کا موضوع انتخاب کیا تھا لیکن برا ہو چور کا۔ وہ پٹنہ سے اپنے گھر بھیکن پور مظفر پور جا رہے تھے کہ دورانِ سفر ان کا بیگ جس میں مواد تھا کسی نے اڑا لیا۔

عام طور پر لوگ جمیل مظہری کو ایک بلند پایہ شاعر، ایک شفیق استاد اور ایک خلیق انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں، کچھ ایسے لوگ جو مظہری کی طرح خود بھی ادب و شاعری کی بزم میں شمع کی مانند جلتے ہیں اور اب اس بزم کے غم فراق میں گم ہیں جمیل مظہری کے ظریفانہ رنگ سخن سے بھی کسی حد تک واقف ہیں لیکن اب تک جمیل مظہری کی تنقیدی صلاحیتوں کے احساس پر بہت کم لکھا گیا۔ ان کی پچاس سالہ ادبی زندگی کے تقریباً ہر دور میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی ضمنی طور پر ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً ندیم کے بہار نمبر 1935ء میں جمیل مظہری کی کامیاب افسانہ نگاری اور دلکش اسلوب کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے جب 1960ء کے قریب مختصر تاریخ ادب اردو کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ترتیب

جمیل مظہری کی رباعی

(1973ء میں جب بینائی زائل ہو گئی)

زخم اپنے دل و جگر کا سی لیں گے جمیل
جس طرح جلائے گا جی لیں گے جمیل
جب آنکھ نہیں پھر قلم سے کیا کام
خون اپنے دماغ کا بھی پی لیں گے جمیل

☆☆☆

اے عمر رواں ٹھہر کہ چلتا ہوں میں
دے مہلت یک نفس کہ بوڑھا ہوں میں
یہ جسم کی جھریاں نہیں ہیں شاید
زنجیریں ہیں زنجیروں میں جکڑا ہوں میں

دیا تو جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے تفصیلی اعتراف کے بعد ان کی "شگفتہ نثر نگاری" کا بھی ذکر کیا۔ آل احمد سرور نے "عصری ادب" میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی تذکرہ چھیڑا۔ اویس احمد دوراں نے "سریر" میں اعتراف کیا کہ اگر جمیل مظہری شعر گوئی کی طرح نثر نگاری کو بھی اپنے فکر و فن کے ابلاغ کا مستقل وسیلہ بنائے ہوئے ہوتے تو آج اردو کے نثری ادب میں بھی وہ بڑے بڑوں کے ہمسر ہوتے۔

جمیل مظہری کے تنقیدی مضامین میں سب سے پہلا مضمون نواب نصیر حسین خیال کی مشہور کتاب "مغل اور اردو" کا مقدمہ ہے پھر "آئینے خانے میں" اختر شیرانی پر (1934ء میں) "تصویر" لاہور میں تبصرہ شائع ہوا۔ حکومت بہار کے تعلقات عامہ کا جریدہ بہار کی خبریں منظر عام پر آیا تو اس میں ان کے تنقیدی مضامین تواتر سے آتے رہے۔ اسی دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد، رضا علی وحشت، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، انشاء اللہ خان ایک ٹریجڈی اور مرزا غالب پر لکھے گئے مضامین غالب ایک مصلح فنکار (جنوری 69ء)، انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن (اگست 69ء) کے علاوہ کل کا عظیم آباد (جنوری 1970ء) فرقہ وارانہ ذہنیت کا تاریخی پس منظر (جنوری 1971ء) قومیت کے ذہنی سانچے۔ (اگست 1971ء) اور ہندوستان بین الاقوامیت میں ایک بین الاقوامی زبان کی ضرورت (اگست 1972ء) بہار کی خبریں میں شائع ہوئے، میر انیس کی نامقبولیت کے اسباب، میر انیس اور صنفی جذبات کی ترجمانی (مجلہ یادگار انیس

کمیٹی پٹنہ 74ء) دو اقبال (علامہ اقبال سیمینار منعقدہ لکھنو 29 دسمبر 77ء) غالب کے نقش قدم پر (ماہنامہ ''گنگ وجمن'' کانپور اپریل 76ء اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر شدہ) شاد عظیم آبادی کی استعاراتی شاعری (ماہنامہ زبان وادب پٹنہ شاد عظیم آباد نمبر مارچ 79ء) صفی لکھنوی کی جغرافیائی شاعری (آج کل نئی دہلی ستمبر 80ء) ایک مثالی کردار (آکاش وانی کا ترجمان پندرہ روزہ آواز) مقدمہ طنزیات انجم مانپوری۔ دانش کی شاعری پر ایک نظر (1954ء) مکاشفات کشفی (1958ء) واحد پریمی کا گلیو (1967ء) مظفر حیدری کا جام جم (1967ء) قاسم شبیر نقوی کی میری غزلوں میں آثار کربلا (سرفراز لکھنو 2 مئی 1970ء)۔

قاسم شبیر کی نقش مرثیہ (سرفراز لکھنو 27 دسمبر 1973ء) فضا شمسی کا دیوان نکہت و خلش (1974ء) تقریظ۔ ساز وآواز (1975ء) علقمہ شبلی کا حرف وصوت (1975ء) تجربہ۔ وہ جو شاعری کا سبب ہوا (مجموعہ کلام کلیم عاجز ''بزم کاف'' 1946ء) صفیر بلگرامی حیات وکارنامے (1976ء) تعارف وحرف آگہی (1977ء) محمد عسکری جدید کے چھ مرثیے اعجاز ناطق (1978ء) تبصرہ وتقریظ بقا نظامی عظیم آبادی کی صہبائے بقا (1979ء) مقالہ۔ کلکتہ اک رباب (1966ء) تعارف۔ بکھری کرنیں (1980ء) تعارف۔ حکایت ہستی (1980ء) میرا نظریہ شعر اور میری شاعری (خودنوشت۔ ماہنامہ کائنات مرزاپور جمیل مظہری نمبر جون 1982ء اور جمیل مظہری نمبر ماہنامہ صبح نو پٹنہ مارچ 1963ء) غبار کارواں' شعر وشاعری اور برکات اسلام (کائنات جمیل مظہری نمبر) ''اسلام اور نازیت کا فرق''۔''اجتماع ضدین'' (روزنامہ عصر جدید سلور جوبلی نمبر) قومیت کے ذہنی سانچے (بہار کی خبریں اگست 71ء) یاد ماضی (خودنوشت' آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر اور کائنات مرزاپور اپریل تا جون 82ء میں طبع) اس کے علاوہ بھی بے شمار تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً مختلف ادبی جریدوں میں چھپے یہ سارے مضامین بزبان خود ان کی تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں۔

جمیل مظہری نے ایک اور صنف سخن کو معراج دی۔ وہ ہے مرثیہ نگاری۔ بقول کلیم الدین احمد ''اردو شاعری کے دامن میں صرف ایک ''مرثیہ'' ہے جسے مانگے کا نہیں کہا جاسکتا ورنہ تمام صنف سخن عربی وفارسی سے مانگی ہوئی ہیں۔''

میر ضمیر نے صنف مرثیہ کو مسدس کا قالب دیا اور اس کے عناصر بھی مقرر کردیے مثلاً چہرہ' رخصت' آمد' جنگ' شہادت' بین وغیرہ۔ اس لیے مرثیہ کو مسدس سے الگ چیز مان لیا گیا ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں دور حاضر کے جن بڑے مرثیہ گو کا نام لیا جاتا ہے وہ ہیں آل رضا رضا' نسیم امروہوی' جوش ملیح آبادی' وفا مانگپوری' مظہر سیتا پوری' نجم آفندی اور جمیل مظہری۔ جمیل مظہری کے مراثی میں ادبیت بھی ہے اور فکر کا سمندر بھی۔ محمد رضا کاظمی ''جدید اردو مرثیہ'' میں لکھتے ہیں۔

''جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کی ابتداء قومی مقاصد ہی کے تحت ہوئی۔ جمیل مظہری خود بیان کرتے ہیں کہ ان کا پہلا مرثیہ ''عرفان عشق'' 1930ء میں ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہوکر کہا گیا تھا۔ سیاسی اغراض کی موجودگی کے باوجود ان کے مرثیوں میں سیاسی عنصر نمایاں نہیں ہے۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جدید مرثیہ کے مبادیات کو مرتکب کرنے تک محدود رہا جائے۔''

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوش نے اپنے سیاسی مسلک کی تشکیل میں مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کیا تو جمیل مظہری مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ محمد علی جوہر کے مزاج کا جوش' ولولہ' بلند آہنگی' جذباتی سیلاب اور عزم سرفروشی کی جھلک جوش کے ابتدائی مرثیوں میں ملتی ہے اس کے برخلاف ابوالکلام آزاد کی علمی متانت' رفتار کی استقامت اور مصلحت کوشی تھی اس کے عناصر کی پرچھائیاں جمیل مظہری کے ہاں ملتی ہیں۔ اسی لیے دونوں کو جدید مرثیہ نگاری کا میر اور امیر کہا گیا ہے۔ جمیل مظہری نے جدید مرثیے کو ایک نیا رخ دیا تو جوش نے اسے وسعت دی۔ جمیل مظہری نے امام حسین کو بطور نجات دہندہ انسانیت قرار دیا تو جوش نے امام مظلوم کو نجات دہندہ تاج مشرقین کہا لیکن جوش کے مراثی اور جمیل مظہری کے مراثی کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو جوش کے الفاظ تراشی کو نظرانداز کرکے حاصل یہ ہوگا کہ جمیل مظہری نے مراثی کو بطور پیغام زیادہ موثر انداز میں عام کیا ہے۔

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک
ایمان کی ہورہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرمن کی ہے جنت ابھی تلک
ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلک
پامالئی حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا ایک قتل عام ہے

جمیل مظہری کے مراثی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو بیعیہ جسے نظم کیے ہیں ان میں یہ برابر خیال ملحوظ

رکھا ہے کہ گریہ وبکا کی فضا تخلیق کرتے وقت امام حسین یا ان کے اعزاء، احباب یا مخدرات عصمت وطہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب و آلام نے ان کے عزائم میں شکستگی و ماندگی پیدا کردی تھی اور آپ کے بین کا یہ ابھی ایک بڑا وصف ہے کہ ان میں رقت و دلدوزی بھی خوب ہے یعنی ایک جانب بشری تقاضے بھی ہیں اور دوسری جانب الوہی تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کے ایک مرثیے سے جانب زینبؑ کے مطمئن نفس کو دیکھیں۔

بیٹھ کر لاش پہ آنسو نہ بہایا اس نے
صبر مخدومہ کونین دکھایا اس نے
صحن میں آن کے سجادہ بچھایا اس نے
سجدہ شکر میں سر اپنا جھکایا اس نے
مامتا دل کو مسلنے جو لگی بات یہ کی
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے مناجات یہ کی
اے میرے پالنے والے مرا فدیہ ہو قبول
میری قربانی احقر مرے مولا ہو قبول
آل احمد کا یہ ناچیز ہدیہ ہو قبول
تپش داغ دل دختر زہرا ہو قبول
کیا ہے اعدا نے میری کوکھ جو ویراں کردی
تیری بخشش تھی تیری راہ میں قرباں کردی

جمیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کسی خاص نقطہ نظر کا سہارا لے کر نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت کی ذاتی تلاش وتاویل کا نتیجہ ہے کہ جمیل مظہری نے فطرت کی کھلی کتاب کو اپنے علم و وجدان اور تجربے کی روشنی میں واقعات کربلا کا جائزہ لے کر مذہب اور خالص فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے بلند کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ ہم اس سانحہ میں انسانی قدروں کو مکمل طور پر جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں۔ جمیل مظہری کا حکیمانہ شعور اخلاقی وروحانی پیکروں کو سامنے رکھتا ہے جس سے زندگی کے لیے جوش وحرارت کا پیغام مل سکے۔

حیف وہ قوم جو ہو ملت شاہ شہدا
وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حیرت کی ہے جا
زندگی میت احساس ہے دل مردہ ہیں
جتنے جذبات ہیں قومی وہ سب افسردہ ہیں

جمیل مظہری کے مشہور مرثیوں میں عرفان عشق، مضراب شہادت، شام غریباں، افسانہ ہستی، عزم محکم، حقیقت نور و نار، لمحہ غور، علم دار کربلا اور مراثی کی دوسری جلد وجدان جمیل کے مرثیے وغیرہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جمیل مظہری کی جگہ اردو کے ان شعرا میں ہے جنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں توسیع کی ہے۔ نئے ابعاد اور جہتیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے معنوی دائرے کو جس حد تک وسیع کیا ہے وہ یقینا ان کا ایک اہم اور قابل قدر کارنامہ ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ اس انفرادیت کا ثبوت ان کی لوریاں بھی ہیں۔ جس طرح دوہے اور برہے گیت کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لوری کو بھی اس کے تحت جانا پہچانا

رومیوں کے بعد قرون وسطی میں صرف عرب قوم ہی ایسی تھی جس نے علم قانون کو ترقی دی اور دنیا کے سامنے قانون کا ایک جداگانہ نظام پیش کیا۔ یہ نظام بنیادی طور پر قرآن اور سنت پر مبنی اور یونانی و رومی قانون سے متاثر تھا اور تمام احکام الٰہی جو قرآن میں پیش کیے گئے ہیں اور احادیث نبویؐ میں ان کی تعبیر و تشریح کی گئی ہے، شریعت اسلامیہ کے ذریعے ان کو بعد کی نسلوں تک پہنچایا گیا۔ شریعت کے فرائض مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو منظم کرتے ہیں۔ چاہے یہ شعبے دینی ہوں کہ سیاسی یا سماجی۔ یہ احکام مسلمانوں کے ازدواجی اور مدنی تعلقات پر حاوی ہونے کے سوا ان کے غیر مسلموں سے تعلقات پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے تمام اوامر ونواہی اسی مقدس قانون سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ قانونی اعتبار سے انسان کے تمام اعمال کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) فرض: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور جس کا ترک کرنا قانوناً مستوجب عذاب ہے۔ (2) مستحب: وہ عمل جس کے کرنے ثواب تو ملتا ہے لیکن نہ کرنے سے کوئی عذاب نہیں ہوتا۔ (3) جائز ومباح: وہ اعمال جن کے کرنے کی اجازت ہے اور قانون ان میں حائل نہیں ہوتا۔ (4) مکروہ: ایسا عمل جو ناپسندیدہ تو ہے لیکن اس کے کرنے سے عذاب نہیں ہوتا۔ (5) حرام: ایسے اعمال جن کے کرنے سے عذاب ہوتا ہے اور ان کا کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

مرسلہ: قرۃ العین حیدر۔ اقراء سٹی، کراچی

میڈیکل سائنس مسلسل ترقی کر رہی ہے۔ نت نئے آلات اور دوائیں سامنے آرہی ہیں۔ ایک طرف انسانوں کو قتل کرنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اسلحہ ایجاد ہو رہا ہے تو دوسری جانب انسانی زندگی کو بچانے کے لیے طبی آلات و نئی نئی دوائیں بھی لائی جا رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں طبیب مختلف جانوروں سے بھی علاج کے لیے مدد لیتے تھے۔ جیسے بادی خون کو نکالنے کے "جونک" کا استعمال، کمر درد کے لیے سنگھی مچھلی سے ریڑھ کی ہڈی پر مچھلی کو چپکانا اور بھی بہت سے جانوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر کتوں سے علاج میں پہلی بار کام لیا جا رہا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کتوں میں سونگھ کر شناخت کرنے کی صلاحیت بہت تیز ہے جو کینسر کا پتا چلانے میں بھی استعمال ہو سکتی ہے، جاپانی قصبے کانیاما کے 6000 سے زائد رہائشی ایک انوکھے مطالعے میں حصہ لے رہے ہیں جس کا مقصد یہ جاننا ہے کہ کیا کتے واقعی سونگھ کر کینسر کا پتا چلا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ مطالعہ نپن میڈیکل اسکول کے پروفیسر ماساؤ میاشیتا اور ان کے ساتھیوں کے زیر نگرانی کیا جا رہا ہے جبکہ اس مطالعے کے لیے مذکورہ قصبے کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں رہنے والے لوگوں کی بڑی تعداد معدے (پیٹ) کے سرطان میں مبتلا ہے۔ مطالعے میں شریک تمام افراد سے پیشاب کے نمونے لے کر ادارے کو بھجوائے جائیں گے جہاں خصوصی تربیت یافتہ کتوں کو ان کی بدبو سنگھائی جائے گی۔ یہ کتے اگر کسی نمونے کی بدبو سونگھ کر شدت سے بھونکنے لگیں گے تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ متعلقہ فرد کو یا تو پیٹ کا کینسر ہو چکا ہے یا پھر وہ اس مرض میں مبتلا ہونے کے قریب ہے۔ البتہ اس بات کی تصدیق دوسرے طریقوں سے بھی کی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ ان تربیت یافتہ کتوں نے پیٹ کے سرطان کی تشخیص درست طور پر کی ہے یا نہیں۔

جاتا رہا ہے۔ کافی بعد لوری آزاد صنف کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ شعرا نے اس صنف سے بے توجہی برتی اور اردو کا دامن لوری سے خالی رہا۔ جمیل مظہری نے جہاں بڑی تعداد میں بچوں کی نظمیں لکھیں وہیں لوریوں سے بھی اردو کی مانگ سجائی۔ جمیل مظہری کی لوریوں کا کینوس کافی وسیع ہے۔ ان کے مخاطب اگرچہ بچے بچیاں ہیں لیکن زندگی کے مسائل، رموز و نکات، عصری سیاست، عالمی عصری صورت حال، امیر و غریب کے امتیاز و فرق کے زیریں لہریں بھی لوریوں میں مدغم ہیں۔ یہ انداز فکر لوریوں کو نئے رنگ اور نئی جلوہ سامانیاں عطا کرتا ہے۔

جاگتی سنسار کی پرچھائیاں بھی سو گئیں
شام سے بجتی ہوئی شہنائیاں بھی سو گئیں
نیند پروانے لائی اور جگنو سو گئے
سو گئیں سارنگیاں محفل کے گھنگرو سو گئے
جلتے جلتے سو گئی شمع شبستاں سو رہو
جان جاناں...... .... سو رہو

لوریوں کی طرح جمیل مظہری نے مثنوی کو بھی حیات نو بخشی، ان کی مثنویوں میں صرف مربوط داستان ہی نہیں ایک پیغام بھی پایا جاتا ہے۔

اس طول بیاں سے یہ غرض ہے
نفرت بھی تمہاری ایک مرض ہے
دشمن سے جو دشمنی کرو گے
اس قرض کا سودا بھی بھرو گے
(آب و سراب)

اب آخر میں ان کی غزل پر بھی دو باتیں کر لی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر تھے، ان کی شعری تخلیقات قاری کو دعوت فکر و نظر دیتی ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا ایک نظریہ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کون و فساد کو اپنی مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس کے نظریہ کی فن کارانہ ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا نظریہ حیات اس کی تخلیقات میں ایک ربط پیدا کرتا ہے جس کی بنیاد پر قاری کچھ مثبت نتیجے اخذ کر کے اس کے نظریے کو رد یا قبول کرتا ہے۔

جمیل مظہری نے اردو شاعری کی عام اور مروجہ روایت کے مطابق محض نظم نما غزلیں یا غزل نما نظمیں لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اور فارموں کو استعمال کر کے ان کے ذریعہ اظہار و بیان میں وسعتیں پیدا کیں اور اپنے تجربوں کو نیا گداز اور نکھار عطا کیا۔ ان کے ہاں موضوع

ماساؤ میاشیتا کا دعویٰ ہے کہ ان کے تربیت یافتہ کتوں میں صرف سونگھ کر سرطان کو درست طور پر شناخت کرنے کی صلاحیت تقریباً 100 فیصد ہے اور یہ مطالعہ اسی بات کی باضابطہ تصدیق کرے گا۔ واضح رہے کہ کتوں کی قوتِ شامہ (سونگھنے کی طاقت) دوسرے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور منشیات سے لے کر دھماکا خیز مواد تک کو سونگھ کر تلاش کرنے کے لیے مختلف ادارے باقاعدہ تربیت یافتہ کتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان ہی باتوں کی بنیاد پر طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ جس طرح کتوں کو منشیات وغیرہ سونگھ کر شناخت کرنے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح انہیں تربیت دے کر سرطان جیسی خطرناک اور جان لیوا بیماریاں کھوجنے کے قابل بھی بنایا جاسکتا ہے۔
گزشتہ دو عشروں کے دوران امریکا، برطانیہ اور جرمنی میں کتوں کے ذریعے کینسر کی تشخیص کے مختلف تجربات کیے جاچکے ہیں اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ کتوں نے مریضوں کی سانس، جلد اور پیشاب کی بدبو سونگھ کر کئی اقسام کے سرطانوں کی 90 فیصد سے بھی زیادہ درستگی کے ساتھ تشخیص کی جبکہ بیماری کے ظاہری آثار بالکل بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے باوجود ماہرین یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ سرطان زدہ خلیات آخر ایسا کون سا مادّہ خارج کرتے ہیں جسے سونگھ کر کتے مبینہ طور پر متعلقہ شخص میں سرطان کی موجودگی کا پتا چلالیتے ہیں۔ دوسری جانب ناقدین کا کہنا ہے کہ اوّل تو کتوں کے ذریعے سرطان کی تشخیص ابھی تک حتمی طور پر ثابت شدہ نہیں اور دوم یہ کہ اگر کسی طرح کتوں کو صرف سونگھ کر سرطان شناخت کرنے کی تربیت دے دی جائے تو یہ ایک طویل اور مہنگا عمل ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے کسی بھی ایک کتے کی تیاری میں 4 سے 5 سال کا عرصہ لگ جائے گا اور 45000 ڈالر خرچ آئے گا۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

اور ہیت دونوں اعتبار سے خاصی جدت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر آسانی سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح ان کی نظموں کے تین واضح مدارج اور اقسام ہیں۔ رومانی' انقلابی اور قومی فکری وفلسفیانہ۔ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تین نمایاں رنگ رومانی' انقلابی اور فکری وفلسفیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری اپنی غزلوں کو افکار منظوم کا نام دیتے ہیں اور انہیں روایتی تغزل کے معیار کو پیشِ نظر رکھ کر غزل قرار دینے سے ہچکچاتے بلکہ انکار کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو ''فکر جمیل'' کے نام سے شائع کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو فکر وفلسفہ جیسی چیز سمجھتے تھے۔

تھی زندگی خدا کا غضب اور مظہری
موت اک خدا کا پیار ہے' لے اس کا پیار دوست

لیکن نقادوں کی رائے ہے کہ جمیل مظہری نے غزل گوئی کو ایک نیا مزاج ایک نیا آہنگ بخشا ہے اور غزل کی روایتوں کو ایک نئی سمت دی ہے۔
ان کی غزلوں میں اپنے خدوخال اتنے واضح ہیں کہ جن کے محسوسات وخیالات کی ایک الگ شخصیت بن گئی ہے لیکن افسوس اس شخصیت کا پرتو آج پورے برصغیر میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاگرد بنانے میں دلچسپی نہ لینا بھی ہے۔ جو بذات خود ان کی شاگردی کے لیے پہنچ جاتے انہیں جلد ہی میدان چھوڑنا پڑتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اشعار پر اصلاح نہیں' قطع برید کرتے تھے۔ اتنی زیادہ کاٹ پیٹ ہوتی کہ شاگرد کی غزل غائب ہو کر استاد کی غزل رہ جاتی۔ اس بات سے سبھی آگاہ تھے نتیجتاً لوگ اس شخص کی غزل کو مشکوک نظروں سے دیکھتے جو خود کو جمیل مظہری کا شاگرد کہتا۔ شاید اسی وجہ سے سہیل جمیلی بھی بعد میں سہیل عظیم آبادی بن گئے۔ وہ اپنا کلام سنانے میں بھی بخل سے کام لیتے۔ بقول جوش ملیح آبادی ''میرے محبوب دوست پروفیسر جمیل مظہری کہ جب تک انہیں جسمانی زدوکوب کا اندیشہ نہ ہو' شعر نہیں سناتے۔''

کہتے ہیں ہر بڑا شاعر ناؤنوش سے دلچسپی لیتا ہے مگر جمیل مظہری اس لعنت سے محفوظ تھے۔ جبکہ انہیں جوش ملیح آبادی کی قربت بھی حاصل تھی۔ جوش کا ایک شعر خاص طور پر انہی کے لیے ہے۔

الحمدللہ جوش اس بدمذاقی کے زمانے میں

جمیل مظہری سا قدر داں بخشا گیا مجھ کو

آخری ایام میں وہ خود سے اتنے بے پروا ہو گئے تھے کہ سہیل عظیم آبادی، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کا کنٹریکٹ بھیجا کرتے اور وہ اسے گم کردیتے۔ مجبور ہو کر سہیل عظیم آبادی کنٹریکٹ ڈاک سے بھیجنے کی بجائے خود جا کر دستخط کروالیا کرتے تھے۔ کمرا ہمیشہ بے ترتیب رہا کرتا۔ ڈھیلی چارپائی پر گندی میلی توشک وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ بستر کی چادر جیسے برسوں سے بدلی نہ گئی ہو۔ گرمیوں میں بھی سوئٹر جسم سے چپکا رہتا۔ مڑے تڑے کاغذوں کا ایک ڈھیر سا توشک کے نیچے جمع رہتا جن پر کلام لکھتے، قلم برداشتہ پوری پوری نظم یا غزل منٹوں میں کہہ ڈالتے۔ اساتذہ قدیم کے سیکڑوں اشعار یاد رکھتے مگر اپنا کلام بھول جاتے۔ ان کی زندگی میں شائع ہونے والے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

شکست و فتح طویل افسانہ (کلکتہ 1950ء) نقش جمیل (پٹنہ نظموں کا مجموعہ 1952ء) فکر جمیل (غزلیات ورباعیات پٹنہ 1959ء) آب وسراب (فلسفیانہ مثنوی کلکتہ 1970ء) عرفان جمیل (مراثی وقصائد لاہور 1970ء۔ الہ آباد 1979ء) وجدان جمیل (مراثی وملی نظمیں لاہور 1979ء)

جمیل مظہری کی زندگی میں ماہنامہ سہیل (گیا) بہار نے دو حصوں میں جون، جولائی 60 مجلہ جشن جمیل مظہری پٹنہ نے 1975ء میں خصوصی شمارے شائع کیے اور انتقال کے بعد ماہنامہ ”کائنات“ (مرزاپور یوپی) ماہنامہ ”آج کل“ (دہلی) اور سہیل (گیا) 1982ء میں خصوصی شمارے اور طلوع افکار (کراچی) نے گوشہ شائع کیا۔

آخری ایام میں جمیل مظہری کو پٹنہ یونیورسٹی نے خصوصی لیکچرر کی حیثیت سے مقرر کرلیا تھا وہ 1969ء سے 1974ء تک کبھی کبھی درس دینے چلے جایا کرتے تھے لیکن جب پیرانہ سالی نے پیروں کو جکڑ لیا اور کثرت امراض نے پریشان کرنا شروع کردیا تو انہوں نے خود ہی سبکدوشی حاصل کرلی اور اپنے چھوٹے بھائی رضا کاظمی مظہری کے ساتھ کلکتے میں رہنے لگے۔

وہ مئی 1980ء میں بھیکن پور (مظفر پور) سفر پر روانہ ہوئے۔ کسے خبر تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے کلکتہ چھوڑ رہے ہیں۔ بھیکن پور کے قیام کا مشہور نقاد جناب سید محمد کاظمی ”تنقیدی ورثا“ میں یوں نقشہ کھینچتے ہیں ”میں کاظم ماموں کی جانب مڑا، ان کی آنکھیں بند تھیں اور ان پر غنودگی طاری تھی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑلیا۔ تین چار مرتبہ آواز دی۔ جواب نہ پا کر میری گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں اپنا نام لے کر ان کو متوجہ کرتا رہا۔ آخر بہت دھیمی آواز میں بولے ”میں سمجھا بابو!“ انہیں باہوش پا کر کچھ غذا دینے کی کوشش کی، وہ نہ مانے۔ اس گھر کے اخلاق کے مطابق ایسے کٹھن وقت میں بھی مہمان کی ضیافت مقدم تھی۔ میرے لیے دسترخوان بچھ گیا، اس پریشانی میں کیا کھاتا، پھر بھی بیٹھ گیا۔ اس دوران امیر رضا ماموں، اپنی خالہ اور دیگر رشتے داروں کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور پاکستانی آعزہ کی خیریت بتا تا رہا۔ آخر جب میری بے تابی کم نہ ہوئی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا ”اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردیجیے۔“ یہ جملہ بھی بار بار دہرانا پڑا کچھ دھیمی آواز میں بولے ”معاف کیا بابو!“ اور لوگوں سے میری حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ مجھے باتوں میں لگالیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سگریٹ مانگا دو ایک کش یوں لیے کہ امیر رضا ماموں کے ہاتھ میں سگریٹ تھی جوان کے ہونٹوں پر لگادیتے۔ دس منٹ بعد انہوں نے کروٹ لی اور تکیہ پر کچھ بلند ہوئے۔

میں نے امیر رضا ماموں سے کہا ”ان کو جلدی سے اچھا کردیجیے، میں آیا ہی ہوں ان کو کراچی لے جانے کے لیے۔ وہاں ان کے چاہنے والے بہت ہیں۔ ان کے شاگردوں کی وہاں اتنی پذیرائی ہوتی ہے، یہ خود پہنچ جائیں تو دھوم مچ جائے گی۔ ان کو تو سب مانتے ہیں صرف میں ان کے خلاف لکھنے لگا ہوں۔

کاظم ماموں نے یہ جملہ سنا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب کسی قدر قوت کے ساتھ کاظم ماموں (جمیل مظہری) بولے ”رات بھر تو ٹھہر جاتے۔“ میں نے عذر پیش کیا کہ صبح آؤں گا۔ آخر جب اٹھا تو صاف اور بلند آواز میں ”فی امان اللہ“ کہہ کر کاظم ماموں نے رخصت کیا۔ یہ ان کی آخری آواز تھی جو میں نے سنی تین دن بعد وہ خود اللہ کی امان میں چلے گئے۔“

23 جولائی 1980ء کو رات کے گیارہ بجے وہ راہی ملک عدم ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ساڑھے چار بجے سہ پہر میں اٹھا اور انہیں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اپنے مرنے کی تاریخ انہوں نے خود ہی ”مظہری مرد“ سے (1399ھ) نکال لی تھی لیکن دس مہینے بعد رضا کاظمی مظہری نے ”ازسر آہ“ سے ایک کے تخمینے سے (1400ھ) تاریخ نکالی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

مشعلِ راہ

زویا اعجاز

علم کی ترسیل عبادت سے کم نہیں، لوگ اس اہم نکتے سے آگاہ ہیں پھر بھی کوشاں نہیں جب کہ مسلمانوں کو علم کی شمع جلانے کا حکم خاص ہے۔ جسے یورپیوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ خود بھی سیراب ہورہے ہیں اور دیگر احباب کو بھی ترغیب دے رہے ہیں۔

ان افراد کی روداد جنھوں نے مشعلِ علم تھام کر ایک مثال قائم کی

قرآن کا حکم ہے کہ ''پڑھو'' گویا تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا کام اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک اچھا عمل ہے۔ جب تک ہم نے علم وفن میں دلچسپی لی تو ہم علم وعرفان میں سب سے آگے نظر آئے۔ بغداد ہو یا ہسپانیہ، علم کی ترویج وتبلیغ میں سب سے آگے تھے۔ اس وقت جب یورپ وامریکا میں لوگ بہتر معاشرے سے قطعی لاعلم تھے۔ ہم میدانِ علم میں راج کررہے تھے لیکن آج؟ آج ہم علم سے دور، بہت دور نظر آرہے ہیں اور یورپ وامریکا علم وفن کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہی لوگ جو ہم سے علم کے باب میں استفادہ کرتے تھے۔ اب ہمیں علم حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ بہترین عالمی اساتذہ کا تعین کررہے ہیں۔ اس بار ''گلوبل ٹیچرز'' کا انعام جن دس اساتذہ کو دیا گیا ان میں سے ایک سلیمہ ہے جس کا تعلق اپنے پاکستان سے ہے۔ ان کی سوانح آپ ... ''روایت شکن'' کے عنوان سے پڑھیں گے اب باقی کے نو اساتذہ کا تذکرہ بھی ملاحظہ کریں۔

اسپین کے تاریخی شہر میڈرڈ سے تعلق رکھنے والا ڈیوڈ 1972 میں پیدا ہوا۔

اس کی زندگی بہت سی مشکلات اور کٹھنائیوں سے عبارت رہی۔ روایتی انداز میں تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے اس نے میڈرڈ پولی ٹیکنک یونیورسٹی سے ٹیلی کمیونیکیشن سسٹم میں انجینئرنگ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم اپنے اخراجات اور دیگر ضروریات پوری کرنے کی غرض سے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اس نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ قدرت نے مستقبل بعید میں اس مقدس پیشہ سے وابستگی اس کے لیے مقسوم کررکھی ہے۔

اس وقت اگر احباب ڈیوڈ سے مستقبل کی منصوبہ بندی

دریافت کرتے تو اس کی چمکتی آنکھوں‘لبوں پر کھلتی مسکراہٹ اور کھویا ہوا انداز با نگ دہل ایک ہی عندیہ دیتا کہ وہ انجینئر بن کر دولت‘شہرت‘ کامیابی کی بلندیاں چھونے اور ٹیلی کمیونیکیشن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا خواہشمند ہے۔ڈگری مکمل ہوتے ہی اسے Florentino Perez,Xfera نامی مقامی کمپنی میں نوکری مل گئی۔زندگی بہت سہل نہ سہی لیکن مشکل بھی نہیں رہی تھی۔

اپنے خوابوں کی تکمیل کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے ڈیوڈ کو پہلی ٹھوکر اس وقت لگی جب 2005 میں ٹیلی کمیونیکیشن سیکٹر میں مالیاتی بحران کی وجہ سے اسے بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔اس بحران کی زد میں آکر ہزاروں ملازمین دربدر ہو گئے۔

خاندانی ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے کے لیے اس نے چاروناچار ایک بار پھر زمانہ طالبعلمی کے ساتھی کا ہاتھ تھام لیا اور عارضی سہارے کی غرض سے اسی ادارہ میں تدریس کا آغاز کر دیا۔کچھ عرصہ بعد اس نے میڈرڈ کے مضافات میں چھوٹے پیمانہ پر اپنی اکیڈمی قائم کرلی۔

دو سال بعد ٹیلی کمیونیکشن شعبہ میں استحکام سے ڈیوڈ جیسے ہزاروں افراد کے لیے خوشحالی‘معقول تنخواہ اور سہولیات کی نوید پیدا ہوگئی۔یہ وقت اس کے لیے بہت کٹھن تھا۔وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں ایک راہگذر اسے اپنے خوابوں کی منزل تک لے جانے کے لیے بانہیں وا کیے پکار رہی تھی۔اس منزل تک رسائی کے بعد دولت‘ تعیشات اور شاندار طرز زندگی پر دسترس یقینی تھی۔لیکن ایک وجدانی جذبہ کے زیر اثر اس نے دوسری راہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور شعبہ تدریس سے وابستہ رہتے ہوئے مزید جذبہ‘لگن اور خلوص سے نسلِ نو کی تربیت کا بیڑا اُٹھا لیا۔

بحیثیت طالبعلم ڈیوڈ نے نصابی دسترس کے لیے بہت کٹھنائیوں کا سامنا کیا تھا۔ریاضیات‘طبیعات‘ کیمیا اور ٹیکنالوجی جیسے مضامین اس سمیت ہزارہا طلبہ کے لیے کونین جیسے تھے جنھیں نگلنا محض ایک مجبوری تھی۔اساتذہ کا روایتی طریقہ تدریس خشک‘غیر دلچسپ اور بے کیف ہوتا۔ان مضامین میں معمولی غلط جنبش پر تمام تر جوابی مواد میں ناکامی طلبہ کو مزید خائف اور بیزار کیے رکھتی۔یہ اہم ترین سائنسی مضامین محض اچھے نمبر اور گریڈز کے حصول کے لیے طوعاً و کرہاً پڑھے جاتے تو لامحالہ طور پر عملی زندگی میں ان پر دسترس اور اطلاق ایک بعید از قیاس امر تھا۔

میڈرڈ کے گردونواح میں واقع سبھی تعلیمی ادارے روایات کے پابند تھے۔کمرا جماعت کا محدود‘گھٹن زدہ ماحول طلبہ کی صلاحیتیں اجاگر کرنے کی بجائے خوابیدگی کی طرف مائل کرتا تھا۔طلبہ کی اکثریت معاشی دباؤ کا شکار بھی تھی جس کے باعث اضافی کوچنگ کلاسز اور اکیڈمی میں داخلے کا تصور بھی محال تھا۔اسے اپنی اکیڈمی میں ایسے طلبہ سے واسطہ رہتا جو کتابوں کو بوجھ گردانتے۔ان میں خوداعتمادی کی شدید کمی تھی۔بیزاری کا یہ سفر اس موڑ پر آن پہنچا تھا کہ وہ ریاضی کیمیا اور طبیعات سے نفرت کرنے لگے۔

ڈیوڈ کی دوراندیش نظریں اپنے ملک و قوم کے لیے مستقبل میں ذہانت‘اہلیت اور تخلیقی صلاحیتوں سے مبرا نسل نو کی ایک بڑی کھیپ تیار ہوتے دیکھ رہی تھیں۔اس نے وسیع تر قومی مفاد کے لیے ذاتی مفاد ترک کر دیا اور ایک ایسی سپاہ کی تیاری میں جت گیا جو سائنسی مضامین کی اہمیت اور اس کی اصل روح سمجھ سکے۔اس کی ذاتی رائے میں سائنس ہی انسانی زندگی کی بہتری‘ قومی اقدار کی تعمیر اور پرامن عالمی زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ضرورت محض اس بات کی تھی کہ ان بے کیف مضامین کے لیے طلبہ کے دلوں میں تحریک‘محبت اور تحقیقی جذبہ اجاگر کیا جائے تاکہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے ایسی طویل مسافت اختیار کریں جو بالآخر قومی ترقی پر منتج ہو۔ڈیوڈ نے اس جنگ کے لیے اپنے تمام تر ہتھیار آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ قدرتی طور پر شیریں دہن اور نرم مزاج تھا۔اس کی گفتگو کی تاثیر مخاطب کے دل میں گھر کر لیتی۔دیگر اساتذہ کی طرح وہ اپنی علمیت جھاڑنے سے گریز کرتا اور طلبہ کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق تعلیم دیتا۔اس کا تشریحی انداز اور روزمرہ زندگی سے منسلک مثالوں کے ذریعہ مشکل ترین سائنسی تصورات کا بیان اس قدر سادہ ہوتا کہ طلبہ دنگ رہ جاتے۔یہ حیرانی بتدریج تجسس‘ کھوج اور جستجو میں ڈھلنے لگی۔ہم عصر اساتذہ کے برعکس کمرائے جماعت کا ماحول خوشگوار بنائے رکھنا ہی اس کی اوّلین ترجیح تھی۔

ڈیوڈ کو بخوبی علم تھا کہ ان مضامین میں طلبہ کن مقامات پر تشنگی محسوس کرتے ہیں۔اس کے سادہ انداز بیان نے ان سبھی مسائل کا خاتمہ کردیا۔طلبہ کی سوچ اور ترجیحات میں تو واضح تبدیلیاں نظر آنے لگیں لیکن ڈیوڈ کی پیشہ وارانہ سوچ اب بھی مضطرب تھی۔

2011 میں یہ اضطراب مزید شدت اختیار کر چکا

تھا۔اسکول'اکیڈمی میں گذارے گئے چند گھنٹے ان طلبہ کے لیے ناکافی تھے۔علاوہ ازیں وہ ان لاکھوں طلبہ کے لیے بھی آزردہ رہتا جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اب بھی روایتی طریقہ تدریس سے جنگ آزما تھے۔ڈیوڈ رنگ'نسل'قوم کے فرق سے قطع نظر سب طلبہ کو یکساں مواقع دینے کا قائل تھا۔اس کی دانست میں مساوات اور وسائل کی یکساں تقسیم ہی عالمی افق پر یقینی مثبت تبدیلی کا واحد حل ہیں اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے حساس ذہن میں ایک ایسے اچھوتے خیال نے جنم لیا جس نے عالمی تعلیمی تاریخ میں انقلاب برپا کردیا۔

ڈیوڈ نے اپنی کاوشوں کی ترویج کے لیے اپنے مختصر لیکچرز ویڈیو کی صورت میں ریکارڈ کیے اور پھر انٹرنیٹ اکاؤنٹ کے ذریعہ یوٹیوب پر بھی ویڈیوز اپلوڈ کردیں۔مخصوص سادہ'دلنشین اور غیر روایتی انداز میں بنائی گئی یہ ویڈیوز محض دس منٹ کے دورانیہ میں طلبہ کو وہ تصورات سمجھادیتیں جنہیں وہ دو سے تین ماہ کی روایتی تدریس کے بعد بھی سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ طبیعات'کیمیا اور ریاضی اب ایک من پسند اور دلچسپ صورت اختیار کرنے لگے۔ڈیوڈ کی یہ ویڈیوز اکیڈمی کے پچپن'تیس طلبہ کو مدنظر رکھ کرنہیں بنائی گئیں بلکہ اس کی سوچ آفاقی تھی۔وہ اپنا وجود ایک بھاری ذمہ داری تلے دبا محسوس کرنے لگا تھا۔

خلوص اور لگن کی راہ کبھی بھی متوازی نہیں رہ پاتی۔مخالفت اور سازشیں ایک آزمائش بن کر لازماً قوتِ پرواز آزماتی ہیں۔ڈیوڈ کو بھی روایت پرست اداروں اور اساتذہ کی محاذ آرائی کا سامنا کرنا پڑا۔انہیں اس انقلابی قدم سے اپنے اداروں کی بقاء اور معاشی برتری خطرہ میں نظر آنے لگی تھی اس لیے مختلف الزام تراشیوں اور افواہوں کا ایک بازار گرم ہو گیا۔اس کے لیے یہ صورت حال نہایت افسردہ اور دل شکن تھی۔اس کے خلوص نیت پر شبہ بظاہر بے غرض جذبات کی توہین تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مخالفین کو دوٹوک موقف سے واضح کیا کہ اس کی بنائی گئی ویڈیوز کمرۂ جماعت اور اساتذہ کا متبادل کسی صورت بھی نہیں ہوسکتیں۔اس کی یہ کاوشیں محض اساتذہ کی مدد کا ذریعہ ہیں تاکہ وہ بھی طلبہ کو بہترین تعلیمی تصورات فراہم کرسکیں۔

ان کٹھن حالات اور مخالفت کے باوجود اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور Unicoos نامی ایک آن لائن تعلیمی چینل کا آغاز کیا۔اس چینل تک رسائی ہر لحاظ سے بلا معاوضہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے'یونی کوس'اسپین اور لاطینی امریکا میں بے حد مقبول ہوگیا۔

اس چینل کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دسمبر 2012 میں اس کا شمار یورپ میں گوگل پر تلاش کیے جانے والے 25 سر فہرست چینلز میں ہونے لگا اور اگلے دو سال میں'یونی کوس'سو بہترین عالمی چینلز کی فہرست میں شامل ہوگیا۔2014 میں ڈیوڈ نے unicoos.com نامی فری آن لائن اکیڈمی کا اجراء کردیا۔اس کے لیے طلبہ کا ردعمل بہت خوش کن اور مثبت محرک تھا۔اسے عوامی مقبولیت یا کسی بھی سرکاری انعام و کرام سے غرض نہ تھی۔اس کے پیش نظر تو صرف ان بچوں کا بہتر مستقبل تھا جنہیں آئندہ زندگی میں اپنے خاندان'ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھالنی تھی اور یہ مقصد واضح تر سائنسی تصورات اور ٹیکنالوجی پر دسترس کے بنا حاصل کرنے کی سوچ دیوانے کا خواب تھی۔اپنے کمرۂ جماعت اور ویڈیوز میں وہ طلبہ کو بارہا ایک

فاروق قیصر

زندگی ایک تماشا ہے۔ہم سب اس کا حصہ ہیں۔کہیں چھوٹے پیمانے پر اور کہیں بڑے پیمانے پر کٹھ پتلی تماشا جاری ہے۔کس مسئلے کا تعلق کس بات سے ہے،کس بات کا کیا مطلب ہے؟اس طرح کے سوالوں کے ذریعے زندگی کی باریکیوں کو مزاح کے انداز میں پیش کرنے والی ایک ہی شخصیت ہے جس کو ہم فاروق قیصر عرف انکل سرگم کے نام سے جانتے ہیں۔فاروق قیصر بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر ہیں۔پی ٹی وی کی تاریخ میں جب بھی مزاحیہ پروگراموں کی تاریخ لکھی جائے گی،اس میں انکل سرگم کا پروگرام ''کلیاں'' سرفہرست ہوگا۔اس کے علاوہ یہ روزنامہ جنگ میں فکر انگیز کالم لکھتے ہیں،نیشنل کالج آف آرٹس کی وزیٹنگ فیکلٹی میں بھی ہیں۔ملائیشیا میں یونیسیف کی طرف سے انہیں ''ماسٹر پپٹ آف دی ریجن'' کا خطاب بھی ملا۔ان کے کریڈٹ پر بہت سی بہترین تحریریں اور شگفتہ جملے ہیں۔جن کی وجہ سے یہ مزاح کی دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں،ایک شاعر کی آگہی بھی آپ کی شخصیت کا حصہ ہے۔ان کی گفتگو میں تلخی ہے مگر سچ ہے۔ان کے زندگی کو دیکھنے کے زاویے بہت مختلف مگر اچھے ہیں۔

اقتباس:باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے

از:خرم سہیل

بات دہراتا۔ ''اُمید کا دامن کبھی مت چھوڑو۔ اپنی امید کبھی بھی ترک مت کرنا۔ آج، کل، زندگی میں کسی بھی مقام پر نہیں۔''

وہ ان طلبہ کو ناکامی، اپنی ذات پر عدم اعتمادی کے آسیب سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا تاکہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر وہ معاشی خواری کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں۔

'یونیکوس' کی کامیابی کے باوجود مقتدر افراد کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی اکیڈمی کی توسیع کے لیے کوئی شراکت دار میسر نہ آسکا۔ اس افسوسناک امر کی وجہ محض یہ تھی 'یونی کوس' نیک نیتی پر مبنی ایک ایسا تعلیمی چینل تھا جس میں کوئی مالی منفعت شامل نہ تھی۔ ڈیوڈ نے اس رویے پر کبھی حرف شکایت تک ادا نہ کیا۔ ہاں! اس کے دل میں ایک خواہش ضرور تھی کہ اگر وہ معاشی طور پر مستحکم ہوا تو اپنی رقم اساتذہ کی تربیت پر صرف کرے گا۔

ابتدائی مخالفت کے باوجود 'یونی کوس' کی مقبولت نے کئی ریکارڈ قائم کیے۔ اس کی بنائی گئی تقریباً 700 ویڈیوز استعمال کرنے والے افراد کی تعداد سو ملین تک پہنچ چکی ہے۔ یوٹیوب پر 700,000 افراد اس کے چینل سے مستفید ہوتے ہیں جبکہ فیس بک پر استعمال کنندہ کی تعداد 170,000 ہے۔ فی الوقت یونیکوس نے اسپین کے تین بہترین چینلو میں رسائی حاصل کرلی ہے اور کئی اساتذہ اپنی تدریس میں ان ویڈیوز کا استعمال کرتے ہیں۔ قومی سطح پر ڈیوڈ کے اس منفرد سلسلہ کی اہمیت اب مسلمہ ہے۔ چند ماہ قبل اسے 'بہترین یوٹیوبر' کا ایوارڈ دیا گیا۔ گوگل انتظامیہ کی جانب سے یونیکوس کو ہسپانوی معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرنے پر نہ صرف ایک خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا بلکہ ڈیوڈ کو یورپی پارلیمنٹ میں اپنی طویل جدوجہد کی داستان بیان کرنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا۔ یونیکوس واحد ہسپانوی چینل ہے جسے قومی سطح پر کئی بار خصوصی اعزازات ملے ہیں۔ تیس سے زائد ممالک میں پندرہ ہزار افراد اس کے باضابطہ رجسٹری شدہ صارفین ہیں۔

ان گرانقدر کامیابیوں کے باوجود اس کی کئی خواہشات اب بھی تشنہ ہیں۔ وہ بزنس، فنانس، حیاتیات، شماریات کے طلبہ کے لیے بھی اس انقلابی مہم کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پُر خلوص کاوشیں مستحق اور نادار طلبہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ بولیویا سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی نے کسی بھی تعلیمی ادارہ کی مدد کے بغیر محض ویڈیوز سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے امتحانات میں کامیابی حاصل کرلی۔ اسپین ہی کا ایک نابینا متعلم بصارت سے محرومی کے باوجود انہی ویڈیوز کے بل بوتے پر سائنسی تصورات میں کسی بھی نارمل طالبعلم سے کمتر نہیں۔

ڈیوڈ کی اس کٹھن جدوجہد کا لامتناہی سفر اب بھی جاری ہے۔ وہ طلبہ کا مکمل نبض شناس ہے۔ بحیثیت معلم وہ طلبہ سے محض چند گھنٹے کے تعامل کا قائل نہیں۔ طلبہ شب و روز میں کسی بھی وقت واٹس ایپ پر رابطہ کرکے اس سے اپنے تعلیمی مسائل کا حل دریافت کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ پیشانی پر کوئی بھی شکن لائے بغیر انھیں فوری رہنمائی فراہم کردیتا ہے۔

ڈیوڈ اپنی اکیڈمی کے طلبہ کو اسباق میں مسائل کے حل کی نشاندہی کرنے کے بعد غیر محسوس طریقہ سے ان کی انگلی تھامے ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے جہاں وہ خود ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ امتحانات کے دوران ان کے شکوک و شبہات، خوف زائل کرنے کے لیے وہ اپنی تدریس کا دورانیہ بھی بڑھانے میں متامل نہیں رہتا اور یہ سبھی اقدام بلا معاوضہ ہوتے ہیں۔

ریمنڈ برطانوی نژاد ہے۔ زمانہ طالبعلمی ہی سے وہ بہت ذہین، جدت پسند اور ذمہ دار تھا۔ کمپیوٹر کی جادوئی دنیا تسخیر کرنا اس کا جنون تھا لیکن لوحِ تقدیر میں اس کے لیے کچھ اور ہی مقسوم تھا۔ وہ حادثاتی طور پر شعبہ تدریس سے وابستہ ہوا۔ پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس میدان میں دریافت اور تسخیر کا ایک وسیع جہان آباد ہے۔ اس وقت برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی کمپیوٹر کی تدریس روایتی اور غیر ترقی یافتہ تھی۔

انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) سے منسلک ریمنڈ کے لیے یہ صورتِ حال بہت مایوس کن تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب زندگی کے ہر شعبہ میں کمپیوٹر کی اجارہ داری ہے 'غیر ترقی یافتہ اور روایتی انداز میں طلبہ کے ذہن میں بھاری بھرکم اصطلاحات زبردستی ٹھونسنا انھیں اس مشین کے تابع بنانے کے مترادف تھا۔ ریمنڈ نے شب و روز کی محنت کے بعد Microsoft Kinect استعمال کرتے ہوئے تدریس میں تنوع پیدا کیا جس کی رو سے آئی سی ٹی لیکچرز کم خشک اور بے حد دلچسپ بن گئے۔

اس نے روایتی طریقہ کار ترک کرتے ہوئے اپنی جماعت میں ہلکا پھلکا انداز رائج کیا۔ طلبہ کو ہمہ وقت مختلف عملی سرگرمیوں میں

شریک کرنے کے بعد خاطر خواہ نتائج میسر آنے لگے۔ اس کے ذاتی مؤقف کے مطابق معلم روشنی اور توانائی کا منبع ہے۔ روشنی کی رفتار بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ اسی طرح جب معلم اپنے طلبہ کی زندگیاں روشنی سے منور کرتا ہے تو ظلمت کے اندھیرے چھپٹ جاتے ہیں۔ ریمنڈ چیمبرز بھی ایسی ہی روشنی بننے کا خواہشمند تھا۔

اس کی تخلیقی سرگرمیوں سے تدریسی عمل میں تبدیلیوں کی لہر آئی تو اس نے اپنے تجربات قومی سطح پر دیگر اساتذہ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ آئی ٹی کو اپنا ہتھیار بنا کر ایک خصوصی بلاگ قائم کیا۔ اپنا تحقیقی مواد اور وسائل سے متعلق معلومات اس بلاگ پر اپلوڈ کرنے کے علاوہ وہ ٹوئٹر پر بھی 'آئی سی ٹی' اساتذہ سے رابطہ قائم رکھتا۔ اس کے غیر روایتی نظریات، ترقیاتی طرزِ فکر اور جدت پسندی نے بہت جلد تعلیمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرلی۔

ریمنڈ کی اہلیت کی گونج عالمی سطح پر بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ 2012 میں اسے یورپی اساتذہ کی ایک خصوصی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس کے کچھ ہی عرصہ بعد حکومت برطانیہ نے ثانوی سطح پر آئی سی ٹی کا نصاب کمپیوٹر سائنس میں تبدیل کردیا۔ اساتذہ کی اکثریت اس تبدیلی سے بہت خائف اور کسی حد تک عدم تحفظ کا شکار بھی تھی۔ ان معلمین کی معاونت اور پیشہ وارانہ قابلیت میں اضافے کے لیے ریمنڈ کی خدمات حاصل کی گئیں۔

بعد ازاں اس نے اپنے ہم پیشہ افراد کی مزید اعانت کے لیے ایک یوٹیوب چینل کا اجراء کیا۔ اس کی لگن، سنجیدگی اور جدت پسندانہ سوچ نے کمپیوٹر سائنس کے میدان میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اس چینل کے 250,000 سے زائد صارف ہیں۔ اس کی روایت شکنی اور جدید طریقہ تعلیم کی بدولت برطانوی نسلِ نو نے کمپیوٹر سائنس کے شعبہ میں اکثر یورپی اقوام پر برتری حاصل کرلی ہے۔ طلبہ کی شاندار کامیابی اور طرزِ فکر میں تبدیلی ریمنڈ کے لیے مزید تحریک کا باعث بننے لگی۔ اس نے اپنی تخلیق اور تحقیق کا دائرہ وسیع تر کردیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب 'بی بی سی' نے قومی سطح پر اساتذہ کے لیے 'مائیکرو بٹ' وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے اسے معاونت کی پیشکش کی۔

ریمنڈ چیمبرز کی 'بروک ویسٹن اکیڈمی' میں زیرِ تعلیم طلبہ اسی کی صلاحیتوں کا پرتو ہیں۔ حادثاتی طور پر تدریس سے منسلک ہونے والے ریمنڈ کے لیے اپنا کام عشق اور جنون کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ اسے اپنے طلبہ سے بھی بہت محبت ہے۔ معلم و متعلم میں تاعمر برقرار رہنے والا یہ رشتہ اپنی طرز میں منفرد ترین ہے۔ اس کے لیے تدریس ایک مکمل طرزِ فکر و طرزِ زندگی ہے۔ تعلیم کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور معلم بھی ہر روز ایک نئی چیز سیکھتا ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لیے مثبت سوچ، کردار اور لگن سے لیس سپاہ تیار کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ریمنڈ کی ذاتی زندگی بھی توازن، خوشیوں اور نظم وضبط سے گندھی ہے۔ بہترین سوچ سے لیس شریکِ حیات نے اس کے جنون اور جستجو کے سفر میں کبھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی۔ ان دونوں نے باہمی رضامندی سے ایک کیلنڈر مرتب کر رکھا ہے۔ یہ خصوصی کیلنڈر موبائل فون کی یادداشت کے علاوہ گھر کی دیوار پر بھی آویزاں ہیں جس میں معمولی ترین امر کی منصوبہ بندی بھی پہلے سے ہی طے شدہ ہے۔ نظم وضبط کے سلسلہ میں وہ کسی بھی سمجھوتے کا قائل نہیں اس لیے اکثر و بیشتر ایسے لوگوں سے نالاں رہتا ہے جو تدریس جیسے مقدس اور ارفع شعبہ میں در پیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے محض زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔

اس جواں سالہ معلم کو قومی سطح پر کئی ایک ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 2013/14 میں اسے جدید، مستعد اور ذہین ترین ماہرِ تعلیم کا اعزاز دیا گیا جبکہ 2015 میں ٹیکنالوجی میں جدت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے برطانوی قومی تدریسی ایوارڈ کا قرعہ فال بھی ریمنڈ ہی کے نام رہا۔

میری کرسٹائن

قوم و وطن پرستی ایک جبلی جذبہ ہے جو ہر انسان کی رگوں میں سمایا ہوتا ہے۔ تاہم رنگ و نسل، وطن و قوم سے مبرا ہو کر کل انسانیت کی بھلائی کے لیے سرگرم رہنے والے افراد بہت کم ملتے ہیں۔ ایسے ہی نادر افراد میں جرمن کی 33 سالہ معلّمہ 'میری کرسٹائن' بھی شامل ہے۔

میری ایک توانا، غیر متعصب اور مقناطیسی شخصیت کی حامل ہے۔ میونسٹر یونیورسٹی سے ریاضی اور سپورٹس سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی درس و تدریس سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ روایتی تعلیمی نظام بچوں کے نرم و نازک وجود اور لطیف نفسیات پر کتابیں کسی بوجھ کی طرح لاد کر انہیں بیزاری اور یقینی تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ان روایتی طریقوں سے شعوری بغاوت کرتے ہوئے اس نے اپنے طلبہ کو 'تعلیم بذریعہ کھیل' سے متعارف کروایا۔

اس روایت شکنی کے نتائج مَیری کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ طلبہ میں گہری دلچسپی اور تجسس پروان چڑھنے لگا۔ اسکول کو 'جیل' اور 'قید خانہ' تصور کرنے والے متعلمین ان غیر روایتی طریقوں کے سحر میں جکڑے مکتب سے محبت میں مبتلا ہوگئے۔

مَیری کرسٹائن قدرتی طور پر ایک عظیم رہنما کی تمام تر صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ اس کے لیکچر طلبہ پر فسوں طاری کردیتے ہیں۔ طریقہ تعلیم میں جدت کی قائل ہونے کے ساتھ اسے ننھے بچوں کی نفسیات پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کے کمرۂ جماعت مچھیرے کے جال کی مانند ہیں جس میں ایک بار جکڑ لیے جانے کے بعد رہائی کسی صورت بھی ممکن نہیں ہوتی۔

طلبہ گروہی سرگرمیوں کی صورت میں کام کرتے معاشرتی تعامل سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ مَیری کی شخصیت ان کے لیے کسی مسیحا سے کم نہیں۔ وہ اسے اپنے گھریلو اور ذاتی مسائل بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور اس کے فراہم کردہ مشوروں اور تجاویز پر دل و جان سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔

مَیری کرسٹائن کی ذات کا ایک اور خوبصورت پہلو مہاجر بچوں سے دلی لگاؤ اور ہمدردی ہے۔ اپنی شخصی شناخت، اسبابِ زندگی، گھر بار اور خوابوں سے منہ موڑے کسی نئی سرزمین میں بسنا بلاشبہ اک بہت کٹھن امر ہے۔ اس کے بعد مہاجر کی قسمت ایک نئی آزمائش کا آغاز کردیتی ہے۔ نئے لوگ، ماحول، اقدار، ثقافت اور سرزمین میں اس کا مزاج اور فطرت کی جڑیں پیوست ہونا بھی قطعی سہل نہیں ہوتا۔

ہجرت کے اس دردناک عمل میں بچے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ اپنے نئے ماحول میں معاشرتی تعامل حاصل نہ کر پائیں تو شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت ذہنی شکستگی اور خود اعتمادی سے محرومی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ مَیری کی خصوصی توجہ بھی انہی بچوں پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ اپنی محبت، شفقت اور خداداد صلاحیتوں سے انہیں زندگی کی طرف دوبارہ مائل کر کے ذاتی وقار اور کردار کی نئی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ اس کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں ایران اور دیگر ممالک کے مہاجر بچے جرمن نژاد بچوں سے بآسانی گھل مل گئے ہیں۔ اپنی بیزاری اور اجنبیت فراموش کیے وہ بہترین زندگی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔

مَیری کرسٹائن کا ذاتی اور پیشہ وارانہ فلسفہ زندگی بہت سادہ ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ تعلیم ہی واحد ہتھیار ہے جس کے ذریعہ معاشرتی ناہمواریوں کو کند کیا جاسکتا ہے۔ کھیل کود کے ذریعہ بچوں میں قوتِ برداشت، شکست تسلیم کرنے کی جرأت اور ہار جیت کے جذبہ سے قطع نظر جہد مسلسل کی لگن پروان چڑھائی جاسکتی ہیں۔ سماجی رتبہ سے محروم بچوں، مہاجر طلبہ کے علاوہ افریقی ممالک میں سیاست و استحصال کی بھینٹ چڑھنے والے متعلمین کو زندگی کی رنگینیوں کی طرف واپس لانے کا سہرا صرف مَیری ہی کے سر ہے۔

اس کی ساحرانہ شخصیت قومی اور بین الاقوامی سطح پر یکساں مقبول ہے۔ جرمنی، نائجیریا اور دیگر افریقی اسکولوں کے باہمی تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے انتظامیہ کا پہلا انتخاب مَیری ہی ہوتی ہے۔ اُمید، خوشی اور مساوات کا درس دینے والی اس خاتون کی کاوشیں انمول ہیں۔ گلوبل ٹیچرز پرائز میں نامزدگی کے علاوہ اسے سرکاری طور پر بہترین رہنما معلمہ کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

ٹریسی۔ این ہال

اس روئے ارض میں بسی انسانیت میں مظلوم ترین قوم بلاشبہ سیاہ فام افراد ہیں۔

ماضی بعید سے تادم تحریر ان کی حالت زار میں کبھی کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ماضی میں سیاہ فام غلاموں کے لیے باقاعدہ منڈی لگائی جاتی اور ان مجبور و بے کس افراد کی اس طرح خرید و فروخت کی جاتی گویا وہ انسانیت کے درجہ میں شمار ہی نہیں ہوتے۔ مغربی سامراجی طاقتوں نے افریقی اور دیگر سیاہ فام ممالک میں نوآبادیاں قائم کر کے یہاں استحصال اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا تھا۔ ان ممالک کے وسائل پر مکمل قابض ہونے کے بعد مقامی آبادی کو حقیر کیچوؤں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔

مختلف ادوار میں ان گنت دردمند افراد نے ان مظلوموں کی مسیحائی کا بیڑہ اٹھایا۔ بہتری و ترقی کی رفتار سست ہی سہی لیکن ہر خطہ میں اب بھی جاری ہے۔ سپینش ٹاؤن، جمیکا میں یہ کارِ خیر ٹریسی۔ این ہال نے سنبھال رکھا ہے۔

جمیکا کی عسرت زدہ، بنیادی ضروریات سے محروم زندگی کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ ٹریسی کا بچپن اور تعلیمی حالات بھی

نہایت دگرگوں تھے۔ وہ ''ڈسلیکسیا'' نامی بیماری کا شکار تھی۔اس بیماری میں طالبعلم متوازن ذہانت کے باوجود بہت سے مسائل میں مبتلا ہوتا ہے۔اسے الفاظ کے ہجے کرنے ان کی شناخت' تلفظ کی ادائیگی' الفاظ کی لکھائی' ذہن میں ان کے تلفظ کی گونج محسوس کرنے میں پریشانی کے علاوہ بآواز بلند ادائیگی میں بھی بہت دشواری ہوتی ہے۔ڈسلیکسیا کا قوت سماعت و بصارت میں عدم توازن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہ ایک جینیاتی اور ماحولیاتی مسئلہ ہے۔عموماً یہ منفرد بیماری اسکول میں ابتدائی طور پر ہی تشخیص کر لی جاتی ہے لیکن ٹریسی کی بدقسمتی دیکھیے کہ اسے کوئی مسیحا نہ ملا۔ اپنی غیر تشخیص شدہ اس محرومی کے لیے کوئی بھی سہولت وعلاج میسر نہ آسکا۔

پڑھائی لکھائی میں حائل ان ناقابلِ عبور رکاوٹوں سے جنگ آزما ٹریسی نے اسکول تعلیم مکمل کرنے کے بعد خودحرکی مشینوں (Automotive) کے ایک گیراج میں فنی تعلیم سیکھنے کا آغاز کیا تو اسے علم ہی نہ تھا کہ مجبوری کے عالم میں لیا گیا یہ فیصلہ مستقبل قریب میں اس سمیت سینکڑوں طلبہ کی زندگیوں کا رخ تبدیل کردے گا۔

گیراج میں ملنے والی اس فنی تربیت نے ٹریسی کے دل میں تدریس کے لیے محبت اجاگر کردی۔اپنی علمی صلاحیت میں اضافہ کے لیے اس نے جمیکا کے ایک ایسے کالج میں داخلہ لیا جہاں پیشہ وارانہ تعلیم دی جاتی تھی۔اگلے تین سال میں وہ اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑتی گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

ٹریسی کے مثبت رویہ اور طرز فکر نے آغاز ہی سے اپنے جوہر دکھانے شروع کردیے۔اوّلین طور پر اسے جن طلبہ پر مشتمل جماعت کی تدریس تفویض کی گئی' ان کا سابقہ ریکارڈ بے حد خراب تھا۔اساتذہ کے نقطۂ نظر میں وہ 'ناقابلِ اصلاح' بچے تھے۔ان 30 لڑکوں پر مبنی جماعت کے لیے ٹریسی نے ان تھک محنت کی۔ان کی ذہن سازی' کردار کی تعمیر اور پھر شاندار تعلیمی نتائج کا حصول ایک بے مثال کارنامہ تھا۔

اس نے اپنی جماعت میں ایک کتب خانہ قائم کرلیا اور ہر کتاب کی تکمیل کے بعد طلبہ سے تبصرہ وباہمی گفتگو کے لیے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔دسویں گریڈ کے وہ بھی بچے مثبت تبدیلیوں کی زد میں آگئے۔اگلے گریڈ میں منتقلی کے بعد یہ تبدیلی ان پر اس قدر حاوی ہوئی کہ آٹھ لڑکوں نے اسکول طائفہ میں شمولیت اختیار کرلی اور ایک طالبعلم 'اسکول ہیڈ بوائے' کے عہدہ پر فائز ہوگیا۔خودحرکتی پیشہ وارانہ امتحانات میں اسکول کی تعلیمی تاریخ میں پہلی بار ٹریسی کی اس جماعت نے 95 فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے۔

تعلیمی برتری سے قطع نظر سیاہ فام ٹریسی اپنے طلبہ کے دلوں میں انسانیت کی خدمت اور تڑپ بھی پیدا کرنا چاہتی تھی۔اس نے طلبہ کے باہمی تعاون و تعامل سے بے گھر' سڑکوں اور گلیوں میں رہائش پذیر افراد کے لیے طعام کی فراہمی کا آغاز کیا۔جونیئر خودحرکتی کلب اور اسکول میگزین کمیٹی کے لیے اس کی محنت وکوششیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔

گذشتہ سالوں میں ٹریسی کے طلبہ اس سے سیکھی گئی تمام تر پیشہ وارانہ اقدار سمیٹے جمیکا کے مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز ہوچکے ہیں۔پولیس افسران' اسکوبا ڈائیورز' ہوٹل مینیجرز اور شیف کے علاوہ خودحرکتی صنعت میں موجود یہ طلبہ اپنی اس روایت شکن معلّمہ سے کیے گئے چند وعدوں پر آج بھی کاربند ہیں۔زندگی میں ہمیشہ ترقی کی جانب گامزن اور مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا درس وہ کبھی فراموش نہ کرپائے۔

ٹریسی کے لیے کمرۂ جماعت اپنی ورکشاپ کے مترادف ہے۔کمرے کی چار دیواری میں جابجا ایسے چارٹس آویزاں کیے گئے ہیں جن پر سابقہ طلبہ کی شاندار کامیابیاں اور حالیہ متعلمین کے مقاصد زندگی' خواب اور ارادے جلی حروف میں رقم ہیں۔ان طلبہ کے مابین دوستانہ مقابلوں میں بہتر گریڈز اور نمایاں بہتری حاصل کرنے والے بچوں کو ٹریسی ذاتی سطح پر تحائف اور انعام وکرام سے نوازتی۔

وہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بہت سے اداروں سے منسلک رہی۔اور ہر ادارہ میں اس کی لگن' ہمت' محنت اور کامیابی کا تناسب یکساں رہا۔اس نے خودحرکتی مشینی صنعت سے وابستہ بااختیار اور اثرورسوخ کے حامل افراد تک ذاتی رسائی کے بعد انہیں ہر ممکن طریقہ سے قائل کیا کہ ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے وظائف فراہم کیے جائیں۔

وسائل کی شدید کمی کے باوجود اس نے انتہائی خوش سلیقگی سے تدریسی مواد کی فراہمی میں کبھی تعطل نہ آنے دیا۔لگن وخلوص کا یہ عالم ہے کہ تعطیلات گرما میں کمتر معاشی

خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے وہ خصوصی سمر کیمپ منعقد کرتی ہے۔ ٹریسی کا مقصد زندگی صرف اپنی قوم اور نسلِ نو کی ذہنی مضبوطی اور تعلیمی برتری ہے۔ اس کی کاوشوں کو خاطر خواہ پذیرائی تو نہ مل سکی لیکن محدود وسائل کے مطابق مقامی و قومی سطح پر اس کی خدمات مختلف ایوارڈز کی صورت میں سراہی جاتی رہی ہیں۔

گلوبل ٹیچرز پرائز کے لیے نامزدگی بلاشبہ اس کے خوش کن خوابوں کی تعبیر جیسی تھی لیکن ٹریسی یہ انعامی رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔

ویمرسن ڈسلوا نوگیرا Wemerson Dasilva Nogueira

ویمرسن 1990 میں برازیل کے علاقے ''نووا وینیشا'' میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین کا تعلق کاشتکار طبقے سے تھا۔ سات بہن بھائیوں میں ویمرسن سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی زندگی میں اضافی لاڈ پیار اور نازنخروں کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اس کے سبھی بہن بھائی سرکاری اسکولوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ ویمرسن کی دلچسپی کا محور حیاتیاتی سائنس تھا۔ اس نے گریجویشن کی ڈگری کے فوری بعد ہی تدریس کا آغاز کردیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے مضافاتی علاقہ میں واقع جس اسکول میں پڑھانے کا موقع میسر آیا، وہاں جرائم کی شرح بے حد بھیانک تھی۔ اسکول میں زیرِ تعلیم طلبہ کے والدین کا سکہ بند مجرم تھے۔ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بچے بھی کم عمری ہی سے اسی راہ پر گامزن تھے۔ اسکول اساتذہ انتہائی مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔ تشدد اور منشیات کی ترسیل ایک ناسور کی طرح اس معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ کم عمر بچے بھی منشیات کی خرید و فروخت میں ملوث رہتے۔

پرائمری جماعت کے بعد اسکول چھوڑنے کی شرح پچاس فیصد سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ اس صورتِ حال میں باقی ماندہ طلبہ کو پڑھائی میں دلچسپی رہتی بھی تو کیونکر؟

ویمرسن ان حالات میں محض افسردگی اور آزردگی محسوس کرنے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا قائل نہ تھا۔ وہ عملی سوچ کا حامل شخص تھا۔ اس نے دیگر اسکولوں کے سربراہان اور اساتذہ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایک نئے سماجی فلاحی منصوبہ 'Young Scientists:Designing a New Future' کے مندرجات پر کام کرنے کا آغاز کیا۔ اس منصوبہ کا مقصد طلبہ میں یہ احساس اجاگر کرنا تھا کہ اسکول اچھا شہری بننے کی تربیت کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے کردار میں تبدیلیوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس منصوبہ سے قطع نظر ویمرسن نے ذاتی طور پر بھی سائنسی مضامین کی تدریس دلنشین، موثر اور دیرپا بنانے کے لیے نت نئے تجربات کا آغاز کردیا۔

اپنی تدریسی عمل میں تحریک اور طلبہ میں توانائی واتحاد پیدا کرنے کے لیے اس نے نصاب میں 'پیروڈی گانے' شامل کر دیئے۔ کمرۂ جماعت میں 'دوری جدول' (Periodic Table) کی بور اور خشک ترین سرگرمی میں دلچسپی کے لیے وہ طلبہ کو نزدیکی دریائی علاقہ میں لے گیا تاکہ انھیں آبی آلودگی، گدلے کیچڑ سے پیدا ہونے والی ماحولیاتی آلودگی کا براہِ راست مشاہدہ کرواسکے۔

بعدازاں پانی میں موجود کیمیکلز کے تجزیہ کے لیے مطلوبہ نمونے اسکول لیبارٹری میں لے جائے گئے۔ اس پانی سے پیدا ہونے والے طبی و ماحولیاتی مسائل سے واقفیت کے لیے مقامی آبادی کا انٹرویو بھی لیا گیا۔ ان حقائق کی روشنی میں وفاقی یونیورسٹی UFES کی لیبارٹری میں بھی کئی ایک دورے کرنے کے بعد ساحلی علاقوں میں رہائش پذیر آبادی کے مسائل کا منطقی حل تلاش کرلیا گیا۔

ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اگلے چار سال میں نوّے فیصد طلبہ منشیات و جرائم کی دلدل سے آزاد ہو گئے۔ ویمرسن کا یہ اسکول برازیل کے بہترین اداروں میں شامل ہو چکا ہے اس اسکول ہی کی بدولت ایسے ملحقہ علاقہ کی شہرت میں مثبت تبدیلی پیدا ہوئی ہے جہاں منشیات کی ترسیل، پسماندگی اور تشدد کے باعث دیگر علاقوں کے رہائشی قدم دھرنے سے بھی سخت خوفزدہ رہتے تھے۔

ویمرسن نے پیشہ وارانہ زندگی میں اپنے فرسودہ تعلیمی نظام کی روایت شکنی کرتے ہوئے تاریخی اقدام اٹھائے۔ اس نے معاشی دباؤ کے شکار طلبہ کو ہر قسم کی اخلاقی اور مالی مدد فراہم کرنے کے علاوہ ہم پیشہ افراد کی تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس کی زندگی محض حیاتیاتی سائنس پر کامل عبور اور اپنے معاشرتی نظام میں اصلاح کے لیے وقف ہے۔ ویمرسن نے

اپنے گھر میں بھی ایک سائنس لیب بنا رکھی ہے جہاں نت نئے تجربات کرتے رہنے سے ہی اس کے اضطراب میں کمی ہوتی ہے۔

ستائیس سالہ یہ معلم محض چوبیس سال کی عمر میں ہی برازیل کے دس بہترین اساتذہ کی فہرست میں شمولیت اور خصوصی ایوارڈ اپنے نام کر چکا ہے اور قرائن یہی بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی مخلص جدوجہد برازیل میں یقینی انقلاب کا سبب بن جائے گی۔

مائیکل وامایا

افریقی نژاد مائیکل کے لیے زندگی محض تاریکی، پریشانیوں اور تکالیف کا دوسرا نام تھی۔

تاریک براعظم سے تعلق رکھنے والے مائیکل کے سبھی خواب یکے بعد دیگرے منتشر ہوتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب تو بچپن ہی سے اس کی آنکھوں میں بسا تھا۔ وہ مشہور افریقی 'وکٹوریہ جھیل' کے نزدیک ایک اسکول میں اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے سرگرداں تھا۔

اسکول آمدورفت کے دوران جھیل کے شفاف پانی کا منظر اکثر اس کے قدم ساکت کر دیتا اور وہ کتنی ہی دیر اس میں خوبصورت، خوشحال اور مثالی زندگی کے عکس دیکھتا رہتا۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اس کی یہ دیرینہ آرزو بھی ملیامیٹ کر دی۔ ہائی اسکول کے بعد مزید تعلیم کے اخراجات اس کی استطاعت میں ہی نہ تھے۔ اس لیے پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ وہ بہت دلبرداشتہ ہوگیا۔

انہی دنوں کینیا کا ایک ثقافتی طائفہ افریقی دورہ پر موجود تھا۔ مائیکل اپنے ماحول سے فرار کا خواہشمند تھا۔ اس نے اس طائفہ میں ایک کامیاب آڈیشن دیا اور رقص کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیروبی منتقل ہوگیا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ 2009 میں ایک فلاحی منصوبہ سے منسلک ہوگیا۔

اس خصوصی منصوبہ سے وابستہ برطانوی انتظامیہ پسماندہ افریقی ممالک کے یتیم، بے آسرا بچوں کے لیے فنون لطیفہ کی تعلیم عام کرنا چاہتی تھی۔ کینیا کی غربت، پسماندگی اور بدترین معاشی حالات تو ویسے بھی مسلمہ ہیں۔ نیروبی سے پانچ کلومیٹر دور ''کیبرا'' کا علاقہ اس ضمن میں سرفہرست ہے۔ کچی آبادی پر مشتمل یہ علاقہ انسانیت کی تذلیل اور بے بسی کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ 700,000 نفوس انتہائی غربت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ بے روزگاری کی شرح آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ عوام کی یومیہ اُجرت ایک ڈالر سے بھی کم ہے۔ ایچ آئی وی ایڈز میں مبتلا لوگوں کی تعداد ناقابل شمار ہے۔ دیگر شہریوں پر جانی اور جنسی حملے تو ایک معمول بن چکے ہیں۔ چنیدہ تعلیمی ادارے طلبہ کی راہ تکتے رہتے ہیں کیونکہ والدین کے لیے بچوں کے تعلیمی اخراجات کا تصور کسی عیاشی سے کم نہیں۔ زندگی کی بنیادی سہولیات نایاب ہیں۔ بجلی، صاف پانی اور طبی سہولتیں ان کے لیے ایسے خواب کی مانند ہیں، جس کی تعبیر ناممکن ہے۔

ان حالات میں مائیکل کا بچوں کو ''بیلے رقص'' (ایک ایسا رقص جس میں قصے کا روپ دھار کر پریوں کا ناچ دکھایا جاتا ہے) کی تعلیم دینے کا تصور ہی انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس خواب سے دستبرداری کے لیے کسی صورت بھی تیار نہ تھا۔ وہ کیبرا، متھر اور نیروبی کی دیگر کچی آبادیوں میں ٹین کی تپتی چھتوں تلے برہنہ پا انہیں رقص سکھانے لگا اور پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اس کے طلبہ 'کینیا نیشنل تھیٹر' جیسے کئی قومی شہرت یافتہ مقامات پر رقص مقابلوں میں فاتح قرار پانے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔

مائیکل ایک ساحرا تالیق اور رہنما تھا۔ اس نے غربت، جبر، استحصال اور پسماندگی کی دلدل میں گھرے بچوں کو زندگی میں ایک نیا اور منفرد مقصد عطا کر دیا۔ وہ پیشہ وارانہ رقص کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں سماجی و اخلاقی ضوابط سے بھی آگاہی فراہم کرنے لگا۔ مسافت کٹھن ہی سہی لیکن ناممکن بہرحال نہ تھی۔ اس کی محنت اور لگن رنگ لانے لگی۔ نفسیاتی، اعصابی
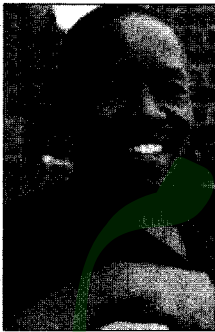
شکستگی اور اخلاق باختگی کا خاتمہ ہونے لگا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب نابالغ بچیوں میں حمل کی شرح میں واضح کمی کے علاوہ طلبہ میں مایوسی، افسردگی اور عدم اعتمادی اپنے وجود پر شرمسار ہونے لگی۔

مائیکل وامایا کی لامتناہی جدوجہد آج بھی اسی جذبہ اور لگن سے جاری ہے۔ Valley View Academy میں تقریباً آٹھ سو طلبہ کو پیشہ وارانہ تعلیم دینے کے ساتھ وہ انہیں ذاتی وقار، خودشناسی، خوداعتمادی اور مقاصد زندگی کے حصول کی راہیں بھی متعین کر رہا ہے۔ زیرتعلیم طلبہ ثقافتی طائفوں کے

ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہیں اور کامیابی سمیٹنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کر کے مائیکل کے خواب جی رہے ہیں۔

ڈاکٹر کین سلبرن Ken Silburn

چمکدار و نایاب ہیرے ہمیشہ کوئلوں کی کان میں ملتے ہیں۔سڈنی کے مضافاتی علاقہ سے تعلق رکھنے والا 'کین سلبرن' بھی ایسا ہی ایک ہیرا ہے۔اس کا بچپن معاشی تنگدستی اور مسائل کے انبار میں چپکے سے بیت گیا۔عہد شباب میں خوش قسمتی کے باعث اسے بہت جدت پسند اور ذہین اساتذہ کی قربت میسر آئی۔وہ اخلاقی طور پر ان معلمین کی محبت' محنت اور شفقت کا مقروض بن چکا تھا اس لیے شعبہ تدریس اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کین نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز' شعبہ امراضیات' (pathology) سے کیا۔کچھ عرصہ فوج کے ساتھ کام کرنے کے بعد اس کا اضطراب شدید ہونے لگا۔اس قرض کی ادائیگی کے لیے وہ اپنے جیسے سینکڑوں طلبہ کے لیے ایک مسیحا بننا چاہتا تھا۔سماجی و معاشی مسائل سے نبرد آزما خاندان اور بچوں کی محرومیوں کا کرب کین سے بہتر بھلا کون سمجھ سکتا تھا؟

آسٹریلوی نظام تعلیم میں ایک انقلاب در آنے کے لیے پوری قوت سے پر تول رہا تھا۔

سائنسی مضامین کی تدریس میں موجود تنوع' مشکلات' دلچسپیاں اور کٹھنائیاں سر کرنے کے لیے اس نے پندرہ سال قبل سڈنی کے جنوب مغربی مضافاتی علاقہ میں Casula High School میں شمولیت اختیار کی تو مسائل کا ایک انبار اس کا منتظر تھا۔اس وقت بارہ سال سے متجاوز اکثر بچے سائنس سے شدید بیزاری اور نفرت کا شکار تھے۔اس اسکول میں محض آٹھ عدد بچے سائنسی شعبہ میں موجود تھے۔طلبہ کا یہ مجموعی رویہ ایک ترقی یافتہ اور بہترین آسٹریلوی مستقبل کے لیے شدید خطرہ کی علامت تھا۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے کین نے بچوں کا گہرا نفسیاتی مشاہدہ شروع کیا اور پھر اسے علم ہوا کہ سات سال کی عمر میں پہنچنے کے بعد کسی بھی طالبعلم کی ذہنی نشوونما میں تین تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔وہ ڈائنوسار' خلائی علم اور دھماکا خیز مواد میں گہری دلچسپی لینے لگتا ہے۔ڈائنوسار کی نسل نابود ہوئے تو اب صدیاں بیت چکی تھیں' گمراہ کن جماعت اور تعلیمی اداروں میں دھماکا خیز مواد کی تیاری اور اطلاق بھی کسی صورت ممکن نہ تھا۔کین نے 'خلائی علم' کے ذریعہ ان کی ذہنی الجھنیں اور سائنسی مضامین سے متعلقہ نفسیاتی گتھیاں و خوف زائل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

برسہا برس کین سلبرن اپنے اسباق میں سمعی و بصری معاونات کا استعمال کرتا رہا۔اس کے موضوعات میں تنوع ہوا کرتا۔ماحولیاتی اور خلائی سائنس سے متعلقہ مسائل سے آگاہی دیتے اس کی ساحرانہ تدریس نے آسٹریلوی نسلِ نو کو کردار اور پیشہ وارانہ زندگی میں ایک نئے اوج تک پہنچا دیا۔محنت شعاری ان کا وتیرہ بن گئی۔اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب سائنسی شعبہ میں طلبہ کی تعداد 86 سے متجاوز کر گئی۔

اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور ذہانت کے بل بوتے پر ان گنت طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے قومی یونیورسٹیوں کی جانب سے وظائف مہیا کیے جانے لگے۔

کین سلبرن کی تدریس میں 'تعلیم برائے عمل' نے ہی طلبہ کو نت نئے تجربات کی طرف مائل کیا۔ان کا رجحان آبی میزائل بنانے کی طرف بڑھنے لگا۔سالہا سال سے وہ Casula High School میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سائنسی پیشہ وارانہ اہلیت میں کامل و یکتا اساتذہ کی ایک ٹیم کا سربراہ ہے۔اس ٹیم کے ارکان نے باہمی مشاورت اور محنت سے ہائی اسکول طلبہ کے لیے ایک افزودگی منصوبہ iSTEM(invigorating Science,Technology,Engineering and Mathematics) تشکیل دیا۔لیکن اس منصوبہ کے مندرجات صرف مقامی طلبہ تک محدود نہ تھے بلکہ آسٹریلیا کے طول و عرض میں دیگر اداروں اور جامعات کو بھی شامل کیا گیا۔یہ سبھی طلبہ جب ایک مخصوص مقام پر اکٹھے ہوتے اور اپنے ہم عمر افراد کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے بھی اپنی تحقیق و ایجادات پر بحث و مباحثہ کرتے تو ان کے ذہنی افق میں وسعت اور کئی ایک تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں۔

اس اسکول کے طلبہ کو ''امریکی خلائی اکیڈمی'' میں واقع 'خلائی کیمپ' میں شمولیت کے مواقع کی فراہمی نے ان کے

سابقہ خوف وخدشات مزید زائل کیے۔ اس کیمپ میں چھ دن کا قیام ایک یادگار تجربہ ہوتا تھا۔ انھیں خلائی علم کی عملی باریکیاں سکھائی جاتیں۔ اکیڈمی کے مخصوص ماحول میں وہ ذہنی طور پر 'خلاء باز' کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں اور یہ یادگار تجربہ تاعمر ان کے ذہن پر مثبت تحریک بن کر حاوی ہو جاتا ہے۔

آسٹریلوی حکومت اور محکمہ تعلیم کین سلمبرن کی ان صلاحیتوں کے ہمیشہ ہی سے قدر دان رہے ہیں۔ اسے تین رکنی آسٹریلوی اساتذہ کی اس ٹیم میں بھی شامل کیا گیا جو ناسا خلائی پروگرام اور مریخ میں مہم جوئی کے لیے تشکیل دی گئی سوسائٹی میں امریکی انتظامیہ کی معاون تھی۔

بین الاقوامی خلائی منصوبوں میں شمولیت کے باوجود کین کا دل اپنی نسلِ نو کے مسائل سے مضطرب رہتا۔ ثانوی سطح پر طلبہ میں تبدیلی پیدا کرنے کے بعد اس نے پرائمری نظام تعلیم کے بنیادی ڈھانچے میں 'جراحی' کا آغاز کر دیا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب طلبہ کو بآسانی سائنسی مضامین کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ذہن بہت زیادہ متجسس ہوتے ہیں۔ ذاتی تجربات انہیں بے حد بھاتے ہیں۔ اس موقع پر اگر ان کی ذہنی تناؤ کا رُخ موڑ دیا جائے تو اس کے ثمرات ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح تک پہنچ کر انقلاب برپا کر دیتے۔

مقامی پرائمری اساتذہ کی مدد کے لیے کین اور اس کی ٹیم نے انہیں مکمل رہنمائی فراہم کی۔ نصاب میں مجوزہ تبدیلیوں کے علاوہ سہل انداز میں تدریس کے لیے ان اساتذہ کو خصوصی تربیت فراہم کی جاتی۔ کین ذاتی طور پر ان اسکولز کے دورے کرتا تھا۔ ان نوعمر بچوں کو پڑھانا' سوالات کے تسلی بخش جواب دے کر انہیں مختلف سرگرمیوں کی طرف مائل کرنا اس کے لیے سنسنی خیز اور یادگار لمحات ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر کین سلمبرن اپنی انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بیس سال قبل آسٹریلیا کی Regional Science Teachers Association کا حصہ بنا اور گزشتہ بارہ سال سے وہ اس تنظیم میں صدارتی عہدہ پر بھی فائز ہے۔ آسٹریلوی نظام تعلیم میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی سے کسی طور بھی کم نہیں۔ دیگر سائنس اساتذہ کو باقاعدگی سے تربیتی ورکشاپ میں کمرۂ جماعت میں اسباق دینے کے طریقہ کار سکھانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ نومنتخب شدہ اساتذہ بھی اس کی تربیت کے بغیر اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کسی صورت نہیں کر سکتے۔

قومی سطح پر کین سلمبرن نے بے شمار ایوارڈز حاصل کیے ہیں لیکن 2015 میں ''پرائم منسٹر سائنس ایوارڈ'' میں فتح اور رواں برس ''گلوبل ٹیچرز پرائز'' کے لیے نامزدگی کے لمحات اس کی زندگی میں بے حد انمول ہیں۔

بویا یانگ Boya Yang

تدریس سے محبت اور خلوص چینی نژاد بویا یانگ کی تین نسلوں پر محیط ہے۔

اس کے دادا' دادی اور والدین کے بعد مسیحائی کی تڑپ بویا کے لہو اور خمیر میں شامل ہے۔ اسکول اس کے لیے دوسرا گھر تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ ذہانت اور چہرہ شناسی کی خوبیوں سے مالا مال تھی۔

اسکول کے کمرۂ جماعت میں بیٹھے طلبہ اور پھر اس کے گھر میں رہنمائی کے لیے آنے والے بچوں کے معصوم چہروں اور آنکھوں میں جھلکنے والی پریشانی' اضطراب اور عدم اعتمادی اس سے کبھی بھی پوشیدہ نہ رہی تھی۔ کم عمر بویا ان کی اس حالت زار پر بہت افسردگی و آزردگی محسوس کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کی ذہانت نے اسی کے ہم عمر ان ننھے فرشتوں کی ذہنی کشیدگی کا راز دریافت کر لیا۔

وہ بھی طلبہ امتحانات سے خائف رہتے تھے۔ امتحانات کا آسیب ان کے اعصاب پر اس شدت سے حاوی رہتا تھا کہ اساتذہ کا پڑھایا گیا نصابی مواد ان کے ذہنوں سے کسی حرف غلط کی طرح مٹ جاتا۔ نتائج میں تنزلی اور ناکامی بسا اوقات انہیں زندگی سے ہی کوسوں دور لے جایا کرتی تھی۔

دوسروں کے مشاہدہ اور رہنمائی کے برعکس کسی بھی انسان کا ذاتی مشاہدہ اور غور و فکر سے اخذ کیے گئے نتائج فطری طور پر بہت پُراثر اور گہرے ہوتے ہیں۔ آگہی کا عذاب اپنی ذات پر جھیلنے والے افراد ہی اکثر دوسروں کے درد کا درماں بنتے ہیں۔ طلبہ کی ذہنی کشمکش کی اس آگہی نے بویا کی زندگی کا رخ بھی بدل دیا تھا۔

ان حالات میں پروان چڑھنے والی اس نرم و نازک چینی گڑیا نے اپنے مستقبل کا فیصلہ آگہی کے اسی لمحہ میں کر لیا تھا۔ اپنے ہم قوم افراد کی مسیحائی کے لیے وہ نفسیات کی معلمہ بن گئی۔ اور پھر

اسے طلبہ کی اس ذہنی اذیت کی اصل توجیہات کا علم ہوا۔

چینی نظامِ تعلیم میں امتحانات پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ طلبہ اپنے روزمرہ وقت کا تین چوتھائی سے زائد حصہ پڑھائی اور کتب بینی میں سرف کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ نتیجتاً وہ اعصابی دباؤ اور ذہنی تھکاوٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس خارجی دباؤ کے علاوہ انہیں ایک داخلی انتشار کا سامنا بھی رہتا تھا۔ اور بلاشبہ یہ ایک ایسا آفاقی المیہ ہے جو روئے ارض کے ہر خطہ میں یکساں موجود ہے۔

''ٹین ایج'' (13 تا 19 سالہ عمر) کی تباہ کاریاں' جذباتی اور نفسیاتی مسائل کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اس جذباتیت سے زندگی میں کم از کم ایک دفعہ تو ضرور گذرتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کی دانست میں یہ انسانی زندگی کا مشکل ترین دور ہوتا ہے۔ بچپن کا جنکشن ختم ہونے کے بعد نوجوانی کی آمد ہوتی ہے تو بچہ اپنی ذات کو بے حد معتبر اور عقل کُل تصور کرنے لگتا ہے۔

اصل کشمکش اور المیہ اس وقت جنم لیتا ہے جب والدین دیگر اقارب اپنے سابقہ جذبات کے پیشِ نظر ان سے بچوں ہی کی طرح برتاؤ جاری رکھتے ہیں۔ انہیں روک ٹوک اور مختلف پابندیوں کے دائرہ میں مقید رکھ کر اپنے تئیں ان کی بھلائی کرتے ہیں لیکن یہی برتاؤ اور پابندیاں بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ مناسب رہنمائی کی عدم موجودگی انہیں مزید تباہی کی طرف دھکیلنے لگتی ہے۔ والدین اور خاندانی اقدار سے متنفر ہوتے ان بچوں کا رجحان دوستوں کی طرف کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اڑان بھرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

مخالف جنس کے لیے کشش میں اضافہ بھی اسی مخصوص عمر کی ایک سوغات ہوتی ہے۔ نوجوانی کے خمار میں مبتلا یہ نادان بچے جبلی تقاضوں سے مغلوب ہو کر صنفِ مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں اور تسخیر کا جنون انہیں جنسی لذت کی وادیوں کا راہی بنا دیتا ہے۔

بویا کے لیے سب سے کربناک لمحہ یہی تھا کہ چینی کم عمر لڑکیوں میں بغاوت کا تناسب خطرناک حد تک بڑھنے لگا تھا۔ جنسی بے راہ روی کی بدولت اسقاطِ حمل کی شرح بھی کم پریشان کن نہ تھی۔ مناسب رہنمائی' شفقت' توجہ اور محبت کا فقدان ہزار ہا لڑکوں اور لڑکیوں کو جرائم کی دلدل میں بھی دھکیل رہا تھا۔ اس نے انتہائی تحمل اور حکمتِ عملی کے تحت ان تمام عناصر سے چھٹکارا پانے کے لیے دو مرحلہ وار اقدام طے کیے۔

پہلے مرحلہ میں اس نے کمرۂ جماعت کے ماحول میں تبدیلی پیدا کی۔ طلبہ کو اعتماد اور محبت کی دولت بخشی تو وہ اس کی مقناطیسی شخصیت کی طرف لوہے کے ذرات کی مانند کھنچے آنے لگے۔ بویا نے اپنی ذات کو ایک اسپنج کا روپ دے دیا۔ وہ ان طلبہ کے سبھی گلے شکوے' شکایات' تلخیاں اور اذیت ناک سوچیں اپنے وجود میں جذب کر لینے کے بعد اپنے علم کی روشنی اور تعلیم برائے کھیل' کے سحر سے ان کے دل و دماغ منور کرنے لگی۔ ان کا ذہنی انتشار' نفسیاتی الجھنیں اور گتھیاں اس کی نرم مزاجی کے سامنے بالکل موم ہو گئیں اور دھیرے دھیرے نوجوان نسل اپنے مدار میں لوٹنے لگی۔

دوسرا مرحلہ طلبہ کے والدین سے تعامل تھا۔

منظم منصوبہ بندی کے تحت اس نے اسکول میں والدین سے ملاقات اور متعلمین کی تعلیمی ترقی' گھریلو مسائل اور برتاؤ کی بابت باہمی گفت و شنید کا آغاز کیا کیونکہ والدین کو بھی ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت تھی۔ وہ ان بچوں سے گھریلو مسائل سنتی اور پھر ایک نئی لگن سے حل تلاش کرنے میں جت جاتی۔ برف پگھلنے لگی۔ منفی جذبات' تنفر' بیزاری' خود ترسی' خود اذیتی' جنسی کشش میں بے لگام خواہشات سے مغلوب تباہی کی اندھی وادیوں میں گامزن چینی بچے اپنے گھر اور اسکول میں ناقابلِ یقین مثالی کردار کے مالک بن گئے۔

کمرۂ جماعت کے آزادانہ اور دوستانہ ماحول میں ڈراما' اوپیرا' موسیقی' آرٹ سمیت طلبہ کی ذاتی پسند پر مبنی سرگرمیوں سے انہیں نصاب سے متعلقہ اعصابی تناؤ اور امتحانی خوف سے بھی رہائی مل گئی۔ بویا کی جماعت میں حاضری کی شرح میں ناقابلِ یقین اضافہ ہوا تو اسے بھی محسوس ہوا کہ ان بچوں کے وجود میں ہنر' توانائی' تخیل اور ذہانت کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ وہ بہت حیران و خوش تھی اور رہے والدین، ان کی مسرتوں کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ اکھڑ مزاج اور ناقابلِ برداشت بچے موم کی ناک بن گئے تھے جو ان کے حکم و خواہش کے مطابق باآسانی مڑ جاتے۔

اس کامیابی نے بویا کا اعتماد اور حوصلہ پہلے سے کئی گنا بڑھا دیا۔ اس نے دیگر ہم خیال اساتذہ کے ساتھ مل کر ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جس کی مدد سے مقامی اسکولوں میں نفسیاتی تربیت کے کئی ایک پروگرام شروع کیے گئے۔ تعلیمی اداروں کے علاوہ یہ سلسلہ جیل میں مقید ان بچوں تک دراز کر دیا گیا جو ماضی میں رہنمائی کے فقدان کی بدولت کسی نہ کسی قانونی اور اخلاقی جرم میں سزا بھگت رہے تھے۔

اپنے گردونواح میں نظر دوڑائی جائے تو کوئی بھی انسان طویل محنت، سالہا سال کے معمول اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں یکسانیت سے اکثر اکتا جاتا ہے۔لیکن بویا یا تنگ کی لغت میں تھکن اور بیزاری کے الفاظ ناپید ہیں۔ ہر گذرتا لمحہ ہر گذرتا دن اس کی توانائی اس قدر مثبت طریقہ سے مہمیز کرتا کہ یہ غیر مرئی شعاعوں کی طرح دیگر اساتذہ پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتیں۔

طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے بویا کی مخلصانہ اور روایت شکن کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ صفر سے شروع ہونے والا یہ سفر مستقل مزاجی سے اپنے پڑاؤ پار کرتا "پچاس ہزار" ٹین ایج بچوں اور ان کے والدین کی ذہنی تربیت تک آن پہنچا۔

اس کی پیشہ وارانہ اہلیت کا ڈنکا قومی سطح پر بھی بجنے لگا تھا۔ اسے کئی ایک قومی کانفرنسز میں خطاب کے مواقع دیئے جانے لگے۔ برقی اور پریس میڈیا اس کے انٹرویو اور مستقبل کی حکمت عملی جاننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اور خود اس کے خلوص اور نیک نیتی کا عالم یہ تھا کہ 2016 میں Harvard SEED (عوامی جمہوریہ چین کی ایک تنظیم جس میں سماجی خدمت، تغیر اور جدت کی بنیاد پر ہر سال ایک نمایاں کارکردگی کے حامل نوجوان منتخب کیے جاتے ہیں۔) کے تحت 'سماجی تغیر' کی بھاری بھرکم انعامی رقم بھی اس نے اپنے تربیتی پروگرام کی چین کے طول و عرض میں پھیلاؤ کے لیے سرف کردی۔

میگی میکڈونلMaggie Macdonnell

2017 میں گلوبل ٹیچرز پرائز کی فاتح "میگی میکڈونل" کی زندگی اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو بلا شبہ وہ لفظ "مسیحا" ہی ہوگا۔

1980 میں روئے ارض کے سرد ترین خطہ میں پیدائش کے بعد میگی نے ہمیشہ اپنے اردگرد وحشت، کٹھنائیوں اور فطرت سے کشمکش کی ایک لامتناہی جنگ دیکھی۔ Nova Scotia کے دیہاتی علاقہ میں پرورش نے اس کی فطرت میں چٹانی سختی پیدا کردی۔

میگی کے حالاتِ زندگی سے آگاہی کے لیے اس کے ماحول اور قطبی علاقہ سے واقفیت ضروری ہے۔

قطب شمالی زمین کے انتہائی شمالی علاقہ میں واقع ہے۔ بحر منجمد شمالی، دیگر ملحقہ بحیروں، الاسکا، کینیڈا، فن لینڈ، گرین لینڈ، آئس لینڈ، ناروے، روس اور سویڈن پر مشتمل زمینی علاقہ 'برفانی جہنم' بھی کہلاتا ہے۔ ٹنڈرا کے خطہ میں شمولیت کے باعث یہاں نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں۔ بحیروں کے علاوہ زیر زمین سطح بھی برف سے منجمد رہتی ہے۔ حالیہ سالوں میں گلوبل وارمنگ کی بدولت برف قدرے کم تو ہوئی ہے لیکن اب بھی یہاں موسم سرما ہڈیوں میں گودا منجمد کردینے والی ٹھنڈک لیے نازل ہوتا ہے۔ موسم گرما کے تیور کچھ دھیمے سہی لیکن رہائشیوں کے لیے برف سے رہائی کسی صورت بھی ممکن ہی نہیں۔ بارش بھی برفباری ہی کی صورت میں ہوتی ہے اور ہوائیں اس قدر تیز اور نوکیلے برفانی ذرات لیے چلتی ہیں کہ بصارت کو برفباری ہی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

درجہ حرارت عموماً منفی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے، تاہم موسم سرما میں منفی 68 ڈگری سینٹی گریڈ تک بھی باآسانی پہنچ جاتا ہے۔

Nova Scotia کینیڈا کے تین ساحلی صوبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ اس کا شمار ان چار صوبوں میں بھی ہوتا ہے جن سے اٹلانٹک کینیڈا تشکیل پایا ہے۔ اس سرد ترین علاقہ میں زندگی کبھی بھی سہل نہیں ہوتی۔

میگی نے انہی آزمائشوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گریجویشن مکمل کرنے کے بعد افریقی علاقہ Sub Sahara میں رضا کار کی حیثیت سے کام کا آغاز کردیا۔ یہ علاقہ غربت، افلاس اور بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2011 میں ایچ آئی وی ایڈز میں مبتلا 69% افراد کا تعلق اسی خطہ سے تھا۔ یہ لاچار لاعلم اور اپنی بیماری کے اسباب سے ناواقف افراد اس بیماری کے مزید پھیلاؤ کا سبب بن رہے تھے۔ میگی پانچ سال تک ان افراد کی طبی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ آگہی و شعور کے در بھی وا کرتی رہی۔

بعد ازاں وہ شمالی امریکا کی اسکیمو کمیونٹی Salluite منتقل ہوگئی۔ یہ کینیڈا کے نزدیک ہی ایک دیہاتی علاقہ ہے۔ بمشکل تیرہ سو نفوس پر مشتمل اس آبادی میں بھی مسائل کا ایک بہت بڑا طوفان اس کا منتظر تھا۔ اس علاقہ میں زمینی راستے مسدود ہوتے ہیں۔ کسی بھی سڑک کے ذریعہ رسائی ناممکن امر ہے۔ یہاں صرف ہوائی رستے سے ہی آمد ممکن ہے۔ اسکیمو آبادی کے انتہائی مشرقی سمت میں واقع اس خطہ ارض کو 'لاغر

نفوس بھی کہا جاتا ہے کیونکہ جنگلی حیات کی کمی کے باعث مقامی باشندے اکثر و بیشتر فاقہ کا شکار رہتے ہیں۔

موسمی حالات کی سختیاں جھیلنا بھی ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ منفی 25 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں برف کسی نیزے کی انی کی مانند جسمانی اعضا کو تختہ مشق بنائے رکھتی ہے۔

اس علاقہ میں آمد کے بعد میگی میکڈونل کے سامنے دو بڑی رکاوٹیں موجود تھیں۔

قطب شمالی کے تعلیمی نظام کا سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ سخت ترین موسمی حالات کے باعث اکثر اساتذہ وہاں قیام ہی نہیں کر پاتے۔ کئی ایک معلم تعلیمی سال ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں یا محکمہ میں اپنے اعصابی تناؤ کی طبی درخواست دائر کرنے کے بعد دیگر پُرسکون علاقوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ فی الوقت میگی میکڈونل جس اسکول سے منسلک ہے وہ اپنے 'سربراہ' سے محروم ہو چکا ہے۔ اسکول پرنسپل نے محض چھ ہفتے بعد ہی طبی درخواست دے کر ادارے سے عارضی رخصت اختیار کرلی تھی۔

ان حالات میں ماتحت اساتذہ کا جذبہ برقرار رہے بھی تو کیونکر؟

معاشرتی حالات بھی انتہائی قابلِ افسوس ہیں۔ موسم کی شدت و ناہمواری نے مقامی باشندوں میں وحشت' بیزاری' تنہائی' یاسیت' خود اذیتی اور زندگی جیسی نعمت سے تنفر پیدا کر رکھا ہے۔ چاندی جیسی برفیلی چادر اوڑھے گلیوں میں جنس کا دیوانی تمام تر بربریت سے چنگھاڑتا نظر آتا ہے۔ تنہائی' بنیادی ضروریات سے محرومی اور یاسیت کی تپش دور کرنے اور راہ فرار حاصل کرنے کے لیے مردم کم عمر لڑکیوں کو نشانہ بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ ٹین ایج لڑکیوں میں حمل کی شرح ناقابل یقین ہے۔

نوجوان نسل میں خود اذیتی کے جذبات بھی اپنی انتہا پر ہیں۔ ذاتی سکون اور وقتی خود فراموشی کے حصول کی خاطر وہ اپنے ہی وجود کو بے طرح رگید ڈالتے ہیں۔ 18 تا 25 سالہ افراد میں زندگی کی خواہش ختم ہونے لگتی ہے۔ انہیں موت کی وادی میں سکون محسوس ہوتا تو خودکشی کا رجحان بھی افسوسناک حد تک بڑھ گئے۔

ان تمام تر حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میگی نے Life Skills Programme کی بنیاد رکھی اور آغاز ہی میں بے شمار لڑکیوں نے اس میں شمولیت اختیار کرلی۔ ان سب نے کمیونٹی کے افراد کے لیے 'گرم کھانوں' کی تیاری و ترسیل ممکن بنانے کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ پیٹ کا جہنم اپنے شعلوں کی تپش سے ان کے دماغ پر اثرانداز نہ ہوسکے۔

بعدازاں میگی نے شراکتی بنیادوں پر 'ڈے کیئر سینٹر' کی بنیاد رکھی جہاں طلبہ کمرائے جماعت میں تجربہ کار ڈے کیئر کارکنان کے ساتھ کام کرسکیں۔ یہ خیال منفرد لیکن بے حد سودمند بھی تھا۔ طلبہ ابتدائی عمر میں تعلیم دینے کے نت نئے طریقے سیکھنے لگے۔ اسی دوران میگی نے تقریباً بیس ہزار ڈالرز محفوظ کر لیے جن کی مدد سے اس نے اسکول میں ایک غذائی پروگرام شروع کر دیا۔ اس نئے منصوبہ کے تحت طلبہ اپنے دیگر ساتھیوں کے لیے ہلکے پھلکے اسنیکس تیار کیا کرتے۔

نسل نو میں منفی جذبات کے خاتمہ کے لیے اس نے بلا تاخیر ''فٹنس سینٹر'' قائم کیا جو دھیرے دھیرے نابالغ' جوان اور ادھیڑ عمر افراد کے لیے یکساں طور پر صحت مند طرز زندگی کا حصول کا اہم مرکز بن گیا۔ ان کا اعصابی تناؤ دور کرنے کے بعد ذہنی و جسمانی مضبوطی میگی کی اوّلین خواہش تھی۔

میگی میکڈونل نے مسائل کو اپنے اعصاب پر بالکل بھی حاوی نہ ہونے دیا بلکہ ان مسائل کے حل کی عملی کوششوں میں مختلف سرگرمیوں کا آغاز ہی مناسب سمجھا۔ اس کا مہربان رویہ اور عملی سوچ طلبہ کی ذہنی تربیت میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ اسکول میں حاضری کی شرح بڑھنے لگی۔ کمیونٹی کچن میں مصروفیت' خودکشی کے رجحانات میں کمی کے تربیتی مراکز میں آمدورفت' ہائیکنگ اور فطری مناظر کی دلکشی نے ان کے وجود سے منفی جذبات کا خاتمہ کردیا۔

ذاتی مسائل میں گھرے رہنے کے باوجود طلبہ نے میگی کی تحریک پر ذیابیطس کے مریضوں کے لیے 37,000 ڈالرز کے فنڈز کا حصول یقینی بنایا۔ اپنی ذات کے دائرے سے قطع نظر انسانیت کی خدمت ہی ان کا وتیرہ زندگی بننے لگی ہے۔

محدود ترین وسائل کے باوجود مختصر عرصہ میں اسی گراں قدر جذبہ اور محنت کے لیے 'ورکی فاؤنڈیشن انتظامیہ' نے گلوبل ٹیچرز پرائز کی 'ایک ملین ڈالرز' کی خطیر رقم کی فاتح ''میگی میکڈونل'' کو قرار دیا۔ قطب شمالی کے دیگر سرد ترین علاقوں میں زندگی سے منہ موڑتے افراد کو اس کائنات کی رنگینیوں کی طرف واپس لانے کے لیے یہ انعام اس کے لیے کسی معجزاتی مدد یا من و سلویٰ سے کم ہرگز نہیں۔ اپنے ہم قوم افراد کو ایک نارمل زندگی جیسی تمام بنیادی سہولیات فراہم کرنے کا دیرینہ خواب اپنی تعبیر کے مراحل میں داخل ہو چکا ہے جس کا سہرا میگی کی 'روایت شکن' کاوشوں ہی کے سر ہے۔

اسپاٹ فکسنگ

اعتزا ززریاب وصلی

کرکٹ نے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہر تیسرا شخص کرکٹ کے جنون میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی نے ہی مفاد پرستوں کو شائقین کے جذبات سے کھیلنے کی راہ سجھائی اور بہت سے مقبول کھلاڑیوں نے چند روپوں کی خاطر بے ایمانی کا راستہ چن لیا۔

اسپاٹ فکسنگ کے گرداب میں کئی کھلاڑیوں کی شہرت ڈوب گئی

''کرکٹ'' دنیا کا ایک مقبول کھیل ہے لیکن بچے بوڑھے جوان سبھی کے دل پر اس کا راج ہے آصف نے کہا۔ کرکٹ میں جہاں کھلاڑی اپنے ملک کی دنیا بھر میں نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کا نام روشن کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں وہیں کچھ کھلاڑی پیسے کے لالچ میں ملک کا نام بدنام بھی کرتے ہیں۔ اسپاٹ فکسنگ نے کرکٹ کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں اسپاٹ فکسنگ کا بہت بول بالا رہا ہے۔ اسپاٹ فکسنگ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پھر بھی ہم ایسے چند کھلاڑیوں کا ذکر کریں گے جو اسپاٹ فکسنگ میں ملوث رہے اور اس کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

اس وقت کمرے میں ہم چار دوست آصف، عمیر، نذر گل اور میں۔ موضوع کرکٹ تھا۔ اس لیے سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے جملہ ختم کر کے ان کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''انڈین کرکٹ ٹیم کے بہترین بلے باز اور کپتان محمد اظہر الدین اسپاٹ فکسنگ میں ملوث ہو کر تاحیات پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ سن 2000 میں سی بی آئی نے اظہر الدین پر اسپاٹ فکسنگ کا الزام لگایا۔ اظہر الدین کا کہنا تھا کہ انہیں مسلمان ہونے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا ہے مگر بعد میں انہوں نے خود بھی یہ جرم تسلیم کر لیا۔ 2000 کے ساؤتھ افریقا انڈیا ٹور کے بعد ساؤتھ افریقن کیپٹن ہنسی کرونیے نے بیان دیا کہ اظہر الدین نے انہیں بکیز سے متعارف کروایا ہے جس کے بعد اظہر الدین نے جرم کا اعتراف کر لیا اور ان پہ تاحیات پابندی لگا دی

گئی۔ 2012 میں اندھرا پردیش ہائی کورٹ نے اس پابندی کو ختم کردیا۔ آٹھ فروری 1963 کو بھارت کی ریاست حیدرآباد دکن میں پیدا ہونے والے اظہرالدین نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز اکتیس دسمبر 1984 کو انگلینڈ کے خلاف اکیس سال کی عمر میں کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے تین ٹیسٹ میچوں میں لگاتار تین سنچریاں اسکور کر کے ریکارڈ قائم کردیا۔ اظہرالدین تین سو ون ڈے کھیلنے والے دنیا کے پہلے کرکٹر تھے۔ مہندرا سنگھ دھونی کے بعد یہ انڈیا کرکٹ ٹیم کو سب سے زیادہ (نوے) ون ڈے جتوانے والے دوسرے کپتان ہیں۔ اظہرالدین اسپاٹ فکسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہونے والے دنیا کے پہلے کھلاڑی ہیں۔ ان کا شاندار کیریئر ایک داغ کے ساتھ ختم ہوگیا۔

میں نے بات ختم کرکے ان کی طرف دیکھا۔

''بھائی میاں!'' آصف نے میری طرف رخ کر کے کہا۔ ''جب بتا ہی رہے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ اظہرالدین کے علاوہ اور کون کون اس الزام کی زد میں آیا؟''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ ''جنوبی افریقا اور انڈیا کی 2000 کی متنازعہ سیریز کے بعد صرف اظہرالدین ہی پابندی کا شکار نہیں ہوئے، ساؤتھ افریقن کپتان ہنسی کرونیے اسپاٹ فکسنگ اسکینڈل کا دوسرا نشانہ تھے۔ سات اپریل 2000 میں ہنسی کرونیے پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے سنجے چاولہ جو کہ ایک مشہور بکی تھا، سے رابطہ کیا ہے۔ اس کے بعد انڈین کپتان اظہرالدین کی طرح ان پہ بھی تاحیات پابندی لگادی گئی۔ ستمبر 2001 میں انہوں نے اس پابندی کے خلاف کورٹ میں درخواست عاید کی مگر اکتوبر 2001 میں یہ درخواست مسترد کردی گئی۔ جون 2002 میں ہنسی کرونیے جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ 25 دسمبر 1969 کو جنوبی افریقا کی ریاست بلویم فونٹین میں پیدا ہونے والے ہنسی کرونیے نے اپنے انٹرنیشنل کیریر کا آغاز 1992 میں کیا۔ ہنسی کرونیے کی قیادت میں جنوبی افریقا نے آسٹریلیا کے علاوہ دنیا کی ہر ٹیم کو شکست دی۔ گریم اسمتھ کے بعد ساؤتھ افریقا کے سب سے زیادہ ون ڈے میچ جیتنے والے کپتان ہیں۔ ہنسی کرونیے نے ستمبر 1995 سے مارچ 2000 تک لگاتار ایک سو باسٹھ ایک روزہ میچ کھیلے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ یہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے لگاتار سو سے زاید ایک روزہ میچ اپنی کپتانی میں کھیلے۔ 1998 میں ان کی کپتانی میں جنوبی افریقا نے ناک آؤٹ کپ کا ٹائٹل جیتا جس کے بعد آج تک جنوبی افریقن ٹیم کوئی ٹورنامنٹ نہیں جیت سکی۔ اس طرح اسپاٹ فکسنگ نے دنیا کے ایک اور بہترین کھلاڑی کو نگل لیا۔''

میں نے ایک اور کھلاڑی کا تعارف کرانے کے بعد میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھر کر گلا تر کیا پھر سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ''پاکستان کے مشہور بیٹسمین سلیم ملک اسپاٹ فکسنگ کا نشانہ بننے والے ایک اور کھلاڑی ہیں۔ سلیم ملک پر رشوت خوری کا الزام لگایا گیا جس میں وہ بے قصور پائے گئے لیکن مئی 2000 میں دوبارہ انکوائری پر جسٹس قیوم نے ان پر تاحیات پابندی لگادی۔ سلیم ملک 16 اپریل 1963 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ سلیم ملک نے پانچ اپریل 1982 کو اپنا پہلا ٹیسٹ میچ سری لنکا کے خلاف کھیلا اور سنچری اسکور کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ٹیسٹ ڈیبیو پر سنچری اسکور کرنے والے یہ 1982 میں دنیا کے دوسرے کم عمر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے بارہ ٹیسٹ اور چونتیس ایک روزہ میچوں میں قومی ٹیم کی قیادت بھی کی۔ اس طرح ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ فکسنگ کی بھینٹ چڑھ گیا۔''

یہی نہیں ان کے علاوہ سلمان بٹ بھی اسپاٹ فکسنگ کا شکار ہوا۔'' 2010 میں ہونے والی انگلینڈ اور پاکستان کی ٹیسٹ سیریز کے دوران اسپاٹ فکسنگ اسکینڈل نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ اس فکسنگ اسکینڈل کا مرکزی کردار سلمان بٹ تھے۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ پر میچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اس کے بعد اکتیس اگست کو ٹیسٹ کرکٹ کی کپتانی سے ہٹا دیا گیا اور ایک روزہ اسکواڈ سے بھی باہر کردیا گیا۔ آئی سی سی نے سلمان بٹ پر دس سال کا بین لگایا۔ نومبر 2011 میں سلمان بٹ کو مجرم کی حیثیت سے تیس مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔ 22 جون 2012 کو وہ جیل سے رہا ہوگئے۔ اگست 2015 میں سلمان بٹ سے پابندی ہٹالی گئی اور 2 ستمبر 2015 سے انہیں انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ سات اکتوبر 1984 کو لاہور میں پیدا ہونے والے سلمان بٹ نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز دسمبر 2003 میں بنگلہ دیش کے خلاف کیا۔ بارہ جولائی 2010 کو شاہد آفریدی کی ٹیسٹ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں قومی ٹیم کا کپتان بنادیا گیا اور انہوں نے اپنی قیادت میں پہلے ٹیسٹ میچ میں ہی آسٹریلیا کو شکست دی۔ سلمان بٹ نے 33 ٹیسٹ میچوں میں 33.46 کی اوسط سے 1889 رنز بنائے جس میں تین سنچریاں اور دس نصف سنچریاں شامل ہیں۔''

میں نے رک کر سب کے چہروں پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ''2010 کے فکسنگ اسکینڈل کا دوسرا بڑا کردار محمد آصف تھا۔ محمد آصف جو کہ اپنی شاندار باؤلنگ سے ...... دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال چکا تھا اور جس کے سامنے بڑے بڑے بلے باز پانی بھرتے نظر آئے، اپنے کیریئر کے عروج پر ہی اسپاٹ فکسنگ کا نشانہ بن گیا۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ کے ساتھ ساتھ ان پر بھی میچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تین نومبر 2011 کو محمد آصف کو ایک سال کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔ ان پر لگائی گئی پانچ سال کی پابندی 14 اگست 2015 کو ہٹالی گئی اور انہیں ہر طرح کی کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ محمد آصف 20 دسمبر 1982 کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا ٹیسٹ ڈیبیو 3 جنوری 2005 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا۔ محمد آصف نے 23 ٹیسٹ میچوں میں 23.18 کی اوسط سے 105 وکٹیں حاصل کیں۔ جب ان پر بین لگایا گیا تب یہ آئی سی سی کی ٹیسٹ رینکنگ میں دوسرے نمبر پر تھے۔ محمد آصف ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ میں میڈن اوور پھینکنے والے دنیا کے پہلے باؤلر تھے۔ 2007 میں محمد آصف نے ساؤتھ افریقا کے خلاف سیریز میں شاندار باؤلنگ کی اور انیس وکٹیں حاصل کیں۔ محمد آصف کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔''

کمرے میں جمع تینوں ساتھی ہمہ تن گوش تھے۔ میں نے سلسلے کو دراز کیا۔ ''2010 کے فکسنگ اسکینڈل کا تیسرا نشانہ پاکستان کے نوجوان تیز باؤلر محمد عامر بنے۔ محمد عامر جس کا کیریئر کے آغاز سے ہی وسیم اکرم سے موازنہ کیا جاتا تھا۔ اپنی اسپیڈ' لائن لینتھ اور شاندار سوئنگ باؤلنگ سے وہ کسی بھی بلے باز کو مشکل میں ڈال سکتے تھے۔ محمد عامر پر اٹھائیس اگست 2010 کو میچ فکسنگ کا الزام لگایا گیا جس کی وجہ ان کی پھینکی گئی ناقابل یقین نوبال تھی۔ محمد عامر نے اپنا جرم تسلیم کرلیا اور قوم سے معافی مانگی۔ نومبر 2011 میں عامر کو جیل بھجوادیا گیا اور ان پر بھی پانچ سال کی پابندی عاید کردی گئی مگر کم عمری کی وجہ سے انہیں کافی رعایت دی گئی۔ 29 جولائی 2015 کو انہیں کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ 2016 میں انہیں پاکستان کی قومی ٹیم میں شامل کرلیا گیا اور اب محمد عامر نیشنل ٹیم کا حصہ ہیں۔ تیرہ اپریل 1992 کو گوجر خان میں پیدا ہونے والے محمد عامر نے اپنا پہلا انٹرنیشنل میچ آئی سی سی ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ 2009 میں صرف سترہ سال کی عمر میں کھیلا۔ محمد عامر نے اس ٹورنامنٹ کے سارے میچوں میں حصہ لیا اور قومی ٹیم کو ٹائٹل جتوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عامر نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز 4 جولائی 2009 کو سری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد عامر ستائیس ٹیسٹ میچوں میں اکیاسی وکٹیں حاصل کر چکے ہیں جبکہ سترہ ایک روزہ میچوں میں انہوں نے تیس وکٹیں حاصل کی ہیں۔ محمد عامر دنیا کے واحد باؤلر ہیں جنہوں نے پانچ وکٹ میڈن اوور پھینکا جس میں دو بولڈ ایک کیچ آؤٹ اور دو رن آؤٹس شامل ہیں۔''

اسی دوران چائے آگئی تھی۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک چسکی لی پھر کہا۔ ''اسپاٹ فکسنگ میں ملوث ہو کر پابندی کا شکار ہونے والے ایک اور کھلاڑی پاکستان کے لیگ اسپنر دانش کنیریا ہیں۔ انگلش کاؤنٹی کھیلنے کے دوران دانش کنیریا اور ان کے ایک ساتھی تیز باؤلر مروِن ویسٹ فیلڈ پر اسپاٹ فکسنگ کا الزام لگا۔ الزام ثابت ہونے پر ویسٹ فیلڈ پہ پانچ سال اور دانش کنیریا پر تاحیات پابندی عاید کردی گئی۔ یہ پابندی انگلش بورڈ کی طرف سے لگائی گئی۔ سولہ دسمبر 1980 کو کراچی میں پیدا ہونے والے دانش کنیریا نے اپنے کیریئر کا آغاز 27 نومبر 2000 میں انگلینڈ کے خلاف کیا۔ دانش کنیریا نے اکسٹھ ٹیسٹ میچوں میں چونتیس کی اوسط سے 261 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کا بہترین باؤلنگ فگر 7/77 تھا۔ دانش کنیریا بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی طرف سے کھیلنے والے دوسرے ہندو اور ساتویں غیر مسلم کھلاڑی تھے۔''

''اجی جناب آپ نے تو پاکستانی کھلاڑیوں کو منتخب کرلیا ہے۔ کیا کسی دوسرے ملک کے کھلاڑی اس جرم میں شریک نہیں ہیں؟'' لوگھن نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

میں نے شروع ہی ایک ہندوستانی کھلاڑی سے کیا ہے۔ اب ایک اور نام سنیں۔

2013 کی انڈین پریمیئر لیگ میں اسپاٹ فکسنگ کا بہت چرچا رہا۔ اس فکسنگ اسکینڈل کا مرکزی کردار راجستھان رائلز کی نمایندگی کرنے والے انڈین فاسٹ باؤلر شانتھا کمارن سری سانتھ تھے۔ سری سانتھ پر انڈین پولیس نے میچ فکس کرنے کا الزام لگا کر انہیں ان کے دوست کے گھر سے گرفتار کیا۔ گرفتاری کے فوراً بعد راجستھان رائلز نے ان کا کنٹریکٹ منسوخ کردیا۔ سری سانتھ کے ساتھ ساتھ دو اور کھلاڑیوں اور چودہ بکیز کو گرفتار کیا گیا۔ ان سب کو دس جون 2013 کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ 2013 میں بی سی سی آئی نے سری سانتھ پر تاحیات پابندی لگادی۔ چھ فروری 1983 کو انڈیا کی ریاست کرالا میں پیدا ہونے والے سری سانتھ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز یکم مارچ 2002 کو انڈیا کے خلاف کیا۔ سری

سانتھ نے ستائیس ٹیسٹ میچ کھیلے اور ستاسی وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین باؤلنگ 2006 میں ساؤتھ افریقا کے خلاف دیکھنے کو ملی جب انہوں نے اپنی بہترین سوئنگ باؤلنگ سے مخالف ٹیم کے چھکے چھڑا دیے اور میزبان ٹیم کو صرف 84 رنز پہ ڈھیر کر دیا اور انڈیا نے تاریخ میں پہلی بار جنوبی افریقا کو ان کے گھر میں شکست دی۔ سری سانتھ نے اس میچ میں پانچ وکٹس حاصل کیں اور مردِ میدان قرار پائے۔ کرکٹ کا یہ ستارہ بھی اسپاٹ فکسنگ کی وجہ سے ڈوب گیا۔

ایک ان پر ہی نہیں، انڈیا کا ایک اور کھلاڑی بھی اس جرم میں ملوث پایا گیا۔

”بھارت کی نمائندگی کرنے والے بیٹنگ آل راؤنڈر اجے کمار شرما بھی اسپاٹ فکسنگ کا شکار ہو چکے ہیں۔ 2000 میں اجے شرما پر اسپاٹ فکسنگ کا الزام لگایا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر ان پر تاحیات پابندی لگادی گئی۔ ستمبر 2014 میں دہلی ڈسٹرکٹ کورٹ نے ان سے پابندی ہٹالی اور بی سی سی آئی کو حکم دیا کہ انہیں بورڈ کی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ 3 اپریل 1964 کو دہلی میں پیدا ہونے والے اجے کمار شرما نے اپنے کیریئر کا آغاز دو جنوری 1986 کو ویسٹ انڈیز کے خلاف کیا۔ اکتیس ایک روزہ میچوں میں اجے شرما نے بیس کی اوسط سے 424 رنز بنائے اور پندرہ وکٹیں حاصل کیں۔“

اس جرم میں صرف بڑی ٹیموں کے کھلاڑی ہی نہیں بلکہ بنگلہ دیش جیسی چھوٹی ٹیم کے کھلاڑی بھی ملوث پائے گئے۔ بنگلہ دیش کے نوجوان بلے باز محمد اشرفل بھی اسپاٹ فکسنگ کا نشانہ بن کر آٹھ سال کی پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے خوبصورت اسٹروک پلے کی وجہ سے مشہور نوجوان بیٹسمین محمد اشرفل بنگلہ دیش کی بیٹنگ لائن اپ کے مستقبل کی اُمید تھے۔ 2013 کی بنگلہ دیش پریمیر لیگ کے دوران محمد اشرفل پر میچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ 2014 میں بنگلہ دیش کرکٹ بورڈ نے محمد اشرفل پر آٹھ سال کی پابندی عاید کی۔ بعد میں یہ پابندی کم کر کے پانچ سال کر دی گئی۔ سات جولائی 1984 کو ڈھاکا میں پیدا ہونے والے محمد اشرفل نے اپنے کیریئر کا آغاز چھ ستمبر 2001 میں سری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد اشرفل نے اکسٹھ ٹیسٹ میچوں میں چوبیس کی اوسط سے رنز بنائے اور اکیس وکٹیں بھی حاصل کیں۔ اشرفل بنگلہ دیش کی طرف سے ون ڈے، ٹیسٹ اور ٹوئنٹی ٹوئنٹی میں تیز ترین نصف سنچری اسکور کرنے والے بلے باز ہیں۔ محمد اشرفل بنگلہ دیش کی طرف سے ایک روزہ کرکٹ اور ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رنز اسکور کرنے والے دوسرے بلے باز ہیں۔ اشرفل 2007 سے 2009 تک تیرہ ٹیسٹ میچ، اکتیس ون ڈے اور گیارہ ٹی ٹوئنٹی میچوں میں بنگلہ دیش کی کپتانی بھی کر چکے ہیں۔ کرکٹ کا ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ فکسنگ کا نشانہ بن گیا۔ اسی طرح اسپاٹ فکسنگ کے جرم میں ملوث ہو کر عمر بھر کے لیے بین ہونے والے کھلاڑیوں میں نیوزی لینڈ کے اوپننگ بیٹسمین لو ونسنٹ بھی شامل ہیں۔ لو ونسنٹ نے 2011 میں ساتھی کھلاڑی نوید عارف کے ساتھ مل کر انگلش کاؤنٹی کا میچ فکس کرنے کا اعتراف کیا۔ جس کے بعد 2014 میں انگلینڈ بورڈ نے ان پر تاحیات پابندی لگادی۔ 11 نومبر 1978 کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہونے والے لو ونسنٹ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز تیس نومبر 2001 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا اور پہلے میچ میں ہی سنچری اسکور کی۔ ڈیبیو پہ سنچری اسکور کرنے والے یہ نیوزی لینڈ کے چھٹے کھلاڑی تھے۔ لو ونسنٹ نے اپنے کیریئر میں 23 ٹیسٹ میچ کھیلے اور تین سنچریوں اور نو نصف سنچریوں کی مدد سے 1332 رنز اسکور کیے۔ لو ونسنٹ نے 102 ایک روزہ میچ کھیل رکھے ہیں جس میں انہوں نے تین سنچریاں اور گیارہ نصف سنچریاں اسکور کیں۔ یہ نیوزی لینڈ کے واحد کھلاڑی ہیں جو اسپاٹ فکسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

انہی کی طرح ویسٹ انڈیز کے مشہور بلے باز مارلون سیموئیلز بھی میچ فکسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے تھے۔ 2007 میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا سیریز کے دوران ان پر بکی کو معلومات دینے کا الزام لگایا گیا۔ 2008 میں آئی سی سی کی طرف سے ان پر دو سال کے لیے بین لگا دیا گیا۔ سیموئیلز پانچ فروری 1981 کو جمیکا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 14 اکتوبر 2000 کو سری لنکا کے خلاف کیا۔ مارلون سیموئیلز اب تک اکہتر ٹیسٹ اور ایک سو ستاسی ایک روزہ میچ کھیل چکے ہیں۔ مارلون سیموئیلز کا شمار ویسٹ انڈیز کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا ہے۔ سیموئیلز 2012 اور 2016 کے ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ جیتنے والی ویسٹ انڈیز ٹیم کا اہم حصہ تھے۔ انہوں نے ان دونوں ٹورنامنٹس کے فائنل میں مین آف دا میچ کا ایوارڈ حاصل کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ورلڈ کپ 2015 میں کرس گیل اور مارلون سیموئیلز نے تین سو بہتر رنز کی پارٹنرشپ قائم کی جو کہ ایک روزہ کرکٹ کی تاریخ کی سب سے بڑی پارٹنرشپ ہے۔ میچ فکسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہونے والے یہ ویسٹ انڈیز کے پہلے کھلاڑی ہیں۔

پرائی کوکھ

کاشف زبیر

اسے دنیا کی ہر سہولت میسر تھی، دولت کے ڈھیر پر وہ بیٹھا ہوا تھا لیکن جب اپنے حویلی نما گھر کا جائزہ لیتا تو دکھ سے دل بھر اٹھتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک عجیب راستہ منتخب کیا تھا لیکن اسے حاصل کیا ہوا ہے؟

مغرب سے درآمد ایک الگ انداز کا واقعہ

سیلی نے اور اس کا شوہر مارینو نے اس کافی فارم میں کام کرتے تھے یہاں برازیل کی بہترین کافی اگتی تھی اور یہ فارم مسٹر بین جوائے کی ملکیت تھا۔ بین جوائے کا شمار برازیل کے چند دولت مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ یوں تو اس کے بے شمار کاروبار تھے جن میں بینکوں سے لے کر ائر لائن تک شامل تھیں لیکن وہ کافی کنگ کے نام سے مشہور تھا۔ بین جوائے نسلاً اطالوی تھا اور وہ دس سال پہلے برازیل آ کر آباد ہوا تھا۔ وہ یہاں مقبول بھی تھا کیونکہ اس

نے اپنی دولت سے برازیل میں بے شمار کاروبار شروع کیے تھے اور کئی ہزار افراد کو روزگار مہیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتا تھا اس نے عورتوں، بچوں اور منشیات کے عادی افراد کی بحالی اور بہتری کے لیے کئی اداروں کو بھاری عطیات دیئے تھے۔

پچاس سالہ بین نے دو سال پہلے ہی برازیل کی مہنگی ترین سپر ماڈل نورمی سے شادی کی تھی۔ نورمی کے حسن و جمال میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے بے شمار پرستار تھے۔ لیکن ان میں کوئی بین جوائے جیسا دولت مند نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بین نے اسے پرپوز کیا تو اس نے اقرار کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ نورمی جانتی تھی کہ اس کی کامیابی کا دور بہت مختصر ہے اور چند سال بعد وہ سابقہ سپر ماڈل بن جائے گی۔ دوسرے وہ اس مشینی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس نے کامیابی، شہرت اور دولت سب حاصل کر لی تھی۔ اب وہ سکون سے ایسی پُرتعیش زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کے لیے اسے خود کوئی تگ و دو نہ کرنی پڑے۔ بین جوائے اسے یہ زندگی دے سکتا تھا۔ اس کے انتخاب کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص نہیں تھا اس نے نورمی کو پسند کیا تھا اور اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس نے نورمی پر کام کرنے کی پابندی بھی نہیں لگائی تھی۔ یعنی وہ شادی کے بعد بھی ماڈلنگ کر سکتی تھی۔ گزشتہ دو سال سے ان کے درمیان بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نورمی کام کرتی تھی لیکن دورانیہ کم کر دیا تھا۔ خاص طور سے جب بین گھر آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ بھی گھر میں ہو۔ اس طرح اس نے کام بھی مخصوص کر لیا تھا اور اب ایسی ماڈلنگ کرنے سے گریز کرتی تھی جس میں اسے مکمل عریاں ہونا پڑے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی معاشرے میں عزت ہے اور نورمی کی عریاں ماڈلنگ سے اسے شرمندگی ہو سکتی ہے۔ نورمی نے بین سے صرف ایک شرط منوائی تھی کہ بین اسے ماں بننے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے بین سے صاف کہہ دیا ہے۔

”میں ماں نہیں بننا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں بچے پسند نہیں ہیں؟“

”بچے تو پسند ہیں لیکن میں ماں بننے کی تکلیف نہیں برداشت کر سکتی۔“

نورمی کا تعلق بہت غریب گھرانے سے تھا اور اس نے اپنے چار بہن بھائیوں کو گھر میں پیدا ہوتے دیکھا تھا اس کی ماں پر اس دوران میں جو گزرتی تھی وہ ہمیشہ کے لیے نورمی کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس نے اس شرط کو باقاعدہ تحریر کروایا تھا۔ یہ ان کے شادی کے معاہدے میں شامل تھی لیکن اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔

بین نے اس وقت تو نورمی کی یہ شرط مان لی تھی لیکن اب اسے اولاد کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ پچاس برس کا ہو چکا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اگر اب اس کا بچہ ہوتا تو وہ کوئی بیس برس بعد جا کر اس قابل ہوتا کہ اس کا وسیع کاروبار اور دولت سنبھال سکے۔ دوسری طرف وہ جانتا تھا کہ نورمی کسی صورت ماں بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ جب بھی ان کے درمیان بچے کے موضوع پر بات ہوتی تو نورمی اپنا عزم ضرور دہراتی تھی۔ ایک موقع پر جب بین نے بچے کو اپنی خواہش قرار دیا تو نورمی نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں اس بات پر تم سے الگ ہونے کو ترجیح دوں گی پھر تم چاہو تو کسی اور سے شادی کر کے اپنی خواہش پوری کر سکتے ہو۔“

لیکن بین، نورمی سے محبت کرتا تھا اور اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بات وہیں رہ جاتی تھی۔ وہ نورمی سے اس موضوع پر بات نہیں کرتا تھا لیکن اس کے اندر بچے کی خواہش باقی تھی۔

سیلی اور مارینو کا تعلق برازیل کے پڑوسی ملک بولیویا کے ایک پسماندہ سرحدی علاقے ٹرینیڈاڈ سے تھا یہ جگہ برازیل کی سرحد سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ مارینو ایک مزدور تھا اور جب سیلی نے اس سے شادی کی تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس نہ تو اپنا مکان ہے اور نہ اپنی زمین۔ کیا ان کے بچے بھی اسی طرح غربت اور محروم زندگی گزاریں گے۔ سیلی اور مارینو کا تعلق بہت غریب گھرانوں سے تھا جہاں ایک وقت کھانا بنتا تھا تو دوسرے وقت کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی کو اس کے ماں باپ نے بڑی مشکل سے ہائی اسکول تک پڑھایا تھا اور اس کے بعد اسے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے آگے پڑھنا ہے تو اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے۔ سیلی جانتی تھی اس کے ماں باپ خود غرض نہیں تھے لیکن وہ کیا کرتے ان کے پانچ بچے اور بھی تھے، ان کو پڑھانا اور پالنا تھا۔ سیلی سب سے بڑی تھی۔

مجبوراً صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے کام شروع کر دیا۔ ان کے علاقے میں کام محدود تھا۔ مرد کان کن بن

جاتے تھے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ سیلی بھی ایک کھیت میں کام کرنے لگی۔ جہاں جان توڑ محنت کے بعد اسے اتنا ملتا تھا کہ وہ بس اپنے اخراجات پورے کر سکتی تھی۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ اتنی آمدنی میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھی اور اگر کالج میں داخلہ لے لیتی تو اتنا کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں زمین زیادہ تر جاگیرداروں کے قبضے میں تھی اور اکثر لوگ ان ہی کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ بولیویا ویسے بھی ایک پسماندہ ملک تھا اب بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس وقت تو غربت بہت زیادہ تھی۔

سیلی کی مارینو سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی کھیت میں کام کرنے والا مزدور تھا اس کی تعلیم معمولی سی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ عام سا نوجوان تھا اس کے مقابلے میں سیلی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی، اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے اور جلد انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ ہسپانوی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہاں کے لوگ عشق و محبت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہسپانوی مشرقیت کے دلدادہ جو ہوتے، وفا ان کی سرشت میں ہوتی ہے اسی وجہ سے یورپ بھر میں انہیں محبت کی دنیا کے باسی کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور چاہے جانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ پیار ان کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اسی لیے ان کی شادی کو دونوں خاندانوں نے سراہا تھا۔ ایک دوسرے کے ہوگئے۔

شادی کے بعد انہیں صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ زندگی کس قدر دشوار ہے خاص طور سے جب آدمی کے پاس بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی رقم نہ ہو۔ بولیویا میں خراب اقتصادی حالات کی وجہ سے پورے ملک کی ایک جیسی پوزیشن تھی اگر وہ کہیں اور چلے جاتے تب بھی ان کا معیار زندگی بہتر نہ ہوتا۔ ابھی ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز تھا اور وہ جدوجہد کر سکتے تھے جب ان کے بچے ہو جاتے تو وہ جدوجہد کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اور پھر ان کو جیسے تیسے گزارا کرنا پڑتا جیسے ان کے ماں باپ کرتے آئے تھے۔ سیلی اس معاملے میں بہت حساس تھی اور وہ چاہتی تھی جو مشکلیں انہوں نے برداشت کی ہیں وہ ان کے بچوں کو نہ برداشت کرنی پڑے۔ وہ باقاعدگی سے اخبار دیکھتی تھی کہ شاید کوئی روشنی کی کرن نظر آجائے۔ پھر اسے یہ کرن نظر آگئی۔ ایک دن مارینو کام سے آیا تو سیلی بہت خوش تھی۔ مارینو نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آرہی ہو؟“

سیلی نے آج کا اخبار اس کے سامنے رکھ دیا اور ایک خبر پر انگلی رکھی۔ اس کے مطابق برازیل میں بولیویا کی سرحد کے پاس کافی کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جارہی تھی اور کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس لیے بولیویا کے سرحدی علاقے سے لوگ برازیل جارہے تھے اور وہاں ان کو ملازمتیں مل رہی تھیں۔ آمدنی تین سے چار گنا زیادہ تھی اس لیے لوگ برازیل جانے کو ترجیح دے رہے تھے اور کیونکہ برازیل کو بھی کارکنوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ آسانی سے بولیویا کے لوگوں کو ورک ویزا دے رہے تھے۔ مارینو نے خبر پڑھ کر سوالیہ نظروں سے سیلی کی طرف دیکھا تو اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”ہم بھی برازیل جا سکتے ہیں اور وہاں کام حاصل کر سکتے ہیں۔“

مارینو ہچکچایا تھا۔ ”لیکن اپنا ملک چھوڑ کر....“

”ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جارہے ہیں۔“ سیلی نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہم وہاں جا کر رقم جمع کریں گے اور جب ہمارے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ ہم اپنی زمین اور مکان خرید سکیں تو ہم واپس آجائیں گے۔“

ٹرینیڈاڈ میں زمین زرخیز اور سستی تھی لیکن لوگ اتنے غریب تھے اور آمدنی اتنی محدود تھی کہ وہ یہ سستی زمین بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ آمدنی محدود تھی تو مہنگائی بہت زیادہ تھی لوگ جو کماتے تھے وہ پورا نہیں پڑتا تھا بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی اور مارینو یہاں دونوں کما رہے تھے لیکن شادی کے بعد ان کی بچت سو بولیوین ڈالرز تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ مارینو ہچکچا رہا تھا لیکن سیلی نے اسے راضی کر لیا۔ مارینو کو خوف تھا کہ یہاں روزگار ویسے ہی مشکل سے ملتا ہے اور وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور ان کو برازیل میں بھی کام نہیں ملا تو ان کو واپس آ کر بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے برعکس سیلی یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ اس کا کہنا تھا خطرے کا سامنا کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا ہے وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو خطروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

بولیویا کے شہریوں کو ویزا سرحد پر مل رہا تھا۔ برازیلی حکام صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ کام کے لیے آنے والے جوان اور مضبوط ہیں۔ وہ کسی کم عمر یا بوڑھے آدمی کو

ویزا نہیں دے رہے تھے۔ سیلی اور مارینو ایک خستہ حال بس اور پھر کوئی چار میل کا پیدل سفر کر کے سرحدی چوکی تک پہنچے۔ جہاں ان کو آسانی سے ویزا مل گیا۔ یہ عارضی ویزا تھا ان کو مستقل ویزا اس وقت ملتا جب ان کو کہیں ملازمت مل جاتی دوسری صورت میں ان کو ایک ہفتے کے اندر واپس آنا پڑتا اور وہ نہیں آتے تو برازیلین پولیس ان کی تلاش شروع کر دیتی۔ سیلی نے سنا تھا کہ برازیل سے زیادہ مواقع پورٹو ویل ہو میں تھے۔ یہ علاقہ خاص طور سے کافی کے باغات کے لیے مشہور ہو رہا تھا۔ وہ پورٹو ویل ہو کی طرف روانہ ہو گئے۔ بس کا ٹکٹ خریدنے کے بعد ان کے پاس بس اتنی رقم بچی تھی کہ وہ اس سے دو دن گزارا کر سکتے تھے اور اس کے بعد فاقے شروع ہو جاتے۔ دو گھنٹے بعد وہ پورٹو ویل ہو میں تھے۔

سیلی نے بس سے اترتے ہی ایک ڈسٹ بن میں نظر آنے والا تازہ اخبار اٹھایا اور اس میں ملازمت کے اشتہار دیکھنے لگی۔ سرحد کے دونوں جانب اسپینش زبان بولی اور لکھی جاتی ہے اس لیے زبان کا مسئلہ نہیں تھا۔ سیلی نے ایک بڑا اشتہار دیکھا۔ یہ جوائے فارمز کی طرف سے تھا اور یہاں کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے مزدور درکار تھے۔ کھانے اور رہائش کے ساتھ معقول تنخواہ بھی دی جا رہی تھی۔ یہ ان کی سابق آمدنی سے تین گنا زیادہ تھی۔ سیلی نے خوش ہو کر مارینو سے کہا۔ ”اگر یہاں ملازمت مل گئی تو ہم تین چار سال میں بہت ساری رقم جمع کر سکتے ہیں۔“

”اگر ملازمت مل جائے تو۔“ مارینو نے جواب دیا وہ ابھی تک شک میں تھا کہ ان کو یہاں کام مل سکتا ہے حالانکہ اس کے ہزاروں ہم وطن یہاں کام کر رہے تھے۔ وہ جوائے فارمز پہنچے اس وقت وہ بین جوائے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ فارمز کے ایک نائب مینیجر نے ان کا انٹرویو لیا اور ان کی عمر، صحت اور کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ جان کر ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ جوائے فارمز کے باغات میلوں کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں کام کرنے والے افراد کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان مزدوروں کے لیے باغات کے درمیان میں ہی جا بہ جا چھوٹے چھوٹے ہٹ بنائے گئے تھے۔ سستے اور سادہ تعمیراتی میٹریل سے بنے ہوئے ان ہٹس میں سہولتیں موجود تھیں۔ ان کو بجلی اور پانی دیا گیا تھا لیکن وہ یہاں کچھ پکا کر نہیں کھا سکتے تھے۔ کچن کی سہولت نہیں تھی۔ ایک بڑا اسامیس تھا جہاں کارکنوں کو تین وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مشروبات بھی دستیاب تھے۔ رہائش اور کھانے کے عوض ان کی تنخواہوں سے معمولی سی رقم کاٹی جاتی۔ سیلی اور مارینو میاں بیوی تھے اس لیے ان کو ڈبل بیڈ والا ہٹ دیا گیا تھا۔ ہٹ ایک کمرے اور ساتھ میں چھوٹے سے باتھ روم پر مشتمل تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، ایک الماری اور دو کرسیاں تھیں۔ یہ سیلی اور مارینو کے بولیویا کے اس گھر سے چھوٹا تھا جہاں وہ کرائے پر رہتے تھے لیکن یہاں ساری ضروری سہولتیں تھیں۔ سیلی اور مارینو خوش تھے۔ وہ جتنا سوچ کر آئے تھے ان کو اس سے زیادہ ہی مل گیا تھا۔ بس کام ذرا سخت تھا۔ صبح سات سے دوپہر دو بجے تک کام کرنا ہوتا تھا اس کے بعد وقفہ ملتا تھا۔ پھر پانچ سے سات بجے تک کام ہوتا تھا۔ رات نو بجے تک میس میں کھانا ملتا تھا اور ان کو صبح چھ بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ سات بجے تک ناشتا کر کے وہ کام پر پہنچ جاتے تھے۔ ان کی درخواست پر ان کو ایک ہی جگہ لگایا گیا تھا۔

جوائے فارمز کی میلوں پھیلی زمین کے وسط میں بین جوائے کا عالی شان محل نما مکان تھا۔ اگرچہ وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریوڈی جینرو میں رہتا تھا لیکن اس کی اصل رہائش گاہ یہی تھی۔ وہ جب یہاں آتا تو اپنے فارم کا دورہ ضرور کرتا اور اس کے ایک ایک حصے میں آتا تھا۔ سیلی اور مارینو اسے مہینے میں ایک بار تو ضرور دیکھتے تھے۔ وہ اپنے کسی کاروبار کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا جتنا جوائے فارمز کو۔ اس کی ذاتی دل چسپی کی وجہ سے فارمز کی انتظامیہ اور سپروائزر بھی مستعد رہتی تھی اور کارکنوں پر مکمل نظر رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سیلی اور مارینو کو کام کے اوقات میں سکون کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور شام کو جب چھٹی ہوتی تو وہ تھک چکے ہوتے تھے۔

اس کے باوجود وہ خوش تھے۔ یہاں کوئی پریشان کرنے والی چیز نہیں تھی وہ محنت کرتے تھے تو ان کو اس کا پورا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ پھر رہائش اور کھانا پینا بھی بہترین تھا اس لیے وہ کام میں پوری دل چسپی لیتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں ان کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ ایک سال بعد جب وہ دو ہفتے کی چھٹی پر واپس گئے تو ان کے گھر والے ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک سال میں جو کمایا تھا اس سے انہوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک چھوٹی سی وادی میں کچھ زمین خرید لی۔ اس وادی میں ایک چشمہ بھی تھا اور وہاں کسان بہت اچھی فصل حاصل کرتے

تھے۔ یہ زمین تھوڑی تھی لیکن ان کو اُمید تھی وہ چند سال میں مزید زمین حاصل کرسکیں گے اور اس پر گھر بھی بنالیں گے۔

بین جوائے عام طور سے مہینے کی آخری تاریخوں میں گھر آتا تھا اور اس کے بعد یہاں ایک ہفتہ یا دس دن ٹھہرتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس سے اگلے دن وہ جوائے فارمز کا دورہ شروع کرتا۔ اپنی واپسی تک وہ روزانہ صبح سے شام تک جوائے فارمز کے مختلف حصے دیکھتا تھا۔ اگر اس کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی حصہ معائنے سے رہ جاتا تھا تو وہ اگلی بار اپنے معائنے کا آغاز اسی حصے سے کرتا تھا۔ اس نے جوائے فارمز میں دنیا کی بہترین کافی کاشت کرائی تھی اور یہ کافی ایک معاہدے کے کافی تیار کرنے والی بہترین کمپنیوں کو فراہم کی جاتی تھی بین اپنے فارمز میں کوئی کیمیائی کھاد یا جراثیم کش دوا استعمال نہیں کرتا تھا اس کے بجائے وہ حیاتیاتی کھاد اور کیڑے مکوڑے مارنے کے قدرتی دوا استعمال کرتا تھا جو اسے کسی قدر مہنگے پڑتے تھے لیکن اس کے نتیجے میں جو کافی پیدا ہوتی تھی اس کا معیار اور ذائقہ لاجواب ہوتا تھا۔ بین جوائے جتنا اس فارم پر خرچ کرتا تھا اس سے کہیں زیادہ کما لیتا تھا۔

لیکن اس بار بین جب گھر آیا تو خلاف معمول دوسرے دن اس نے فارم کا معائنہ نہیں کیا۔ نہ اس سے اگلے دن نکلا اور پھر وہ پورا ایک ہفتہ تک اپنے محل نما مکان سے نہیں نکلا تھا۔ فارمز انتظامیہ اور کارکن حیران تھے کیونکہ برسوں سے بین جوائے کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تو اسے اگلے دن اپنے درمیان دیکھنے کے عادی تھے۔ جو لوگ بین سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں فارمز کے معائنے پر نہیں نکلا تھا۔ انہوں نے بین سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پرسنل اسٹاف نے کسی ملاقات کے امکان کو رد کردیا تھا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

یہ بین کی آمد کا چھٹا دن تھا۔ وہ اور نورمی مکان کے ٹیرس میں موجود تھے جہاں سے دور تک پھیلے باغات صاف نظر آتے تھے اور وہ اپنے ہی فارمز کی بنی کافی پی رہے تھے۔ بین جوائے کو کافی زیادہ پسند نہیں تھی لیکن اس کے خیال میں یہ کاروباری اخلاقیات کا تقاضہ تھا کہ وہ جو چیز دوسروں کو بیچ رہا ہے اسے خود بھی استعمال کرے۔ دونوں میاں بیوی خاموش تھے۔ پھر نورمی نے ہچکچا کر کہا۔ ''کیا یہ مناسب ہوگا؟''

بین نے کسی قدر سرد انداز میں اسے دیکھا۔ ''یہی مناسب ہوگا، ورنہ تم بتاؤ اس کے سوا اور کیا راستہ ہے؟''

''میرا مطلب ہے کیا اخلاقی اور قانونی لحاظ سے یہ درست ہوگا؟''

''شاید نہیں۔'' بین کا لہجہ مدھم ہوگیا تھا۔ ''لیکن دوسروں کو اس بارے میں پتا ہی نہیں چلے گا۔''

''کیسے پتا نہیں چلے گا جب کہ اس کام میں بہت سارے لوگ ملوث ہوں گے۔'' ڈاکٹروں کی پوری ٹیم رہے گی۔ نورمی کی آواز تیز ہوگئی۔

''تم مجھ پر اعتماد رکھو۔'' بین نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ ممکن ہے۔''

''میں جانتی ہوں اور مجھے تم پر اعتماد ہے۔ لیکن اگر بات کھل گئی تو تم سوچ سکتے ہو ہم کس مشکل میں پڑ جائیں گے؟''

''کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' بین نے کہا۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے تھے۔ گزشتہ چار دن سے تین ڈاکٹروں کی ایک ٹیم جدید ترین آلات کی مدد سے ان کا جسمانی معائنہ کر رہی تھی۔ ان کے متعدد ٹیسٹ لیے گئے تھے اور آج ہی اس ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر روز انے بین کو بتایا تھا کہ وہ جو چاہتا تھا وہ عملی طور پر مشکل ضرور لیکن ناممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کی یہ ٹیم اپنے عملے اور آلات سمیت بہت خفیہ محل تک آئی تھی۔ وہ جس حصے میں مقیم تھی وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں تک کھانے پینے کا سامان بھی خودکار روبوٹک ٹرالیوں کی مدد سے جاتا تھا۔ ڈاکٹر روز کی طرف سے اوکے کا سگنل ملنے کے بعد ہی بین جوائے نے نورمی سے بات کی تھی اگرچہ نورمی کو پہلے بھی معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن اس وقت ان کے ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔ اب اسے معلوم ہوگیا تھا کہ بین جوائے جو چاہتا ہے وہ ممکن ہے۔ نورمی اگرچہ اس خیال سے متفق نہیں تھی کیونکہ ایک تو اسے اخلاقی لحاظ سے درست نہیں سمجھ رہی تھی اور دوسرے اسے اولاد کی خواہش نہیں تھی جب کہ بین جوائے بہر صورت اپنا وارث چاہتا تھا اور اس کے لیے کسی حد تک جانے کے لیے تیار تھا سوائے اسے چھوڑنے کے، کیونکہ وہ نورمی سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ نورمی سے بات کر کے بین جوائے محل کے اس حصے میں آیا جہاں ڈاکٹر اپنے عملے اور سامان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بین

جوائے ڈاکٹر روزا کے پاس آیا۔

''ہم تیار ہیں۔''

''گڈ۔'' ڈاکٹر روزا مسکرایا۔ ''اب ایک ایسی عورت درکار ہے جو شادی شدہ ہو، کنواری نہ ہو اور ابھی ماں بھی نہ بنی ہو۔''

''اسے دیکھنا پڑے گا۔'' بین جوائے نے کہا۔ ''لیکن بندوبست ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے ہم کل سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر روزا نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے ایک مہینے کے اندر ہمیں کامیابی مل جائے گی۔''

اگلے روز بین جوائے محل سے نکلا اور اس نے فارمز کا معائنہ شروع کر دیا۔ فارمز کی انتظامیہ اور کارکنوں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ بین جوائے ٹھیک تھا۔ وہ ٹھیک تھا تو ان کی روزی بھی سلامت تھی۔ اس علاقے میں بین اپنے ملازمین کو سب سے اچھی تنخواہیں اور سہولیات دیتا تھا۔ کسی ہنگامی صورت حال میں بھی ان کا خیال رکھتا تھا تو ایسے مالک کی سب کو فکر رہتی تھی۔ جب بین جوائے اس حصے میں داخل ہوا جہاں سیلی اور مارینو فے کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں ایک درخت کے آس پاس زمین صاف کر رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بین جوائے ٹھٹک گیا تھا اور اس نے اس حصے کے سپر وائزر کو اشارے سے پاس بلایا وہ دوڑا آیا تھا۔

''جناب عالی۔''

''یہ دونوں کون ہیں؟''

''یہ میاں بیوی ہیں۔ سیلی فے اور مارینو فے' دونوں بولیوین ہیں۔ یہاں ایک سال سے زیادہ عرصے سے کام کر رہے ہیں دونوں محنتی اور اچھے کارکن ہیں۔'' سپر وائزر نے مستعدی سے جواب دیا۔

بین جوائے نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ اس نے سپر وائزر سے پوچھا۔ ''یہ کہاں مقیم ہیں؟''

''سیکٹر فائیو میں ان کو ایک ہٹ الاٹ کیا گیا ہے۔''

اس وقت سیلی اور مارینو بین جوائے کو سامنے دیکھ کر مؤدب کھڑے ہو گئے تھے۔ جب وہ سپر وائزر سے بات کر رہا تھا تو سیلی نے محسوس کیا وہ ان کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ کیونکہ گفتگو کے دوران بین کی نظریں مستقل ان پر مرکوز تھیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سیلی پر مرکوز تھیں لیکن انہیں مردانہ نظریں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سیلی نے موسم کی مناسبت سے جینز کی چھوٹی سی نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا صحت مند جسم اس لباس میں نمایاں ہو رہا تھا اس کے باوجود بین نے اسے مرد کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ سیلی کو ایسی نظروں کا خوب تجربہ تھا۔ بین کچھ دیر سپر وائزر کے ساتھ بات کرتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے کچھ کارکنوں سے بات کی لیکن پھر سیلی اور مارینو کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کام معمول کے مطابق ہونے لگا تو سیلی نے آہستہ سے مارینو سے کہا۔

''مجھے لگ رہا ہے بین جوائے ہمارے بارے میں بات کر رہا تھا۔''

مارینو نے بے یقینی سے کہا۔ ''اسے ہمارے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پتا نہیں لیکن مجھے ایسا ہی لگا۔'' سیلی بولی۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی بین جوائے کو ہم جیسے معمولی کارکنوں کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' سیلی نے کہا اور کام میں لگ گئی۔ وہ ایک مہینا پہلے ہی واپس آئے تھے اور ان کو چھٹیوں کے پندرہ دنوں کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ زمین خریدنے اور آنے جانے کے اخراجات کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا اس لیے وہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کے منتظر تھے۔ ان کو دو دن بعد آنے والی پہلی کو تنخواہ مل جاتی۔ سیلی کو کچھ نئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ زیادہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کی منتظر تھی۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو سیلی یہی بات کر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گئے۔ رات کے اس وقت کوئی نہیں آتا تھا۔ یہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا کچھ کارکنوں سے اچھے تعلقات تھے تو ان سے بھی میس میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

''کون ہے؟'' مارینو نے پوچھا۔

''سپر وائزر آئزمین۔'' باہر سے آواز آئی۔ آئزمین ان کا سپر وائزر تھا مارینو نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

''تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے؟''

''اس وقت؟'' مارینو بولا۔ ''کیا کوئی کام ہے؟''

''نہیں تمہیں جناب بین جوائے نے طلب کیا ہے۔''

مارینو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ''جناب بین

جوائے نے؟''

''تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔'' آئز مین نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔''فوراً چلو وہ انتظار کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔''

''ایک منٹ جناب میں اپنی بیوی کو کہتا ہوں۔'' مارینو کہہ کر اندر آیا اور اس نے سیلی کو بتانا چاہا لیکن وہ پہلے ہی سن چکی تھی۔ مارینو نے کہا۔''تیار ہو جاؤ۔''

دونوں میاں بیوی اس طلبی پر پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں خدشہ آیا تھا کہ شاید ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جس کی پاداش میں ان کی طلبی ہو رہی ہے۔ آئز مین گاڑی میں آیا تھا راستے میں مارینو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔''کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو ہمیں بلایا گیا ہے؟''

آئز مین ہنسا۔''یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن جہاں تک کسی غلطی پر جواب طلبی ہے تو یہ جناب بین جوائے کا کام نہیں ہے۔''

یہ بات سیلی اور مارینو بھی سمجھ رہے تھے اس کے باوجود وہ سہمے ہوئے تھے۔ اگر ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا تو اتنی اچھی ملازمت دوبارہ نہیں ملتی۔ کام تو مل جاتا لیکن اس میں نہ تو اتنی اچھی تنخواہ ہوتی اور نہ ان کو رہائش اور کھانے کی سہولت ملتی۔ آئز مین نے ان کو محل کے دروازے پر موجود ایک سوٹ پوش جوان آدمی کے سپرد کیا اور وہ ایک ویران اور خاموش راستے سے گزار کر محل کے اندر لے آیا اور کئی طویل راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ہال نما جگہ پہنچے جہاں کئی افراد ڈاکٹروں والے لباس میں موجود تھے۔ وہاں ڈاکٹر روزا بھی تھا وہ ان کے پاس آیا۔''مسٹر اور مسز فے میرے ساتھ آؤ۔''

وہ ان کو ایک چھوٹے سے کیبن میں لے گیا۔ یہ ڈاکٹر روزا کا دفتر تھا۔ اس نے ان کو بٹھایا اور نرم لہجے میں سمجھانے لگا کہ ان کے کچھ ٹیسٹ ہوں گے اس کے بعد ان کو بین جوائے کی طرف سے ایک پیش کش ہو گی اور اگر انہوں نے یہ پیش کش قبول کر لی تو ان کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر روزا کی اسپینش اچھی تھی۔ لیکن بعض الفاظ پر وہ لڑکھڑا جاتا تھا۔ بہر حال سیلی اور مارینو اتنا سمجھ گئے تھے کہ بین جوائے ان سے کوئی کام لینا چاہتا تھا اور اس کے بدلے ان کو بہت بڑی دولت مل جاتی۔ وہ دولت کے لیے تو یہاں آئے تھے اور ڈاکٹر روزا کے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ خوش ہو گئے۔ سیلی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہمارے کس قسم کے ٹیسٹ ہوں گے۔''

''یہ تم کل دیکھ لو گے لیکن کیا یہ بات یقینی ہے کہ تم کبھی اُمید سے نہیں ہوئیں؟''

''ایک بار بھی نہیں۔'' سیلی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر روزا نے یہ سوال پہلے بھی کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے اُمید سے ہونے یا نہ ہونے سے ان لوگوں کو کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر روزا ان کو ہال میں لے کر آیا جہاں ایک شخص نے ان کو دو دو انجکشن دیئے اور پھر کچھ دوائیاں کھانے کو دیں اور پھر ان کو آرام کرنے کے لیے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ دوائیوں میں شاید کوئی نیند کی دوا بھی تھی کیونکہ ان کو لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی جب کہ اس سنسنی میں اتنی آسانی سے نیند نہیں آتی۔ جو اس وقت وہ محسوس کر رہے تھے۔ صبح ان کو بیدار کیا گیا تھا کیونکہ ان کے ٹیسٹ صبح سویرے نہار منہ ہونا تھا۔ ان کے خون کا نمونہ لیا گیا اور پھر ان کو کئی مشینوں کی مدد سے چیک کیا گیا۔ ڈاکٹر روزا سیلی کو الگ حصے میں لے گیا اور اس کا مخصوص معائنہ کیا۔ اس کام میں بھی اس نے مشینیں استعمال کی تھیں۔ یہ تمام ٹیسٹ اور چیک اپ کوئی تین گھنٹے تک جاری رہے تھے۔ اس کے بعد ان کو بھرپور ناشتا فراہم کیا گیا۔ جس وقت وہ ناشتا کر رہے تھے۔ اس حصے کے ایک کمرے میں ڈاکٹر روزا بین جوائے اور نوری سے بات کر رہا تھا۔

''عورت مکمل طور پر فٹ ہے شی از اے پاورفل وومین لیکن اس کے شوہر کے ساتھ مسئلہ ہے۔ بلڈ رپورٹ کے مطابق اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اب تک ماں باپ نہیں بن سکے ہیں۔''

نوری کسی قدر بے چین تھی اس نے کہا۔''کیا یہ عورت مان جائے گی؟''

''یہ تو آپ پر ہے۔'' ڈاکٹر روزا نے محتاط انداز میں کہا۔''معاملات اسی وقت آگے بڑھیں گے جب وہ مان جائے گی۔''

بین جوائے بھی مضطرب تھا۔ اس نے کہا۔''ڈاکٹر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری طرف سے تم ان سے بات کرو؟''

''میں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔''میں کیسے بات کر سکتا ہوں جناب؟''

''کر سکتے ہو میری طرف سے تم ان کو کوئی بھی مالی پیش کش کر سکتے ہو اور ان کی وہ تمام شرائط بھی مجھے قبول ہوں گی جو میرے بس میں ہیں۔''

ڈاکٹر روزا ہچکچایا لیکن پھر مان گیا کیونکہ اگر یہ کام انجام پذیر ہوتا تو اسے بھی انعام میں بہت بڑی رقم ملتی جو اس کے معاوضے کے علاوہ ہوتی۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میں ان سے بات کرتا ہوں۔''

''صرف بات مت کرو بلکہ ان کو راضی کرو۔'' بین جوائے کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ ''تم جانتے ہو یہ تمہارے لیے بھی بہت ضروری ہے۔''

ڈاکٹر روزا اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ وہ ہال میں واپس آیا جہاں سیلی اور مارینو کرسیوں پر پاس پاس بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی سیلی نے کہا۔ ''ڈاکٹر تم نے بتایا نہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''صبر... صبر۔'' اس نے جواب دیا اور ان کو اپنے دفتر والے کیبن میں لے آیا یہاں ان کی بات کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ ان کو بٹھا کر ڈاکٹر روزا نے پہلے تمہید باندھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ممکن ہے میں تم سے جو کام لینا چاہتا ہوں وہ تمہارے لیے پسندیدہ نہ ہو لیکن اس دنیا میں سب کچھ تو انسان کی پسند سے نہیں ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے بدلے مل کیا رہا ہے؟''

''ڈاکٹر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مارینو بولا۔ ''ہم اب تک کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں۔''

''میں سمجھا رہا ہوں لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں جو کہوں اس پر غور ضرور کرنا۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر روزا آہستہ آہستہ ان کو بتانے لگا کہ بین جوائے ان سے کیا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی حیرت بھرے انداز میں سن رہے تھے خاص طور سے سیلی کی تو آنکھیں ہی پھیل گئی تھیں کیونکہ اصل مطالبہ اسی سے تھا البتہ یہ ان دونوں میاں بیوی کی اجازت سے مشروط تھا۔ ان کا پہلا ردِّعمل نہایت مخالفانہ تھا۔ مارینو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''اگر تمہارا مطلب ہے کہ سائنسی لحاظ سے تو یہ بالکل....''

''سائنس گئی بھاڑ میں۔'' مارینو برہمی سے بولا۔ ''یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''دیکھو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ صرف ایک سال کی بات ہے۔''

''صرف ایک سال۔'' سیلی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''صرف ایک سال جو ہماری باقی ساری زندگی کو برباد کر دے گا۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''چلو مارینو یہاں سے۔''

''ایک منٹ....'' ڈاکٹر روزا نے جلدی سے کہا اور ان کو کسی نہ کسی طرح پھر سے بیٹھنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ''ابھی اصل بات تو ہوئی نہیں ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو اس کے عوض تم کیا حاصل کر سکتے ہو۔ تم جو رقم مانگو گے بین جوائے تم کو دے گا تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔''

''ہمیں نہیں چاہیے۔'' مارینو نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس میں سیلی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آئے گا۔ اس کی عزت محفوظ ہو گی۔''

''یہ عزت محفوظ ہو گی۔'' سیلی زہریلے انداز میں بولی۔ ''کسی عورت کی بے عزتی صرف اس طرح تو نہیں ہوتی ہے جس طرح عام طور سے سمجھا جاتا ہے تمہاری تجویز بھی بے عزتی کے برابر ہے۔''

''ہمیں دولت نہیں چاہیے۔'' مارینو نے کہا۔ ''ہم جو کما رہے ہیں اس سے مطمئن ہیں۔''

''جناب بین جوائے سے کہا جائے کہ وہ کسی اور کو تلاش کریں۔'' سیلی نے کہا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر روزا سمجھ گیا تھا کہ کوئی ترغیب ان کو راضی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان کے لباس اور گفتگو سے جان گیا تھا کہ ان کا تعلق معاشرے کے نہایت غریب طبقے سے تھا اور اسی وجہ سے اسے اُمید تھی کہ وہ مان جائیں گے لیکن انہوں نے اس کی پیش کش سننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ ایک آخری حربہ دھمکی کا باقی رہ گیا تھا۔ اس نے سرد لہجہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو اس انکار کی تمہیں کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے؟''

☆☆☆

سیلی بستر پر لیٹی سسکیاں لے رہی تھی اور مارینو اس کے برابر میں سرہانے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تسلی دینے کے انداز میں سیلی کے شانے پر تھا۔ کچھ دیر بعد سیلی نے بھیگی آواز میں کہا۔ ''مجھے مت چھو میں اس قابل نہیں ہوں۔''

مارینو نے سرد آہ بھری۔ ''ہم دونوں ہی اس قابل نہیں رہے ہیں بلکہ قصور تو میرا ہے۔''

سیلی اٹھ بیٹھی۔ ''نہیں اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔''

''تمہاری حفاظت کی ذمے داری مجھ پر ہے اور میں اس ذمّے داری کو نہیں نبھا سکا۔''

''یہ بھی تو میری وجہ سے ہوا ہے۔'' سیلی کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''مجھے بچانے کے لیے تم نے اپنی غیرت کی قربانی

دی۔“

مارینو آہستہ سے بولا۔ ”شاید ہم دونوں ہی کمزور ہو گئے تھے۔ جان بچانے کے لیے ان کی بات مان لی۔“

اس بات کو ایک مہینا گزر چکا تھا جب ان کو بین جوائے کے محل میں لے جایا گیا تھا اور آج ڈاکٹر روزا نے تصدیق کر دی تھی کہ سیلی اُمید سے ہو گئی تھی۔ وہ بدستور محل میں مقیم تھے اور ان کو یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اس کام پر تیار ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بین جوائے نے ڈاکٹر روزا کے توسط سے ان کو پیغام بھیجا تھا کہ ان کو اتنا دیا جائے گا کہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ سیلی اور مارینو نے اس بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ محض مجبور تھے۔ جب سیلی ڈاکٹر روزا کے تجربات سے گزر رہی تھی تو اس نے مارینو کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اب سیلی کے پاس نہیں جائے گا۔ اسے پندرہ دن تک سیلی سے بالکل الگ رکھا گیا تھا اور جب حمل کی تصدیق ہو گئی تو اسے سیلی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ اس پر بھی وارننگ برقرار تھی کہ وہ سیلی کے پاس نہیں جائے گا۔ کمرے میں کیمرے لگے تھے اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کرتا تو ان کو پتا چل جاتا اس صورت میں مارینو کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جاتا جہاں وہ قید ہوتا۔ آج وہ کتنے دن بعد ایک ساتھ تھے۔ سیلی نے سرگوشی میں کہا۔

”میں اس بچے کو پیدا کرنا نہیں چاہتی۔“

مارینو نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”یہ ہماری خواہش نہیں ہے اور نہ ہمارا بچہ ہے لیکن ہم اس معاملے میں بے بس ہیں۔“

”میں اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔“ سیلی نے پھر کہا۔

”اس کی ایک ہی صورت ہے ہم مر جائیں۔“

لیکن سیلی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے اور مارینو کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی اپنے ان بچوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی جنہیں پیدا کرنے کا اس نے خواب دیکھا تھا اس کے اور مارینو کے بچے۔ یہ بچہ نہیں جو اس کے پیٹ میں تھا اور اسے ابھی سے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں کوئی عفریت گھس آیا ہو۔ اس نے اس کے اور مارینو کے بچوں کا حق غصب کر لیا ہو۔ ڈاکٹر روزا نے مارینو کو بتایا تھا کہ اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی

اولاد پیدا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔ لیکن مارینو اور سیلی کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ ان کے خیال میں ڈاکٹر روزا اپنے مفاد کی خاطر ان سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے مارینو سے کہا کہ وہ چاہے تو وہ اس کا علاج کر سکتا ہے۔ وہ اس چیز کا ماہر ہے لیکن مارینو نے انکار کر دیا تھا۔ انہیں ڈاکٹر روزا پر اعتماد نہیں تھا۔ حمل کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے سیلی کو احتیاطیں بتائی تھیں،

''اب تم دونوں کو بچے کی پیدائش تک یہیں رہنا ہو گا۔''

''اس گھٹے ہوئے ہال اور کمرے میں؟'' سیلی نے کہا۔

''نہیں تم لوگ چاہو تو باہر کھلی فضا میں بھی جا سکتے ہو اور چاہو تو محل میں کسی اور جگہ بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔''

انہوں نے کسی اور جگہ جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن باہر کھلی فضا میں گھومنے والی پیش کش قبول کر لی تھی۔ یہاں کئی تجربات کے بعد ان کو پتا چل گیا تھا کہ وہ مستقل نہ صرف کیمروں کی زد میں رہتے ہیں بلکہ ان کی باتیں بھی سنی جاتی ہیں گویا وہ مکمل طور پر ان کی نظر اور سماعت میں تھے۔ باہر جانے کی صورت میں وہ ایک تو تازہ ہوا اور دھوپ حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے وہ آپس میں کھل کر بات کر سکتے تھے۔ ان کو باہر جانے کی اجازت مزید دو دن بعد ملی تھی جب ڈاکٹر روزا نے سیلی کے مزید ٹیسٹ مکمل کر لیے تھے۔ اس دوران میں اس کے لیے ایک عورت فزیو آئی تھی جس کا کام دن بھر میں سیلی کو مختلف ایکسر سائزز اور حرکات کرانا تھا تا کہ وہ جسمانی طور پر فٹ رہے اور اس کے وجود میں پلنے والا بچہ بھی صحت مند رہے۔ جس دن وہ باہر نکلے تو ان سے ساتھ دو نگران بھی تھے لیکن وہ ان سے دور رہے تھے۔ محل کا سبزہ زار ناقابل بیان حد تک خوب صورت تھا۔ مگر ان دونوں کے نزدیک اس جگہ کی حیثیت ایک خوب صورت قید خانے سے زیادہ نہیں تھی۔ اور قید خانہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو آدمی وہاں سے رہائی کے خواب دیکھتا ہے۔ سیلی نے بھی موقع ملتے ہی یہ بات کی تھی۔

''مارینو کیا ہم یہاں سے جا نہیں سکتے ہیں؟''

''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ہم کوشش کر سکتے ہیں۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن ناکام رہے تو یہ شاید ہمیں الگ الگ کر دیں۔''

''نہیں۔'' سیلی کانپ گئی تھی۔ ''میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔''

''اب ہم باہر نکلنے لگے ہیں تو میں موقع دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی راستہ سمجھ میں آجائے۔''

سیلی نے نگرانوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔''

''کیونکہ ہم نے اب تک رویہ بھی ایسا ہی رکھا ہے۔'' مارینو نے سوچ کر کہا۔ ''اگر ہمیں یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو ہمیں اپنے رویے میں بھی تبدیلی لانی ہو گی۔''

اگرچہ یہ کام مشکل تھا کیونکہ سیلی اور مارینو دونوں ہی سادہ فطرت انسان تھے جن کو زیادہ اداکاری نہیں آتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے خود پر جبر کر کے ایسا ظاہر کرنا شروع کر دیا جیسے وہ اب خوش ہیں اور ان کو اس تجربے پر پہلے جیسا اعتراض نہیں رہا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ انہیں ملنے والی رقم نے نرم کیا ہے مارینو نے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔ ''بین جوائے ہمیں کیا دے گا؟''

''جو تم چاہو۔'' ڈاکٹر روزا خوش ہو کر بولا کیونکہ اب تک وہ ان پر اور خود پر جبر کرتا رہا تھا وہ ایک ڈاکٹر تھا جو انسانوں کی خدمت کرنے کا حلف اٹھا کر اس مقام تک آیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اسے کوفت ہو رہی تھی اس لیے جب اس نے مارینو اور سیلی کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو خوش ہو گیا تھا۔

''یہ ہمیں کس طرح ملے گا؟''

''بچے کی پیدائش کے فوراً بعد.... دنیا میں جہاں کہو اور جس کرنسی میں کہو مل جائے گا۔''

چند دن بعد سیلی نے ڈاکٹر روزا سے کہا۔ ''کیا ہم اس محل کے علاوہ کہیں اور نہیں رہ سکتے۔''

''یہاں کیا مسئلہ ہے؟''

''یہاں مجھے گھٹن ہوتی ہے جبر کا احساس ہوتا ہے۔''

''میں بین جوائے سے بات کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے بین جوائے سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے اگر ایسا ہو جائے تو یہ میاں بیوی ذہنی دباؤ سے نکل جائیں گے اور بعد میں بھی آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔''

مستقبل کا خیال بین جوائے کو بھی پریشان کر رہا تھا بچے کی پیدائش کے بعد تو اسے ان دونوں کو چھوڑنا پڑے گا اور اس وقت نہ جانے ان کا کیا ردِعمل ہو۔ اس لیے اس نے

اجازت دے دی۔ یہاں سے کچھ دور ایک بلند پہاڑی مقام پر اس کا ایک چھوٹا سا ولا تھا۔ جب یہاں گرمی زیادہ ہوئی تھی تو وہ نورمی کے ساتھ وہاں بھی چلا جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان دونوں کو ڈاکٹر روزا اور اس کے عملے کے ساتھ وہاں منتقل کر دے گا۔ اس طرح سیلی اور مارینو بھی خوش ہو جائیں گے۔ ابھی تک اس کا ان سے سامنا نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ایک ہی جگہ رہنے کا احساس دونوں طرف سے حاوی رہتا تھا۔ الگ جگہ چلے جانا دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ نورمی تو مستقل ریوڈی جینرو چلی گئی تھی بین جوائے کا بھی زیادہ وقت جوائے فارمز سے دور گزرتا تھا۔ لیکن یہ بات سیلی اور مارینو کو نہیں معلوم ہوتی تھی۔

''ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ تین مہینے ہونے میں کتنا وقت ہے اور یہ میاں بیوی کوئی گڑبڑ تو نہیں کریں گے؟''

''ابھی ایک مہینا باقی ہے۔'' ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے صورت حال کو ذہنی طور پر قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ دولت کی کشش بھی ان کو مجبور کر رہی ہے میرا خیال ہے بچے کی پیدائش تک وہ بالکل راضی ہو جائیں گے اور جب آپ ان کو بہت بڑی رقم دیں گے تو ان کی رہی سہی تکلیف بھی ختم ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے تین مہینے مکمل ہونے پر ان کو ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے اس دوران میں تم وہاں بھی دیکھ بھال کے تمام انتظامات کرلو۔''

ایک مہینے کے دوران میں ڈاکٹر روزا نے بین جوائے کے سمر ہاؤس میں تمام انتظامات کر لیے تھے اس نے سیلی اور مارینو کو بھی بتا دیا تھا کہ ان کو ایک مہینے کے اندر ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ ایک مہینے بعد ان کو سمر ہاؤس منتقل کر دیا گیا تھا یہ دو منزلہ لکڑی کا بنا ہوا سمر ہاؤس تھا۔ جو پہاڑی پر سب سے بلند جگہ تھا۔ یہاں موسم گرمیوں میں بھی خوشگوار ہوتا تھا اور رات کو کسی قدر سرد ہو جاتی تھی۔ سیلی اور مارینو کو ماسٹر بیڈ روم دیا گیا تھا۔ یہاں آکر سیلی اور مارینو کو سچ مچ آزادی کا احساس ہوا تھا۔ یہاں وہ گھٹن نہیں تھی جو وہ جوائے فارمز والے محل میں محسوس کرتے تھے۔ یہاں ڈاکٹر روزا اور اس کے دو معانین تھے باقی افراد کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ اتنے افراد میں صرف ڈاکٹر روزا ہی بین جوائے کے راز سے واقف تھا باقی افراد کو اس تجربے کے بارے میں کچھ.... معلوم نہیں تھا۔ اب سیلی کو فزیوتھراپسٹ کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ڈاکٹر روزا خود سیلی کا خیال رکھتا تھا۔ ان تین افراد کے علاوہ ایک باورچی تھا اور ایک دوسرے کاموں کے لیے مخصوص شخص تھا۔ سمر ہاؤس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی ہوتی تھی لیکن ان کا سمر ہاؤس سے تعلق نہیں تھا وہ باہر سے آتے تھے اور دوسرے گارڈز کے آنے پر ڈیوٹی ان کے حوالے کر کے چلے جاتے تھے ان کا کھانا پینا بھی باہر سے آتا۔

سمر ہاؤس سے نکلنے کے لیے صرف یہی ایک گیٹ تھا اس کے علاوہ چاروں طرف دس فٹ بلند دیوار تھی جس پر ڈیزائن والی خار دار باڑھ بھی لگی تھی۔ گویا بین جوائے نے یہاں بھی خیال رکھا تھا کہ سیلی اور مارینو کہیں فرار نہ ہو جائیں۔ عقب میں تقریباً دیوار جیسی سیدھی ڈھلان تھی جس پر اترنا خودکشی کے مترادف تھا۔ لیکن بین جوائے ایک بات بھول گیا تھا کہ انسان کو قید کیا جا سکتا ہے اس کی فطرت کو قید نہیں کیا جا سکتا ہے یہ فطرت ہے جو آگ کا دریا بھی پار کر جاتی ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

وقت گزرتا رہا چھٹے مہینے میں سیلی کا پیٹ نمایاں ہونے لگا تھا اور اسے چلنے پھرنے میں کسی قدر دقت ہوتی تھی اس کے باوجود وہ ہر شام کو سمر ہاؤس کے اوپری ٹیرس میں ضرور جاتی تھی کیونکہ ایک بار ڈاکٹر روزا نے اسے بتایا تھا کہ سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کے پاس اس کا ملک بولیویا تھا۔ یعنی وہ بولیویا کے سرحد کے پاس کہیں تھے۔ تب سے سیلی ہر روز اوپر ٹیرس پر آکر ان پہاڑوں کی طرف حسرت سے دیکھتی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ ایک بہت بڑے قید خانے میں آ گئی ہو اور اس کی آزادی ان پہاڑوں کے پار تھی لیکن وہاں تک جانا ناممکن تھا۔ کم سے کم اس حالت میں۔ شروع میں ان کو فرار کا خیال آتا تھا لیکن جب وقت گزرتا گیا اور بچے نے اس کے وجود میں اپنی جڑ مضبوط کر لی تو ان کے لیے فرار بھی ممکن نہیں رہا تھا اب اسے اس بچے کو جنم دینا ہی تھا۔ اس کے بعد ہی اسے چھٹکارا مل سکتا تھا۔ اس لیے فرار کا خیال رفتہ رفتہ ان کے ذہن سے محو ہوتا چلا گیا تھا۔

چھ مہینے بعد سیلی اکثر سوچ میں گم نظر آتی تھی۔ مارینو پوچھتا تو وہ ٹال جاتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں میں مارینو کو اس کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ ہو لیکن جیسے ہی مارینو حرکت کرتا یا اسے آواز دیتا تو وہ ساکت ہو جاتی اور سوتی بن جاتی تھی۔ مارینو نہیں جان سکا تھا کہ وہ کیوں روتی تھی۔ ایک رات مارینو کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ مارینو نے اسے سمر ہاؤس کے اندر تلاش کیا وہ

اندر نہیں تھی پھر اسے اوپر ٹیرس کا خیال آیا۔ سیلی وہاں موجود تھی۔ وہ ساکت کھڑی دور مغرب میں تاریک پہاڑوں کو گھور رہی تھی۔ مارینو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''سیلی کیا بات ہے تم مجھ سے ہر بات کرسکتی ہو۔''

سیلی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم میری بات سنو اور مانو گے؟''

''ہاں کیونکہ تم میری بیوی ہو۔'' مارینو نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''میں یہ بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں دوں گی۔ کیا تم مجھے اور میرے بچے کو یہاں سے نکال کر لے جاسکتے ہو؟''

مارینو ساکت ہوگیا پھر اس نے کہا۔ ''ہاں میں تمہیں لے جاسکتا ہوں یہاں سے۔''

☆☆☆

بین جوائے برازیل کے دارالحکومت برازیلیہ میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا وہاں اسے اطلاع ملی تھی تو اس نے فوری طور پر اپنی مصروفیت منسوخ کی اور ذاتی جیٹ طیارے سے پورٹو ویلہو کی طرف روانہ ہو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد وہ سمر ہاؤس میں تھا جہاں ڈاکٹر روزا اور گیٹ گارڈز بدحواس موجود تھے۔ اس دوران میں بین جوائے کی ہدایت پر محل سے اس کے درجنوں آدمی یہاں پہنچ گئے تھے اور وہ پیدل، گاڑیوں اور ہیلی کاپٹرز کی مدد سے سیلی اور مارینو کو تلاش کر رہے تھے جو سمر ہاؤس سے رات کسی وقت نکل گئے تھے۔ یہاں کیمرے اور مائیک نہیں تھے اس لیے ڈاکٹر روزا یا کسی کو بھی صبح سے پہلے معلوم نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر روزا اور خود بین جوائے مطمئن تھا کہ معاملات ان کی مرضی کے مطابق جارہے ہیں اور وہ اپنے حفاظتی انتظامات سے بھی مطمئن تھا۔ اس کے باوجود جب ڈاکٹر روزا صبح سات بجے سیلی کو جگانے آیا۔ وہ ناشتے سے پہلے اسے کچھ مخصوص ورزشیں کراتا تھا تو وہ اور مارینو اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ اس نے فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود گارڈز...کو چیک کیا لیکن وہ ڈیوٹی پر تھے اور انہوں نے انکار کیا کہ سیلی اور مارینو گیٹ سے نکل کر گئے ہیں۔ دیواریں پھلانگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بین جوائے کو کال کر کے اطلاع دی اور ایک گھنٹے میں محل سے اس کے آدمی آگئے تھے اور اب وہ باریک بینی سے سمر ہاؤس کا جائزہ لے رہے تھے کہ سیلی اور مارینو کیسے نکلے۔ اس کے ساتھ پہاڑوں پر ان کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔

''وہ کیسے نکلے؟'' بین جوائے نے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔

''اس بارے میں آپ کا سیکیورٹی انچارج بتا سکے گا اسی نے پتا کیا ہے۔'' ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ بین جوائے نے سیکیورٹی انچارج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔

''وہ دونوں بیس منٹ میں موجود سیوریج کے پائپ کی مدد سے نکلے ہیں۔ پائپ چار سوفٹ نیچے نکلا ہے انہوں نے کہیں سے رسی حاصل کر لی تھی اور اس کی مدد سے نیچے اترے ہیں۔''

''ایک سات مہینے کی حاملہ عورت دو فٹ قطر کے پائپ سے نکل گئی وہ بھی چار سوفٹ نیچے۔'' بین جوائے کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''آزادی کے لیے انسان سب کر سکتا ہے جناب۔'' ڈاکٹر روزا نے کہا نہ جانے کیوں اسے اندر سے اس بات کی خوشی ہورہی تھی۔

''ڈاکٹر یہ تمہاری ذمے داری تھی۔'' بین جوائے بولا۔

''نہیں جناب ان کی نگرانی اور سیکیورٹی میری ذمے داری نہیں تھی میری جو ذمّے داری تھی وہ میں نے پوری کی ہے۔''

بین جوائے اس دن وہیں رہا اور تلاش کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ اس نے پولیس کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ مقامی پولیس ایک طرح سے اس کی ذاتی ملازم تھی۔ انہوں نے بین جوائے کے آدمیوں کے ساتھ مل کر پہاڑوں کا ایک ایک حصہ چھان مارا تھا اور سرحد تک دیکھا تھا لیکن سیلی اور مارینو کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔ دو دن بعد بین جوائے نے تسلیم کر لیا کہ وہ دونوں سرحد عبور کر کے بولیویا جا چکے تھے۔ بین جوائے کا اثر برازیل تک ہی نہیں تھا بلکہ اس کے رابطے بولیویا میں بھی تھے اس نے اپنے جاننے والوں سے رابطہ کر کے ان سے کہا کہ وہ بولیویا میں اس علاقے میں سیلی اور مارینو کو تلاش کریں جہاں وہ آبائی رہتے آئے تھے۔

بین جوائے کے رابطہ کاروں نے سیلی اور مارینو کے علاقے میں دیکھا دونوں کے خاندانوں سے بھی تفتیش کی اور مقامی پولیس کی مدد بھی حاصل کی لیکن سیلی اور مارینو وہاں بھی نہیں آئے تھے۔ ایک مہینے بعد بین جوائے ناکام اور

نامراد واپس ریوڈی جینرو لوٹ گیا تھا جہاں نورمی اس کی منتظر تھی اس نے بین جوائے سے پہلا سوال بچے کے بارے میں کیا تھا۔

''وہ نہیں مل سکے۔'' بین جوائے نے تھکے انداز میں کہا تو نورمی نے اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''ذلیل شخص میں اسی وجہ سے اس مکروہ تجربے کا حصہ بننے پر تیار ہوئی تھی کہ تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور مجھے بچہ مل جائے گا اور اب تم کہہ رہے ہو وہ بچہ لے کر غائب ہیں۔''

بین جوائے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''بکواس مت کرو.... تمہیں بچہ چاہیے ہی نہیں تھا یہ تو بس میری خواہش تھی اور میں نے اسے حاصل کرنا چاہا تھا۔''

''لیکن اب تم نے اسے گنوا دیا ہے۔'' نورمی تلخ انداز میں بولی۔

''میں مایوس نہیں ہوں میں ان کو تلاش کروا رہا ہوں اور اگر وہ نہ ملے تو میں دوبارہ....''

اس بار نورمی نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ ''تم میرے اندازے سے بھی زیادہ گھٹیا شخص نکلے۔ تمہیں اس بچے کی کوئی پرواہ نہیں ہے جو ہمارا ہے تمہیں صرف اپنے کاروبار کے لیے ایک وارث چاہیے۔''

''ہاں مجھے ایک وارث چاہیے۔'' بین جوائے بولا۔ ''اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔''

''تب تم وارث حاصل کرتے رہو۔'' نورمی بولی۔ ''لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی اور نہ ہی تم مجھے استعمال کر سکتے ہو۔''

''ایک منٹ نورمی میری بات سنو....'' بین جوائے نے اسے روکنا چاہا لیکن نورمی اس کی بات سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ پھر وہ اس کے گھر اور زندگی سے بھی نکل گئی تھی۔ اس نے بین جوائے سے کہا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ میری زبان بند رہے تو شرافت سے علیحدگی کا معاملہ طے کر لو میں اب تم سے بات نہیں کرنا چاہتی میرا وکیل رابطہ کرے گا اور یاد رکھنا اگر بات کورٹ تک گئی تو میری زبان بند نہیں رہے گی۔''

بین جوائے کو لگ رہا تھا کہ ایک ایک کر کے اس کا سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا وہ مجبور تھا اگر انکار کرتا تو نورمی اس کا راز فاش کر دیتی۔ چھ مہینے کی تلاش کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ سیلی اور مارینو اس کی پہنچ سے دور نکل گئے تھے اس نے بچے کی پیدائش کے متوقع دنوں میں بولیویا کے تمام اسپتالوں کو بھی چیک کرایا تھا کہ شاید سیلی کہیں داخل ہو لیکن اس کی یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی کسی ایسی جگہ چلے گئے تھے جو اس کی سوچ سے بھی باہر تھی۔ نورمی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اپنا وارث حاصل کرنے کے چکر میں وہ اپنی بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

نورمی کے بعد اس نے ایک عام عورت سے شادی کی جسے بچے پیدا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اس بار قدرت کی طرف سے اولاد اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر روزا کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے بھی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لی۔ مارشا دو بار اُمید سے ہوئی لیکن ہر بار بچہ ضائع ہو گیا۔ تیسری بار وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد بین جوائے نے ہار مان لی تھی۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اولاد اس کے مقدر میں ہے اور جو اولاد اس کی تھی وہ اس کے مقدر میں نہیں ہے۔

وقت گزرتا رہا بین جوائے دنیاوی لحاظ سے ترقی کر رہا تھا اس کی دولت دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ مگر اولاد اور وارث سے محرومی اس کی زندگی کا سب سے بڑا آزار بن گئی تھی۔ چند سال بعد مارشا نے بھی اس سے طلاق لے لی تھی اور اس نے طلاق اس وجہ سے لی تھی کہ بین جوائے اسے بچہ نہیں دے سکا تھا جب کہ اسے بچے کی خواہش تھی۔ مارشا نے دوسری شادی کی اور اس کے کئی بچے ہوئے تھے۔ اس سے الگ ہونے کے بعد بین جوائے نے پھر شادی نہیں کی تھی۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اور اب اس کی عمر ستّر سے زیادہ ہو چکی تھی۔

سیلی اور مارینو کا خیال اس کے ذہن سے نکلا نہیں تھا اس نے ایک جاسوس ایجنسی کی خدمات مستقل بنیادوں پر حاصل کر رکھی تھی۔ وہ سیلی اور مارینو کو تلاش کر رہی تھی۔ ایجنسی کی جانب سے ہر مہینے ایک لفافہ آتا تھا اور اس میں صرف ناکامی کی اطلاع ہوتی تھی۔ بین جوائے لفافے کو برقی ڈسٹ بن میں ڈال کر جلا دیتا تھا۔ یہ اس کا راز تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ غلطی سے بھی فاش ہو جائے۔ ایجنسی کے مالک کارلوس بیانے کئی بار اس کیس سے دست بردار ہونے کا ارادہ کیا لیکن بین جوائے نے ہر بار اسے روک دیا۔ ''تم اپنا کام کرتے رہو۔''

ایک مہینا پہلے کارلوس لفافے کے بجائے خود اس

سے ملنے آ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اس کیس کا باب بند کر دیا جائے لیکن بین جوائے نے پھر انکار کر دیا۔ ''جب تک میں زندہ ہوں تم یہ کام جاری رکھو گے۔''

''ایک سوال ہے جناب۔'' کارلوس نے کہا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لوگ بولیویا میں ہوں گے؟''

''ہاں تو اور کہاں جا سکتے ہیں؟''

''بعض اوقات جب انسان نے کسی سے چھپنا ہو تو وہ اس سے دور جانے کے بجائے پاس چھپنے کو بھی ترجیح دیتا ہے جب کہ چھپنا آسان ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''بولیویا ایک پسماندہ اور چھوٹا ملک ہے اس کے مقابلے میں برازیل ایک بڑا اور ترقی یافتہ ملک ہے یہاں کسی کے چھپنے کے مواقع زیادہ ہیں بہ شرط کہ تلاش کرنے والے کا ذہن اس طرف نہ جائے۔''

بین جوائے نے تعجب سے کہا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے۔''

''بعض اوقات دور کی سوچتا ہے اور پاس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔'' کارلوس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ''ایک مہینے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔''

لیکن ایک مہینے کے بجائے اس کی طرف سے دو ہفتے بعد ہی لفافہ آ گیا اور بین جوائے اس خلاف معمول لفافے کو دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر شمالی برازیل کے ایک چھوٹے سے قصبے کا پتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی بین جوائے کا جیٹ طیارہ اسے لے کر شمالی برازیل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سیلی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں دھلے کپڑے سوکھنے کے لیے ٹانگ رہی تھی۔ سڑک کے پار کھیل کے میدان میں کچھ لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک سنہری بالوں اور گوری رنگت والا نوجوان بھی تھا۔ وہ بڑی مہارت سے فٹ بال کو دونوں پیروں سے باری باری اچھال رہا تھا اور اسے زمین پر گرنے سے روک رہا تھا۔ جب تک سیلی کپڑے لٹکاتی رہی نوجوان نے فٹ بال کو گرنے نہیں دیا تھا۔ وہ مسکرائی اور خالی ٹوکرا لے کر اندر جانے کے لیے مڑی تھی کہ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی کار آ کر رکی۔ سیلی نے توجہ نہیں دی تھی لیکن جب اس سے ایک سفید بالوں والا بوڑھا آدمی اترا تو وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی وہ بین جوائے تھا۔ وہ ہر روز ہی کہیں نہ کہیں اسے ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ شروع میں وہ ان کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو راتوں میں آ کر ان کو جگا دیتا تھا اس کے خوف سے وہ سالوں سہمے رہے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ان کو تلاش نہ کر لیا جائے۔ پھر رفتہ رفتہ خوف کم ہوتا گیا۔ ان کے پہلے بچے نے جنم لیا جو اصل میں ان کا نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی ان کا بچہ تھا دونوں نے اس سے اسی طرح ٹوٹ کر محبت کی تھی جیسے وہ اپنے بچے سے کرتے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ اسی طرح پاگل ہو جاتے تھے جیسے انسان اپنے بچے کے لیے ہوتا ہے۔

جب جوزینو تین سال کا ہوا تو سیلی پھر اُمید سے ہو گئی۔ وہ اور مارینو خوشی سے پاگل ہو گئے تھے کیونکہ ڈاکٹر روزا کی بات ان کے ذہن میں تھی اور ان کو لگتا تھا کہ وہ کبھی ماں باپ نہیں بنیں گے۔ اس لیے اس کی پیش گوئی غلط ثابت ہونے پر وہ خوش تھے۔ اس بار بھی بیٹا ہوا تھا۔ وہ پہلے بچے کے برعکس ان پر گیا تھا۔ پھر دو بیٹیاں ہوئیں اور یہ بھی ان کی طرح سیاہ بال اور سانولا رنگ لیے ہوئے تھیں۔ مگر یہ تعجب کی بات نہیں تھی ہر گھر میں ایک آدھ بچہ اپنے ماں باپ سے مختلف ہوتا ہے۔

جب وہ سمر ہاؤس سے نکل کر یہاں آئے تو شروع میں ان کو بہت دشواری اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سیلی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی کام کر سکتی اور سارا بوجھ مارینو پر تھا پھر وہ غیر قانونی تارکِ وطن تھے ان کے پاس کاغذات بھی نہیں تھے۔ اس لیے مارینو کو ملازمت ملنے میں بہت دشواری ہوتی تھی کبھی کام ملتا اور کبھی نہیں۔ ان کو اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے تھے۔ پھر جوزینو کی پیدائش پر سیلی کو اسپتال لے جانا پڑا اور ان کا راز کھل گیا۔ بہر حال بچے کی وجہ سے ان کو برازیل کی شہریت بھی مل گئی اور مارینو کو کام بھی ملنے لگا۔ اس کے بعد حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ مارینو نے سخت محنت کر کے کچھ رقم جمع کر کے اپنی زمین لے لی اور اب وہ اس پر کام کرتا تھا۔ وہ بہت خوشحال تو نہیں تھے لیکن اب ایک مناسب زندگی بسر کر رہے تھے۔ بین جوائے کا بھوت بھی ذہن کے نہاں خانوں میں جا چھپا تھا اور اب اس کا خیال بھی آتا تھا تو وہ خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اتنے سالوں بعد بین جوائے کو سامنے دیکھ کر سیلی

کے اندر موجود خوف باہر آ گیا تھا۔ بین جوائے نے کار سے اترتے ہی اسے دیکھا اور اس کی نظریں کچھ دیر سیلی پر جمی رہی تھیں۔ بیس سالوں نے اس پر زیادہ اثر نہیں چھوڑا تھا وہ پہلے کی طرح مضبوط اور خوب صورت جسم کی مالک تھی۔ اس کا چہرہ جوانی جیسا تروتازہ نہیں رہا تھا لیکن اس پر جھریاں بھی نمودار نہیں ہوئی تھیں۔

بین جوائے نے لکڑی سے بنی دیوار میں لکڑی کا بنا ہوا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ ''ہیلو.... کیسی ہو تم سیلی؟''

''تو تم نے ہمیں تلاش کر لیا؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہاں اور اس کام میں صرف دو ہفتے لگے۔''

''میرا تو خیال ہے بیس سال گزر چکے ہیں۔''

''بیس سال تک میں تم دونوں کو غلط مقام پر تلاش کروا رہا تھا یہ خیال تو صرف دو ہفتے پہلے آیا کہ تم دونوں برازیل میں بھی ہو سکتے ہو۔''

سیلی اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ مارینو کام پر گیا ہوا تھا اور بچے اسکول گئے تھے۔ اب سیلی کو ہی حالات اور بین جوائے کا سامنا کرنا تھا اس نے ابتدائی خوف پر قابو پا لیا تھا اور تن کر بین جوائے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ''ٹھیک ہے تم نے ہمیں تلاش کر لیا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو؟''

''تم جانتی ہو میں کیا چاہتا ہوں۔'' بین جوائے بولا۔ ''میں اپنا وہ بچہ لینے آیا ہوں جو تمہارے پیٹ میں تھا جب تم اور مارینو فرار ہوئے تھے۔''

''وہ بچہ تمہارا نہیں ہے اسے میں نے جنم دیا ہے وہ میرا بیٹا ہے۔''

''تم صرف ایک کیریر تھیں اصل میں وہ میری اور نورمی کی اولاد ہے۔'' بین جوائے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اولاد اس کی ہوتی ہے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے میں اس کی ماں ہوں۔''

''ایک بات سے شاید تم بے خبر ہو۔'' بین جوائے نے دھیمے انداز میں کہا۔ ''تمہارے جسم میں ایک مکمل جنین رکھا گیا تھا۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ وہ جنین میرے اور نورمی کے تولیدی خلیوں سے تیار کیا گیا تھا اور یہ کام ڈاکٹر روزا نے ٹیسٹ ڈش میں انجام دیا تھا۔ پھر اسے تمہارے جسم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایسا صرف اس وجہ سے کیا گیا کیونکہ نورمی بچہ

چلغوزے

چلغوزے گردے، مثانے اور جگر کو قوت بخشتے ہیں۔ موسم سرما میں ان کا کھانا پیشاب کی زیادتی کو روکتا ہے۔ چلغوزہ موسم سرما کے اثرات کو کم کرتا ہے اور جسم کو حرارت عطا کرتا ہے۔ چلغوزے کھانے سے پہلے نہ کھائیں، کیونکہ اس طرح بھوک ختم ہو جاتی ہے اور کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اس لیے انہیں ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

تل

تل موسم سرما کی سوغات ہے۔ اسے کھانے سے سردی اثر نہیں کرتی۔ موسم سرما میں کمزور اور بوڑھے افراد کو پیشاب بار بار آتا ہے۔ اس طرح بعض بچے بھی رات کو سوتے ہوئے بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تل کے لڈو کھانا بہت مفید ہے۔ روزانہ تل کا ایک چمچہ کھا لینا صحت کے لیے مفید ہے۔

پیدا کرنے کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔''

''تم بلا وجہ اپنی توانائی ضائع کر رہے ہو۔'' سیلی بولی۔ ''مجھے ڈاکٹر روزا پہلے ہی یہ سب بتا چکا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جوزینو میری اولاد ہے۔''

''ایک معمولی سا ٹیسٹ ثابت کر دے گا کہ وہ میری اولاد ہے۔'' بین جوائے لڑکے کا سن کر خوش نظر آنے لگا تھا۔

''ہاں لیکن کیا تم اس بات کا اعلان کر سکتے ہو؟'' سیلی نے اسے چیلنج دیا۔ ''کیا تم سب کو بتا سکتے ہو کہ تم نے اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کیا تھا۔''

بین جوائے چپ ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے تاثرات دوبارہ سخت ہو گئے۔ ''ٹھیک ہے اس میں میری بدنامی ہو گی اور ممکن ہے مجھے مجرم بھی قرار دیا جائے لیکن اپنی اولاد کو حاصل کرنے کے لیے میں سب برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''

''تم نے مجھے جانور کی طرح استعمال کیا۔'' سیلی جذباتی ہو گئی۔ ''ایسا تو مجرم بھی نہیں کرتے ہیں۔''

''جو ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں۔'' بین جوائے نے کہا۔ ''تم جس طرح چاہو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے سیلی کا معمولی سا گھر دیکھا پھر اس نے کپڑے اور ان کا سائز دیکھا۔ اسے پتا چل گیا کہ سیلی کے اور بچے بھی تھے۔ ''جس طرح سے بھی تم چاہو۔

''اگر تمہارا اشارہ دولت کی طرف ہے تو وہ تم پہلے بھی دے رہے تھے اور ہم نے پہلے بھی اسے ٹھکرا دیا تھا ورنہ فرار ہی نہ ہوتے۔''

''اس وقت تم صرف دو تھے لیکن اب تم ایک فیملی ہو اور تم کو اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضرورت ہوگی۔''

بین جوائے کا لہجہ ترغیب دینے والا تھا۔

''ہم اپنی بساط کے مطابق ان کو بہتر زندگی دے رہے ہیں۔ میرا شوہر اس کے لیے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔''

بین جوائے نے محسوس کیا کہ سیلی کسی صورت نہیں مانے گی اور اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نہیں نکلے گا جو دونوں فریقوں کے حق میں ہو۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔ سنہری بالوں اور دمکتی سفید رنگت والا نوجوان اندر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بہترین اور نئی فٹ بال اٹھا رکھی تھی اور اس کا لباس بھی بہترین تھا۔ اس نے اندر آکر سیلی کا گال چوما اور بین جوائے کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے مام؟'' اس کی نظروں میں اجنبیت تھی اس نے ٹی پر بین جوائے کو دیکھا لیکن یہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ مشہور زمانہ بین جوائے ان کے گھر آسکتا ہے۔ بین جوائے کو لگا جیسے اس کے سامنے اس کی جوانی کی تصویر سامنے آگئی ہو۔ وہ یقیناً اس کا اور نورمی کا بیٹا جوزینو تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ جوزینو سے تعارف کراتا سیلی نے اس کا ماتھا چوما اور بولی۔

''ایک پرانا واقف کار ہے۔ تم اندر جا کر نہا لو آج میں نے تمہارا پسندیدہ اسٹو بنایا ہے۔''

''دنیا کی سب سے گریٹ مام۔'' جوزینو خوش ہوگیا تھا اس نے پھر سیلی کو پیار کیا اور فٹ بال اچھالتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

''یہ.....میرا.....''

''تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سیلی پھر تن کر کھڑی ہوگئی۔ ''جوزینو.....صرف میرا بیٹا ہے اگر تم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو یقین کرو ہم آخر تک لڑیں گے اور عدالت میں جائیں گے۔ مجھے یقین ہے دنیا کی کوئی اولاد ایک ماں سے اس کا وہ بچہ نہیں چھین سکتی جسے اس نے جنم دیا ہو۔ میں تمہارے سارے کرتوت دنیا والوں کے سامنے لے آؤں گی۔''

بین جوائے سیلی کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا ہے اور وہ بہر صورت اپنی سی کر کے رہے گا۔ یک دم سیلی کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا اسے معلوم تھا بین جوائے طاقت ور آدمی تھا اس نے پہلے بھی انہیں مجبور کیا تھا اور اب کر سکتا تھا۔ وہ ان سے جوزینو کو چھین کر لے جا سکتا تھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ''جوزینو بہت اچھا فٹ بالر ہے۔ ابھی اس نے مقامی لیگ سے معاہدہ کیا ہے اس کا کھیل دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں برازیل کی ٹیم میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ وہ اچھا طالب علم ہے وہ ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ گھر اور خاندان اس کا فخر ہے۔'' سیلی نے کہتے ہوئے سر اٹھایا۔ ''کیا تم صرف اس لیے اس سے اس کا فخر اور اس کا سب کچھ چھین لو گے کہ تمہیں اپنے کاروبار کے لیے ایک چیف ایگزیکٹو درکار ہے۔ شاید تمہیں چیف ایگزیکٹو مل جائے لیکن جوزینو سے اس کا سب چھن جائے گا۔ ٹھیک ہے میں مانتی ہوں؛ وہ تمہاری اولاد ہے لیکن کیا تم صرف اس لیے اسے تباہ کر دو گے کہ وہ تمہاری اولاد ہے؟''

بین جوائے کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس پتھر میں دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ پتھر کے نیچے سے نرمی نمودار ہو رہی تھی۔ بین جوائے نے ایک گہری اور شکست خوردہ سانس لی۔

''سیلی تم ٹھیک کہہ رہی ہو جوزینو کو صرف اس لیے تباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ میری اولاد ہے۔ لیکن میری تم سے ایک التجا ہے۔ کیا میں کبھی کبھی اسے دیکھنے آسکتا ہوں۔ تم لوگوں سے میرا تعلق بھی تو ہے۔ بس دس پندرہ منٹ کے لیے؟''

سیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہتر ہوگا تم اس باب کو یہیں بند کر جاؤ کیونکہ تم بار بار آؤ گے تو اس سے کوئی خرابی ہو سکتی ہے۔''

بین جوائے نے ایک اور گہری سانس لی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ میری دولت کا وارث ہوگا۔''

''یہ بعد کی بات ہے۔'' سیلی نے بات ختم کردی اور بین جوائے کے پاس وہاں سے رخصت ہونے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا اس کے جانے کے بعد جوزینو اندر سے نکل آیا اس نے نہا کر لباس بدل لیا تھا۔

''مام وہ بوڑھا کیوں آیا تھا؟''

''وہ کسی کا پتا پوچھتا آیا تھا لیکن اس کا بتایا ہوا شخص یہاں نہیں رہتا ہے وہ غلطی سے آیا تھا اور اب کبھی نہیں آئے گا۔'' سیلی نے یقین سے کہا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

دن کے نو بجے تھے، جیسن اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک میں داخل ہوا اور اپنی کلاس میں لیکچرار کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ یونانی تاریخ کا مضمون پڑھایا کرتا تھا۔ اس کی عمر اکیس برس تھی اور قد چھ فٹ دو انچ۔ وہ اپنے طالب علموں میں مقبول تھا۔

34 طالب علموں کی اس کلاس میں دروازے تو تھے مگر کھڑکیاں نہیں تھیں۔ اسے دیکھ کر طلبا خاموش ہوگئے۔ جیسن نے برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انیس سالہ ٹام الیگزینڈر کو دیکھ کر سر کو خفیف سی جنبش دی، جو سیکنڈری اسکول میں انگریزی کا

شکیل صدیقی

ترقی یافتہ ممالک میں دہشت گردی کی وباء اس طرح پھیل رہی ہے کہ ہر کوئی حیران و پریشان ہے۔ یہ دہشت گردی دولت کے حصول کی خاطر نہیں ہوتی ہے بلکہ نفسیاتی دباؤ، قتل و خونریزی پر اکساتا ہے۔ زیر نظر خونی واقعات اب وہاں عام ہیں۔

ایک خونی واقعے کی روداد جو امریکا میں عام ہے

استاد بننا چاہتا تھا۔ جب کہ سامنے کی قطار میں چھبیس سالہ مائنگ کونر بیٹھا جو تاریخ کا پروفیسر بننا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے فولسنڈر کا لیکچر تھا۔ وہ اپنے لیکچر کی ابتدا کرنا چاہتا تھا کہ اس نے دروازے پر کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا تم اس کلاس کے طالب علم ہو؟“

وہ بھاری جسم کا تھا اور اس کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ وہ برساتی جیکٹ پہنے تھا اور اس کے چہرے سے سختی جھلکتی تھی۔ اس نے اپنے شانے سے لٹکنے والے بیگ سے ایک بندوق نکال لی۔ ”آج کا سب سے اہم اعلان یہ ہے کہ تم سب لوگ یرغمالی ہو۔“

ٹام جو انگریزی کا استاد بننے والا تھا، اس صورت حال سے خوفزدہ ہوگیا اور اس کی گدی کی ایک رگ پھڑ کنے لگی۔ اسے ہرن کا شکار کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ اجنبی کے اعشاریہ 270 کی ریمنگٹن سیمی آٹومیٹک جس سے پانچ گولیاں فائر کی ہیں۔ اگر کسی شخص کے قریب جا کر کیا جاتا تو اس کے ٹکڑے اڑ سکتے تھے۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھے رہو۔ کوئی حرکت نہ کرے۔“ اس نے رائفل لہراتے ہوئے کہا۔ اس نے طائرانہ نگاہ سے ہال کا جائزہ لیا پھر دائیں جانب پڑی ہوئی میز کی طرف بڑھ گیا اور اس نے اپنی برساتی جیکٹ اتار دی۔ نیچے ایک اور جیکٹ تھی۔ سیاہ رنگ کی چمکدار جیکٹ جس سے میچنگ کرتی ہوئی پتلون اس نے پہن رکھی تھی۔

”چلو اٹھو۔“ وہ چیخا۔

سارے طالب علم اپنی جگہوں سے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ بندوق بردار نے پروفیسر کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اب تم میڈیا سے رابطہ قائم کرو اور ہو سکے تو کانگریس اور جناب صدر کو بھی اطلاع دو۔“

فولسنڈر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدمی سے ملحقہ آفس میں چلا گیا۔ پھر اس نے یونیورسٹی پولیس کو فون کیا اور انہیں بندوق بردار کے بارے میں بتایا۔

☆☆☆

بندوق بردار اب دائیں جانب کی دیوار سے ٹیک لگائے طالب علموں سے 35 فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بندوق میز کے سہارے سے کھڑی کی پھر اس نے جیب سے ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگائی۔ اس نے پہلا کش کھینچ کر لاابالی انداز سے کہا۔ ”میں ایک غلط تجربے کی پیدائش کی پیداوار ہوں۔“ اس نے اپنی بندوق اٹھا لی اور موڑ میں بولا۔ ”مگر میں اس کے بارے میں کسی اور کو بتانا نہیں چاہتا۔“

مائنگ کونر نے سوچا یہ شخص غالباً دیوانہ ہے۔

وقت گزر رہا تھا اور بندوق بردار خالی نشستوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ میک اینتسی جو قانون کا طالب علم تھا اسے بندوق بردار کی جیب میں پڑی ہوئی گولیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ”کیا تم اس دیوانے پر چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے اپنے قریب کھڑے ساتھی سے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔

”ان دروازوں کو کھولو۔“ بندوق بردار نے بندوق کی نال سے اشارہ کیا۔ وہ دروازہ ایک سرنگ سے جا کر مل جاتا تھا۔

وہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر کوئی بھی اندر آسکتا تھا اور خونریزی ہو سکتی تھی۔ ”اے ٹھہرو۔ اسے نہ کھولو۔“ مائنگ کونر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

بندوق بردار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک ہی عمر کے تھے۔ بندوق بردار چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سر کو اثباتی جنبش دی جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔ پھر اس نے کہا کہ وہ کمرے کے ابتدائی حصے کی طرف جائیں جہاں بارہ فٹ کی ایک پروجکشن اسکرین لگی تھی۔

مائنگ نے محسوس کیا کہ اجنبی کا رویہ کبھی کبھار دوستانہ ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس سے شناسائی پیدا کرلوں تو کام بن سکتا ہے۔ برہمی میں جو اس کی ناک سختی سے کھڑی ہے ممکن ہے کہ میں اسے موڑنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

اس نے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے ملائمت اور رسانیت سے کہا۔ ”ہیلو فرینڈ! ایک سگریٹ مل جائے گی؟“

اجنبی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ پھر اس نے مائنگ سے کہا۔ ”ہاں۔“ اس نے ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”لیکن کسی اور کو نہیں ملے گی۔“

مائنگ نے دیکھا کہ ان کے درمیان صرف چھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس نے سگریٹ اچھال دی تو مائنگ نے اسے کیچ کرلیا۔ ”ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“

”جب میں نوعمر تھا تو انہوں نے میرا دماغ کھول کر اس میں ایک کمپیوٹر چپ رکھ دی تھی۔ تاکہ میں جو کچھ سوچوں اس

امریکن ہرٹ ایسوسی ایشن کی رپورٹ میں ڈاکٹر فرینک سیک نے ناریل کے تیل کو کھانوں میں استعمال کرنے کے نقصانات نہیں بتائے، البتہ اسے خطرناک چربی کا تیل قرار دیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ناریل کے تیل میں جانوروں کے گوشت میں موجود چربی، مکھن اور دیگر چربی والی اشیاء کے مقابلے زیادہ چربی ہے، مگر لوگ اسے صحت کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں امریکا کی 7 کلینکس کی جانب سے ناریل کے تیل سمیت دیگر چربی والے تیلوں پر کی جانے والی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کوکونٹ آئل میں موجود چربی کی خراب مقدار (ایل ڈی ایل) دل کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔

مرسلہ: ابوعمر۔ ملتان

سے وہ باخبر ہوجائیں۔ وہ مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور مجھ پر مکمل کنٹرول چاہتے ہیں۔"

مائنگ نے سوچا کہیں وہ پاگل تو نہیں ہے؟

پروجکشن اسکرین کے پیچھے سے اچانک کسی نے اس اجنبی کو مخاطب کیا۔ "ہیلو! کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟"

طالب علموں کے چہروں پر قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ اجنبی کو وہاں آئے ہوئے پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ آواز پروجکشن اسکرین کے پیچھے سے آرہی تھی، جب کہ اسکرین دھندلے شیشے کا تھا۔ چنانچہ دوسری طرف کون تھا اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

طلبہ نے اس کے سامنے ایک مائک رکھ دیا تاکہ وہ بات کر سکے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" پوچھا گیا۔

"یہی کہ یونیورسٹی کے صدر، گورنر، سپریم کورٹ کے جج اور صدر امریکا کو یہاں بلایا جائے۔"

"ٹھہرو دیکھتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" جواب دیا گیا۔ "میرا نام کیوون ہے اور تمہارا؟"

"اپنے ذرائع سے میرا نام معلوم کرو۔" اس نے غرا کر کہا۔ پھر مائک پھینک کر دوبارہ رائفل اٹھالی پھر اس کی انگلی ٹریگر پر سختی سے جم گئی۔ اس نے نال کا رخ چھت کی طرف کر کے طلبہ سے پوچھا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں فائر کردوں؟"

"نہیں، نہیں۔" ہال میں بہت سی خوفزدہ آوازیں ابھریں۔

مائک کونر نے ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "چھت میں لوہا اور کنکریٹ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تمہاری چلائی ہوئی گولی چھت توڑ کر دوسری طرف نکل جائے۔ اگر وہ پلٹ گئی تو تمہارے دماغ میں بھی سوراخ کر سکتی ہے۔"

"تم درست کہتے ہو۔" وہ بولا۔ پھر اس نے رائفل کی نال کا رخ پروجکشن اسکرین کی طرف کر کے فائر کردیا۔ ایک دھماکا ہوا اور طلبہ کی چیخیں گونجیں۔ پھر پروجیکشن اسکرین سے ملبا گرنے لگا۔

اس اسکرین کے پیچھے ایک کمرا تھا جہاں پولیس کے دو افسران کیوون اور جیمز ہورٹن بیٹھے تھے۔ انہوں نے فائر کا دھماکا سنا پھر اسکرین میں ایک سوراخ ہوتے دیکھا۔ وہ گولی کا سوراخ تھا۔ انہوں نے جلدی سے خود کو آڑ میں کرلیا۔

"یہ بڑی رائفل کا دھماکا ہے۔ گولی جسم میں داخل ہوجائے تو یقینی موت ہے۔" ہورٹن نے کہا۔ پھر اس نے ریڈیو پر ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دیتے ہوئے بتایا کہ حملہ آور کا صحیح طور پر پتا نہیں ہے، اس لیے اتنے طلبہ کی موجودگی میں ایکشن نہیں لیا جاسکتا۔

☆☆☆

رائفل کے کارتوس کا کھوکھا اس نے چیمبر سے نکال کر طلبہ کے سامنے پھینک دیا اور مسکرا کر بولا۔ "میرے پاس ایسے بہت سے کارتوس ہیں۔" اس نے جیب سے کارتوس نکال کر میز پر رکھ دیے پھر انہیں گننے لگا۔ اس کے بعد اس نے کمر میں لگا ہوا خنجر نکالا اور اس کی دھار پر انگلی پھیرتا ہوا بولا۔ "اس کی دھار بہت تیز ہے۔" اس نے تھوڑی دیر بعد خنجر کو دوبارہ اس کے غلاف میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہال میں ٹہلنے لگا۔ جب وہ رائفل سے دس فٹ دور چلا گیا تو اینتھنی نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر اس طرف آئے چھلانگ لگا کر رائفل تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات اس نے سرگوشی میں اپنے ساتھی سے بھی کہہ دی۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی تو اینتھنی نے اپنی ٹانگوں کی پوزیشن تبدیل کر لی اور سرگوشی میں بولا۔ "مگر یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کی جیب میں کوئی ریوالور تو نہیں ہے، جس سے اندھا دھند فائرنگ شروع کردے۔"

اجنبی نے جیسے اندازہ لگا لیا۔ اس نے پلٹ کر اپنی رائفل اٹھا لی اور نال کا رخ اینتھنی کی طرف کر کے بولا۔ "سیدھے کھڑے ہوجاؤ۔ اگر مجھ پر چھلانگ لگانے کا

ارادہ ہے تو اس ارادے کو جیب ہی میں رکھو۔اس لیے کہ میں فائر کرنے میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔خبردار ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

ایمنسی کو گھبراہٹ میں پسینا آنے لگا۔اسے اپنے والدین اور بھائی یاد آنے لگے۔اسے رات کو دادی کے ساتھ ڈنر کرنا تھا، جواب ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

رائفل بردار سیمپسن کی طرف مڑا جو کلاس میں واحد نیگرو تھا۔وہ چھ فٹ تین انچ کا تھا اور اس کا وزن 260 پاؤنڈ تھا۔وہ فٹبال ٹیم کا کیپٹن تھا۔اجنبی نے کہا۔"اور تمہارا نمبر دوسرا ہوگا۔"

ان دونوں کا ساتھ بیٹھنا اسے پسند نہیں آیا۔اس نے ایمنسی سے کہا۔"تم ہال کی دوسری طرف جاؤ اور ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا، میرا غصہ بہت خراب ہے۔"

اس نے مائکروفون اٹھا کر کہا۔"ہاں، تو تم لوگ اب کیا کررہے ہو؟"

"دوبارہ فائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم نے میڈیا کے لوگوں کو بلالیا ہے۔" کیودن نے کہا۔

"میرے ساتھ نفسیاتی کھیل نہ کھیلو۔میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو۔ورنہ میں طلبہ کو گولیاں مارنا شروع کردوں گا۔" اس نے گونجدار لہجے میں کہا تو دو لڑکیاں رونے لگیں۔

"چیخو چلاؤ نہیں۔میں تم لوگوں کو گولی نہیں ماروں گا۔" اس نے کہا۔"دروازہ کھول دو اور انہیں جانے دو۔ان کے ساتھ کوئی اور دروازے کی طرف نہیں بڑھے گا ورنہ میں اس کی پیٹھ پر گولی مار کر اسے جہنم میں پہنچادوں گا۔"

مائک کونر اور ایمنسی نے دروازہ کھولا تو دوسری طرف سے سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور وہ کپکپا کر رہ گئے۔دونوں لڑکیاں اس سرنگ سے باہر چلی گئیں۔مائک نے دیکھا کہ وہ جہاں کھڑا تھا، آزادی وہاں سے صرف پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھی، لیکن اس کوشش میں کسی اور کی بھی جان جاسکتی تھی۔وہ جنونی، جنون میں دوسرے طلبہ کو نشانہ بنا دیتا تو اس کی ذمے داری مائک پر ہی عائد ہوتی۔چنانچہ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دروازہ بند کردیا۔پھر ایمنسی بھی اپنی جگہ پر چلا گیا۔

اجنبی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند چھوٹی کنکریاں نکالیں اور طلبہ کو دکھانے لگا۔"میں دیوانہ نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔"انہیں رکھنے کی بھی ایک وجہ ہے۔"

"یہ کنکریاں تمہیں کہاں سے ملیں؟" مائک کونر نے پوچھا۔

"یہ میری بھتیجی نے دی ہیں۔اس نے بتایا تھا کہ جب آپ مٹھی میں ان کنکریوں کو دبا کر مسلیں گے تو سکون محسوس کریں گے۔"

پھر اس نے مائکروفون اٹھا کر کہا۔"میرے لیے ایک ٹیلی وژن سیٹ لاؤ، پورٹیبل ٹوائلٹ، غذا اور سگریٹ وغیرہ بھی۔"

"اس کے بعد کیا تم طلبہ کو جانے دو گے؟" دوسری طرف سے ہورٹن نے پوچھا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔" وہ دھاڑا۔"ٹیلی وژن لا کر رکھو۔" اس نے طلبہ کی طرف مڑ کر کہا۔"تم سب ہال کے وسط میں آجاؤ۔"

جب سب بیٹھ گئے تو ٹام الیگزینڈر سے برداشت نہ ہوسکا۔وہ اجنبی پر جھپٹ پڑا۔اجنبی ایک قدم پیچھے چلا گیا۔اس کی بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹتی جارہی تھی۔پھر وہ گھوما اور زینے کی طرف دوڑا۔الیگزینڈر نے اس کی کمر تھام لی اور اسے اپنی طرف گھما دیا۔اچانک الیگزینڈر نمودار ہوا۔وہ دونوں مل کر اسے گھسیٹتے ہوئے آخری زینے تک لے گئے۔

اجنبی کو موقع مل گیا۔اس نے خنجر نکال لیا۔الیگزینڈر اور مائک کونر نے اسے دروازے سے ٹکرا دیا۔خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔اس دوران میں تین مضبوط جسم کے لڑکوں نے اجنبی پر ہلہ بول دیا۔وہ فرش پر گر پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان میں سے ایک نے پروجکشن ہال کا دروازہ کھولا تو آٹھ مسلح پولیس والے دوسری طرف سے آگئے۔انہوں نے اجنبی کو ہتھکڑی لگادی۔

ایمنسی اور دوسرے لڑکے جو دھماچوکڑی میں زخمی ہوگئے تھے انہیں ایلبنی میڈیکل سینٹر لے جاکر طبی امداد دی گئی۔وہ سب ایک دوسرے کے شکر گزار تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کی جانیں بچالیں۔

☆☆☆

ستائیس سالہ رالف ٹوروی امریکی تھا اور شکاگو میں رہتا تھا۔زیادہ پڑھنے لکھنے کی بنا پر وہ ذہنی مریض ہوگیا تھا اور وارداتیں کرنے لگا تھا۔ہر وقت غلامی سے آزاد ہونے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔جس کمپیوٹر چپ کا وہ تذکرہ کرتا رہتا تھا وہ اس کے دماغ میں کہیں بھی نہیں ملی۔معلوم نہیں کیوں اس کے دماغ میں یہ وہم پرورش پارہا تھا اور کب سے؟ اسے ایلبنی جیل میں بند کردیا گیا۔جلد ہی اس پر مقدمہ چلنے والا تھا۔

فلم نگری

لیڈی کلر

انور فرہاد

پاکستانی فلم نگری میں ایک سے ایک اداکار آئے، فن کا جوہر دکھایا، کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن وہ شہرت وہ پسندیدگی جو اس اداکار کے حصے میں آئی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ پردۂ سیمیں پر آتے ہی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی۔ انتقال کے بعد بھی اس کے شائقین اسے پوجنے کی حد تک پیار کرتے ہیں۔

اس نامور اداکار کی سرگزشت جس کا نام کامیابی کی ضمانت تھا

اللہ کے بے شمار بندے ایسے ہیں جو جیتے جی بھی زندہ رہنے کے حقدار نہیں کہلا سکتے جب کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی، عالم جاودانی پہنچ جانے کے بعد بھی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو جانے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے بے شمار چاہنے والوں اور پرستاروں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک وحید مراد بھی تھے۔ پاکستانی لیجنڈ فنکار 23 نومبر 1983ء کو اپنے چاہنے والوں

کے درمیان سے اٹھ کر افق کے اس پار چلے گئے مگر آج بھی اتنے دنوں کے بعد بھی وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہیں۔ اپنے سینکڑوں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں پیار کرنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ ہیں۔

کروڑوں دلوں پر راج کرنے والے یہ خوب صورت اور من موہنی صورت کے فنکار دلیپ کمار کے بعد وہ واحد اداکار تھے جن کا ہیئر اسٹائل ضرب المثل بنا۔ حتیٰ کہ اس زمانے کی اکثر لڑکیاں تک وحید مراد کے اسٹائل کے بال بنایا کرتی تھیں۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی پاپولرٹی خواتین کے حلقوں میں حد درجہ زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ''شہنشاہ رومانس'' اور ''لیڈی کلر'' جیسے القاب سے بھی یاد کیا گیا۔ ان کے چاہنے والوں نے انہیں چاکلیٹی ہیرو کا بھی خطاب دیا اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن بھی کہا۔ بے مثل، منفرد، لاجواب اور باکمال وحید مراد کہہ کر بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ نغمات کی پکچرائزیشن کے حوالے سے بھی وہ برصغیر کے لاثانی ہیرو تھے اس لیے انہیں ماسٹر آف سونگ پکچرائزیشن کا خطاب بھی دیا گیا۔

سلور اسکرین پر جلوہ گر ہونے والے فنکاروں کو ہر دور میں اور ہر جگہ فلم بینوں کا بڑا طبقہ چاہتا ہے، پیار کرتا ہے، یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں مگر ان کے جیتے جی ہی اس پیار کا بندھن بندھا رہتا ہے بلکہ اکثر تو اس وقت تک عوامی مقبولیت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ جب تک وہ خود مقبول ہوتے ہیں۔ ادھر وہ اسکرین سے آؤٹ ہوئے، اُدھر چاہنے والوں کے دلوں میں بھی ان کی چاہت کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ نئی اور انوکھی بات یہ ہے کہ دنیا سے گزرنے کے برسہا برس بعد بھی چاہنے والوں کی چاہت کم نہ ہو۔ پیار کرنے والے بھلا نہ سکیں۔ یہ حیران کن بات ہے۔ وحید مراد کو ہم سے بچھڑے 34 سال بیت چکے ہیں مگر وحید مراد آج بھی اپنے بے شمار چاہنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر دھڑک رہے ہیں۔ اس دور میں بھی جب عام لوگ اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ کو بھی ان کے گزرنے کے سال دو سال بعد یاد نہیں رکھتے۔ وحید مراد کے پرستاروں کی اس والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ خصوصی طور پر میڈیا نے ان کی اس عقیدت بھری محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے وحید مراد کی برسی پر خاص اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ شوبز کے اخباروں اور پرچوں نے خصوصی ایڈیشن شائع کرنا شروع کر دیے اور ٹی وی چینلز نے وحید مراد کو خصوصی طور پر ٹریبوٹ پیش کرنے کے لیے خاص پروگرام نشر کرنا شروع کر دیے۔ اس حوالے سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وحید مراد کل بھی زندہ تھا۔ آج بھی زندہ ہے۔ اور کل بھی زندہ رہے گا۔

وحید مراد نے جب نیا نیا فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت سنتوش کمار، سدھیر، درپن، کمال، حبیب، یوسف خان اور اعجاز درانی وغیرہ بڑے اور سپر ہیرو کے طور پر موجود تھے۔ یہ تمام اداکار اپنی شخصیت اور اداکاری میں لاجواب تھے۔ سب کا اپنا اپنا انداز تھا اپنا اپنا فن تھا۔ ان سب میں کمی صرف یہ تھی کہ وہ نوجوان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس دور میں وحید مراد ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کردار کیا کرتے تھے۔ فلم ''اولاد'' میں وحید مراد نے حبیب کے ساتھ پرفارم کیا۔ فلم ''دامن'' میں سنتوش کمار کے ساتھ اداکاری کی۔ ''عید مبارک'' میں ایک بار پھر حبیب کے ساتھ جزوی کردار ادا کیا۔ یہ ساری بڑی اور کامیاب فلمیں تھیں مگر ان میں وحید مراد کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ عوام میں کھل کر ان کی پہچان نہیں ہوئی۔ تھوڑی توجہ انہوں نے ''دامن'' میں حاصل کی جب نیلو کے ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب اپنانے والے کردار میں ایک ڈانس آئٹم کلب کے ماحول میں پکچرائز کرایا۔ پہلی بار لوگوں کو ان کا انداز ذرا ہٹ کر اور مختلف لگا۔

ایک اداکار جو کچھ خود چاہتا ہے کہ ایسا کردار ہو تو وہ اس میں اپنی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور پر اجاگر کر سکتا ہے مگر دوسروں کی فلموں میں ایسے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے انہیں خود اپنی فلمیں بنانی پڑتی ہیں۔ وحید مراد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا جس کے بینر تلے وہ دو فلمیں بنا چکے تھے مگر ان میں وہ بطور اداکار شامل نہیں تھے۔ اب جب انہیں اپنی اداکاری کو اپنی خواہش کے مطابق نکھارنے اور سنوارنے کا خیال آیا تو انہوں نے پہلے ''ہیرا اور پتھر'' اور پھر ''ارمان'' جیسی فلمیں پروڈیوس کیں۔ جن میں خود ہیرو کا رول پلے کیے۔ ''ہیرا اور پتھر'' میں وہ پہلی بار مکمل ہیرو کے طور پر منظر عام پر آئے اور اس حیثیت سے انہیں فلم دیکھنے والوں نے پسند کیا۔ ان کے لیے اتنی پذیرائی ہی کافی تھی۔ اس کے بعد اپنی اگلی فلم ''ارمان'' میں اپنے سارے ارمان پورے کر لیے۔ ''ارمان'' میں وہ ایک ایسے نوجوان کے رول میں آئے جو شرارتی بھی ہے، عاشق بھی اور جدائی میں تڑپنے والا بھی ہے۔ ایسے نوجوان کا کردار اپنی ساری فنی خوبیوں کے

ساتھ ادا کر کے انہوں نے فلم بینوں کو چونکا دیا۔ لوگوں نے بار بار ''ارمان'' دیکھی اور وحید مراد کی محبت میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ یہ ایسی فلم تھی جس کے ذریعے رب العزت نے انہیں ایسی شہرت بخشی جو انہیں تمام ہیروز سے الگ ثابت کر گئی۔ ان کی اپنی الگ پہچان بنا گئی۔ ''ارمان'' وحید مراد کی نئی زندگی کی ایک خوشگوار ٹرننگ پوائنٹ تھی۔ ایک ایسی فلم جس نے ان کو شہرت اور مقبولیت کے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا۔

یہ درست ہے کہ اس فلم کے ذریعے وحید مراد کو جو عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں خود وحید مراد کا کلیدی کردار تھا۔ ان کی فنی صلاحیتوں کا بڑا عمل دخل تھا مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک پوری ٹیم تھی جس نے وحید مراد کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور نکھارنے میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان میں پرویز ملک کا خصوصی کردار تھا۔ ملک صاحب امریکا سے فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے تازہ بہ تازہ پاکستان واپس آئے تھے۔ وحید مراد کے دیرینہ دوست تھے۔ جب کہ وحید مراد نے ''ہیرا اور پتھر'' شروع کی تو اقبال رضوی اسے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ جب وحید مراد نے پرویز ملک کو اس کی ڈائریکشن کے لیے کہا تو وہ بولے۔ ''اب تک اس فلم کو کون ڈائریکٹ کر رہا تھا؟''

''اقبال رضوی۔''

''کیا وہ برا نہیں مانیں گے اگر میں نے......''

''ارے نہیں یار! میں انہیں رضا مند کر لوں گا۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔'' اور جب ملک کو اطمینان ہو گیا کہ اقبال رضوی نے بخوشی انہیں ''ہیرا اور پتھر'' کی ہدایات کی اجازت دے دی ہے تو انہوں نے ''ہیرا اور پتھر'' سے اپنی ہدایت کاری کی ابتدا کی۔ سب سے پہلے فلم کے اسکرپٹ کو بغور پڑھا اور جہاں جہاں انہیں ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر شوٹ کیے ہوئے حصے میں بھی جس کو مناسب سمجھا اسے رکھا باقی کو ریجیکٹ کر دیا۔ اسکرین پلے میں بھی اپنی مرضی سے تبدیلی کی۔ اس کے بعد اپنے انداز میں فلم مکمل کی۔ ''ہیرا اور پتھر'' پسند کی گئی مگر پرویز ملک اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے لیکن وحید مراد نے جب اگلی فلم شروع کی تو ملک صاحب نے اپنی بھرپور صلاحیتوں اور امریکا سے حاصل کی ہوئی تعلیم و تربیت کا مظاہرہ کیا۔ ''ارمان'' مکمل ہو کر سلور اسکرین کی زینت بنی تو

زندگی نامہ

نام: وحید مراد (خاندانی بھی اور فلمی بھی)
پیدائش: بروز بدھ 2 اکتوبر 1938ء)
مقام پیدائش: کراچی
والد: نثار مراد
والدہ: شیریں مراد
تعلیم: انگریزی ادب میں ایم اے
شادی: بروز جمعرات 17 ستمبر 1964ء کو سلمیٰ بنت ابراہیم سے طارق روڈ کراچی میں شادی ہوئی۔ سلمیٰ مراد 31 مارچ 1941ء کو بھارت کے شہر سورت میں پیدا ہوئی تھیں۔ اولاد: ایک بیٹی عالیہ مراد، ایک بیٹا عادل مراد۔ عالیہ 23 دسمبر 1969ء کو فلم ''عندلیب'' کی شاندار گولڈن جوبلی کے موقع پر پیدا ہوئیں جب کہ عادل مراد 13 نومبر 1976ء کو ڈائمنڈ جوبلی فلم ''شبانہ'' کی ریلیز کے موقع پر پیدا ہوئے۔
فلمی کیریئر: فلم ساز، اداکار، ہدایت کار، مصنف اور گلوکار۔ فلم ساز کے طور پر گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔ اداکار کے طور پر 125 فلموں میں اداکاری کی۔ ان میں 115 اردو، 9 پنجابی اور ایک پشتو فلم تھی۔ بطور ہدایت کار اور گلوکار ان کی ذاتی فلم اشارہ تھی۔ بطور مصنف ان کی تین فلمیں ارمان، احسان اور اشارہ ہیں۔
اعزازات: 44 فلموں نے سلور جوبلی، 28 فلموں نے گولڈن جوبلی، 4 فلموں نے پلاٹینیم جوبلی اور ایک فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔
ایوارڈز: مختلف اداروں کی جانب سے 32 ایوارڈز حاصل کیے۔ 2011ء میں بعد از مرگ حکومتِ پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز دیا گیا۔
فلمیں: پہلی فلم بطور اداکار فلم ساز درپن اور ہدایت کار الحامد کی فلم ''ساتھی'' جس میں وہ ایک مل مزدور کے مختصر کردار میں نمودار ہوئے۔ بطور مکمل ہیرو، پہلی فلم ''ہیرا اور پتھر'' آخری فلم ''زلزلہ'' جوان کی موت کے بعد ریلیز ہوئی۔ بطور فلم ساز پہلی فلم ''انسان بدلتا ہے'' آخری فلم ''ہیرو'' جوان کے انتقال کے بعد نمائش پذیر ہوئی۔
انتقال: 23 نومبر 1983ء بروز بدھ صبح 10 بجے کراچی میں انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر 45 برس تھی۔
تدفین: بروز جمعرات صبح ساڑھے دس بجے لاہور میں ہوئی۔

اس نے دھوم مچادی۔

اس فلم سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ فلم میکر اور غیر تربیت یافتہ اور نا اہل فلم بنانے والوں میں یہ فرق ہوتا ہے۔

اس فلم کے دوسرے نمایاں تخلیق کاروں میں مسرور انور اور سہیل رعنا تھے۔ موسیقی کا فلموں کی کامیابی میں بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ اچھی موسیقی اچھے گانے ہوں تو کمزور کہانی کی فلمیں بھی پسند کرلی جاتی ہیں۔ ''ارمان'' کی کہانی، ہدایت کاری، اداکاری تو سپر کلاس کی تھیں۔ اس پر سہیل رعنا کی دلوں میں اتر جانے والی موسیقی کی دھنیں اور مسرور انور کے مدھ بھرے گیتوں نے سونے پر سہاگا کا کام کیا جب کہ احمد رشدی کی جادوئی آواز نے بھی ایسی جادوگری دکھائی کہ فلم کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اگر ارمان کو لوگوں نے بار بار دیکھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پوری ٹیم کی فنی کارکردگی عروج پر ہے۔ اس فلم کی سپر ڈپر کامیابی نے وحید مراد کی پسندیدگی، مقبولیت اور شہرت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس فلم کی نمائش کو اتنے دن ہو گئے مگر آج بھی اس کی تر و تازگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

وحید مراد بلاشبہ ایک ذہین اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال فنکار تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے سامنے آئے تو منہ بند کلیوں کی طرح ان کی فنی صلاحیتیں کھلتی چلی گئیں۔ ان کی فلمیں دیکھنے والے ان کے گرویدہ اور شیدائی ہوتے چلے گئے۔

ہر دور میں فنکاروں کے چاہنے والے موجود ہوتے ہیں۔ آج بھی شان، جاوید شیخ، عجب گل اور شاہد خان کو ان کے پرستاروں کا طبقہ انہیں چاہتا ہے ان سے پیار کرتا ہے مگر جس تناسب سے وحید مراد کو اس کے چاہنے والوں نے چاہا، پیار کیا اس تناسب سے کسی اداکار کو بھی چاہا نہیں گیا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ جو اب تک نہیں ٹوٹا اور شاید آنے والے دنوں میں بھی نہیں ٹوٹے گا۔

رومانی ہیرو کے طور پر سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے وحید مراد کی پسندیدگی کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ نوجوان لڑکوں اور کالج کی طالبات ہی اس کی گرویدہ نہیں تھیں بلکہ پردہ دار گھریلو خواتین بھی سب سے چھپ کے اس کے نام کی مالا جپا کرتی تھیں۔ شہر کے سینماؤں میں اس کی فلمیں لگتیں تو انہیں دیکھنے ضرور جاتیں واپس آکر اس کی ایک ایک ادا کو یاد کر کے سو سو جان سے اس پر فدا ہوتیں۔

اس کی یہ عوامی مقبولیت دیکھ کر فلم ساز اسے ایسی ہی فلموں میں کاسٹ کرتے تھے جو اس کے پرستاروں کو اچھی لگیں، پسند آئیں اور ایسی فلمیں عام طور پر لو اسٹوری ہوتی تھیں۔

وحید مراد کو رومانوی کرداروں کی ادائیگی میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے وہ رومینٹک فلموں کی اہم ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ رومانوی کرداروں کی ادائیگی کی طرح رومانوی گیتوں کی پکچرائزیشن میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے ہی انہیں ماسٹر آف سونگ پکچرائزیشن کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

وحید مراد نے اپنی فلمی زندگی میں 292 نغمات فلمبند کروائے جن میں بڑی تعداد رومینٹک گیتوں کی تھی۔

کچھ اداکار اپنی پہلی ہی فلم میں ہٹ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ندیم۔ مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہیں منزل مقصود کے حصول کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے اگرچہ وہ ایک معروف فلم تقسیم کار نثار مراد کے فرزند ارجمند تھے۔ اس کے باوجود وحید مراد کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے زینہ زینہ قدم بڑھانا پڑا۔

وحید مراد ہدایت کار الحامد کی فلم ''ساتھی'' میں پہلی بار اداکار درپن کے ہمراہ جلوہ گر ہوئے۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ ایک مختصر سا جزوی سا کردار تھا۔ ہدایت کار ایس سلیمان کی دوسری فلم ''باجی'' بھی وحید مراد کی دوسری فلم تھی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں وحید مراد اور محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ ایک تقریب کا سین تھا جس میں ایک مقبول گیت فلمبند کیا گیا تھا جس کے بول تھے

سجن لاگی توری لگن

یہ گیت اداکارہ رقاصہ پنا پر عکس بند کیا گیا تھا۔ گانے کی اس تقریب میں حاضرین کی صف میں وحید مراد بھی شامل تھے۔

اسی طرح 1966ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''میں وہ نہیں'' میں بھی وحید مراد اور محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک تقریب کا منظر تھا۔

ہاں 1962ء میں فلم ساز و ہدایت کار ایس ایم یوسف کی معاشرتی، سماجی، گھریلو اور نغماتی فلم ''اولاد'' میں وحید مراد کو ایک مختصر کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے حبیب اور نیر سلطانہ کے صاحبزادے کا کردار ادا کیا تھا اور

اس فلم کو ان کی اوّلین فلم کہا جاتا ہے۔
ہدایت کار قدیر غوری نے انہیں اپنی گھریلو اور نغماتی فلم ''دامن'' میں پہلی بار نیلو کے ساتھ رومانی پیئر بنا کر پیش کیا تھا مگر سنتوش کمار اور صبیحہ خانم اس فلم کے ہیرو ہیروئن تھے۔ وحید مراد اور نیلو کے جزوی رومانوی کردار تھے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض تو ایکسٹرا کے طور پر فلمی میدان میں قدم رکھتے ہیں جن کی بہترین مثال سلطان راہی اور رنگیلا کی ہے۔ وحید مراد کے ساتھ یہ نوبت تو نہیں آئی مگر چھوٹے موٹے کرداروں کے بعد جب انہیں قدرے بڑے رول بھی ملنے لگے تو وہ بھی ثانوی ہوتے تھے۔ بڑے فنکاروں کے ساتھ بغل بچہ کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔ وحید مراد پڑھے لکھے اور باشعور اداکار تھے ان کے لیے یہ صورت حال لمحہ فکریہ تھی۔ کبھی جب وہ اکیلے بیٹھے ہوتے تو خود ہی خیال آرائی کرتے۔ ''اس طرح تو میں اپنی منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے بوڑھا ہو جاؤں گا۔''
ان کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ لہٰذا اس کے سدباب کے لیے انہیں اپنی طبیعت کے مطابق کرداروں پر پرفارم کرنے ہی میں اپنی بہتری نظر آئی۔
''کیوں نہ میں اپنے لیے اپنی فلم بناؤں؟'' انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ چند روز تک اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کیا اور پھر ''ہیرا اور پتھر'' بنا کر اس میں فرسٹ رومانی پیئر کے طور پر کام کیا اور تماشائیوں نے انہیں سولو ہیرو کے طور پر دیکھ کر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا۔
لوگوں میں جہاں بہت سی اچھائیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں وہاں ان میں کچھ خرابی اور برائی بھی ہوتی ہے۔ انسان ہونے کے ناتے وحید مراد بھی اس انسانی جبلت سے پاک نہیں تھے جہاں ان میں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک خرابی یہ تھی کہ وہ بڑے جذباتی تھے۔ فوراً روٹھ جاتے تھے۔ ناراض ہو جاتے تھے اور اپنے بہترین ساتھیوں اور دوستوں سے بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ ان کے بہت قریبی اور بہت اچھے دوست ہدایت کار پرویز ملک کی زبانی ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ پرویز ملک کہتے ہیں۔ ''وحید مراد میرے محسن تھے۔ انہوں نے مجھے بطور ہدایت کار متعارف کرایا۔ وہ ایک مکمل رومانوی ایکٹر تھا مگر اس کی ذاتی زندگی میں کافی ہلچل سی تھی جس کی وجہ سے وہ سفارش پسند نہیں کرتے تھے۔'' آخری دنوں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے

وحید مراد کے بچے

عالیہ مراد کی شادی 12 فروری 1987ء کو سید سجاد حسین شاہ سے ہوئی جن سے ان کے دو بیٹے سید مقبول شاہ اور محمد علی ہیں۔
عادل مراد کی شادی مریم رحیم سے 27 دسمبر 2005ء کو ہوئی ان کا بیٹا عیان عادل 16 نومبر 2006ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔

عادل مراد بحیثیت اداکار

وحید مراد کے صاحبزادے عادل مراد جو وحید مراد کے انتقال کے وقت سات سال کے تھے۔ اب ماشاءاللہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اب بچوں کے باپ ہیں اور اب اپنے والد وحید مراد کے پیشے پر فارمنگ آرٹ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان کی پہلی فلم ''چین آئے نہ'' 11 اگست 2017ء کو ریلیز ہو رہی ہے (شاید یہ سطریں پڑھتے وقت آپ عادل مراد کی یہ فلم دیکھ چکے ہوں) ''چین آئے نہ'' سید نور کی فلم ہے۔ ان کی اس سے پہلے 55 فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں۔ عادل مراد جو ٹی وی انڈسٹری سے بطور پروڈیوسر ڈائریکٹر وابستہ تھے اور متعدد ڈراما سیریز اور سوپ کرتے رہے تھے۔ ایک دن سید نور کی طرف سے انہیں ان کی فلم میں کام کرنے کی دعوت ملی جسے غور و فکر کے بعد عادل نے قبول کر لی۔ اگرچہ یہ ایک نیگیٹو کردار تھا۔ ایک وڈیرے کے بگڑے ہوئے بیٹے کا کردار تھا جو یو کے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے اور دولت کے نشے میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ اس منفی کردار کو قبول کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے عادل مراد کہتا ہے۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ وحید مراد کو ''شیشے کے گھر'' میں ان چاہنے والوں نے قبول نہیں کیا تھا اگر یہ سوچ کر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا رہوں گا تو یہ میرے اور وحید مراد کے چاہنے والوں کے لیے اچھی بات نہیں ہوگی کیونکہ وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ یہ عوام کا کام ہے کہ میرا کام دیکھ کر فیصلہ کریں کہ میں بحیثیت اداکار کتنا کامیاب رہا ہوں۔

کہا۔ ''پرویز! میں نے تمہاری باتوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے آج یہ وقت کافی برا لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے۔ جب میں ندیم کے ساتھ فلموں میں مصروف تھا اس کے باوجود میں تمہیں ایک دوست اور بھائی سمجھتے ہوئے مشورے دیتا رہتا تھا۔ کیونکہ تم پاکستان کے ایک عظیم ہیرو ہو۔ آج میں جو کچھ ہوں صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہوں۔''

پرویز ملک کہتے ہیں۔ ''اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں نے وحید مراد سے جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف درست ہے مگر میرے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے کہ میں نے وحید مراد کے ساتھ بے وفائی کی۔ یہ سراسر جھوٹ اور منفی پروپیگنڈہ ہے۔ میں نے ہم دونوں، قربانی، ہلچل، انتخاب، پہچان، مہربانی پروڈیوسر کی خواہش اور تقسیم کاروں کی ڈیمانڈ کے مطابق بنائی تھی۔''

پرویز ملک اس حوالے سے مزید کہتے ہیں۔ ''وحید مراد اور ہمارے چند مخالفین نے ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر میں آج بھی وحید مراد کو ایک بہت بڑا اداکار مانتا ہوں۔ وحید مراد کا مقابلہ ہم بھارت کے بڑے بڑے ہیروز کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ گانوں کی پکچرائزیشن میں بھی وحید مراد کو کمال مہارت تھی۔ آج یہ بات میں فخر کے ساتھ کہوں گا کہ میری فلموں میں وحید مراد نے جو پرفارم کیا تھا ان فلموں میں گانوں کی پکچرائزیشن میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ وحید مراد کو جاتا ہے۔''

وحید مراد کی کامیابی و ناکامی سے قطع نظر میں یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ وہ دنیائے فلم کے واحد ہیرو ہیں جو دو دہائی گزارنے کے بعد بھی اپنے پرستاروں کے درمیان موجود ہیں۔

پرویز ملک کے اس اظہاریئے سے آپ بخوبی اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ وحید مراد اپنے اتنے اچھے دوست کو بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک ایسا وقت آیا تھا جب وحید مراد کی کچھ فلمیں تابڑ توڑ ناکام ہو گئی تھیں۔ ہمارے ہاں ایک بری روایت ہے کہ اگر کسی اداکار یا اداکارہ کی کچھ فلمیں باکس آفس پر ناکام ثابت ہوں تو وہ ان کی نگاہوں سے ایک دم گر جاتا ہے۔ اسے ناکام ہیرو یا ہیروئن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگرچہ فلم ایک ٹیم ورک ہے۔ متعدد لوگوں کی کارکردگی سے فلم بنتی اور کامیاب یا ناکام ہوتی ہے مگر ناکامی کی صورت میں سارا ملبا ہیرو یا ہیروئن پر گرتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ فلم میکرز نے ناکام فلموں کا ذمہ دار وحید مراد کو ٹھہرا کر انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور ان کی جگہ ندیم اور دوسرے ہیروؤں کو کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ وحید مراد پڑھے لکھے تھے۔ باشعور انسان تھے۔ انہیں تو یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی بجائے ندیم کو فلموں میں کاسٹ کرنے کے ذمہ دار پرویز ملک ہیں۔ پرویز ملک تو بس اسی بات کے گناہ گار تھے کہ پروڈیوسرز نے جس ہیرو کا انتخاب کیا اسی کو لے کر فلم بنائی۔

وحید مراد کی منفی سوچ نے انہیں ڈپریشن کا شکار کر دیا۔ اگرچہ اس حوالے سے ندیم صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اس صورتِ حال کا مقابلہ خود وحید مراد کو کرنا چاہیے تھا جس طرح انہوں نے اپنی ذاتی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو منوایا تھا اسی طرح اس موقع پر بھی اپنی فلموں کے ذریعے فلم سازوں کے اس نظریے کو مسترد کرنا چاہیے تھا۔ ان کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا۔ ان کے پاس سرمایہ بھی تھا۔ وہ یہ کام بخوبی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔''

وحید مراد کے بارے میں ان کے دور کے ایک اور ہدایت کار شوکت ہاشمی نے بھی اپنے محسوسات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ نئی نسل کو شاید شوکت ہاشمی کے بارے میں زیادہ علم نہ ہو۔ اس لیے ان کے بارے میں مختصراً عرض ہے کہ وہ ایک پرانے ہدایت کار اور مصنف تھے۔ بمبئی فلم انڈسٹری میں بہت دنوں تک اپنی فنی زندگی جاری رکھی۔ انہوں نے اس دور میں ایک عشق بھی کیا۔ اس میں ناکام بھی ہوئے اور پھر اس عشق کو شہرت ان کے لکھے ناول ''نیا جوبک گئی'' سے حاصل ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے کئی فلمیں بنائیں۔ آخری عمر بحیثیت صحافی گزاری۔

پاکستان میں انہوں نے ''ڈاکٹر'' کے نام سے جو فلم بنائی تھی اس میں انہوں نے وحید مراد کو بطور ہیرو پیش کیا تھا۔ یہ وحید مراد کی چوتھی فلم تھی۔ اس کے بعد بھی وحید مراد کو لے کر کچھ فلمیں بنائیں۔ شوکت ہاشمی فلم میکر کے علاوہ ادیب اور صحافی بھی تھے اس لیے ان کی سوچ، فکر اور وژن قابلِ غور وفکر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

''وحید مراد، سنتوش، درپن اور سدھیر سے زیادہ فریش اور ٹیلنٹیڈ تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اپنے کرداروں کی روح میں اتر کر پرفارم کرتا تھا۔ وقت پر اسٹوڈیو آتا، جلدی سے میک اپ کر کے سیٹ پر پہنچ جاتا۔ اپنا سین پڑھتا، مکالمے یاد کرتا، کوئی اچھا تجکشن ہوتا تو ہدایت کار

کو بڑے ادب سے بتاتا۔ شوٹنگ کے دوران محنت سے کام کرتا۔ اِن ڈور آؤٹ ڈور، گرمی سردی جہاں بھی شوٹنگ ہوتی وہ خوشی خوشی کام کرتا۔ ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا۔ فلمی حلقوں میں روز بروز پاپولر ہوتا گیا اور دوسرے ہیروز کو پیچھے چھوڑتا ہوا بہت آگے بڑھ گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے لاکھوں روپے کمائے اور بڑی عزت اور مقبولیت حاصل کی۔

یہ تو وحید مراد کی وہ خوبیاں تھیں جنہیں شوکت ہاشمی نے محسوس کیا۔ اب ان کی زبانی وحید مراد کی ایک اور خوبی کے بارے میں بھی اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔ شاید کسی اور نے اس جانب نشاندہی نہیں کی۔ وحید مراد کو اس بات کی قدرت بھی حاصل تھی کہ وہ آنے والے دنوں کے بارے میں کچھ فلموں اور فلمی لوگوں کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے تھے جو سچ ثابت ہوتی تھیں۔

شوکت ہاشمی کہتے ہیں۔ ''میری فلم ''ڈاکٹر'' جس کے وہ ہیرو تھے۔ اس کی تکمیل کے دوران انہوں نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا۔ ''آپ جتنے بھی جتن کر لیجیے۔ میری یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ پڑھے لکھے ناظرین اور ناقدین مبصرین کی تعریف و توصیف کے باوجود ''ڈاکٹر'' بارہ ہفتوں سے زیادہ نہ چل سکی۔

میں نے بعد میں اس سے پوچھا۔ ''تم نے فلم کی تکمیل اور اس کی نمائش سے پہلے کیسے یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کامیاب نہیں ہوگی؟''

میں نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ''اس کی وجہ ہیروئن ہے۔ اس فلم میں تمام اداکار اور ٹیکنیشنز پلس ہیں صرف ایک مائنس ہے اور یہ مائنس تمام ہی پلس پر بھاری ہے یعنی اس فلم کی ہیروئن۔''

میں نے اسے بتایا۔ ''اس فلم کی ہیروئن ہی اس فلم کی پروڈیوسر ہے اور اس کا فلم بنانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ بطور ہیروئن کسی طرح اسٹیبلش ہو جائے۔''

وحید کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ میں اسے بخوبی جانتا ہوں۔ وہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔ وہ اوور ایج ہے۔ بدصورت ہے۔ بھدی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اداکاری کا کوئی اسپارک نہیں ہے۔ بہر حال میں صرف آپ کی خاطر اس فلم میں کام کر لوں گا۔ میرا کیا ہے، میرے پاس دس فلمیں ہیں میرا کچھ نہیں بگڑے گا

گیتوں کی پکچرائزیشن

وحید مراد گانوں کی پکچرائزیشن میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس لیے ان پر ہر فلم میں زیادہ سے زیادہ گیت فلمبند کرائے جاتے تھے مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان کے کریڈٹ میں کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں ان پر کوئی گیت عکس بند نہیں کرایا گیا۔ ایسی فلموں میں اولاد، دامن، میرے اپنے، آہٹ، پرواہ نہیں۔ انوکھا راج اور جوگی قابلِ ذکر ہیں جب کہ کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں صرف ایک گانا پکچرائز کرایا گیا۔ ان فلموں میں ممتا، بہو بیگم، ماں باپ، انسانیت، چاند سورج، بہارو پھول برساؤ، وقت، خریدار، جیو اور جینے دو، گونج اٹھی شہنائی، آدمی، شیشے کا گھر، نذرانہ، وعدے کی زنجیر، یہاں سے وہاں تک، چھوٹے نواب، بندھن، پیاری، گن مین، کرن اور کلی، دوپٹہ جی، مانگ میری بھر دو، ہیرو اور زلزلہ شامل ہیں۔

وحید مراد کی ذاتی فلمیں

وحید مراد نے بطور فلم ساز گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔ جو یہ ہیں۔ انسان بدلتا ہے، جب سے دیکھا ہے تمہیں، ہیرا اور پتھر، ارمان، احسان، سمندر، اشارہ، نصیب اپنا اپنا، مستانہ ماہی (پنجابی) جال اور ہیرو۔

چاکلیٹی ہیرو۔ لیڈی کلر

وحید مراد کو اس کی زندگی میں بھی اور آج بھی چاکلیٹی ہیرو اور لیڈی کلر جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ وحید مراد کو حسب حال نام دینے والا کون شخص تھا؟ یہ دکھی پریم نگری تھے جو معروف صحافی، مصنف اور نغمہ نگار تھے۔ جن کا ایک سپرہٹ گیت آپ نے بھی سنا ہوگا۔ ''دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں'' یہ فلم ''جاگ اٹھا انسان'' کا گیت ہے۔

وحید کے ہدایت کار، اداکارائیں، موسیقار اور گلوکار

وحید مراد نے 53 ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ ان کے ساتھ 27 اداکارائیں ان کی ہیروئن بنیں۔ ان پر 292 نغمات عکسبند ہوئے جنہیں 22 گلوکاروں نے گایا۔ 23 موسیقاروں نے ان گیتوں کی دھنیں کمپوز کیں۔

مگر اس فلم میں آپ کا کیریئر ختم ہو جائے گا۔ آپ سوچ لیجیے۔"

وحید مراد نے سچ کہا تھا۔ فلم ابھی نصف کے لگ بھگ مکمل ہوئی تھی کہ یہ آثار نظر آنے لگے کہ آگے خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ ہیروئن صاحبہ کے شوہر نامدار کی ہر بات، ہر معاملے پر مداخلت سے مجھے فلم مکمل کرنا ناممکن نظر آنے لگا۔ وہ چاہتے تھے کہ فلم کا کوئی منظر کوئی سین ایسا نہ ہو جس میں ہیروئن نظر نہ آئے۔ فلم کی کہانی میرے ایک دوست نے لکھی تھی اور کہانی کے تقاضے کے مطابق جہاں جہاں ہیروئن کی انٹری ضروری تھی وہاں وہاں اس کا کردار تھا۔ ہیروئن کے شوہر (فلم کے فلمساز) کا کہنا تھا کہ آپ کہانی میں ایسی تبدیلی کریں کہ ہیروئن ہر سین میں موجود ہو۔ ایسا کرنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ہیروئن صاحبہ کا اردو تلفظ بھی بہت ناقص تھا۔ میں بار بار ٹوکتا اور صحیح ادائیگی کے لیے کہتا تو ہیروئن سے زیادہ ان کے شوہر کو ناگوار گزرتا۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں ہیروئن کو لٹ ڈاؤن کر رہا ہوں۔ یونٹ میں بڑا کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ میرا حامی تھا دوسرا گروپ ہیروئن اور ان کے شوہر کی ہر ناجائز بات کو بھی درست تصور کرتا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس فلم سے علیحدگی اختیار کر لوں۔

میری علیحدگی کے بعد میرے ایک نالائق شاگرد نے جو پروڈیوسر کا خوشامدی تھا، فلم کو مکمل کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور ہیروئن اور ان کے شوہر کی خواہش کے مطابق اسکرپٹ میں تبدیلی کر کے فلم مکمل کر لی۔ "بندھن" ریلیز ہوئی تو اس سے عوامی رشتے کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ایسی فلم کا جو حشر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ پہلے ہی ہفتے میں اس کا دھڑن تختہ ہو گیا۔

"بندھن" کی نمائش کے دوسرے دن ایورنیو اسٹوڈیو میں میری وحید مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ان دنوں میں روزنامہ "مشرق" میں سینئر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کر رہا تھا۔ وحید مراد میرے قریب آیا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔ "آپ نے بہت اچھا کیا جو ملازمت کر لی۔ اب آپ کا فلمی کیریئر ختم ہو چکا ہے۔ دل لگا کر اخبار میں کام کیجیے یہ پیشہ فلم ڈائریکشن سے زیادہ ریسپکٹ ایبل ہے۔"

اگرچہ آدھی فلم (بندھن) چھوڑ کر میں آ گیا تھا مگر اس کے پروڈیوسر نے انتقاماً فلم کے ٹائیٹل اور پبلسٹی وغیرہ میں میرا نام بطور ہدایت کار تحریر کیا تھا۔ حالانکہ اس فلم میں سوائے چھ آؤٹ ڈور اور ان ڈور گانوں کی پکچرائزیشن کے میرا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا۔ پروڈیوسر کی اس انتقامی کارروائی سے میرے فلمی کیریئر کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ میں نے اس صورت حال سے پہلے ہی اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بدل دیا۔ میں نے بہت مناسب وقت میں صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے۔ اس کے بہت سے پرستار ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے اسے اس کی زندگی میں نہیں دیکھا ایسے چاہنے والے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں نہیں جانتے۔ نئی نسل کے ایسے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سپر اسٹار کی ابتدائی زندگی کے متعلق بھی بتایا جائے۔

وحید مراد کے والد محترم نثار مراد کا تعلق سیالکوٹ شہر سے تھا۔ نثار مراد بعد ازاں کراچی آ گئے جس کے بعد انہوں نے پاکستان فلمز کے نام سے فلموں کی تقسیم کاری کا ادارہ قائم کیا اور اس ڈسٹری بیوشن دفتر سے متعدد فلمیں ریلیز ہوئیں۔

وحید مراد کا بطور طالب علم پہلا اسکول میری کلاسکو سیکنڈری اسکول تھا۔ اسی اسکول سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد ایم ایس کالج سے ایف ایس سی اور آرٹس کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ماسٹر کی ڈگری تک ان کا تعلیمی کیریئر شاندار رہا۔

دوران تعلیم وہ فراغت کے اوقات میں اپنے والد نثار مراد کے دفتر میں بھی وقت گزارتے تھے۔ جہاں فلمی دنیا کے مختلف شعبوں کی مختلف شخصیات کی آمد بھی رہتی تھی۔ اس طرح انہیں فلموں اور فلم والوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ انہی دنوں انہوں نے دو فلمیں بھی پروڈیوس کیں۔ ان کی پہلی ذاتی فلم کا نام "انسان بدلتا ہے" جب کہ دوسری فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ان کے دوست پرویز ملک فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے امریکا جا رہے تھے تو وحید مراد نے بھی ان کے ساتھ ہی امریکا جانے اور فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر جب انہوں

نے اس بات کی خواہش اپنے پاپا سے کی تو انہوں نے انہیں امریکا جانے نہیں دیا۔ وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھے اور ان کے پاپا نثار مراد ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ چند برسوں کے لیے بھی وہ ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھایا۔ ''تمہیں فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟ کیوں ضرورت نہیں؟ میرا بھی ارادہ اسی لائن کو پیشہ بنانے کا ہے۔''

''اسی لیے تو تمہیں ضرورت نہیں۔'' نثار مراد بولے۔ ''تم فلم ساز کی حیثیت سے فلمیں پروڈیوس کرو۔ اپنا پروڈکشن ہاؤس بنالو۔ سرمایہ کاری کے لیے تمہیں کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پپا کے پاس جو روپیا پیسا ہے وہ سب تمہارا ہی ہے۔''

نوجوان وحید مراد نے چند لمحے سوچا۔ پھر کہا۔ ''ہاں آئیڈیا تو اچھا ہے۔''

''آئیڈیا اچھا نہیں بہت اچھا ہے۔ یہیں کراچی میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس دوران یا اس کے بعد فلم سازی شروع کرو۔ مجھے تو کچھ فلم والے کہتے ہیں تمہارا بیٹا بالکل ہیرو ٹائپ ہے۔ اسے فلموں کا ہیرو بناؤ۔''

وحید مراد ہنسنے لگے۔ ''ارے نہیں پاپا! میں کیا اداکاری کروں گا۔''

نثار مراد نے بیٹے کی محبت میں اسے امریکا جانے نہیں دیا مگر اس کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اسے فلم پروڈکشن میں لگا دیا۔ اپنی ابتدائی ذاتی فلموں میں وحید مراد نے اداکاری نہیں کی مگر نثار مراد کے دوستوں نے ان کے بیٹے کو اداکار بنا دیا۔ ہدایت کار ایس ایم یوسف نے وحید مراد کو اپنی فلم ''اولاد'' میں ایک نمایاں کردار میں پیش کر دیا۔ یہ ہیرو کا کردار نہیں تھا اس کے باوجود اہم رول تھا۔ جس میں وحید مراد نے توقعات سے بڑھ کر اچھی اداکاری کر کے سب کو حیران کر دیا۔ یہ فلم 1962ء میں ریلیز ہوئی اور گولڈن جوبلی کے اعزاز سے ہمکنار ہوئی۔ اس کے بعد سنتوش کمار اور صبیحہ خانم نے اپنی ذاتی فلم ''دامن'' میں سیکنڈ فلمی پیئر کے طور پر نیلو کے ساتھ پیش کیا۔ اس فلم میں بھی وحید مراد کی اداکاری کو فلم بینوں کی بڑی تعداد نے پذیرائی کی سند عطا کی اور وحید مراد بطور اداکار فلم والوں کی نگاہوں میں آ گئے۔

اس کے بعد وحید مراد کو ان کے بہی خواہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اب تم مکمل ہیرو کے روپ میں خود کو پیش کرو۔ ان لوگوں میں ان کے والد محترم نثار مراد بھی شامل تھے۔ وحید مراد خود بھی چاہتے تھے کہ وہ ثانوی کرداروں کے حصار سے نکلیں اور مرکزی رومانوی کرداروں میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔ اس وقت تک پرویز ملک امریکا سے واپس آ چکے تھے۔ وحید مراد نے پڑھے لکھے اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے اپنے فنی سفر کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے اپنی ایک ٹیم بنائی۔ اس میں ہدایت کار پرویز ملک، موسیقار سہیل رعنا اور مصنف و نغمہ نگار مسرور انور کے اہم کردار تھے۔ اس اشتراک کے نتیجے میں وحید مراد کی ''ارمان'' جیسی بلاک بسٹر فلم وجود میں آئی جس نے نہ صرف باکس آفس پر پلاٹینم جوبلی (75 ہفتے) کا پرچم لہرایا بلکہ وحید مراد کو فلم انڈسٹری کا کامیاب ترین ہیرو منوا لیا۔ ''ارمان'' 18 مارچ 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس ٹیم کی فلم ''احسان'' اور کچھ اور فلموں نے بھی کامیابی کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ارمان'' کی نمائش سے پہلے یعنی 17 ستمبر 1964ء میں نثار مراد نے بڑے ارمانوں کے ساتھ بیٹے کے سر پر سہرا سجایا۔ ان کی دلہن سلمیٰ تھیں جو ایک بڑے اور نامور صنعت کار کی صاحبزادی ہیں۔

وحید مراد کے فلمی کیریئر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور فلم ساز اپنے ادارے فلم آرٹس کے بینر تلے انہوں نے گیارہ فلمیں بنائیں۔ جن میں پنجابی فلم ''مستانہ ماہی'' اور آخری فلم ''ہیرو'' بھی شامل ہیں۔ بطور مصنف وحید مراد کی چار فلمیں ہیں۔ ارمان، احسان، اشارہ اور ہیرو جو ان کی وفات کے بعد ریلیز ہوئی۔ بطور ہدایت کار ان کے فلمی کیریئر میں صرف ایک فلم ہے اور یہ فلم تھی اشارہ۔ اس فلم کی ہیروئن شبنم تھیں۔

انہوں نے بطور ہیرو مختلف ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا۔ وحید مراد کی پہلی جوڑی زیبا کے ساتھ تھی۔ زیبا کے ساتھ انہوں نے 9 فلموں میں کام کیا۔ جب کہ رانی کے ساتھ 18 فلموں میں اور شبنم کے ساتھ 16 فلموں میں کام کیا۔ نیلو، نغمہ، روزینہ، روحی بانو، بہار، بابرہ شریف، سنگیتا، کویتا، ممتاز، نجمہ، انجمن، وردانہ رحمٰن، شائستہ قیصر، نشو، شمیم آراء اور چترا سنہا (بنگالی اداکارہ) کے ساتھ بھی وہ بطور ہیرو جلوہ گر ہوئے۔

کبھی کبھی کچھ فلم ساز و ہدایت کار کچھ تجربے بھی کرتے ہیں جو کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہو جاتے ہیں۔ جیسے اسلم

پرویز جب ہیرو کی حیثیت سے ناکام ہونے لگا اور یکے بعد دیگرے اس کی بہت سی فلمیں فلاپ ہونے لگیں تو اس نے از خود فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ کئی برسوں کے بعد ہدایت کار حسن طارق نے اسے اپنی ایک فلم میں بطور ولن کاسٹ کیا۔ غالباً یہ فلم ''شکوہ'' تھی۔ فلم ریلیز ہوئی تو فلم کے ساتھ اسلم پرویز بھی بطور ولن ہٹ ہوگیا۔ اسی طرح اپنے وقت کے بہت بڑے ہدایت کار نذرالاسلام نے بھی اپنی ایک فلم ''شیشے کا گھر'' میں ایک تجربہ کیا تھا۔ وحید مراد کو ولن کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اس فلم کا ہیرو شاہد تھا مگر ان کا یہ تجربہ بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ وحید مراد کے پرستاروں نے وحید مراد کو ولن کے روپ میں قبول نہیں کیا۔ انہوں نے یہ فلم یکسر مسترد کردی۔ اس طرح نذرالاسلام جو کامیاب فلموں کے ہدایت کار تسلیم کیے جاتے تھے ان کی یہ فلم ناکام ترین فلم ثابت ہوئی۔ ''شیشے کا گھر'' 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی جو منفی کردار میں وحید مراد کی پہلی اور آخری فلم تھی۔

وحید مراد کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہوا کہ ان کی فلم ''رشتہ ہے پیار کا'' کی فلم بندی پہلی بار کسی یورپی ملک میں کی گئی۔ وہ فلمی دنیا کے کرکٹ کلب کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اس کلب کے کھلاڑی کی حیثیت سے 29 میچ کھیلے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے 43 انٹرویوز نشر ہوئے۔ پاکستان ٹیلی وژن میں وہ پانچ بار جلوہ گر ہوئے۔ طارق عزیز کے ''نیلام گھر'' میں دو بار اور پروگرام ''گیت مالا'' میں بھی دو بار۔ اور ایک بار ''سلور جوبلی'' پروگرام میں۔

وحید مراد کے اسٹائل اپنانے کا رجحان پاکستان میں ہی نہیں ہالی ووڈ میں بھی ان کی نقالی کرتے ہوئے کچھ اداکار نظر آتے تھے۔

وحید مراد جس نے 20 سال تک اپنے چاہنے والوں کے دلوں پر راج کیا۔ ان کا فلمی کیریئر اکیس بائیس برسوں پر محیط ہے۔ جن میں بیس سال تک فلم انڈسٹری میں اپنا سکہ رائج رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہی نہیں اس جہان فانی سے گزر جانے کے بعد بھی لاکھوں دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ رہنا اور وہ بھی سال دو سال تک نہیں 34 سال گزرنے کے بعد بھی دلوں پر راج کرنا وحید مراد کا ہی اعزاز ہے۔ اس مرتبے پر ابھی تک کوئی دوسرا فنکار نہیں پہنچا۔ ناقدین اور مبصرین اسے ''مجسم فن'' اور ''مکتبہ فن'' کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہماری فلم انڈسٹری اور اس کے کرتا دھرتاؤں نے اس کی اور اس کے فن کی قدر نہیں کی۔ اس کی فلموں کی کامیابی اور ناکامی کو ترازو میں تول کر اس کی بے قدری کی۔ جب تک اس کی فلمیں ان کے بینک بیلنس میں اضافہ کرتی رہیں، اس وقت تک اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ جب اس کی کچھ فلمیں کامیابی کے معیار پر پوری نہ اتریں تو اسے نظر انداز کردیا۔ اگرچہ ان فلموں کی ناکامی میں ان کا اپنا حصہ بھی تھا۔

بہرحال وہ عظیم تھا اور ہمیشہ فنی عظمت کے میناروں میں اس کا نام اور کام روشن رہے گا۔ اس کی بہت سی باتیں ہیں جو گزشتہ 33 برسوں سے لکھی جارہی ہیں پڑھی جارہی ہیں لیکن اب تک ختم نہیں ہوئی ہیں۔

ہم بھی آپ کے لیے اپنے قارئین کے لیے اس کی مزید باتیں کرتے ہیں جواب تک نہیں کرسکے۔

یہ نابغۂ روزگار فنکار 2 اکتوبر 1938ء کو بروز بدھ کراچی میں پیدا ہوا۔ اس کا نام وحید مراد رکھا گیا۔ کیونکہ اس کے والد محترم کا نام نثار مراد تھا۔ اس لیے اس کے نام وحید کے ساتھ مراد بھی جوڑا گیا۔

وحید مراد، نثار مراد کی واحد اولاد تھے۔ اس لیے بڑے چاؤ اور لاڈ پیار سے ان کی پرورش ہوئی۔ ماں باپ کے حد سے زیادہ لاڈ پیار کے باوجود وہ بگڑے نہیں۔ ان کے بڑوں نے انہیں اچھی تعلیم اور اچھی تربیت دی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات تو کچھ ایسی ہی بات وحید مراد کے ساتھ تھی۔ وہ بچپن اور لڑکپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تک ان کا تعلیمی کیریئر بہت شاندار رہا۔ انہوں نے میٹرک میری کلاسکو اسکول سے 1952ء میں پاکستان ایس ایم سائنس کالج سے بی اے کیا اور 1968ء میں کراچی یونیورسٹی سے انگلش ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ایم اے کی ڈگری سلمٰی بیگم سے شادی کے بعد حاصل کی۔

یہ بات سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہے کہ وحید مراد طالب علمی کے زمانے سے ہی فلموں کے دھندے سے وابستہ ہوگئے تھے۔ دو فلمیں بنالی تھیں مگر اس نگری میں آکر بھی بہکے نہیں۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر فلموں میں اداکاری بھی کرنے لگے مگر عام فلمی اداکاروں کی طرح بے راہ روی کے راستے پر گامزن نہیں ہوئے۔ اس کی خاص وجہ ان کے والدین کی اچھی تربیت تھی۔ بیٹے کے سلسلے میں اچھی منصوبہ بندی تھی۔ انہوں نے مناسب موقع دیکھتے ہی بیٹے کی شادی کردی۔ جس سال ستمبر کے مہینے میں بیٹے کی شادی کی

اسی سال دسمبر کے مہینے میں ''ہیرا اور پتھر'' ریلیز ہوئی۔ جو وحید مراد کی چوتھی یا پانچویں فلم تھی۔ نثار مراد صاحب نے بیٹے کے فلمی کیریئر کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ اس طرح اس کی عوامی مقبولیت اثر انداز ہوگی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بیٹے کو اخلاقی طور پر ثابت قدم رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ یہ کسی اداکار کے لیے بڑا رسکی اقدام ہوتا ہے مگر اللہ نے ان کے نیک اقدام کا انہیں زبردست انعام دیا۔ ''ارمان'' 18 مارچ 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی۔

ندیم جو اپنی پہلی فلم ہی سے ہٹ ہو گئے تھے۔ وہ بھی ''چکوری'' کی کامیابی کے بعد اپنی شادی پر رضامند نہیں تھے مگر انہیں ان کے سسرالیوں کے مجبور کرنے پر شادی کرنی پڑی مگر وہ بہت خائف تھے کہ کہیں ان کی شادی کی خبر ان کی مقبولیت کو متاثر نہ کرلے مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ وہ خوفزدہ تھے نہ ان کے والدین۔ شادی کے بعد وہ فلموں میں پہلے کی طرح کام بھی کرتے رہے اور ان کی عوامی مقبولیت میں روز بروز اضافہ بھی ہوتا رہا۔ ''ہیرا اور پتھر'' نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی اور ''ارمان'' نے پلاٹینم جوبلی کی۔

شادی کے بعد ان کے بچے بھی ہوئے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام انہوں نے عالیہ مراد رکھا اور بیٹے کا نام عادل مراد۔ دونوں کا نام عین (ع) سے شروع ہوتا ہے دونوں دادا دادی کے بھی لاڈلے تھے۔

وحید مراد کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے اداکاری کا شوق تھا مگر یہ حقیقت نہیں۔ انہیں فلموں میں کام کرنے کا قطعی کوئی شوق نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی دونوں ذاتی فلموں ''انسان بدلتا ہے'' اور ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' میں اداکاری ضرور کرتے مگر انہوں نے ان میں کوئی ثانوی کردار بھی ادا نہیں کیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کچھ فلم والوں نے انہیں زور زبردستی اداکاری کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی ساری دلچسپی تو صرف فلم سازی سے تھی۔ اداکار بننے میں ان کے علاوہ گھر کے کسی فرد کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خود کرکٹر بننا چاہتے تھے ان کی والدہ کی خواہش کچھ اور تھی جب کہ ان کے والد نثار مراد انہیں سی ایس پی آفیسر بنانا چاہتے تھے مگر ہوا وہی جو منظور خدا تھا۔ ان سمیت گھر کے تمام افراد کے نہ چاہنے کے باوجود وحید مراد اداکار بن گئے۔ فلموں کے ہیرو بن گئے اور ایسے بنے کہ آخری دم تک ہیرو ہی بنے رہے۔

سمندر

کبھی کبھی فلم ساز و ہدایت کار اپنی عام روش اور شیڈول سے ہٹ کر کچھ تجربہ کرتے ہیں جس میں کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہوتے ہیں۔ وحید مراد نے بھی اپنی ایک فلم ''سمندر'' میں اپنے شیڈول سے ہٹ کر کچھ فیصلے کیے۔ جیسے اس فلم کے لیے پرویز ملک کی جگہ رفیق رضوی کو بطور ہدایت کار لیا۔ سہیل رعنا کی بجائے دیبو بھٹہ چاریہ کو سائن کیا اور مسرور انور کی جگہ صہبا اختر کو بطور شاعر آزمایا۔ شبنم کو اس فلم میں پہلی بار مغربی پاکستان کی فلم میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا۔ یہ فلم 10 مارچ 1968ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی۔ اس نے 37 ہفتے چل کر محض سلور جوبلی حاصل کی۔ اس فلم کے گیتوں نے کامیابی حاصل کی جن میں ''تیرا میرا ساتھی ہے لہراتا سمندر'' آج بھی مقبول ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجربہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

وحید مراد روڈ

کراچی شہر کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس کی ایک سڑک وحید مراد روڈ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ سابق مارسٹین روڈ تھا جو قیام پاکستان سے قبل برٹش افسر کے نام سے منسوب ہے۔ 1989ء میں اسی مارسٹین روڈ کو وحید مراد کا نام دے دیا گیا۔ وحید مراد روڈ ریو سنیما کی طرف سے شروع ہوتا ہے اور گارڈن روڈ سے نکل کر گوڈین سنیما کی سائٹ پر آجاتا ہے اور یہاں سے ایم اے جناح روڈ سے جا ملتا ہے۔ ایم اے جناح روڈ سے آنے والے کئی راستے وحید مراد روڈ کو ایم اے جناح روڈ سے ملاتے ہیں۔ وحید مراد روڈ پر ریوالی سنیما تھا۔ اس کے برابر سے جو راستہ جاتا ہے کچھ ہی فاصلے پر سیدھے ہاتھ پر کوہ نور سنیما تھا۔ اس کے بالکل سامنے جوبلی سنیما تھا۔ وحید مراد روڈ پر، گوڈین سنیما، افشاں سنیما اور نشیمن سنیما ہوا کرتے تھے۔ ان چھ سنیماؤں میں اب صرف دو سنیما گھر باقی رہ گئے ہیں۔ وحید مراد کے نام سے سڑک متعین کرنے کا مطالبہ وحید مراد کے پرستاروں کا تھا۔ کوئی چھ سال بعد اس پر عمل درآمد ہوا۔ اس سلسلے میں الیاس رشیدی مرحوم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ پاکستان میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی اداکار کے نام پر شہر کی کوئی سڑک منسوب کی گئی۔

اداکاری میں وہ کیسے آئے یہ کہانی بھی عجب ہے۔ ایک دن نثار مراد صاحب نے درپن سے کہا۔ ”میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ہیرو لینے کا ارادہ ہے۔“

درپن نے وحید مراد کی طرف اشارہ کر کے کہا، جو اس وقت ان کے قریب ہی تھے۔ ”اب آپ کو کسی بھی ہیرو کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہیرو تو آپ کے اپنے ہی گھر میں موجود ہے۔“

درپن کی رائے سن کر نثار مراد صاحب کو فلم بنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کیونکہ درپن نے اپنی ذاتی فلم ”ساتھی“ میں وحید مراد کو کاسٹ کرلیا۔ وحید مراد کی یہ پہلی فلم جمعہ 23 اکتوبر 1959ء کو ریلیز ہوئی۔ الحامد اس فلم کے ہدایت کار، جے اے چشتی موسیقار اور درپن فلم ساز تھے۔ اس فلم کی کہانی اقبال رضوی نے تحریر کی تھی۔ مکالمے بھی انہی کے تھے جب کہ گیت طفیل ہوشیار پوری نے لکھے تھے۔ عکاسی کے فرائض نسیم حسین نے انجام دیے تھے۔ درپن، صبیحہ خانم، سنتوش کمار، نذر اور طالش نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ وحید مراد کو ایک اہم مگر ثانوی کردار میں پیش کیا گیا تھا۔

”ساتھی“ سے شروع ہونے والا وحید مراد کا یہ فلمی سفر 125 فلموں پر محیط ہے۔ ”زلزلہ“ اس ”ساتھی“ کی آخری مووی ثابت ہوئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اچھائی خود خوشبو کی طرح پھیلتی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وحید مراد کی ”ساتھی“ میں مختصر مگر بااثر اداکاری نے یہ اثر دکھایا کہ دوسرے فلم میکرز بھی اس نئے نویلے اداکار کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہدایت کار ایس ایم سیف صاحب نے اپنی فلم ”اولاد“ میں بھی اس نئے اداکار کو ایک چھوٹا سا کردار دیا۔ اس فلم میں وہ نیر سلطانہ اور درپن کے بیٹے کے رول میں نمودار ہوئے تھے۔ اس مختصر کردار میں بھی وحید مراد فلم دیکھنے والوں کو اچھے لگے۔ ان کی اداکاری پسند آئی۔

وحید مراد کی اداکاری اور عوام کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے سنتوش کمار نے اپنی ذاتی فلم ”دامن“ میں اس ابھرتے ہوئے اداکار کو زیادہ بہتر کردار میں پیش کیا۔ بطور سائیڈ ہیرو کے اس سے کام لیا۔ اس فلم میں ان کی سائیڈ ہیروئن نیلو تھیں۔ وحید مراد کو اس فلم میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا زیادہ بہتر موقع ملا۔ فلم بینوں نے اس نئے جوڑے کو نہ صرف پسند کیا بلکہ فلم میکرز کو بھی اس نئے اداکار میں پوشیدہ فنی خوبیوں کا اندازہ ہوا۔

”ارے بھئی! یہ لڑکا تو غضب کی اداکاری کرتا ہے یہ تو جلد ہی ہماری فلموں کی ضرورت بن جائے گا۔“

وہ جو کہتے ہیں جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ تو کچھ ایسی ہی بات اس نئے اداکار کی تھی۔ اس کی اداکاری پسند کرنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ فلم بنانے والے تماشائیوں کا رجحان دیکھتے ہیں۔ عوامی پسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر فلموں کی کاسٹ ترتیب دیتے ہیں۔ فلم میکرز بڑی سنجیدگی سے اس نئے اداکار کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگے۔

وحید مراد کے والد نثار مراد ایک جہاندیدہ فلم تقسیم کار تھے۔ فلم والوں سے ان کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ انہوں نے فلم سازوں کے اس ارادے کو بھانپ لیا کہ فلم میکرز ان کے ابھرتے ہوئے اداکار بیٹے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انہوں نے سوچا یہ فائدہ وہ اور ان کا بیٹا خود کیوں نہ اٹھائیں۔ انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ”ڈیدو! تم خود فلم بناؤ اور اس میں مکمل ہیرو کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرو۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم خود اپنی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“

وحید مراد اپنے باپ سے بے پناہ پیار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اپنا بہترین بہی خواہ اور رہنما بھی سمجھتے تھے۔ ”ٹھیک ہے پاپا! میں ایسی فلم بناتا ہوں۔“ اور انہوں نے ”ہیرا اور پتھر“ کے پروجیکٹ پر کام شروع کردیا۔

وحید مراد نے اس وقت کے کراچی فلم انڈسٹری کے معروف مصنف اور ہدایت کار اقبال رضوی سے ایک ہلکی پھلکی رومانوی کہانی لکھنے کو کہا۔

وہ جب کہانی لکھ کر لائے تو اس کی پسندیدگی کے بعد بولے۔ ”رضوی صاحب! آپ اس کے مکالمے بھی لکھیں گے۔“

جب وہ مکالمے لکھ چکے تو فلم ساز وحید مراد نے کہا۔ ”اس فلم کو ڈائریکٹ بھی آپ ہی کریں گے۔“

”جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

اور پھر دونوں نے مل کر کہانی کی ضرورت کے مطابق آرٹسٹوں کا انتخاب کیا اور موسیقی کے لیے سہیل رعنا اور نغمات کے لیے مسرور انور اور موج لکھنوی کو منتخب کیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو شوٹنگ شروع کردی گئی۔ اس دوران کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وحید مراد کے دیرینہ دوست پرویز ملک امریکا سے فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے واپس

وطن آ گئے۔ کئی برسوں کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے دوست ملے تو بہت خوش ہوئے اور وحید مراد نے اسی وقت ایک فیصلہ کرلیا۔ یہ فلم ''ہیرا اور پتھر'' اب پرویز ملک ہی ڈائریکٹ کرے گا۔ اقبال رضوی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ فلم بن گئی اور کامیاب ٹھہری۔

''ہیرا اور پتھر'' کی کامیابی سے جہاں وحید مراد مکمل ہیرو کے طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ وہاں پرویز ملک کو بھی بطور ہدایت کار شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

''ہیرا اور پتھر'' کے بعد وحید مراد نے پرویز ملک سے کہا۔ ''اب میری اگلی فلم تم شروع سے آخر تک اپنی پسند اور اپنے تجربے اور تعلیم و تربیت کی روشنی میں بناؤ۔ ''ہیرا اور پتھر'' میں تو صرف تمہاری ڈائریکشن تھی۔ اس فلم میں سب کچھ تمہاری مرضی کا ہو۔''

''جو حکم سرکار کا۔'' پرویز ملک نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''جیسا آپ چاہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔''

''ارمان'' ان دونوں کی دوسری فنی کاوش تھی۔ جس کے لیے پرویز ملک نے اس کے ہر شعبہ کو اپنی پسند اور معیار کے مطابق ترتیب دیا۔ جو کچھ فلم سازی کے بارے میں امریکا سے سیکھ کر آئے تھے اس کی روشنی میں اس فلم کو بنایا، سنوارا اور ایک اچھی فلم بنانے میں اپنی ساری فنی صلاحیتوں سے کام لیا۔

اللہ رب العزت اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ پرویز ملک کی محنت، لگن، جدوجہد اور فنی صلاحیتوں کا اظہار، ایک شاندار اور یادگار فلم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ''ارمان'' ہر پہلو سے ایک بہترین فلم ثابت ہوئی۔ اس دور میں ہی نہیں ہر دور میں اپنی مثال آپ ہے۔ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جس طرح اپنی پہلی نمائش کے زمانے میں تھی۔

''ارمان'' کی کہانی اس کے مکالمے، موسیقی، اس کے گیت، اداکاری اور فلم کی ہدایت کاری، معیار کے لحاظ سے اعلیٰ ترین تسلیم کی گئی۔ تماشائیوں نے اسے اپنی سپر پسندیدگی سے پلاٹینم جوبلی کا اعزاز عطا کیا۔ ناقدین اور مبصرین نے اسے کامیاب فلموں کے سر کا جھومر قرار دیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس کے معیار میں، اس کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا ہے۔

''ارمان'' کی سپر ڈپر کامیابی سے جہاں پرویز ملک فلم انڈسٹری کے صف اوّل کے ہدایت کار تسلیم کر لیے گئے۔ وہاں وحید مراد بطور ہیرو شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر چاند سورج بن کر جگمگانے لگے۔ اس وقت ٹاپ کے جو ہیروز تھے۔ ان کو اس نئے ابھرتے ہوئے ہیرو سے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی چمک دمک سے ان کی شہرت اور مقبولیت کو گہن نہ لگ جائے۔

دوسرے ہیروز کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ فن اداکاری سے جس کو بھی آگاہی حاصل تھی اس نے ارمان میں وحید مراد کی اداکاری دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اس اداکار نے اداکاری کو حدِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ گویا وحید مراد نے اداکاری کا جدید اسلوب رائج کیا۔ ان میں بے جان الفاظ میں جادو بھرنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ گیتوں کو اپنی شوخ اور چنچل اداکاری سے تماشائیوں کو فریفتہ کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری میں ہوا کا ایک تازہ جھونکا بن کر نمودار ہوئے اور فلموں کو عطر بیز کر دیا۔ پاکستان میں بننے والی رومانوی فلموں کو ایک نیا اور خوشگوار موڑ دیا۔ اس نے فلم کے گانوں سے محبت کے جذبات کا ایک طوفان اٹھا دیا۔ اس کی ان خداداد خوبیوں کی وجہ سے وہ فلم انڈسٹری کے لیے ایک گوہر نایاب قرار دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی فنی جگمگاہٹ سے دوسرے فلمی ستاروں کو ماند کر دیا۔

اس کے والد محترم نے اسے یاد دلایا۔ ''تمہیں یاد ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا، اس سے پہلے کہ دوسرے تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ تم خود اپنی پسند کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو فائدہ پہنچاؤ۔''

''جی ہاں مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا۔ میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ آپ جتنے اچھے ہیں آپ کی باتیں، آپ کے مشورے بھی اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ کے کہے پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فائدہ پہنچایا۔ میرا تو ایمان ہے کہ جو لوگ اپنے ماں باپ کا کہا مانتے ہیں ان کے کہے پر عمل کرتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ کامیاب و کامران کرتا ہے۔''

ایک محتاط جائزے کے مطابق وحید مراد کی تقریباً 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جن میں کچھ ناکام فلمیں بھی شامل ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مزید فلموں میں بھی اداکاری کی تھی مگر مختلف وجوہات کی بناء پر وہ ریلیز نہ ہوسکیں۔ جن میں بہت سی فلمیں مکمل ہوچکی تھیں اور کچھ غیر مکمل تھیں۔ یہ سب اگر مکمل ہو کر اسکرین کی زینت بنتیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں نہ صرف مزید کامیاب فلموں کا اضافہ ہوتا بلکہ ان کی

فلموں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔

جو فلمیں ریلیز نہ ہوں ان کے بارے میں معلومات جمع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن میں نے ''ڈیڈو'' کے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ مشکل مرحلہ بھی طے کیا ہے۔

آئیے! ان بدنصیب فلموں کے بارے میں آگاہی حاصل کیجیے جن کو ریلیز ہو کر وحید مراد کے کریڈٹ میں اضافے کا موقع نہ مل سکا۔

مکمل فلموں کے علاوہ کچھ فلمیں ایسی بھی ہیں جو ساٹھ ستر فیصد تک بنی ہوئی ہیں۔ ان کی مکمل ہو جانے والی فلموں میں پہلی فلم کا نام ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' ہے۔ اس فلم کے فلم ساز صبا فاضلی اور ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ موسیقی کی دھنیں ناشاد نے ترتیب دی تھیں۔ تسلیم فاضلی اس کے نغمہ نگار تھے۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، شمیم آراء، صوفیہ بانو اور حنیف شامل تھے۔ وحید مراد نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ ایک رول میں ان کی ہیروئن شمیم آراء تھیں۔ دوسرے میں صوفیہ بانو! اگر یہ فلم ریلیز ہو جاتی تو وحید مراد کی ہیروئنوں میں صوفیہ بانو کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ یہ رنگین فلم تھی۔ وحید مراد اس فلم سے بہت پُرامید تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس فلم میں، میں نے اپنی زندگی کا یادگار ڈبل رول ادا کیا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وحیدی آرٹ پروڈکشن کی جانب سے اس فلم کا ایک خصوصی پریس شو کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو میں ایک بار منعقدہ کیا گیا تھا۔ جس میں اس فلم کے ہدایت کار اقبال یوسف نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی تھی۔ دیگر شرکاء میں وحید مراد مرحوم کی اہلیہ محترمہ سلمیٰ مراد، فلم ساز بشیر دانا والا، اسد قریشی، اداکار گلاب چانڈیو، محمود سلطان، بابر سلطان، ایس ایم بروہی اور آل پاکستان وحیدی کلب کے ممبروں نے شرکت کی تھی۔ یہ فلم ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' مار دھاڑ سے بھرپور عام فلموں سے قطعی مختلف ہے۔ خوب صورت گیتوں سے مزین ایک رومانوی فلم ہے جس میں وحید مراد کے ساتھ تمام اداکاروں نے بہترین اداکاری کی ہے۔ اس فلم کو دیکھنے والوں کی اجتماعی رائے یہ ہے کہ مرحوم وحید مراد کی یادگار فلموں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس فلم کے تمام گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند گیت یہ ہیں۔

☆ وہ نظر مہرباں ہو گئی ہے۔ میرے دل کی زباں ہو گئی ہے (آواز ملکہ ترنم نور جہاں)

☆ میرا پیار بڑا شرمیلا ہے (آواز احمد رشدی)

☆ تجھے چاہوں تجھے دیکھوں (آواز احمد رشدی)

''میرے جیون ساتھی'' مرحوم وحید مراد کی دوسری مکمل فلم ہے جو آج تک ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کی پروڈیوسر نامور اداکارہ دیبا بیگم ہیں۔ دیبا نے جب یہ فلم شروع کی تھی۔ تب اس کا نام ''مجھے تم سے پیار ہے'' رکھا تھا۔ بعد ازاں اس کا نام بدل دیا گیا اور اس کا نام ''میرے جیون ساتھی'' رکھ دیا گیا۔ اس کے ہدایت کار محمد جاوید فاضل تھے۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ دیبا نے وحید مراد کے ساتھ مرکزی رومانوی کردار ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں محمد علی، عشرت چوہدری، لہری، زرقا، طالش اور طارق عزیز قابلِ ذکر ہیں۔ وحید مراد نے اس فلم میں ایک کروڑ پتی باپ کے بیٹے کا کردار بڑے احسن طریقے پر کیا تھا۔ وہ لو میرج کا قائل تھا یعنی محبت کرنے کے بعد کی شادی کا قائل تھا۔ دیبا نے ایک سیلف میڈ خاتون کا کردار بڑے اچھے طریقے سے نبھایا تھا۔ اس فلم کی کہانی علی سفیان آفاقی نے لکھی تھی جب کہ اس گھریلو اور نغماتی فلم کی موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی۔ ''میرے جیون ساتھی'' کے جو نغمات مقبول ہوئے ان میں یہ گیت بھی تھے۔

☆ چلی ایسی ہوا مستانی کہ دوپٹا بے ایمان ہو گیا (گلوکارہ مالا)

☆ ذرا ہم سے روٹھو جی۔ تم کو منانے کو جی چاہتا ہے (گلوکار احمد رشدی)

☆ جارے جارے کارے بدرا جا (گلوکارہ نور جہاں)

☆ چاند کی نگری تاروں کا انگنا (آصف جاوید، صبیحہ خانم)

اداکارہ و فلم ساز دیبا بیگم نے یہ فلم 1971ء میں بنانا شروع کی تھی۔ یہ فلم ہر لحاظ سے ایک منفرد نغماتی اور سوشل فلم ہے۔ اس فلم کو ریلیز کرنے کا ذکر دیبا بیگم نے وحید مراد کے مداحوں سے کیا تھا مگر باوجود کوشش کے یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی جس کا دکھ وحید مراد کے پرستاروں کو ہمیشہ رہے گا۔

ایورنیو پکچرز پاکستان ایک بہت بڑا فلم ساز ادارہ ہے۔ اس ادارے کی بنی ایک مکمل گھریلو رومانوی فلم ''دیا جلے ساری رات'' سالوں سے مکمل ہونے کے باوجود آج تک نمائش کے لیے پیش نہ ہو سکی۔ اتنے بڑے ادارے کی ایک مکمل فلم یوں التوا کا شکار ہو جائے بڑے دکھ کی بات ہے۔ اس ادارے کے سربراہ سجاد گل اگر چاہیں تو یہ فلم ریلیز کر سکتے

ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں اور یہ ان کی ذاتی فلم ہے۔

''دیا جلے ساری رات'' کے فلم ساز سجاد گل کے والد محترم آغا جی اے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے۔ شمیم آراء نے اس فلم میں وحید مراد کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ التوا کے شکار اس مووی کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین ہیں جب کہ اس کے تمام تر نغمات نامور شاعر قتیل شفائی کے تحریر کردہ ہیں۔

کسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے مہناز بیگم کی آواز میں گایا ہوا ایک نغمہ نشر ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو۔

اس مطلبی دنیا کو کوئی پیار سکھا دے
ہاں پیار سکھا دے

یہ خوب صورت گیت بھی وحید مراد کی ایک مکمل فلم ''نغمات کی رات'' کا ہے اس کے فلم ساز، مصنف اور ہدایت کار نامور شاعر شیون رضوی تھے۔ نثار بزمی اس فلم کے موسیقار تھے۔ اس کے گانے اس کی ریلیز سے پہلے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، بابرہ شریف، شاہد، صاعقہ اور طالش شامل تھے۔ شیون رضوی کو اپنی اس فلم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس فلم کو ریلیز کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اچانک ان کی موت واقع ہو گئی یوں یہ فلم سلور اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔

''پہلی نظر'' بھی وحید مراد کی ایک مکمل فلم تھی۔ جو بوجوہ ریلیز نہ ہو سکی۔ اس کے فلم ساز ظہور قریشی تھے۔ ہدایت کاری کے فرائض الحامد نے انجام دیے تھے۔ کہانی شور لکھنوی کی تھی جب کہ اسکرین پلے اور مکالمے اقبال رضوی نے لکھے تھے۔ تاج پکچرز کے بینر تلے بننے والی اس فلم میں وحید مراد، زیبا، آزاد، نرالا، شاہینہ، ترنم اور حنیف نے نمایاں کردار ادا کیے تھے مگر افسوس کہ یہ مکمل فلم بھی نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

وحید مراد کی مکمل فلموں میں ایک پنجابی فلم ''شہری بابو'' بھی ہے۔ ایک فلم اسی نام سے بہت پہلے پاکستانی فلموں کے ابتدائی دور میں سورن لتا کی تھی جو اس دور کی کامیاب فلم تھی۔ یہ ''شہری بابو'' جس میں وحید مراد نے ٹائیٹل رول کیا تھا رنگین فلم تھی۔ ایکشن اور رومان کا شاہکار تھی۔ اس کے فلم ساز میاں جاوید قمر اور ہدایت کار افتخار خان تھے۔ یہ وہی افتخار خان ہیں جو اس سے پہلے وحید مراد کی ذاتی پنجابی فلم ''مستانہ ماہی'' کی بھی ہدایات دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جال،

لورز کلب اور لورز

☆ پرنس وحید مراد فینز کلب۔ ہیڈ آفس کلفٹن کراچی۔ ☆ آل پاکستان سینئر وحیدی کلب۔ لانڈھی، کورنگی کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد لورز کلب، لاہور۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد کنگ آف۔ لیجنڈز، لاہور۔ ☆ شہنشاہ رومانس وحیدی کلب، کورنگی کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد گرینڈ فینز الائنس، سیالکوٹ، لاہور، کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد فین کلب، کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، سیالکوٹ۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، حیدر آباد۔ ☆ پاکستان لائف ٹائم کمبائنڈ فیڈریشن۔

ان لورز کلبوں کو قائم کرنے والے اور ان کے تحت وحید مراد کی عظمت اور بڑائی کا پرچم بلند کرنے والے محض ٹین ایجرز اور نوجوان لڑکے نہیں، بڑی عمر کے اور پختہ کار لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کلبوں کے عہدے داران اور ممبران وحید مراد کے بارے میں نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھ کر اخبارات و جرائد میں شائع کرواتے ہیں بلکہ وحید مراد کی برسی پر فلمی اخباروں سے وحید مراد پر خصوصی ایڈیشن نکلواتے ہیں۔ اس موقع پر وہ ایسے اخباروں کو اپنے کلبوں کی جانب سے بڑے بڑے اشتہارات چھپواتے ہیں اور ان خصوصی اشاعتوں کو زیادہ قیمتوں کے باوجود ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں۔ ایسے خصوصی شماروں کے لیے ان کلبوں کی جانب سے بھرپور مواد بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

بدر منیر کی عقیدت

پشتو فلموں کے لیجنڈ ہیرو بدر منیر اپنے ابتدائی دور میں کچھ عرصہ تک وحید مراد کے ذاتی ملازم رہے۔ انہوں نے (وحید مراد نے) بدر منیر کی اداکاری کی طرف دلچسپی دیکھتے ہوئے ان کے لیے پشتو فلم میں کام کرانے کی سفارش کی۔ لہٰذا انہیں (بدر منیر کو) پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' میں ہیرو کے طور پر منتخب کرلیا گیا۔ بدر منیر پشتو اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرنے لگے۔ پشتو فلموں کے سپر اسٹار بن گئے مگر وحید مراد کی عزت احترام میں کمی نہیں آنے دی۔ تمام عمر وہ وحید مراد کو ''آقا'' کہہ کر پکارتے رہے۔

سپونی، میرا ماہی، پرواہ نہیں اور راجا کی آئے گی بارات بھی ان کی کامیاب فلمیں ہیں۔ اس فلم کی کہانی تنویر کاظمی نے لکھی تھی۔ نغمات خواجہ پرویز کے تھے۔ موسیقی وجاہت عطرے نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں وحید مراد کے ساتھی فنکاروں میں نیلو، اعجاز، نیر سلطانہ، اقبال حسن، ساون اور سلطان راہی تھے۔ اداکارہ رانی وحید مراد کی ہیروئن تھیں۔ وحید مراد کو اپنی اس فلم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ''مستانہ ماہی'' کی طرح ان کی یہ پنجابی فلم بھی کامیابی کے شاندار ریکارڈ قائم کرے گی۔ افتخار خان کی بھرپور ڈائریکشن سے بھی وہ بہت پُرامید تھے مگر افسوس کہ پوری فلم ہر طرح سے مکمل ہونے کے باوجود نمائش پذیر نہ ہوسکی۔

''پیاسا سمندر'' جیسے خوب صورت نام کی فلم وحید مراد کی ایسی فلم ہے جس کی نمائش کی پیاس اب تک نہیں بجھ سکی ہے۔ اگرچہ یہ فلم مکمل ہوگئی تھی۔ یہ فلم ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز امان مرزا اور نذیر احمد تھے۔ اس کی کہانی بشیر نیاز نے لکھی تھی۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ وحید مراد، محمد علی، بابرہ شریف، نیر سلطانہ، حبیب، خالد سلیم موٹا، ساقی، ملک انوکھا نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے مگر صد افسوس کہ اتنی بڑی کاسٹ اور کریڈٹ کی فلم اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔

اب کچھ ان فلموں کا ذکر جو مختلف حالات اور واقعات کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکیں۔ ان میں ایک فلم ''انجانے راستے'' تھی۔ اس کے ہدایت کار رفیق رضوی (باپو) تھے۔ آئی ایچ جعفری فلم ساز تھے۔ ''انجانے راستے'' کی کہانی صحافی اور مصنف آغا نذیر کاوش نے تحریر کی تھی۔ دیبو بھٹہ چاریہ اس کے موسیقار اور مسرور انور نغمہ نگار تھے۔ ستر فیصد بنی ہوئی اس فلم میں وحید مراد کی ہیروئن شبنم تھیں۔ ناز بیگم، سنتوش رسل، آزاد، آغا طالش اور محمد علی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

اداکار و فلم ساز قوی خان نے وحید مراد کو بطور ہیرو لے کر دو فلمیں بنائی تھیں۔ ان میں ایک فلم ''آنکھوں کے تارے'' اور دوسری ''حنا'' تھی۔

''آنکھوں کے تارے'' کی کہانی اطہر شاہ خان نے تحریر کی تھی۔ اس کی موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، نشو، دیبا، صاعقہ، لہری، عثمان پیرزادہ، قوی خان اور طالش شامل تھے۔ یہ فلم 1976ء میں زیر تکمیل تھی۔ ساٹھ فیصد تک بننے کے بعد فنانس کی کمی کے باعث التواء کا شکار ہوگئی اور آگے نہ بڑھ سکی۔

قوی خان کی دوسری فلم ''حنا'' بھی تعطل کا شکار ہو کر مکمل نہ ہوسکی۔ ''حنا'' کے ہدایت کار اقبال اختر تھے۔ موسیقی کمال احمد کی تھی۔ کہانی بی ایچ بخاری نے تحریر کی تھی۔ اے حمید اس کے عکاس تھے۔ وحید مراد، بابرہ شریف، نوین تاجک، شاہد، نیر سلطانہ اور قوی خان اس فلم کے نمایاں فنکاروں میں شامل تھے۔ نوین تاجک وحید مراد کی ہیروئن تھیں۔ اس فلم کو بھی مکمل ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

یاد رہے کہ قوی خان نے بطور فلم ساز کوئی درجن بھر فلمیں بنائیں مگر وہ جتنے اچھے بڑے اور اعلیٰ معیار کے اداکار ہیں۔ ان کی پروڈیوس کی ہوئی فلمیں باکس آفس پر اس کے برعکس ثابت ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ فلم کا سبجیکٹ تو بہت اچھا تلاش کر کے اس پر کہانی لکھواتے تھے مگر فلم کی کامیابی کے لیے جو گلیمر یا مصالحہ ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے گریز کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی چند ایک ہی فلمیں باکس آفس کے معیار پر پوری اتریں جن میں ''چوری چوری'' اور ایک آدھ فلمیں تھیں۔ اپنی فلموں کی مسلسل ناکامی کے بعد انہوں نے فلم سازی سے توبہ کرلی۔

وحید مراد کی نامکمل فلموں میں ایک فلم ''مل گئی منزل'' بھی تھی۔ جسے رفیق رضوی (باپو) ڈائریکٹ کررہے تھے۔ آغا نذیر کاوش اس کے کہانی کار ناشاد موسیقار اور تسلیم فاضلی نغمہ نگار تھے جب کہ اس فلم کی عکاسی رفیق رضوی کے صاحبزادے سعید رضوی سرانجام دے رہے تھے۔ 80 فیصد سے زائد فلم بنائی جاچکی تھی کہ اس کے فلم ساز نے اس کا نام تبدیل کرکے ''اپنی منزل اپنی راہیں'' کردی۔ جانے اس نام کی تبدیلی کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ نہ راہیں، ہموار رہیں نہ منزل مل سکی۔ فلم اچانک روک دی گئی۔ اس نامکمل رہ جانے والی فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، شائستہ قیصر، نشو، منور سعید، شاہ نواز، عرش منیر اور ساقی شامل تھے۔ تبدیل شدہ نام ''اپنی منزل اپنی راہیں'' کے نام سے اس کے گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہوئے۔ جن میں سے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ پیار دنیا سے بے نیاز ہوا (آواز۔ نور جہاں)

☆ اپنے ہوئے پرائے (آواز۔ نور جہاں)

☆ سلام آیا بہاروں کا (آواز۔ مالا)

فلم ساز محمد امین اور ہدایت کار لئیق اختر کی فلم ''دیدار'' بھی وحید مراد کی ریلیز نہ ہونے والی فلموں میں ایک تھی۔ اس فلم کی کہانی ذکی، بی اے نے تحریر کی تھی۔ موسیقی ایم اشرف کی

تھی جب کہ دو نامور شاعروں مسرور انور اور فیاض ہاشمی نے اس کے گیت لکھے تھے۔ عکاسی مسعود الرحمان کی تھی۔ یہ فلم کافی حد تک بن چکی تھی۔ بلکہ اس کی پبلسٹی بھی زور وشور سے جاری تھی کہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر ''دیدار'' مکمل نہ کی جا سکی۔ کہتے ہیں کہ بس تھوڑا سا ہی اس کا کام باقی رہ گیا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد کی ہیروئن شمیم آراء تھیں جب کہ دیگر کاسٹ میں دیبا، لہری، نبیلہ اور جمیل بسمل شامل تھے۔

وحید مراد کی ایک نامکمل فلم ''من کی آس'' بھی تھی۔ جس کی تکمیل اور نمائش کی آس پوری نہ ہو سکی۔ اس کے فلم ساز سعید ملک اور ہدایت کار مشتاق رضوی تھے۔ کہانی اور مکالمے نذیر ابراہیم اور راقب نوشاہی نے تحریر کیے تھے۔ موسیقی رفیق علی اور کمال احمد کی تھی۔ نغمہ نگار سعید گیلانی اور تسلیم فاضلی تھے۔ ''من کی آس'' کے کئی گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول بھی ہوئے۔ اس دور میں جب فلمیں بن رہی ہوتی تھیں تو ان کی تشہیر کے لیے فلم ساز اپنی فلموں کے گانے ریڈیو پر نشر کرنے کے لیے فراہم کر دیا کرتے تھے۔ ''من کی آس'' کے ایسے ہی چند گیت۔

☆من کی آس ہوئی نہ پوری۔ پیار کا سپنا ٹوٹ گیا (آواز۔نور جہاں)

☆مہکی فضاؤں میں تو ہے صنم۔ اللہ قسم (آواز۔غلام عباس، شازیہ)

اس فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، نجمہ، غلام محی الدین، صبیحہ خانم، طالش، حنیف اور اسلم پرویز شامل تھے۔

''زیبو'' بھی وحید مراد کی ایک نامکمل فلم تھی۔ اس کے فلم ساز نصیر ملک اور ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ روحی بانو، وحید مراد کی ہیروئن تھیں۔ جب کہ اس فلم کا دوسرا رومانی پیئر بابرہ شریف اور قوی خان کا تھا۔ صبیحہ خانم، سنتوش کمار اور اسلم پرویز اس فلم کے دیگر اہم کردار ادا کرنے والوں میں تھے۔ یہ ایک سوشل فلم تھی۔ مکمل ہو جاتی تو قوی امکان تھا کہ کامیاب بھی ہوتی۔

متذکرہ بالا فلموں کے علاوہ وحید مراد کی اور بھی فلمیں ہیں جو 30 فیصد، 40 فیصد اور 45 فیصد تک بنی ہوئی ہیں جب کہ چند فلمیں ایسی بھی ہیں جن کا تھوڑا ہی کام باقی رہ گیا تھا۔ ان کی مزید نامکمل فلموں میں، میں نے کیا جرم کیا؟ اُمید، اب کیا ہوگا، بات اک رات کی (جس میں ریشماں ان کی ہیروئن تھیں) ''دلہن ایک رات کی'' (جس میں شمیم آرا ان کی ہیروئن تھیں) ہدایت کار پرویز اختر کی فلمیں برسات، تیرا نام ہے محبت، پیغام اور وحید مراد کی ذاتی فلم ''مقدر'' قابلِ ذکر ہیں۔ وحید مراد یہ فلم اداکار شاہد کے اشتراک سے بنا رہے تھے جو 40 فیصد تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ بابرہ شریف اس فلم میں وحید مراد کی ہیروئن تھیں کہتے ہیں کہ یہ فلم شاہد کی بے پروائی کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی۔

وحید مراد کی نامکمل فلموں میں گھر کی عزت، عقیدت اور وفا بھی ہیں جو تکمیل کے دوران مختلف وجوہ کی بنا پر رک گئیں اور دوبارہ شروع نہ کی جا سکیں۔

وحید مراد کے پرستاروں کی خواہش ہے کہ وحید مراد کی جو فلمیں مکمل ہیں اور کسی نہ کسی وجہ سے نمائش کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکی ہیں انہیں اسکرین کی زینت بنایا جائے اس سلسلے میں وہ درخواست گزار ہیں کہ ان فلموں کے مالکان یا ان کے وارث اس سلسلے میں اپنے وسائل بروئے کار لا کر ان کی نمائش ممکن بنائیں۔ پرستاروں کا کہنا ہے کہ ان فلموں کی کامیابی یقینی سمجھی جائے اگر وحید مراد کی بیشتر پرانی فلمیں بار بار دکھائی ہوئی فلمیں اب چلتی ہیں اور اچھا خاصا بزنس کرتی ہیں تو یہ نئی فلمیں بھی اللہ نے چاہا تو باکس آفس پر کامیاب ہوں گی۔

مکمل فلموں میں اقبال یوسف کی فلم ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' دیبا بیگم کی ''میرے جیون ساتھی'' فلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف کی ''دیا جلے ساری رات'' اور نامور ہدایت کار افتخار خان کی ڈائریکشن میں بنی رنگین پنجابی فلم ''شہری بابو'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' اور رنگین پنجابی فلم ''شہری بابو'' کے پروڈیوسروں یا ان کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ ان فلموں کی نمائش میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کر کے انہیں ریلیز کریں تاکہ وہ سرمایہ جو ان فلموں کی وجہ سے منجمد ہو گیا ہے، اسے منافع کے ساتھ حاصل کریں۔

آج حسن طارق زندہ ہوتے تو شاید وہ ریاض شاہد (عابدہ ریاض) کی فلم ''بہشت'' اور ایم صادق مرحوم کی رکی ہوئی فلم ''بہارو پھول برساؤ'' کی طرح وحید مراد کی ان فلموں کو بھی مکمل کرا کے ریلیز کرتے۔

اگر متذکرہ بالا فلمیں ریلیز ہو جائیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں کچھ اچھی اور کچھ بہت اچھی فلموں کا اضافہ ہو جاتا مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ بہرحال ان کی کم وبیش

جو 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئی ہیں ان میں بھی ان کا اداکارانہ فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ان کی کچھ فلمیں ناکام بھی ہوئیں لیکن ان کا فن ان فلموں کی ناکامیوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہ ہر فلم میں فن کا ایک ایسا گل کھلا گئے جس کی خوشبو آج تک لوگوں کی سانسوں اور ذہنوں میں اسی طرح بسی ہوئی ہے جسے کوئی فراموش کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ فن کی اصل معراج یہی ہے کہ وہ ہمیشہ قائم ودائم رہے۔

فن کو جلا بخشنے والا وحید مراد اپنی ذات کی جنگ میں بھلے ہی شکست کھا گیا ہو لیکن فن کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہیں ہوا۔ 1982ء تک ہر سال اس کی فلمیں اسی اوسط سے ریلیز ہوتی رہیں جو ان کے ابتدائی سالوں سے چلتا آرہا تھا۔ یہ محض غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ تھا کہ وحید مراد اپنے فنی کیریئر کے آخری چند برسوں میں فن کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اگر ہم ان کے آخری پانچ سالوں کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ مفاد پرستوں نے ان کے خلاف کتنی گھناؤنی سازش کی تاکہ یہ عظیم فنکار فن کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کر کے اپنی موت آپ مر جائے۔

1979ء میں وحید مراد کی 7 فلمیں ریلیز ہوئیں جب کہ محمد علی کی 11 اور ندیم کی صرف 2 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ 1980ء میں جو ہماری فلمی صنعت کا بحرانی سال تھا۔ وحید مراد نے 5 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ان کے برعکس ندیم کی 7 اور محمد علی کی صرف 2 فلمیں ریلیز ہو سکیں۔ 1981ء میں وحید مراد کی 9 فلمیں منظر عام پر آئیں۔ محمد علی کی گیارہ فلمیں جب کہ ندیم کی صرف تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ 1982ء میں وحید مراد کی سب سے کم یعنی صرف تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جب کہ محمد علی کی چھ اور ندیم کی آٹھ فلمیں اسکرین کی زینت بنیں۔

اس تخمینے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلموں کی کمی بیشی کا شکار صرف وحید مراد ہی نہیں رہے۔ ہر بڑے فنکار کو اس نازک مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اپنے آخری برسوں میں وحید مراد فلموں کے حوالے سے کسمپرسی کا شکار ہو گئے تھے۔

ان کی ذات پات کو ان کے فن سے منسوب کرنے والے نہ صرف ان کے فن کی بے قدری کر رہے ہیں بلکہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ وہ بھلا فن کے ہاتھوں کیسے شکست کھا سکتا ہے؟ کیا یہ امر وحید مراد کے فن کی عظمت کا واضح ثبوت نہیں کہ انہیں ہم سے بچھڑے 33 سال ہو گئے ہیں پھر بھی ان کے لاکھوں چاہنے والے انہیں اب تک بھلا نہیں پائے ہیں۔ ان گنت لوگوں کے دلوں میں وہ آج بھی دھڑکن بن کر دھڑکتے ہیں۔

بات وحید مراد کی پسندیدگی اور چاہے جانے کی چل نکلی ہے تو اس سلسلے میں کچھ دلچسپ اور غیر معمولی واقعات و حالات بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ باتیں اس دور کی ہیں۔ جب آتش جوان تھا۔ ہمارا خوبرو ہیرو شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر جگمگا رہا تھا۔

1971ء کی بات ہے ماسکو (روس) میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا انعقاد ہوا تو اس فلمی میلے میں پاکستان سے وحید مراد، محمد علی، زیبا وغیرہ نے شرکت کی۔ پاکستانی فلمی صنعت کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کی جہاں بڑی آؤ بھگت کی گئی وہاں ایک روسی اداکارہ آئری شیلف نے وحید مراد کو دیکھا تو اس کا حال یہ تھا کہ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ پہلی نظر میں ہی وہ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ فلمی میلے میں وحید مراد کی فلم "ارمان" دکھائی گئی تو اس سے متاثر ہو کر کئی روسی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے وحید مراد کو اپنی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی جب کہ دوسری طرف روسی اداکارہ آئری شیلف وحید مراد کے گلے پڑ گئی۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"مگر میڈم! میں آپ کو اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی میں نے گھر بھی جانا ہے۔"

مگر اس نادان خاتون پر وحید مراد کے کلام نرم و نازک کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ وحید کے ساتھ پاکستان آنے پر بضد ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے وحید مراد نے اس سے جان چھڑائی اور روسی فلم سازوں سے بھی معذرت کی کہ میرے لیے پاکستانی فلمیں ہی کافی ہیں۔ وفد کے دیگر ممبران نے جن میں کچھ سرکاری عہدے دار بھی تھے۔ انہوں نے پاکستان واپس آنے کے بعد بتایا۔ "وحید مراد صاحب یہاں اپنے ملک میں ہی خواتین کی دیوانگی کا سبب نہیں بنتے ہیں۔ بیرون ملک بھی انہیں دیکھنے والی لڑکیاں اور خواتین دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کی گرویدہ ہو جاتی ہیں۔"

لڑکیوں کی دیوانگی کا ایک واقعہ 1974ء میں بھی منظر عام پر آیا۔ پنجاب یونیورسٹی کیمپس کی پندرہ بیس خوبرو

لڑکیاں وحید مراد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کلاس روم سے غائب رہنے لگیں۔ جب پرنسپل صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے ان لڑکیوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔ یہ پرنسپل صاحب جن کا نام رؤف قریشی تھا صحافت سے بھی انہیں شوق تھا۔ انہی دنوں انہوں نے ''اخبار جہاں'' کراچی کے لیے وحید مراد سے انٹرویو کرتے ہوئے کہا۔ ''وحید صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی مقبولیت کا جادو آج کی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کررہا ہے۔''

وحید مراد کے استفسار پر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ان لڑکیوں کی حرکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس جرم میں وہ یونیورسٹی سے نکال دی گئی ہیں۔

اس پر وحید مراد نے جواب دیا۔ ''جن میری بہنوں نے ایسا کیا بہت برا کیا۔ یہ حرکت اچھی نہیں۔ کلاس روم سے غائب ہوکر انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ میں آپ کے توسط سے ایسی لڑکیوں تک اپنا یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدارا آیندہ کوئی لڑکی ایسے جرم کی مرتکب ہوکر اپنی تعلیم کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے ایسے عمل سے ان کے خاندان کی بدنامی اور ان کے مستقبل پر داغ لگ جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کی اس دیوانگی نے مجھے ایک فلمی ہیرو کے طور پر نہیں ایک برے اور نا کردہ گناہ کا مجرم بنا دیا ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے رؤف قریشی صاحب سے کہا۔ ''میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ان نادان لڑکیوں کو معاف کر کے یونیورسٹی میں انہیں پھر سے داخلہ دلوا دیں۔''

''میں آپ کی باتوں اور آپ کے اخلاق و آداب سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔'' قریشی صاحب بولے۔ ''اور اب مجھ پر یہ راز عیاں ہوا کہ آپ کی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی ہے کہ جو آپ کو دیکھ لے وہ آپ کا بن جائے۔''

نامور مصنف، ڈائریکٹر اور صحافی علی سفیان آفاقی نے ایک بار وحید مراد کی باتیں کرتے ہوئے لکھا تھا۔

1969ء کی بات ہے۔ میں ناظم آباد کراچی میں اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی فیملی بالخصوص خواتین شام کو تیار ہوکر اپنے شوہروں کے ساتھ باہر چلی جاتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ایک عزیز سے پوچھ بیٹھا۔ ''آپ لوگ اکثر شام کو باہر کیوں چلے جاتے ہیں۔ کیا کسی خاص کام کے لیے جاتے ہیں یا سیر و تفریح کے

شہنشاہِ رومانس، ڈاکو کے روپ میں

وحید مراد برصغیر کے واحد ہیرو ہیں جنہوں نے ایک ہی سال میں مسلسل تین فلموں میں ڈبل رول کیے ہیں۔ جن میں ہل اسٹیشن، ناگ منی، دولت اور دنیا شامل ہیں۔ دولت اور دنیا میں وحید نے پہلی بار ڈاکو کا رول کیا۔ قبل ازیں وہ خالصتاً رومانس کے شہزادے کے طور پر فلموں میں نظر آتے تھے۔ اس مختلف کردار میں بھی وحید نے ناظرین کو متاثر کیا۔ اس کردار میں وہ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس نظر آئے جب کہ ہماری فلموں کے ڈاکو لانبا کرتہ یا شلوار قمیص میں دکھائے جاتے تھے۔ اس فلم میں ان کا ایک رول ڈاکو کا تھا تو دوسرا مصور کا۔ ڈاکو کے کردار میں انہوں نے لازوال کردار نگاری کی اور یہ ثابت کردیا کہ وہ ہر رنگ میں اپنی اداکاری کا جوہر دکھا سکتے ہیں۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی کو صرف اور صرف وحید مراد کی پرفارمنس قرار دیا گیا کیونکہ اس فلم کے ہدایت کار خلیفہ سعید احمد کی اردو فلموں میں کوئی ویلیو نہیں تھی جب کہ اس کی دونوں ہیروئنوں عالیہ اور روزینہ دوسرے درجہ کی اداکارائیں تھیں۔

چاہت کا ایک انداز

وحید مراد کے چاہنے والوں میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وحید مراد کے انتقال کے بعد پشاور سے روبینہ خان نامی ایک خاتون ایک بڑی سی گاڑی میں اپنے چار گارڈز کے ہمراہ ہر جمعرات کو ایک طویل اور تھکا دینے والا... سفر طے کرتے ہوئے گلبرگ III وحید مراد کی قبر پر حاضری دینے آتی ہے پھولوں کی چادر چڑھاتی ہے فاتحہ پڑھتی ہے اور واپس پشاور لوٹ جاتی ہے۔

مشاہیر شعراء کا کلام اور وحید کی فلمیں

وحید مراد کی فلموں کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل رہا ہے کہ اردو ادب کے نامور شاعروں کا کلام ان میں شامل کیا گیا۔ جن میں اختر شیرانی (فلم جان آرزو)، احسان دانش (تم ہی ہو محبوب میرے)، شان الحق حقی (پھر چاند نکلے گا)، فیض احمد فیض (چاند سورج)، داغ دہلوی (جاگ اٹھا انسان، گونج اٹھی شہنائی)، آغا حشر کاشمیری (کنیز)، معین احسن جذبی (چاند سورج) قابلِ ذکر ہیں۔

لیے؟"

وہ صاحب بولے۔" آفاقی صاحب! آپ سے کیا پردہ ہم لوگ شام کو وحید مراد کی فلم "عندلیب" دیکھنے چلے جاتے ہیں۔"

"اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ واقعی وحید مراد کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔" آفاقی صاحب کا کہنا ہے۔" وحید مراد جیسا کریز پاکستان بھر میں کسی اور فلمی ہیرو کو نہ مل سکا۔"

کوئی کسی کو خوا مخواہ نہیں چاہتا۔ کوئی خاص بات ہوتی ہے جب ہی اس کے حوالے سے وہ چاہا جاتا ہے۔ وحید مراد کی پاپولیٹری کا ایک واقعہ یہ بھی ہے۔

22 فروری 1974ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تھی جس میں یاسر عرفات، شاہ فیصل، کرنل قذافی، عیدی امین، سلطان قابوس، انور سادات، شیخ مجیب الرحمٰن اور شاہ ایران جیسے اسلامی ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی تھی۔ لاہور کے اسمبلی ہال میں جب اسلامی سربراہان کو عشائیہ دیا گیا تھا تو ہماری فلم انڈسٹری کی کئی معروف شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں وحید مراد، محمد علی، ندیم، زیبا، نور جہاں، مہدی حسن، آغا جی اے گل، حسن طارق، سیف الدین سیف، سنتوش کمار، صبیحہ خانم، رانی اور شبنم قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر سیف الدین سیف، محمد علی اور وحید مراد نے تقریریں بھی کیں۔ اس موقع پر وحید مراد نے انگلش اور عربی زبان میں تقریر کی تو حاضرین ششدر رہ گئے۔ وحید مراد انگریزی کی طرح عربی بھی بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ ان کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ وحید مراد عربی زبان سے بھی اس قدر آشنا ہیں کہ روانی سے عربی میں بھی تقریر کر سکتے ہیں۔ اگلے روز بہت سے اخباروں اور جریدوں میں خبر کی صورت میں وحید مراد کی اس خاص خوبی کا ذکر کیا گیا تھا۔

وحید مراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں انگریزی اور عربی کے علاوہ بھی کئی غیر ملکی زبانیں آتی تھیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمی کے دور اور اس کے بعد بھی فرصت کے اوقات میں کئی غیر ملکی زبانیں سیکھی تھیں۔

وحید مراد کی عوامی مقبولیت کا ایک اور واقعہ بھی آپ سے شیئر کروں گا۔ مئی 1975ء کو فلم کے کچھ سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگوں نے فلموں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی عریانی اور فحاشی کے خلاف احتجاجی ریلی نکالی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہماری فلمی صنعت میں کچھ نا اہل اور نان کمرشل لوگ قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے فلموں کو عریانی اور فحاشی کے زور پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ سرکاری طور پر بھی شاید ان دنوں ان پر ہولا ہاتھ رکھا جا رہا تھا۔ اس لیے سنیما گھروں میں بھی پاکستانی فلموں سے پہلے بعد میں یا درمیان میں غیر ملکی بلیو فلموں کے ٹوٹے دکھائے جاتے تھے۔ یہ احتجاجی ریلی اسی کے خلاف نکالی گئی تھی۔ اس ریلی میں فلم انڈسٹری کے نامور فلمی لوگ شامل تھے۔ یہ سارے فلمی لوگ مختلف ٹرکوں پر سوار ہو کر لاہور کے اسمبلی ہال سے لکشمی چوک تک چکر لگا کر اور فحاشی اور عریانی کو روکنے کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس موقع پر دیکھنے والی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ دیگر ٹرکوں کے مقابلے میں اس ٹرک پر لاہوریوں کی خصوصی توجہ مرکوز تھی جس پر وحید مراد سوار تھے۔ اس پر عوام کی جانب سے گل پاشی کی جا رہی تھی اور وحید مراد زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اس موقع پر خواتین و حضرات کی جانب سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا۔

"وحید مراد! ہمیں اپنا دیدار کراؤ۔"

مجبور ہو کر وحید مراد کو ٹرک سے نکل کر اپنے چاہنے والوں کے درمیان آنا پڑا۔ ان کے پرستاروں نے انہیں پھولوں سے لاد دیا۔ وحید مراد نے ان سے کہا۔" اگر آپ لوگ حقیقی معنوں میں مجھ سے پیار کرتے ہیں تو میرے سامنے وعدہ کیجیے کہ سنیما گھر میں گندی، بے ہودہ اور بلیو فلمیں نہیں دیکھیں گے۔"

لاہوریوں نے ان سے وعدہ کیا۔" وحید مراد! ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ نہ صرف ہم سنیما گھروں میں ایسی فلمیں نہیں دیکھیں گے بلکہ عریانی اور فحاشی کا پرچار کرنے والے سنیما گھروں کو بھی تہس نہس کر دیں گے۔"

وحید مراد نے کہا۔" دیکھو دوستو! پہلے انہیں شرافت سے سمجھانا کہ یہ گندہ کھیل تماشا بند کرو۔ اس پر وہ رضامند ہو جائیں تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچانا اگر آپ لوگوں کی بات نہ مانیں اور ضد کریں اور اپنی حرکت سے باز نہ آئیں تب ان کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا۔"

وحید مراد کے پرستاروں نے ایسا ہی کیا اور ان کے ڈرانے دھمکانے پر سنیما گھروں میں بلیو فلموں کا تماشا دکھانا بند کر دیا گیا۔

وحید مراد کے چاہنے والوں میں نوجوان ہی پیش پیش نہیں تھے۔ بڑی عمر کے اور بزرگ حضرات بھی انہیں عزت

احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

معروف فلم پروڈیوسر چوہدری محمد سلیم کے فرزند محمد حسین چوہدری بتاتے ہیں کہ میرے والد 1960ء سے فلم پروڈکشن سے وابستہ تھے۔ ان کی مشہور فلموں میں من موجی، آج اور ابھی، سانول، ماجھو، لکھاں وغیرہ شامل ہیں والد مرحوم کے دفتر (ایورنیو اسٹوڈیو) میں فلمی لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے فلمی لوگ تھے فلمی لوگوں ہی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ والد صاحب وحید مراد سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دفتر میں اگر کسی سے یہ غلطی ہو جاتی کہ غلطی سے بھی وحید مراد صاحب کی شخصیت یا فن پر کوئی تنقید کرتا تو اسے مارنے کے لیے اپنا جوتا اٹھا لیا کرتے تھے اور کہتے۔ ”پہلے خود کو اس قابل تو بنا کہ تو کس عظیم آدمی کا نام لے رہا ہے۔“

والد صاحب ہم سب سے کہتے۔ ”وہ درویش صفت انسان ہے۔ میں نے رات کے پچھلے پہر میں بارگاہِ الٰہی میں اسے تہجد کی نماز پڑھتے اور گڑگڑا کر روتے ہوئے عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ تو کوئی عجیب ہی دنیا کا بندہ ہے۔“

والد صاحب سے اگر کوئی یہ کہتا۔ ”آپ اگر وحید مراد کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں تو انہیں اپنی فلموں میں ہیرو کیوں نہیں لیتے؟“

والد صاحب جواب دیتے۔ ”وہ جس کلاس کا آرٹسٹ ہے اس لیول کا ہمارے ہاں کوئی ڈائریکٹر ہی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں بھی اوروں کی طرح اسے ضائع کروں۔ کم از کم جو میرے دل میں ان کے لیے احترام اور ان کی شخصیت کا خاکہ ہے وہ تو قائم رہے۔“

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ فلمی فنکاروں کے پرستار عام لوگ اور ناپختہ ذہن کے افراد ہوتے ہیں۔ سنجیدہ لوگ پرستاری کے چکر میں نہیں پڑتے مگر مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ معروف ڈراما نگار سیما غزل وحید مراد کی پرستاروں میں تھیں۔ اس بارے میں ان کی ہی زبانی ان کی کہانی سنیے۔

”جب میں ریڈیو سے منسلک تھی تو میری یہ خواہش تھی کہ میں اپنے فیورٹ ہیرو وحید مراد کو بھی دیکھ سکوں۔ ان سے بات کروں۔ ان سے آٹوگراف لوں۔ آخر کار ایک دن میری یہ حسرت پوری ہو گئی۔ جب وہ ریڈیو پاکستان کی دعوت پر ریڈیو کے مہمان بنے۔ ان کا انٹرویو ریکارڈ ہونا تھا لیکن ریڈیو اسٹیشن کے باہر عوام کا اس قدر جم غفیر تھا کہ خدا کی پناہ۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہی وہ اندر آسکے اور ان سے میری ملاقات آخر ہو ہی گئی اور یوں میں نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو پہلی بار دیکھا۔ ان سے ہمکلام ہوئی اور آج ایک طویل عرصے کے بعد بھی ان لمحوں کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔“

کیسی عجیب بات ہے کہ وحید مراد کو اگر ایک طرف لاکھوں لوگ پیار محبت سے یاد کرتے ہیں تو دوسری طرف آج بھی ایک طبقہ ایک مخصوص طبقہ ان کی موت کے بعد بھی ان پر تنقید کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ان کی زندگی میں ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ان پر تنقید کر کے اپنا قد بڑا کرتے تھے اور ان کی موت کے بعد آج بھی ایسے افراد موجود ہیں جو ان کی ذات اور ان کے فن میں کیڑے نکال کر ان کی عظمت کو کمتر کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جسے اللہ رب العزت نے عزت دی ہو اسے کون ماند کر سکتا ہے۔ وہ ایک بے ضرر اور اخلاص و محبت کی مٹی سے گوندھے ہوئے پیکر تھے۔ اس لیے اپنی زندگی میں بھی کبھی ایسے لوگوں کو کچھ نہیں کہا۔ کبھی منفی جذبات کے شکار نہیں ہوئے اور اب جب وہ اس دنیا میں نہیں، ان کے چاہنے والے لوگ بھی ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔ قدرت کی طرف سے انہیں یہ بتا اور دکھا دیا جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً ایک اچھا اور نیک انسان تھا اس لیے چوتھائی صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد زندہ ہے بے شمار لوگوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر اب بھی دھڑکتا ہے۔

دنیائے فلم کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو ایسی کوئی دوسری مثال نہیں مل پائے گی کہ کسی اداکار کی برسی اس کے مداح اس قدر شان و شوکت اور عقیدت و احترام سے مناتے ہوں۔

گزرتے وقت کے ساتھ حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ پہلی تاریخ سے چودہ تاریخ تک چاند چڑھتا ہے۔ پھر پندرہ تاریخ سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بھی ایسا اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ وحید مراد کی شہرت اور مقبولیت کا سورج نصف النہار میں چمکتا تھا، آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتا چلا گیا۔ مصنف، ہدایت کار اور صحافی شوکت ہاشمی اس دور کی روداد کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

”وحید مراد کی اوپر تلے اتنی فلمیں فلاپ ہو گئیں کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا۔ مالی پریشانی تو نہیں تھی لیکن

کاروباری اعتبار سے وہ ہیرو سے زیرو ہو گیا تھا۔ ہفتوں مہینوں اس کی کوئی شوٹنگ نہیں ہوتی تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔"

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وحید مراد بیمار ہے اور ڈیوس روڈ پر ایک کلینک میں داخل ہے۔ میں اس سے ملنے گیا وہ بستر پر لیٹا ہوا کوئی انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ میں نے میز پر پھل رکھے تو کہنے لگا۔ "مجھے تو کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں۔ آپ ناحق لے آئے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بچوں کے کام آجائیں گے۔"

وحید مراد بچوں کے ذکر پر کچھ بولا نہیں، چپ رہا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ تو کہنے لگا۔ "ابھی تو ٹیسٹ ہو رہے ہیں شاید آپریشن ہوگا۔"

میں نے اسے تسلی دی مگر وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ شاید اس کے گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ میاں بیوی کے درمیان جس قسم کی مفاہمت سے گھر بستے ہیں اور زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ وہ شاید سلمیٰ اور وحید کے درمیان نہیں تھے۔ اس نے کچھ باتیں کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شدید قسم کے ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس ڈپریشن کی وجوہات بہت سی تھیں۔ ایک سال قبل اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے انتقال کی وجہ سے کراچی کا ڈسٹری بیوشن آفس بالکل بند ہو گیا تھا اس کی فلمی ساکھ اور ویلیو بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہر وقت گھر میں رہنے سے اس کی زندگی اجیرن بن گئی تھی اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

ایک ماہ بعد وحید صحت یاب ہو کر کلینک سے چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن دو ماہ بعد ایک روز وحید سے ایورنیو اسٹوڈیو کے باہر ملاقات ہوئی تو میرے قدموں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔ وہ بہت کمزور اور بہت دبلا ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی اور شخص ہے جو وحید مراد سے تھوڑی مشابہت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم تو بالکل بدل گئے ہو وحید! تمہاری صحت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا۔ "اب تو میں بہت بہتر ہوں شوکت صاحب۔ پہلے آپ مجھے دیکھتے تو پہچان نہ پاتے۔"

"وحید! تمہیں مکمل طور پر صحت یاب ہونے اور اپنا کھویا ہوا رنگ روپ اور وزن حاصل کرنے سے پہلے تمہیں اسٹوڈیو نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں نے اس سے کہا۔ "اس سے تمہاری ویلیو پر اثر پڑے گا۔"

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اس کے بعد بولا۔ "اب بھی ہمیں کون لے رہا ہے ہاشمی صاحب۔ اب تو ہم عبرت کا نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ سوچتا ہوں اب اپنی ہی فلم شروع کر دوں۔"

اس رات گھر آکر میں بہت دیر تک وحید کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے فلمی کیریئر کا آغاز اور انجام دونوں میرے سامنے تھے۔ وقت کا نشتر بھی کتنا بے رحم ہوتا ہے۔ دلوں پر کیسے کیسے گھاؤ ڈالتا ہے جو کسی مرہم سے مندمل نہیں ہوتے۔

وحید مراد کی خواہش کے مطابق ان کی آخری ذاتی فلم "ہیرو" بنی مگر اس کی کامیابی یا ناکامی انہیں خود دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ 11 جنوری 1985ء میں نمائش پذیر ہوئی جب کہ وہ 1983ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے۔

ان کی موت کے بعد ریلیز ہونے والی ان کی آخری فلم "زلزلہ" تھی جو 13 مارچ 1987ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ یعنی ان کی موت کے 5 سال بعد۔

وحید مراد کی زندگی میں زہر گھولنے والے گھر کے باہر کے لوگ ہی نہیں تھے گھر میں بھی موجود تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وحید مراد کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ محمد علی اور ندیم کے مقابلے میں وحید مراد کی گھریلو زندگی پُرسکون اور خوشگوار نہیں تھی۔ ایک عالم جس شخص سے پیار کرتا تھا اس کی بیوی، اس کی شریکِ حیات اس سے خوش نہیں تھی۔

اب جب وحید مراد کے چاہنے والے انہیں وحید مراد کی شریکِ حیات ہونے کے حوالے سے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ انہیں ہر محفل اور ہر تقریب میں صدرِ محفل بناتے ہیں تو یقیناً سلمیٰ بیگم کو احساس ہوتا ہوگا کہ وہ ایک عظیم شخص تھا۔ اب وہ اس کی یاد میں چھپ چھپ کر روتی ہوں گی۔ تڑپتی بھی ہوں گی اور انہیں اس کی فلم "دوراہا" کا گیت یاد آتا ہوگا تو ان کی حالت دیدنی ہوتی ہوگی۔ وحید مراد نے خود پر فلمایا ہوا یہ گیت کیا میرے ہی لیے گایا تھا وہ سوچتی ہوں گی اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں گی۔

مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو
مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے

نہ جانے مجھے کیوں یقین ہو چلا ہے
مرے پیار کو تم مٹا نہ سکو گے
مری یاد ہو گی جدھر جاؤ گے تم
کبھی نغمہ بن کر کبھی بن کے آنسو
تڑپتا مجھے ہرطرف پاؤ گے تم
شمع جو جلائی ہے میری وفا نے
بجھانا بھی چاہو بجھا نہ سکو گے
کبھی نام باتوں میں آیا جو میرا
تو بے چین ہو ہو کے دل تھام لو گے
کسی نے جو پوچھا سبب آنسوؤں کا
بتانا بھی چاہو بتا نہ سکو گے

انسان پر جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب اس کی فلمیں یکے بعد دیگرے ناکام ہونے لگیں تو فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس سے کترانا شروع کر دیا۔ وہ سنگی ساتھی جن کو لے کر اس نے ایک ٹیم بنائی تھی، انہوں نے بھی اس موقع پر کسی صورت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بھلے وہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی ڈیمانڈ پر کام کرتے رہے مگر اس برے وقت میں اس کے پاس آ کر یہ نہیں کہا کہ وحید تم اپنی فلم بناؤ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ اس کا پاپا جو اس کا سب سے بڑا اور مخلص رہنما اور دوست تھا، اب وہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ ہوتے تو شاید وہی اسے سنبھال لیتے۔ اس بھری دنیا میں اب اگر کوئی اس کے ساتھ تھا تو اس کی والدہ اور اس کا ننھا بیٹا عادل مراد تھا۔

سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام ہے کہ ایسے برے حالات میں کس کا جی جینے کو چاہتا ہے؟ ایسے میں ان کی کار کا حادثہ۔ ان کا چہرہ زخموں سے بدنما ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص ایسا اداکار ایسا ہیرو جس کی شکل وصورت کے ہزاروں نہیں لاکھوں فریفتہ ہوں، اس کے دل پر کیا بیتی ہو گی؟ وہ اپنے چند ہی خواہوں کے مشورے پر اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کراچی چلے آئے۔ کراچی میں اب ان کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی منہ بولی بہن ممتاز مسز کرنل ایوب اپنے گھر لے گئیں۔ جہاں وہ چند دنوں کے بعد مردہ حالت میں پائے گئے۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کی وفات حسرت آیات کی روداد ہفت روزہ نگار کے مالک و مدیر الیاس رشیدی نے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ میں ان کی اس تحریر کے کچھ اقتباسات پیش کر کے اس دلخراش وقوع سے آپ کو باخبر کرنے کی کوشش کروں گا۔

”میں نگار کی آخری کاپی کی تکمیل میں مصروف تھا کہ یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جب فون کی گھنٹی کئی بار بج چکی تو میں نے نہایت غصے سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے سنگیتا کی آواز آئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”الیاس صاحب! میں لاہور سے بول رہی ہوں۔“

”بولو کیا بات ہے؟“

”میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ لاہور میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے کہ وحید مراد کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ آپ اس خبر کے بارے میں صحیح صحیح بتائیں کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کرے کہ یہ افواہ ہو۔“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ سراسر افواہ ہے۔ وحید مراد کے کسی دشمن نے اڑائی ہوگی اگر یہ سچی خبر ہوتی تو مجھ تک ضرور پہنچتی۔“

میری بات سن کر سنگیتا نے خدا کا شکر ادا کیا اور فون

نادر معلومات

وحید مراد کے قومی شناختی کارڈ کا نمبر 270-39-158328 اور پتا مکان نمبر G-32 گلبرگ III لاہور ہے۔ شناختی علامت پشت پر کاٹے کا نشان درج ہے۔ میٹرک سائنس، انتخابی مضامین طبیعات و کیمیا، لازمی مضامین، انگریزی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور عربی کے ساتھ اپریل 1954ء میں درجہ دوم میں پاس کیا۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی کی 18 مئی 1954ء کو جاری کردہ سند پر وحید مراد کی تاریخ پیدائش 2 اکتوبر 1938ء درج ہے۔ انہوں نے میٹرک کے سالانہ امتحان میں طبیعات اور کیمیا کے مضامین میں اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔

ایک خامی

وحید مراد کی جہاں بہت سارے روشن اور باعثِ فخر پہلو ہیں وہیں ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ وہ اپنے سارے کیریئر میں اولڈ کیریکٹر کرنے سے گریزاں رہے۔ یہی وہ خامی تھی جس نے انہیں بہت سا میچور اور ناقابلِ فراموش کام کرنے سے باز رکھا۔

بند کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی یاسین گوریجہ صاحب کا لاہور سے فون آ گیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے وہی سوال کیا جو سنگیتا نے پوچھا تھا۔ میں نے یاسین گوریجہ کو بھی وہی جواب دیا جو سنگیتا کو دیا تھا۔ گوریجہ نے میری بات پر یقین کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں نے نگار کے اسٹاف صلاح الدین پراچہ سے کہا۔ ''لاہور سے دو فون سنگیتا اور یاسین گوریجہ کے آئے ہیں کہ کیا وحید مراد کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ ایک تردیدی نیوز بنا دیں کہ یہ محض افواہ ہے۔''

پراچہ صاحب نے فوراً ہی نہ صرف تردیدی خبر لکھ دی بلکہ اس کی کتابت بھی کرا دی۔ اس دوران گوریجہ صاحب کا دوبارہ فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''الیاس بھائی! کراچی میں جہاں وحید مراد مقیم تھے وہاں سے وحید کے چچا علیم مراد جو لاہور میں فلم تقسیم کار ہیں کو فون پر وحید مراد کی حرکت قلب بند ہونے کی خبر کنفرم ہو گئی ہے۔ آپ ہیں کہ اتنی اہم خبر کراچی میں رہتے ہوئے بھی اسے افواہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔''

یاسین گوریجہ کی زبان سے یہ خبر سن کر جو اس قدر وثوق سے کہہ رہے تھے مجھے بھی احساس ہوا کہ وحید مراد کی موت کی خبر درست ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے پراچہ صاحب کے ساتھ اپنے صاحبزادے اسلم الیاس کو وحید مراد کے ذاتی فلیٹ جہاں وہ اکثر کراچی میں اقامت پذیر ہوا کرتے تھے بھیجا۔ فلیٹ پر فون بھی کیا لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ تب مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ کسی کا ریسیور نہ اٹھانا چہ معنی دارد؟ چنانچہ میں نے نگار کی آخری کاپی چھپنے کے لیے پریس نہیں بھیجی۔

کچھ دیر کے بعد پراچہ اور اسلم الیاس بھی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وحید مراد کے فلیٹ کے چوکیدار نے بتایا ہے کہ وحید صاحب دو روز پہلے فلیٹ چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر چلے گئے تھے چوکیدار سے جب ان کی بہن کا پتا معلوم کیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

اسی دوران ایور ریڈی پکچرز کراچی کے جنرل منیجر منظور صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ ''وحید مراد کی خبر آپ نے سن لی ہو گی؟''

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا اس کی موت کی خبر درست ہے؟''

''سو فیصد درست ہے۔'' اور پھر انہوں نے جلدی میں فون بند کر دیا۔

اب میں نے اس خبر کی تصدیق کے لیے مختلف تقسیم کاروں کو فون کرنا شروع کر دیا لیکن جسے فون کیا اس کا فون انگیج ملا جس کے بعد میرا شبہ یقین میں بدلتا چلا گیا کہ شاید تقسیم کار اس سلسلے میں آپس میں بات کر رہے ہیں۔ بعد ازاں میں نے منظور صاحب کو دوبارہ فون کیا تو انہوں نے کہا۔

''ستیش صاحب کو اس خبر کی مکمل طور پر تصدیق ہو گئی ہے۔''

اب اس خبر کی صداقت پر یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے نگار کے صفحہ اوّل کی ساری خبریں نکال کر ان کی جگہ وحید مراد کی موت کی ہیڈ لائن لگائی اور وحید مراد کی پرانی فلموں کی تصویریں لگا دیں۔ اس شمارے میں وحید مراد کی موت کی پوری تفصیلات درج نہ ہو سکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی نگار ایوارڈ کی تقریب جو 29 نومبر کو کراچی میں منعقد ہونے والی تھی اور جس کی خبر ہیڈ لائن کے طور پر شائع کی جا رہی تھی، اس تقریب کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد مجھے یہ جستجو ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی موت کی وجہ معلوم کی جائے۔ جس کے لیے سب سے پہلے اس کی قیام گاہ کا پتا چلانا تھا۔ لہٰذا میں نے اور روزنامہ جنگ کراچی کے فلمی رپورٹر سلیم باسط نے وحید مراد کے ایک خاص دوست قادر موسانی، جن کی جیولری کی دکان ''پیرا اپنا'' طارق روڈ پر ہے ان کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ ان کی دکان سے وحید مراد کی منہ بولی بہن مسز ممتاز کرنل ایوب کا پتا اور ان کا فون نمبر حاصل کیا۔ پھر کرنل صاحب کی کوٹھی پر بار بار فون کیا لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ کرنل صاحب کی کوٹھی جانا چاہیے۔ چنانچہ سلیم باسط کی کار میں ہم کرنل ایوب کی کوٹھی کی تلاش میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف چل پڑے۔ ہمیں کوٹھی کا جو نمبر بتایا گیا تھا وہ غلط تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد بھی ہمیں وہ کوٹھی نہ ملی۔ کوٹھی کے ٹیلی فون نمبر پر بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ لہٰذا ہم مایوس ہو کر دفتر واپس آ گئے۔

میں نے سلیم باسط سے کہا۔ ''مرحوم کے چچا اور اس کی والدہ اگر لاہور میں مقیم ہیں تو اس کی میت یقیناً لاہور بھیجی

جائے گی یا پھر اس کے رشتے دار کراچی آ کر اس کی تدفین کریں گے۔ لہٰذا لاہور سے رابطہ کر کے اصل صورتِ حال کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔

سلیم باسط نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میں نے لاہور میں روبن گوش کو فون کر کے اس بارے میں پوچھا۔ روبن نے کہا۔ ''میں ابھی ابھی وحید مراد کی کوٹھی سے واپس آیا ہوں۔ مجھے وہاں پتا چلا کہ رات 8 بجے کی فلائٹ سے وحید کی میت روانہ کی جائے گی اور ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جائے گی۔''

اس اطلاع کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ کہیں اور جا کر وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ایئرپورٹ جانا چاہیے۔ لہٰذا ہم دونوں صلاح الدین پراچہ، رضوان حیدر برنی، ذیشان صدیقی اور اسلم الیاس کو ساتھ لے کر ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے کے بعد سی این پی ایس کے سربراہ سعید الظفر اور کچھ دیر بعد ایڈویوز ایڈورٹائزنگ کے زاہد شیراز بھی ایئرپورٹ پہنچ گئے۔

سب سے پہلے ہم لوگ پی آئی اے کے کارگو انچارج سے ملے۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ''لاہور جانے کے لیے وحید مراد کا ایک تابوت ضرور بک کرایا گیا ہے مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون وحید مراد ہے۔''

''ارے صاحب! یہ پاکستانی فلموں کا چاکلیٹی ہیرو وحید مراد ہے۔''

''اوہ!'' اس نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا اور کہا، ہمیں تو بس یہ بتایا گیا کہ تابوت میں وحید مراد کی میت ہے۔''

اس کے بعد ہم لوگ بڑی شدت اور بے چینی سے میت کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ سوا سات بجے ہمیں ایک سوزوکی آتی ہوئی نظر آئی۔ ہم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی مگر جب وہ ہمارے سامنے سے گزرتی ہوئی کارگو کی طرف جانے لگی تو اچانک میری نظر سوزوکی میں رکھے ہوئے تابوت پر پڑی۔ تابوت کا ایک حصہ سوزوکی سے نکلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم لوگ سمجھ گئے یہ تابوت وحید مراد ہی کا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ دوڑتے ہوئے سوزوکی کے قریب پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ اس سوزوکی میں اگلی نشست پر صرف ایک ڈرائیور بیٹھا ہے۔ آگے گئے تو ایک اور آدمی بھی نظر آیا پتا نہیں وہ ڈرائیور کا ہیلپر تھا یا تابوت کو کھول کر دکھانے والا

اور پھر بند کرنے والا تھا۔
وحید مراد کی لاش کو اس طرح بے یار و مددگار دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ آہ! پاکستان کا ایسا نامور فنکار اور صاحب ثروت شخص اور اس کسمپرسی کی حالت میں اس کی میت لاہور بھیجی جا رہی ہے جیسے اس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ اس وقت سب ہی لوگ دل گرفتہ تھے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرائیور سے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟''
''صاحب! ہم کو ایک صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ تم ایئرپورٹ پہنچو، ہم تمہارے پیچھے اپنی کار میں آرہے ہیں۔''
یہ سوچ کر غم والم سے میرے آنسو چھلک پڑے کہ کراچی کا وہ شہزادہ جو کل تک قیمتی کاروں میں کراچی کی سڑکوں پر گھومتا تھا۔ آج اس کی میت ایک کرائے کی سوزوکی پر رکھ کر لائی گئی ہے۔ اس سوزوکی میں نہ وحید مراد کا کوئی دوست تھا، نہ کوئی اور۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی منہ بولی بہن خود بھائی کے تابوت کے ساتھ ہوتی۔
ذرا دیر بعد تابوت کو سوزوکی سے نکال کر سامان تولنے والی مشین پر رکھ دیا گیا۔ وزن کرنے کے بعد تابوت کو کھول کر پی آئی اے کارگو کے عملے کو دکھایا گیا کہ اندر واقعی لاش ہے یا کوئی اور چیز۔ اس کے بعد ڈرائیور کے ساتھ آنے والے نے تابوت میں کیلیں ٹھونک کر تابوت بند کر دیا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا۔ ''وحید مراد کی میت کو غسل بھی دیا گیا۔ اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی گئی یا نہیں؟''
دونوں بیک زبان بولے۔ ''ہم نے تو وہاں نہ کسی غسل دینے والے کو دیکھا نہ ہی کسی نے جنازے کی نماز پڑھوائی۔''
میں نے وہاں موجود تمام ساتھیوں سے کہا۔ ''اگر اس غریب کو کراچی میں کسی نے غسل نہیں کرایا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تو دوستو! ہم ہی کم از کم اس کے لیے فاتحہ خوانی کر دیں۔''
چنانچہ وزن کے کانٹے پر رکھے ہوئے تابو کے قریب پہنچ کر ہم سب نے فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد پی آئی اے کا عملہ تابوت کو جہاز کی طرف لے گیا۔
چند منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وحید مراد کی منہ بولی بہن ممتاز کے شوہر ریٹائرڈ کرنل ایوب اور وحید کے دوست قادر موسانی پی آئی اے کارگو آفس تشریف لے آئے اور پوچھنے لگے۔ ''تابوت کو جہاز پر سوار کر دیا گیا یا نہیں؟''
''ابھی ابھی جہاز پر بھیجا گیا ہے۔''
کرنل ایوب سے تو میں واقف نہیں تھا البتہ قادر موسانی سے واقف تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ''قادر صاحب! اصل بات تو بتاؤ کہ وحید مراد کی موت اچانک کیسے واقع ہوگئی؟''
قادر موسانی بولے۔ ''میں اپنے کام کی وجہ سے دو ایک روز سے وحید سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ تین چار روز قبل وحید اپنے بیٹے کی سالگرہ کے لیے کافی سامان خرید کر میری دکان پر رکھ گیا تھا۔ میں نے اس سے ازراہ مذاق کہا۔ ''تم پہلے تو کبھی اتنا سامان نہیں خریدا کرتے تھے۔ اس بار بہت مال خرچ کر رہے ہو۔''
''پتا نہیں آئندہ سال تک زندہ بھی رہتا ہوں یا نہیں، اس لیے اس سال دل بھر کر تحفے تحائف لایا ہوں۔ خوب دھوم دھام سے بچے کی سالگرہ مناؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔
قادر موسانی نے بتایا۔ ''جس روز وحید مراد کا ہارٹ فیل ہوا، صبح ساڑھے 10 بجے کے قریب وحید مراد کی منہ بولی بہن ممتاز میرے پاس آئیں۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''وحید کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ آپ جلدی چلیں۔''
میں ممتاز کے ہمراہ ان کی.... ڈیفنس سوسائٹی پہنچا۔ جب میں اوپر گیا، جہاں وحید کا بیڈروم تھا تو میں نے دیکھا۔ وہ بجلی کے سوئچ بورڈ کے پاس دیوار کے سہارے گرا ہوا ہے۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بالکل زرد تھا۔ نبض دیکھی وہ بالکل بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا۔ ''شاید وحید مراد کا انتقال ہو چکا ہے۔''
ممتاز نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد موت کی تصدیق کر دی۔
میں نے قادر موسانی کی زبانی وحید مراد کی موت کی کہانی سننے کے بعد کہا۔ ''تم تمام ڈسٹری بیوٹرز کو جانتے ہو۔ میرے دفتر کا بھی تمہیں علم ہے۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور تم نے اس کی کسی کو اطلاع نہیں دی۔ تم کسی کو فون ہی کر دیتے۔''
قادر موسانی نے جواب دیا۔ ''اس کوٹھی کا فون ہی خراب ہے۔ دوسرے ہم سب پریشان تھے۔''
''اس کوٹھی کا فون خراب تھا تو ڈیفنس کی کسی بھی کوٹھی سے فون کر دیتے۔ وہاں تو ہر گھر میں فون ہے اور صحیح پتا لکھوا دیتے۔ کم از کم کچھ لوگوں کو تو علم ہو جاتا اور وہ وہاں اس کا

آخری دیدار کرلیتے۔ اس کی میت کو کاندھا بھی دے دیتے۔ آخرتم لوگوں نے وحید کے چچا کو لاہور بھی تو فون پر اطلاع دی تھی۔ ہمیں بھی وحید کی موت کی خبر لاہور ہی سے ملی۔'' میں نے کہا۔'' کراچی سے جس طرح وحید کی میت کسمپرسی کے عالم میں لاہور بھیجی جا رہی ہے اسے تو میں پُراسرار طور پر ہی کہوں گا اگر ہم چند لوگ ایئرپورٹ نہ پہنچتے تو ہمیں مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی توفیق بھی نصیب نہ ہوتی۔ آپ لوگوں نے تو حد کردی۔ وحید کی میت کو بے یارومددگار ہی لاہور بھجوار ہے ہیں۔''

''نہیں یہ بات نہیں۔'' قادر موسانی بولے۔'' میت کے ہمراہ وحید کی ساس ممتاز اور وحید مراد کا بچہ بھی اسی فلائٹ سے لاہور جارہے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ جاتا لیکن وحید کی بیگم سلمٰی اور ان کی بیٹی عالیہ امریکا سے کل کراچی پہنچنے والی ہیں میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر لاہور جاؤں گا۔''

میں نے وحید مراد کی موت کو اس لیے پُراسرار کہا ہے کہ قادر موسانی اور ممتاز کے بیانات میں تضاد نظر آتے ہیں۔ قادر موسانی نے کہا۔'' جب میں کمرے میں گیا تو وحید بجلی کے سوئچ بورڈ کے نیچے دیوار کے سہارے گرا ہوا تھا اور وہ فوت ہو چکا تھا۔'' جب کہ وحید کی منہ بولی بہن نے لاہور پہنچ کر اخبارات کو دو متضاد بیان دیئے ایک بیان میں وہ کہتی ہیں۔'' جب میرا نوکر وحید بھائی کو جگانے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا وحید مراد اپنے بستر سے نیچے گرے پڑے ہیں اور فوت ہو چکے ہیں۔''

جب کہ ایک اور بیان میں موصوفہ نے کہا۔'' جب ہمارا نوکر کمرے کے قریب گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ کوئی آواز آئی۔ چنانچہ اس نے آکر مجھے یہ بات بتائی۔ پھر ہم کمرے کا دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وحید بھائی اپنے بستر سے نیچے پڑے ہیں اور وہ فوت ہو چکے تھے۔''

ایسے متضاد قسم کے بیانات پڑھ کر لوگوں کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونا بڑا فطری ہے۔ پھر جس خاموشی کے ساتھ وحید کی میت لاہور بھیجی گئی اس سے ان شبہات کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

الیاس رشیدی صاحب کی تحریر کے اقتباسات سے پاکستانی فلموں کے ایک سپر اسٹار کی ایسی کسمپرسی کی موت اور

مونگ پھلی

مونگ پھلی ایک لذیز میوہ ہے۔ یہ موسم سرما میں کھائی جاتی ہے۔ یہ سستا میوہ ہے۔ غریب آدمی بھی آسانی سے خرید سکتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں لحاف میں بیٹھ کر اس کا کھانا بہت لطف دیتا ہے۔ مونگ پھلی آپ جتنی بھی کھالیں، اس کی چکنائی سے کولیسٹرول نہیں بڑھے گا۔ اسے خالی پیٹ نہ کھائیں کیونکہ یہ بھوک کو ختم کردیتی ہے اس لیے ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

جرمنی کی بربادی

گلیڈیو آپریشن 9/11 سے پہلے یورپ اور جنوبی امریکا تک انسدادِ کمیونسٹ آپریشن کے نام پر پھیلا دیا گیا۔ بیلجیئم، ناروے، جرمنی، یونان، پرتگال، اسپین اور دوسری مغربی یورپی جمہوریتوں نے ان برسوں میں گلیڈیو کی دہشت گردی برداشت کی۔ 1970ء کے نصف آخر میں جب میں اسکاٹ لینڈ میں پی ایچ ڈی کررہا تھا اس وقت بدر منہاف گروہ اچانک خبروں پر چھا گیا۔ اس گروہ کو عام طور پر سرخ فوج یا آر اے ایف کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ 1977ء میں ہانز مرٹن اسکلیر کا اغوا تھا جو مغربی جرمنی کے سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ تھا۔ اس کا اغواء پانچ ستمبر کو ہوا۔ بالکل اسی تاریخ کو جب اسرائیلی کھلاڑیوں کو 1972ء میں مارا گیا تھا۔ یہ گلیڈیو کے منتظمین کا مشہور طریقۂ کار تھا۔ وہ بائیں بازو کی تحریک میں خفیہ طور پر شامل ہوجاتے اور اس سمت میں اس کی قیادت کرتے جو سمت گلیڈیو کے منتظمین کے لیے موزوں ہوتی۔

مصری سائنسدان کا منفرد کارنامہ

جاپان میں خدمات انجام دینے والے ایک مسلمان مصری سائنسدان ڈاکٹر شریف الصفتی نے ماحول، پانی اور مٹی سے تابکاری کو علیحدہ اور ختم کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کرکے ایٹمی ترقیات کے شعبے میں اہم کامیابی حاصل کرلی ہے۔ وہ دنیا کے پہلے سائنسدان ہیں جنھوں نے اس گراں ترین اور مشکل ترین کام کو اپنی ٹیم کے ساتھ صرف چند ہفتوں میں مکمل کرکے ایٹمی ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے۔

اس کے بعد ایک باوقار اور صاحب حیثیت شخص کی میت کی ایسی بے پروائی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

اللہ وحید مراد کو غریق رحمت کرے۔ اب اس کی میت کی لاہور آمد کی داستان یاسین گوریجہ صاحب کی زبانی سنیے۔ ''ملک کے خوبرو اور اپنے دور کے چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کو جمعرات کی صبح ساڑھے دس بجے ان کی کوٹھی سے ملحقہ قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقع پر کون سی آنکھ تھی جو اشکبار نہ تھی۔ سوگوار عورتوں کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ بدھ کی رات دس بجے پی آئی اے کے ذریعے وحید مراد کی میت جب کراچی سے لاہور پہنچی تو وحید کے چچا سلیم مراد اور محمد علی کے علاوہ درجنوں فلمی شخصیات ایئر پورٹ پر موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں میت کا تابوت ایک وین کے ذریعے مرحوم کی کوٹھی گلبرگ پہنچایا گیا۔ کوٹھی میں میت کی آمد پر بے حد دل خراش مناظر دیکھنے میں آئے۔''

وحید کی بیمار والدہ نے اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی میت دیکھی تو چیختے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ وحید کو بکس میں بند کر کے کیوں لائے ہو؟''

''اس کی والدہ کی آہ و بکا دیکھ کر اس جگہ موجود ہر شخص بری طرح رو رہا تھا۔ وحید کی والدہ نے اپنے سات سالہ پوتے عادل مراد کو سینے سے چمٹا لیا اس کے بعد ان کی زبان گنگ سی ہو گئی۔ ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔''

''وحید مراد کی موت کی اطلاع بدھ کی صبح بارہ بجے کے قریب لاہور پہنچی تو کسی نے بھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں نے جب وحید مراد کے چچا سلیم مراد کی کوٹھی فون کیا تو پتا چلا کہ اطلاع واقعی درست ہے۔ وحید مراد کی موت کی خبر جب دن کے دو بجے کے قریب میں نے دفتر نگار کو بذریعہ فون دی تو مدیر نگار کو اس کا یقین نہ آیا۔ کیونکہ وحید مراد تو اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔''

یہاں لاہور میں یہ خبر بے حد حیرانگی اور افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ کراچی میں فلم سے وابستہ شخصیات کو کسی نے بھی وحید کی موت کی اطلاع نہیں دی۔

لاہور میں وحید مراد کے جنازہ کو اٹھانے کا وقت دوسری صبح دس بجے دیا گیا تھا۔ جیسے ہی یہ خبر لاہور میں صبح کے اخباروں میں شائع ہوئی وحید مراد کے ہزاروں پرستار مرحوم کی کوٹھی گلبرگ پہنچ گئے۔ دس بجے تک فلمی صنعت سے وابستہ ہر شعبہ کے افراد وہاں موجود تھے۔ ان میں فلم ساز بھی تھے، ہدایت کار بھی، اداکار بھی اور ٹیکنیشنز بھی۔ تمام اداکارائیں بھی صبح ہی وحید کی کوٹھی پہنچ گئی تھیں۔ اداکار محمد علی اور ہدایت کار لئیق اختر جنازہ اٹھانے کے انتظامات میں مصروف تھے۔ قبر کے لیے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ دس بجے تک ہجوم اتنا بڑھ گیا کہ کوٹھی کا لان اور باہر کی سڑک مرحوم کے پرستاروں سے بھر چکی تھی۔ سوا دس بجے جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے پہلے وحید مراد کی میت دیدار کے لیے لان میں رکھ دی گئی تھی۔

چونکہ لان میں اتنے سارے لوگ جمع نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ کوٹھی کے سامنے وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی جائے۔ جنازہ اٹھا تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ بے شمار خواتین جن میں اداکارائیں بھی شامل تھیں بے اختیار چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ الغرض اشکبار آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے لوگوں نے جنازہ اٹھایا اور کھلے میدان میں رکھ دیا۔ بے پناہ ہجوم کی وجہ سے صفیں درست کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ نماز جنازہ کے بعد ساڑھے دس بجے قبرستان لے جانے کے لیے جنازہ اٹھایا گیا۔ اس موقع پر ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھ کر وحید کے جنازے کو کندھا دے سکے۔ چند منٹ بعد جنازہ قبرستان پہنچ گیا۔ یہاں بھی بڑی مشکل سے ہجوم پر قابو پایا گیا۔ چند بڑوں نے وحید مراد کے پرستاروں سے منت سماجت کی تب کہیں ہجوم قبر سے ذرا دور ہٹا اور آخر کار گیارہ بجے میت کو دفنانے کے بعد بھی بے شمار لوگ کافی دیر تک کوٹھی کے باہر موجود رہے۔

اگلا روز جمعہ کا تھا۔ سہ پہر تین بجے رسم قل ادا کی جانی تھی۔ اس موقع پر بھی عوام کی بڑی تعداد پہنچ چکی تھی۔ فلمی صنعت سے وابستہ افراد کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں عزیز رشتے دار اور پرستار تھے جو راولپنڈی، سیالکوٹ، پشاور، گوجرانوالہ اور فیصل آباد سے آئے تھے۔ نماز عصر کے بعد قرآن خوانی شروع ہوئی۔ جس کے اختتام پر مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقع پر وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ بیگم کا بڑی شدت سے انتظار کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا جہاز رات کو پہنچے گا۔

وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ مراد کو بذریعہ فون امریکا میں ان کے شوہر کی وفات کی اطلاع دی گئی تھی جسے سن کر انہوں نے پہلے تو اس پر یقین نہیں کیا اور کہا۔ ''یہ سچی خبر نہیں افواہ ہے۔'' لیکن انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ خبر صد فیصد سچ ہے۔

وحید واقعی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تب انہیں شدید رنج ہوا اور انہوں نے التجا کی کہ ان کے آنے تک ان کی تدفین نہ کی جائے۔

لیکن ان کی اس خواہش پر عمل نہ کیا جا سکا کیونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق میت کو اتنی دیر تک روکنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو سکا تدفین کردی گئی (غالباً اس دور میں کولڈ اسٹوریج کا بندوبست نہیں تھا جیسا اب ہے)۔

بہرحال سلمیٰ مراد جمعہ کی شب جب قل کی رسم بھی ادا کی جا چکی تھی اپنی گیارہ سالہ بیٹی عالیہ مراد کے ہمراہ لاہور پہنچیں۔ جنہیں لینے محمد علی، زیبا، قوی خان، ان کی بیگم اور چند عزیز رشتے دار ایئرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

جہاز سے اترتے ہی سلمیٰ نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا۔ محمد علی اور زیبا وغیرہ نے انہیں دلاسہ دیا اور اپنے ہمراہ اس کی رہائش گاہ پر لائے۔ یہاں پہنچتے ہی سلمیٰ اپنے بیٹے عادل مراد کو اپنے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگیں انہیں اس موقع پر بھی بڑی مشکل سے چپ کرایا گیا۔

اس وقت وہاں موجود کچھ لوگ ان کی بھری جوانی میں بیوگی پر دل ہی دل میں افسوس کر رہے تھے۔

دوسری طرف عالیہ اپنی دادی کے گلے لگ کر روتی رہی۔ وحید مراد کی والدہ کی حالت اس وقت بھی نارمل نہیں تھی۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ اس قسم کی باتیں گویا نیم بے ہوشی کے عالم میں کہہ رہی ہوں۔

”تم سب کیوں رو رہی ہو، جب اسے تمہاری ضرورت تھی تم اسے چھوڑ کر اس سے دور چلی گئیں۔ تمہاری اس بے مروتی پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کار کے حادثے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔“

وہاں موجود لوگوں نے ان کی ہذیانی بڑبڑاہٹ کو روکنے کے لیے انہیں دوائی کھلا کر سلا دیا۔ ان کے لیے جوان بیٹے کی جدائی ایک جاں کاہ صدمہ تھا۔ جب ایک عام آدمی ایک عام پرستار غم سے اس قدر نڈھال تھا تو اکلوتے بیٹے کی ماں کا کیا حال ہو سکتا ہے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام تھا۔ بہرحال یہ بھی حقیقت تھی کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ وقت سلمیٰ مراد کو بھی دکھ دینے کا نہیں تھا۔ وحید بہرحال ان کے شوہر تھے۔ جیون ساتھی تھے۔ میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ میاں سے لڑ کر امریکا چلی گئی تھیں مگر وہ یہ کب چاہتی تھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو جائیں۔

مرحوم کے دوستوں، بہی خواہوں اور رشتے داروں نے اس موقع پر سلمیٰ بیگم کو سنبھالنے اور سہارا دینے کے لیے ان کی دل جوئی شروع کی۔ ساس کی باتوں کو نظرانداز کرنے کو کہا۔

جب سلمیٰ بیگم کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟“

”دو ماہ پہلے لاہور میں ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ چہرے پر خاصا زخم آیا تھا۔ اللہ نے اتنا کرم کیا کہ دونوں آنکھیں سلامت رہیں۔ کچھ دنوں تک اسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ پھر صحت یاب ہو کر گھر آگئے۔ زخم مندمل تو ہو گئے مگر چہرہ داغدار ہو گیا تھا۔ صحت بالکل ضائع ہو چکی تھی۔ اس موقع پر وہ بالکل تنہا تھے۔ کوئی اپنا ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں تھا۔ ان کے کچھ دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرالو۔

انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا۔ ”جی ہاں آپ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالیں مگر اس کے لیے آپ کو بیرونِ ملک جانا پڑے گا یا کراچی میں یہ کام کروانا پڑے گا۔ یہاں لاہور میں پلاسٹک سرجری نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وحید مراد صاحب کراچی چلے گئے۔“

”جب بہن مسز ممتاز ایوب کو معلوم ہوا کہ ان کے بھائی وحید مراد اکیلے اپنے فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ وہاں پہنچیں اور ضد کر کے اپنے گھر ڈیفنس لے گئیں۔ وہاں وہ منگل کی رات تک ٹھیک ٹھاک تھے۔ خوشگوار موڈ میں گپ شپ کرتے رہے تھے۔ بدھ کی صبح جب وہ دس بجے تک نہیں جاگے تو کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور جب کافی دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو دروازہ توڑ کر اندر دیکھا گیا۔ وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔

سلمیٰ مراد چپ رہیں۔ کچھ دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ پھر دھیرے سے خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ”ایک شخص جو رات کے وقت بالکل بھلا چنگا تھا۔ صبح ایک دم مردہ حالت میں پایا گیا کیا یہ مس ٹیرس نہیں؟ پُراسرار نہیں؟“

اور پھر کئی دنوں کے بعد جب نگار اور دوسرے اخباروں میں وحید مراد کی موت کی روداد شائع ہوئی تو ان کا موڈ بہت جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھیں کہنا

چاہتی تھیں، اس پُراسرار موت کی تصدیق کروانا چاہتی تھیں مگر انہوں نے بہت صبر وضبط سے کام لیا۔ کسی کا نام لے کر یا بغیر نام لیے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ جانے اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے شاید اس مسئلے کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ...... ایسا کرنے سے ان کی شخصیت کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

بہرحال ان کا چپ رہنا ہی بہتر تھا۔ سانپ تو گزر چکا تھا۔ اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر پر لاٹھی پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں تھا کہ وحید مراد کا گزرنا، اس کے گھر والوں ہی کے لیے نہیں بے شمار لوگوں کے لیے صدمہ عظیم تھا۔ مصنف وہدایت کار شوکت ہاشمی نے اپنے جذبات واحساسات کا جو اظہار کیا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھیے۔

''اس سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب اس کی میت لحد میں اتارنے سے پہلے میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ خاموش لب، پُرسکون چہرہ، زندگی کے تمام تفکرات سے آزاد۔ اب وہ کسی ڈپریشن کا شکار نہیں تھا۔ اب اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنے قدر دانوں، اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں سے بے نیاز آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کوئی فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگئی ہے اور اس کے دوستوں نے اس کو پھولوں سے لاد دیا ہے۔''

قبرستان کے گرد اس کے ہزاروں پرستار پھیلے ہوئے تھے لگ بھگ پچیس تیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور وہ سب یک آواز نعرہ لگا رہے تھے۔ ''وحید مراد زندہ باد۔ وحید مراد زندہ باد''

اور گورکن اس عظیم فنکار کی میت پر مٹی ڈال رہا تھا جس کی اداکاری نے پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نیا اسلوب دیا تھا اور جس نے فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ فنکاروں کی آمد کے راستے کھولے تھے۔ جس کی جواں مرگی پر پاکستان ٹیلی ویژن نے صرف ایک سطری خبر ٹیلی کاسٹ کی تھی۔ ''مشہور اداکار وحید مراد آج صبح کراچی میں انتقال کرگئے۔''

پی ٹی وی کے اس رویے سے وحید مراد کی فنی شخصیت اور ان کی شہرت اور مقبولیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پاکستانی فلموں کے ون اینڈ اونلی شومین سید نور ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

''میں آج تک ان کی یادوں کے گھیرے سے نہیں نکل سکا۔ میں آج بھی اس خوشبو کو محسوس کرتا ہوں جو ''ارمان'' دیکھتے ہوئے میں نے اپنی ٹین ایج میں پہلی بار اپنے دل سے اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ مجھے یقین ہے وہ خوشبو، وہ احساس وہ چاہت وحید صاحب اور ان کی فلموں کے لیے مرتے دم تک قائم رہے گی۔''

وحید مراد صاحب پاکستان فلم انڈسٹری کا وقار تھے، ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ذاتی زندگی شاید بہت شاندار نہ رہی ہو لیکن ان کی فلمی زندگی اور اس کی یادیں پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بہت بڑا فخر ہیں۔

مصنف وہدایت کار پرویز کلیم نے وحید مراد کے نام ایک ایسا خط لکھا جو پتا نہیں اس کے پاس پہنچا یا نہیں مگر اس کے بے شمار پرستار اسے بڑھ کر اپنے محبوب فنکار کی عظمت اور بڑائی سے اور ان کی مقبولیت اور چاہت سے ایک نئے انداز سے ضرور واقف ہوئے ہوں گے۔ اس خط کے کچھ اقتباس۔ ''تمہاری ہر برسی پر تمہاری یادیں تمہارے چاہنے والوں میں بانٹنا نہیں بھولتا۔ لگتا ہے تمہاری موت نے تمہیں بھی عمر کی ایسی دعا دی ہے جو تمہیں لگ چکی ہے۔''

''وحید! تمہیں یاد ہے تم نے اپنی ایک ہیروئن کا نام رادھا رکھا تھا۔ تمہاری رادھا بوڑھی ہوچکی ہے اس کے سر میں چاندی کے تار اتر آئے ہیں مگر اس کی آنکھوں کا گرم پانی آج بھی جوان ہے۔''

''تمہاری تصویر دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ ہم اسے کیا تسلیاں دیں۔''

''زیبا، دیبا، عالیہ، شبنم، بابرہ، سنگیتا، کویتا، نشو یہ سب تمہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتیں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ فلمی محبتیں بھول ہے مگر وہ لمحے، وہ پل، وہ گھڑیاں نہیں بھلائی جاتیں جو ہنس ہنس کے گزاری ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو ماضی کا ہاتھ تھام کر اپنے آج پھر چھپ کر رو لیتے ہیں اور کچھ ہنستے ہوئے چہرے، روئی ہوئی آنکھوں سے تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔''

تمہیں بھلانا ہی اوّل تو دسترس میں نہیں
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے؟

بابائے جغرافیہ

طارق عزیز خان

جغرافیہ ہی وہ کلیہ ہے، وہ ذریعہ ہے جو کرۂ ارض کی معلومات فراہم کرتا ہے لیکن یہ علم بہت زیادہ پرانا نہیں، اس علم کی بنیاد رکھنے والے نے کس طرح اسے تخلیق کیا کن مصائب سے گزر کر اس نے دوسروں کے لیے رہنما طریق کار واضح کیا اسی کا بیان۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفہ خاص

جغرافیہ جسے انگریزی میں Geography کہتے ہیں دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین کا بیان..... یہ وہ علم ہے جس میں زمین کی خصوصیات، اس کے باشندوں اس کے مظاہر اور اس کے نقوش کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسے زمین کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ آج تک بنی نوع انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ سب جغرافیہ کی ہی مرہون منت ہے۔ اس علم کا آغاز بطور سائنس یونان میں ہوا۔ وہ پہلا انسان جس نے لفظ جغرافیہ استعمال کیا ، ایراتو ستھینز

(Eratosthenes) ایک یونانی تھا۔
قدیم جغرافیہ دانوں کی زمین سے متعلق تحریریں نہایت دلچسپ ہیں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ ہوا زمین میں داخل ہو کر محبوس ہو جاتی ہے اور جب وہ واپس خلا میں جانے کی کوشش کرتی ہے تو زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان عجیب و غریب نظریات کے باوجود یونانیوں نے جغرافیہ کے حوالے بعض حیرت انگیز دریافتیں بھی کیں۔ دو سو سال قبل مسیح کے قریب ارسطارتس نے مدوجزر کی لہروں میں تناسب معلوم کرنے کے بعد اعلان کیا کہ نہ صرف بحر اوقیانوس اور بحر ہند آپس میں منسلک ہیں بلکہ بحر اوقیانوس کے مغرب میں ہزاروں کلومیٹر دور شمال سے جنوب کی طرف ایک بڑا خطہ زمین واقع ہے۔ ارسطارتس کی اس تحقیق کے 1700 سال بعد کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔ یونانیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں مسلم ممالک میں جغرافیہ کے حوالے اہم پیش رفت ہوئی۔ اس دور کے اہم جغرافیہ دانوں میں ابن بطوطہ، ابن خلدون اور ادریسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مسلمانوں کے علمی زوال کے بعد یورپ میں زمین کے جغرافیہ سے متعلق ٹھوس اور مستند تحقیقات سامنے آئیں۔ آج ہم کرۂ زمین سے متعلق جس قدر معلومات رکھتے ہیں ان کا بیشتر ماخذ یورپین جغرافیہ دانوں کی تحقیق ہے۔
آج کی جدید خلائی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ لگ بھگ 13 ارب 70 کروڑ سال پہلے بگ بینگ دھماکے کے ذریعہ کائنات کی تشکیل شروع ہوئی۔ قریب 4 ارب 60 کروڑ سال پہلے نظام شمسی وجود میں آنا شروع ہوا اور تقریباً 4 ارب 50 کروڑ سال پہلے کرۂ ارض کی پیدائش ہوئی۔ زمین کی پیدائش کے ابتدائی 50 کروڑ سال کے دوران پوری زمین پر محیط ابتدائی سمندر ظاہر ہوا۔ اگلے 2 ارب سال کے دوران سمندر کی تہہ کے نیچے موجود ٹیکٹونک پلیٹس (Tectonic Plate) میں ہوئی حرکت کی وجہ سے سطح سمندر پر ابھرنے والے خشکی کے عظیم خطوں میں جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ لگ بھگ 300 سو ملین سال پہلے کرۂ ارض پر صرف ایک عظیم براعظم پانگیا (Pangaea) اور اُس کے چاروں اطراف میں ایک ہی وسیع و عریض سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ 280 ملین سال پہلے پانگیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور قریب ترین اندازہ ہے کہ تقریباً 20 ملین سال پہلے کرۂ ارض پر موجود سات براعظم (ایشیا، افریقا، شمالی امریکا، جنوبی امریکا، یورپ، انٹارکٹیکا) اور تین بڑے سمندر (بحرالکاہل، بحر اوقیانوس، بحر ہند) اُس مقام پر موجود تھے کہ جہاں آج ہم انھیں دیکھتے ہیں۔
لگ بھگ 300 قبل از مسیح تک خلیج فارس اور بحیرہ روم کے اطراف میں بسنے والی اقوام کی پہنچ جنوب مغربی ایشیا، وسطی ایشیا اور وسطی و مغربی یورپ کے کچھ علاقوں کے ساتھ ساتھ افریقا کے دور دراز خطوں تک ہو چکی تھی۔ افریقا اور ایشیا میں ابتدائی مہمات کے بعد مصری، ایرانی اور فونیشیائی تو تھک ہار کر بیٹھ گئے لیکن یونانیوں کی بے چین طبیعت نے اُنھیں چین لینے نہ دیا۔ اُن کی فطرت ایسی تھی کہ وہ ہر روز ایک نیا ہنگامہ چاہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں ہر روز ایک نیا تماشا اور اُن کی زبانیں ہر دن کسی نئے مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی تھیں۔ یونانیوں کی یہ خصوصیات انھیں ایک مخصوص ڈگر پر چلنے سے روکتی تھیں۔ وہ خود کو اس عہد کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب سمجھتے تھے، تاہم کرۂ ارض سے متعلق ان کے خیالات دقیانوسی تھے۔ اہل یونان کے نزدیک زمین چپٹی اور کائنات کا مرکز تھی۔
مشہور زمانہ یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) نے 340 ق م میں اپنی کتاب ''افلاک پر'' (On the Heavens) میں پہلی بار زمین کے گول ہونے کے بارے میں دلائل دیے۔ عام یونانیوں نے تو ارسطو کے خیالات کا مذاق اڑایا، تاہم اس کے سب سے قابل شاگرد نے اپنے استاد کے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے کرۂ ارض کو دریافت کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اسکندر نے 334 سے 323 قبل از مسیح کے دوران شمال مشرقی افریقا سمیت جنوب مغربی ایشیا کے وسیع علاقے کو دریافت کیا۔ تاہم وہ زمین کے گول ہونے کو ثابت نہ کر سکا۔ اسکندر کی ایشیا میں مہمات کے دوران یونانی ملاح پائے تھے اس نے شمال مغربی یورپ میں مہمات سرانجام دیں۔ لیکن وہ بھی بحیرہ شمالی (بحر اوقیانوس) کی وسعت کے آگے بے بس ہو گیا۔
یونانیوں میں اسکندر کا کوئی وارث تو پیدا نہیں ہوا، تاہم اسکندر اعظم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ایران، مشرق وسطیٰ اور مصری علاقوں پر مشتمل ایک وسیع یونانی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ یونانی سلطنت کے دور عروج میں شمالی مصر میں اسکندر کا قائم کردہ شہر اسکندریہ، بحیرہ روم کی اہم بندرگاہ کے ساتھ ساتھ تجارت، ثقافت اور تحصیل علم کے عالمی مرکز کے طور پر ابھرا۔ انسان کی بہت سی اہم دریافتوں کی طرح کرۂ ارض کے بارے میں بنیادی نوعیت کی تمام اہم دریافتیں عظیم عروس

البلاد اسکندریہ میں کی گئیں۔ یونانیوں نے اسکندریہ کی تعمیر پر بے شمار دولت خرچ کی تھی۔ شہر کو 30 میٹر چوڑے کشادہ بازاروں نفیس انداز تعمیر، مجسمہ سازی، اسکندر کے یادگاری مقبرے اور ایک بہت بڑے مینارہ نور فیروس (Pharos) (قدیم دنیا کے سات عجوبوں میں شامل ایک عجوبہ) سے شایان و سرفراز کیا گیا تھا۔ ان سب کے علاوہ اسکندریہ کا سب سے بڑا عجوبہ اُس کا کتب خانہ اور اس سے ملحقہ عجائب گھر تھا۔ مصر کے یونانی بادشاہ جاننے اور سیکھنے کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ اُنھوں نے اس کتب خانے کے قیام کے بعد اگلی کئی صدیوں تک تحقیقی کام کی اعانت کی اور اسکندریہ کے کتب خانے میں اپنے عہد کے بہترین اذہان کے لیے ایک علمی ماحول قائم رکھا۔ کتب خانے کے 10 بڑے کمرے اور ہر کمرا علیحدہ موضوع کے لیے وقف تھا۔ چشمے اور ستونوں کی قطاریں، نباتاتی باغ، چڑیا گھر، جراح خانے، رصدگاہ، کھانے کا کمرا اور پانچ لاکھ نادر و نایاب کتابیں اس کتب خانے کی شان تھیں۔ یونانی حکمرانوں کو اسکندریہ میں کتابیں جمع کرنے کا اس حد تک شوق تھا کہ ان کی پولیس یونانی سلطنت کی حدود میں داخل ہونے والے ہر بحری جہاز کی تلاشی لیتی اور جہازوں سے کسی بھی قسم کے کتابی نسخے کے برامد ہونے کے بعد ان کی نقل تیار کر کے اسکندریہ روانہ کر دیتی۔

240 قبل از مسیح میں اسکندریہ کے اس عظیم کتب خانے کا ڈائریکٹر ایراتوستھینز تھا۔ ایراتو 276 قبل مسیح میں لیبیا کی بندرگاہ بن غازی (Banghazi) سے 180 کلومیٹر مغرب میں واقع ایک قدیم صحرائی قصبے سائرینے قدیم نام (Cyrene) موجودہ شاہات (Shahhat) میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن لیبیا کے ساحلی علاقوں میں گزرا۔ بہت کم عمری میں ہی وہ ایک بحری جہاز پر ملازم ہوا اور اس نے تیونس اور الجزائر کی سیاحت کی۔ اسے جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ نوجوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے ہم عصر جغرافیہ دانوں کی بیشتر تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اب اس کی دلچسپی کا مرکز بحیرہ روم سے پار کی دنیائیں تھیں۔ وہ دنیا کے چپٹا ہونے سے متعلق نظریات سے کبھی بھی متفق نہیں ہوا۔

ایراتو کا دلپسند مشغلہ بن غازی کے ریتیلے ساحلوں پر دنیا کے نقشے بنانا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو ساحل پر جمع کرتا اور پھر چھڑی کی مدد سے نقشے بنا کر انھیں دنیا کے جغرافیہ سے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کرتا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بحیرہ روم کے قرب و جوار کی سیاحت کر چکا تھا۔ اس دوران وہ اسکندریہ پہنچا اور محض 36 سال کی عمر میں اپنے علم و تحقیق کے بل بوتے پر اسکندریہ کے عظیم کتب خانے کا نگران مقرر ہو گیا۔ اسکندریہ میں قیام کے دوران اسے اپنے زمانے کے نامور جغرافیہ دانوں کی تصنیفات کے مطالعے کا موقع ملا۔ خود اس نے بھی فلکیات، تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق مقالے تحریر کیے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ زمین کی پیائش سے متعلق درست نقشے بنائے۔ بدقسمتی سے اسکندریہ میں قیام کے دوران ہی ایراتو کی نظر اس حد تک کمزور ہو گئی کہ اسے مطالعے اور تحقیق کے لیے اپنے شاگردوں کی مدد لینا پڑتی تھی۔

چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایراتو کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اُس کی کتابوں کے عنوانات فلکیات سے لے کر "دکھ سے نجات" تک محیط تھے۔ تاہم اس کی دلچسپی کا مرکز کرۂ ارض کا جغرافیہ تھا۔ اپنے ہم عصر یونانیوں کی طرح وہ زمین کو چپٹا نہیں مانتا تھا۔ اس کے دن رات اسی تحقیق و جستجو میں بسر ہو رہے تھے کہ زمین کا ٹھیک ٹھیک طول و عرض معلوم کرے۔

اس دوران اس نے ایک کتاب میں پڑھا کہ سائینے شہر (قدیم نام سائینے Syene موجودہ نام اسوان Aswan) کے جنوبی سرحدی علاقے میں دریائے نیل کی پہلی آبشار کے نزدیک، 21 جون کو عین دوپہر کے وقت زمین پر گاڑی عمودی چھڑی کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موسم گرما کے اس طویل اور گرم ترین دن میں دوپہر کے وقت سائینے شہر کے جنوبی حصے میں واقع معبدوں کے ستونوں کے سائے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت کسی گہرے کنویں کی تہ میں سورج کا عکس دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ عین سر پر چمک رہا ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس مشاہدے کو نظر انداز کر دیتا۔ سائے، کنویں میں عکس، سورج کا مقام اور عمودی چھڑی جیسے بے سروپا الفاظ کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ لیکن ایراتوستھینز جغرافیہ دان ہونے کے ساتھ ساتھ ریاضی دان بھی تھا۔ اس نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور 21 جون کے دن اسکندریہ میں اپنی لائبریری کے صحن میں عین دوپہر کے وقت ایک عمودی چھڑی گاڑی اور پایا کہ چھڑی کا زمین پر سایہ پڑ رہا تھا۔ لیکن قریب ہی کھودے گئے کنویں کی گہرائی میں موجود پانی میں سورج کا عکس غائب تھا۔ ایراتو نے خود سے سوال کیا، ایسا کیوں تھا؟ ایک ہی تاریخ کے ایک ہی وقت میں شمالاً جنوباً واقع دو مصری شہروں میں کیے گئے ایک جیسے تجربے کے نتائج

مختلف کیوں تھے؟

اراتو نے قدیم مصر کا ایک نقشہ لے کر اسکندریہ اور سائنے پر دو چھوٹی تیلیاں عمودی کھڑی کیں۔ وہ سوچنے لگا فرض کریں کہ سورج کے عین سر پر ہونے کی صورت میں کسی ایک لمحے میں دونوں ہی چھڑیوں کا سایہ زمین پر نہ پڑے یا ایک ہی وقت میں دونوں چھڑیوں کے سائے ایک ہی جتنے لمبے ہوں تو اس کا ایک ہی مفہوم نکلے گا یعنی زمین چپٹی اور اسپاٹ ہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں کسی ایک چھڑی کا سایہ پڑنے اور دوسری کا نہ پڑنے کا کیا مطلب تھا؟ اراتو نے غور کیا کہ کرۂ ارض کی سطح کا خمیدہ ہونا اس پہیلی کا واحد ممکنہ جواب تھا۔ مطلب یہ کہ زمین گول تھی۔ ایک بار کرۂ ارض کو گول تصور کر لینے کے بعد اراتو کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ دونوں چھڑیوں کے سایوں میں مشاہدہ کیے گئے فرق کے لیے اسکندریہ اور سائنے کے درمیان فاصلہ کرۂ ارض کی سطح کے ساتھ 7 ڈگری ہونا چاہیے تھا۔

یعنی اگر ہم چھڑیوں کو کرۂ ارض کے مرکزی نقطے تک پہنچتے ہوئے تصور کریں تو وہاں وہ ایک دوسرے کو سات ڈگری پر قطع کر رہی ہوں گی۔ اراتو نے اسی پر بس کرنے کی بجائے ایک آدمی کو اُجرت دے کر سائنے اور اسکندریہ کے درمیان فاصلے کو ناپا جو اس وقت کے اندازے کے مطابق 800 کلومیٹر سے کچھ زیادہ تھا۔ اراتو کے لیے بعد کا حساب آسان تھا یعنی 7 ڈگری کا فاصلہ کرۂ ارض کے کل محیط 360 ڈگری کا 50واں حصہ تھا اور یوں 800 کلومیٹر کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر کے قریب تھا۔ اراتو نے اعلان کیا کہ خط استواء پر کرۂ ارض کا محیط 40 ہزار کلومیٹر یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔

اراتو ستھینز کی دماغ سوزی کے مقابلے میں آج کی جدید تحقیق کے مطابق دنیا کے نقشے پر کھینچے گئے ہر ایک ڈگری کے خط کا درمیانی فاصلہ 111.32 کلومیٹر ہوتا ہے۔ اسکندریہ 31.15 ڈگری شمال جبکہ سائنے 23.97 ڈگری شمال پر واقع ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان 7.18 ڈگری کے فرق کا مطلب 799.27 کلومیٹر فاصلہ اور اس کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر ہے۔ اور یہی کرۂ ارض کا کل محیط ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں کہیں تو ہمیں عین خط استواء پر زمین کے گرد ایک دھاگا لپیٹنے کے لیے کل چالیس ہزار کلومیٹر لمبے دھاگے کی ضرورت ہوگی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں محض چھڑیاں، پاؤں اور دماغ کے ساتھ تحقیق کا شوق، اراتو کے آلات تھے اور ان آلات کی مدد سے اُس نے صرف چند فی صد کی غلطی سے کسی سیارے کا محیط بالکل ٹھیک ٹھیک ناپا تھا۔

گو کہ اگلے ایک ہزار سال تک عام یورپین باشندے زمین کو چپٹا ہی مانتے رہے لیکن اراتو ستھینز کی تحقیق نے کرۂ ارض کے بارے میں پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کی رائے کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ عظیم محقق، تحقیق اور مطالعے کی زیادتی کی وجہ سے اپنی آخری عمر میں اندھا ہو کر 196 ق م میں مصر کے شہر اسکندریہ میں انتقال کر گیا۔ اراتو ستھینز کے دور میں بحیرہ روم سیاحت اور تجارت کے لیے مشہور اور اسکندریہ وہاں واقع سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔

اراتو کے ہاتھوں کرۂ ارض کا محیط دریافت ہونے کے بعد اسکندریہ میں گلوب تعمیر کیے گئے۔ ان گلوب میں دنیا کو خلا سے دیکھے جانے کے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ تاہم یہ گلوب بحیرہ روم اور اس کے گرد واقع تین براعظموں کی حد تک تو ٹھیک تھے۔ لیکن چونکہ اراتو، مغرب میں واقع غیر دریافت شدہ خطوں (امریکا اور بحرالکاہل) کے بارے میں نہیں جانتا تھا اس لیے بحر اوقیانوس کی وسعت میں دور جاتے جاتے یہ گلوب غیر درست ہوتے جاتے تھے۔ اراتو کا ماننا تھا کہ اگر بحر اوقیانوس کی وسعت رکاوٹ نہ بنتی تو ہم مغرب کی طرف سے سمندر کے راستے ہندوستان تک چلے جاتے۔

اراتو کی تحقیق کے بعد اطالوی جغرافیہ داں اسٹرابو (Strabo) نے سمندروں کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ زمین گول تھی اور کرۂ ارض کے تمام سمندر آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اسٹرابو نے اپنی زندگی (63 ق م سے 24 عیسوی) میں یونان کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق 43 کتابیں لکھیں۔ اس نے اراتارتس کے نظریات کا دفاع کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کے پار ایک خطہ زمین کے ہونے کی حمایت کی۔ اسٹرابو کی رائے میں دنیا کے گرد چکر لگانے کی ناکام کوشش کرنے والے واپس آکر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ کسی براعظم نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ بلکہ اُن کی ناکامی کی بڑی وجہ ہمت حوصلے اور رسد کی قلت تھی۔ اسٹرابو نے اراتو کی تحقیق کا دفاع کرتے ہوئے لکھا کہ زمین کا خط استواء پر محیط چالیس ہزار کلومیٹر کے قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا سترھواں حصہ

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

روز مرہ کے استعمال کی معمولی سی دوا اموکسیل میرے گلے کا پھندا بن گئی۔ تفتیش کرنے والے افسران مجھے یوں گھیرے کھڑے تھے جیسے میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ وہ سوالات پر سوالات کر رہے تھے اور میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے جوابات نے انہیں کچھ حد تک نرم کر دیا تھا۔ اس افسر کے چہرے پر جو بے رحمی کی چھاپ تھی وہ کم ہو چکی تھی۔

ڈھائی گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، تفتیش مکمل ہو کے نہ دی تھی مگر وہ سب کچھ حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ اسی لیے مجھے

اُمید ہو چکی تھی کہ اب وہ لوگ مجھے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ ذہن پر چھائی دھند بھی صاف ہو چکی تھی اور میری کھوئی ہنسی بھی لوٹ آئی تھی۔ میں مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس افسر نے پھر مجھے دہلا دیا۔ اس نے کہا۔ ''میں تو بہت حد تک مطمئن ہو چکا ہوں لیکن ابھی ایک پولیس آفیسر آ رہا ہے۔ اگر تم نے اسے بھی مطمئن کر دیا تو ہم تمہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

اس جملے نے مجھے پھر سے دہلا دیا۔ میری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اب میں پولیس آفیسر کا انتظار کرنے لگا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا رات ڈھل چکی تھی کہ صبح کے پانچ بجے ایک پولیس آفیسر آ گیا۔ وہ پکی عمر کا تھا اور اس کے سر پر بال خال خال رہ گئے تھے۔ لمبا قد اور کسرتی جسم۔ پہلے والا آفیسر اٹھا اور پولیس آفیسر نے اس کی سیٹ سنبھال لی۔ اس کا انداز بھی امیگریشن افسر جیسا تھا۔ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کر کے وہ بولا۔ تم زیر حراست ہو اور اپنے وکیل کو بلوا سکتے ہو؟ میرا وہی جواب تھا کہ مجھے وکیل کی ضرورت نہیں ہے اور میں خود ہی جواب دے سکتا ہوں۔

اس کے وہی سوالات تھے جن کے جوابات جو میں امیگریشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اب تو وہ جوابات مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ سوال کرتا اور میں فی الفور جواب دے دیتا۔ جو میں امیگریشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اس نے تین گھنٹے کے بجائے دو گھنٹے مجھ سے تفتیش کی۔ میرے سارے سامان کو بھی کھنگالا۔ اب میں بھی تھک چکا تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ بھی بور ہونے لگے تھے۔ آخر میں وہ بولا۔ ''ہم کیس کی تفتیش پھر سے کریں گے اور پھر کوئی فیصلہ کر کے تم کو اطلاع کر دیں گے۔'' اس نے مجھ سے میرا فون نمبر اور ایڈریس لے لیا۔ اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میری بس تو جا چکی ہے، اب میں کیسے جاؤں گا۔''

کہنے لگا۔ ''اگر ٹکٹ تمہارے پاس ہے تو وہی دکھا کر ٹورنٹو جانے والی کسی بھی بس میں بیٹھ جاؤ۔''

جب میں باہر نکلا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ رات کی سیاہی روشنی میں بدل چکی تھی۔ میں شدید نقاہت اور تھکاوٹ کی حالت میں تھا اور بس کے انتظار میں اپنے بھاری سامان کے ساتھ امیگریشن آفس کے باہر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ سردی نے بے حال کر رکھا تھا۔ پوری رات کا جاگا ہوا تھا اور بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ بہت ہی سخت وقت سے گزرا تھا تب جا کر یہ کالی رات ٹلی تھی۔ اتنے میں ایک آفیسر میرے پاس آیا اور پوچھا۔ ''بس کا انتظار کر رہے ہو؟''

اس کا احمقانہ سوال سن کر بھی میں نے اپنے آپ کو خوشگوار رکھا اور مسکرا کر ہاں میں جواب دیا۔

اس نے پھر پوچھا۔ ''کیا بس نکل گئی تھی؟''

میں نے سارا ماجرا اسے سنا دیا۔ سن کر بولا۔ ''کوئی پیپر تم کو دیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگا۔ ''پھر تم پر کوئی کیس نہیں ہے فکر مند نہ ہو۔''

وہ چلا گیا مگر میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا شکل سے میں اسے فکر مند لگ رہا تھا؟ جس کی وجہ سے وہ افسر مجھے اطمینان دلانے آیا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گزر گیا تب جا کر گرے ہاؤنڈ کی بس آئی۔ میں نے ٹکٹ دکھایا تو اس نے میرا سامان نیچے کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور کچھ دیر بعد اس دہشت ناک ماحول سے نکل آیا۔

بس نیاگرا سٹی میں رکی، لیکن مجھ میں نیاگرا فال دیکھنے کا کوئی جوش و خروش باقی نہ تھا۔ حالانکہ دن نکلا ہوا تھا اور نیاگرا سٹی کا چھوٹا سا حسین شہر میرے سامنے تھا۔ پریشانی میں دل بجھا ہو تو نہ رنگ اچھے لگتے ہیں اور نہ ہی نظارے۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ جب شہریت ملتی ہے تو سارا ریکارڈ دوبارہ سے کھنگالا جاتا ہے اور اگر یہ بات سامنے آ گئی تو پھر فیصلہ عدالت کرتی ہے کہ میں آیا سٹیزن کا اہل ہوں بھی یا نہیں۔

میں نے طارق کو فون ملایا۔ اسے سارا ماجرا بتایا تو اس نے سر پکڑ لیا اور مجھ پر برس پڑا کہ اس کے پوچھے بغیر میں نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں نے برف ہٹائی ہیں، کالنگ کارڈز بیچے ہیں، کوئی چھوٹے نہیں بیچتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

بس نے ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو میں اپنے ٹرمینل پر اتارا۔

☆......☆

بڑی مشکل سے میں اپارٹمنٹ پہنچا۔ ٹیکسی کا کرایہ بچانا چاہتا تھا، اسی لیے ایک سے دوسرے سب وے میں اپنے بھاری بھر کم بیگز کے ساتھ اپنا بوجھل جسم اور سن دماغ بھی گھسیٹ کر لایا تھا۔ راستے بھر میں یہ سوچتا آیا تھا کہ اگر پولیس نے زیادہ تفتیش کی اور کچھ نہ کچھ میرے کھاتے میں ڈال دیا تو میرے پاس جواب کیا ہوگا؟

کئی ایک خدشات میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ میں جب اپنے سامان سمیت بس اسٹاپ پر تھکا ہارا اترا تھا تو ایسا لگا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ ساری رات کا سفر اور پھر پولیس کی تفتیش نے میرا اور میرے دماغ کا کچومر نکال دیا تھا۔ اب اسٹاپ سے سوگز دور اپارٹمنٹ تک آنا میرے لیے دوبھر ہوگیا تھا۔ اپنے سامان کو اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا میں اپنے کمرے کی ڈور وال کے قریب آیا تو بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے۔ سامان کو ڈور وال کے باہر جھاڑیوں کے قریب رکھا اور خود مضمحل سا اپارٹمنٹ میں آگیا، گھر میں کوئی نہ تھا۔ سب وے کے دھکے کھاتا، اپنے سامان کو گھسیٹتا اپارٹمنٹ پہنچا تو دن کے بارہ بجے تھے۔ مفتی جاب پر گیا ہوا تھا۔ سرجی اور شہباز کہیں گئے ہوئے تھے۔

میں نے کمرے میں جا کر ڈور وال کو کھولا اور باہر پڑا سامان اندر کمرے میں گھسیٹ لیا۔ ڈور وال بند کی اور بے ہوش سا اپنے میٹرس پر گر پڑا اور غور وفکر کرتے کرتے میں سوگیا۔

کچھ دیر ہی سویا ہوں گا کہ مفتی جاب سے واپس آگیا۔ اس نے کمرے میں جھانکا اور چیخ کر کہا۔ ”تم کب آئے؟“

میں بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹا سویا تھا کہ مفتی نے اٹھا دیا۔ اٹھ کر بیٹھا اور اپنے مرتعش ذہن کو یکجا کیا تھا لیکن مفتی سوالات پر سوالات کر کے میرے دماغ کے پرخچے اڑاتا رہا۔ میں نے پورے تحمل سے یہ کہا۔ ”یار تم چائے بناؤ! میں ابھی منہ دھو کر آتا ہوں۔“

ہم سوئے ہوں تو کبھی کبھار انجانے میں دوسرے آپ کی نیند کا خیال نہیں کرتے۔ پاکستان میں جب میں اپنے کمرے میں گہری نیند میں ڈوبا ہوتا تو میرا ایک کزن ہر وقت شاید اسی تاک میں رہتا تھا کہ میں کب سوؤں اور وہ آ کر دروازہ کھول کر شور مچاتے ہوئے پوچھے۔ ”کیا سو رہے ہو؟“

میں جب امریکا سے ایک بار سردیوں میں پاکستان گیا۔ اپنے بستر میں گرم رضائی میں لپٹا سو رہا تھا۔ میرا ایک دوست ملنے آیا تو مجھے گہری نیند میں سوتے دیکھا تو اتنا خیال کیا کہ مجھے نیند سے نہ اٹھائے اور پھر اسی رضائی میں گھس کر میرے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ارد گرد کوئی مخلوق ہے تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے خاموشی سے سوچوں میں گم اپنی رضائی کے اندر بیٹھے دیکھا تو دہل گیا۔ اپنے حواس میں آیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”دن میں تو ملتے نہیں، سوچا کہ فجر پڑھ کر ہی مل آتا ہوں۔“ میں خود فجر پڑھ کر سویا تھا۔ اس دن مفتی نے بھی مجھے ایسے ہی جگایا تھا۔

میں واش روم سے لیونگ روم میں آیا تو اس نے چائے بنا رکھی تھی۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ میں اس کے لیے ایک جیکٹ لایا تھا جو اس کے حوالے کی اور اس کے بھرپور شکریے پر میں نے مخصوص الفاظ کہے۔ ”اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟“

چائے پی کر سرجی اور شہباز کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ دونوں جاب پر گئے ہیں اور ایک گھنٹے تک آئیں گے۔ مفتی سفر کا اور امریکا کا احوال پوچھ رہا تھا جو سرجی نے پہلے ہی اسے گوش گزار کر دیا تھا۔ میں کچھ بتاتا تو یہی جواب ملتا کہ ”سرجی بتا چکے ہیں۔“ لیکن اب میں نے کہا کہ ”وہ بتاتا ہوں جو سرجی نے نہیں بتایا ہوگا۔“

پھر میں نے بارڈر پر اپنے ساتھ ہونے والے سارے واقعے کی مختصر تفصیل بتائی۔ وہ سن کے حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اسی وقت اس نے خان قیصر کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی تھا اور اسے آنے میں چند منٹ ہی لگے۔ اب دونوں بیٹھ کر پھر سے سب کچھ سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سوالات بھی کرتے جا رہے تھے۔

خان قیصر نے ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگا کر ایک تسلی دی اور کہا۔ ”کچھ نہیں ہونا! اور اگر کچھ ہوگیا تو میں انہیں چھوڑ دوں گا۔“

مفتی نے مجھے تسلی دی اور کہا۔ ”میرا ایک کزن مارکھم کا کونسلر ہے۔ میں اس سے بات کر کے سب معاملہ ختم کروا دوں گا۔“

دوست مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ میری پریشانی اب اتنی نہ تھی جتنی یہ میری تشفی کر رہے تھے۔ یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ کوئی کیس بنانا چاہتے تو مجھے یا تو کوئی پیپر دیتے اور یا پھر مجھ کو ہی اپنے پاس رکھ لیتے مگر میرے دوست مجھے تسلیاں نہ دے رہے تھے بلکہ پولیس کی غیر موجودگی میں دھمکا رہے تھے اور میں بھی ان کی ان ”تسلیوں“ میں آنے والا نہ تھا مگر ان کے خلوص سے میں انکاری بھی نہ تھا۔ میں مطمئن تھا مگر ان دونوں کی تسلیاں زیادہ سے زیادہ پانے کے لیے اپنا منہ بسورے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کو غم میں گھلتے ہوئے دیکھ کر مجھے اندر سے طمانیت مل رہی تھی کہ میرے خیر خواہ بھی موجود ہیں۔

اسی دوران دو اور خیر خواہ سرجی اور شہباز ایک ساتھ وارد ہوئے۔ سرجی ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے۔ شہباز پہلے ہمیں بغور دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نیا سیاپا ضرور ہوا ہے۔“

خان اور مفتی دونوں نے مل کر میرے ساتھ ہونے والی پوری واردات کچھ مرچ مصالحہ ملا کر گوش گوار کی تو وہ دونوں پریشان ہو کر میرے اردگرد بیٹھ گئے۔اب ہم پانچ بندے بیٹھے نئے سیاپا کا ماتم کر رہے تھے۔کوئی تسلی دیتا اور کوئی کسی خدشے کا اظہار کرتا۔اور میں ڈور وال کی کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا کہ موسم بدل رہا تھا۔آسمان نیلا اور شفاف تھا۔برف باری تمام ہوئیں اور زمین جیسے کسی معجزے کی منتظر تھی۔بہار آنے میں گویا چند لمحے رہ گئے تھے۔

ہماری یہ پارلیمنٹ کسی نتیجے یا کسی حل تک پہنچنے سے پہلے برخواست ہوگئی۔خان قیصر سرجی کے ہاتھوں کی چائے پینے کے بعد شہباز کو گالیاں دیتا اور اس سے کچھ سن کر رخصت ہوا۔مفتی کو میں نے جیکٹ کا تحفہ دیا تو وہ خوش ہو کر میٹرس پر چڑھ بیٹھا۔شہباز اس بات پر خوش تھا کہ دو ہفتے بعد اسے ایک لیب میں اینالسٹ کے Op-Co پروگرام میں جاب شروع کرنی تھی۔سرجی مطمئن ہو کر فریج کھولے جلیبیوں بھرے لفافے پر لالچی نظریں گاڑے کھڑے تھے۔

میں اپنے دل میں کوئی ترنگ لیے کمرے میں آیا اور نسرین کو فون ملایا۔فون اس کے بیٹے سعد نے اٹھایا۔میں نے پوچھا۔"ماما گھر پر ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔"ہاں ہیں۔"

میں نے پوچھا۔"بات کروا سکتے ہو؟"

جواب دیا۔"آپ کون؟"

بیچ میں سرجی کی آواز آئی۔"ماموں بات کر رہے ہیں۔"

سرجی نے اردو میں کہا تھا جو بچے کی سمجھ میں نہ آیا۔میں کمرے میں بیٹھا فون کر رہا تھا۔سرجی کسی کو فون کرنے لیونگ روم میں آئے اور ریسیور اٹھایا تو اسی وقت میں سعد سے بات کر رہا تھا۔اس نے میرا پوچھا تو سرجی نے اپنے جواب کی توپ چلا دی۔میں نے غصے میں فون بند کر دیا اور لیونگ روم میں آکر ان کی گردن پکڑ لی۔وہ ابھی تک ریسیور تھامے کھڑے تھے۔میں سخت غصے میں تھا۔شہباز اور مفتی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔قصور سرجی کا بھی نہ تھا۔وہ تو اچانک بیچ میں نادانستہ طور پر داخل ہوئے اور پھر غیر ارادی طور پر بول پڑے تھے۔اب مجھے زیادہ غصہ کر کے اپنا دل نہیں جلانا تھا۔میں سونے چلا گیا۔دن کے کچھ لمحے باقی تھے۔میں کمرے میں آکر سویا تو پھر دوسری صبح اٹھا۔

بعد کے دنوں میں اپارٹمنٹ کا فون ٹیپ ہوتا رہا۔جب بھی میں کہیں کال کرتا یا پھر کال آتی تو کچھ ہی لمحوں میں کوئی کلک کی آواز آتی اور مجھے محسوس ہو جاتا کہ بیچ میں کوئی ہے۔ایک بار رشید کا فون آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمہاری وجہ سے اور اپنی بیوقوفی کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔اس نے سب معاملہ سنا تو پھر اس کا فون کبھی نہ آیا۔میں نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکلتے وقت ایک پولیس کی گاڑی باہر کھڑی نظر آتی تھی۔یہ معاملہ کچھ دن چلتا رہا اور دو ڈھائی ماہ بعد پولیس آفیسر کا فون آیا۔اس نے کہا۔"ہم نے تمہارا سارا کیس دیکھ لیا ہے۔تم اس میں معصوم تھے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔"فون بند کرنے سے پہلے اس نے مزید کہا۔"تمہاری فائل اب ہم بند کر رہے ہیں۔" پھر اچھے دن کی نوید سنائی اور فون بند کر دیا۔

آج جمعے کا دن تھا۔منگل کو مجھے ہیموسال کو جوائن کرنا تھا۔

میرے ذہن میں یہ چل رہا تھا کہ ہفتے کے پانچ دن ہیموسال میں جاب کروں گا اور ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر میں دن بارہ بجے سے رات بارہ بجے بارہ گھنٹے کی شفٹیں اگر مل گئیں تو وہ بھی کر لیا کروں گا۔اسی طرح ہولڈنگ سینٹر سے نو سو ڈالر ایک ماہ میں بن جایا کریں گے۔میرا ماہانہ خرچ پانچ سو ڈالر تھا اور اس کے علاوہ ہیموسال کی تنخواہ کی بھی سیونگ ہو جایا کرے گی۔ہیموسال میں ایک ہفتے مارننگ یعنی صبح سات بجے سے تین بجے شفٹ ہوتی تھی اور دوسرے ہفتے دوپہر تین سے رات گیارہ بجے۔وہاں رات کی شفٹ کا ایک الگ عملہ تھا جو صرف رات میں کام کرتا تھا۔اسی طرح آپریشن ہفتے میں پانچ دن چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔میری فیملی نے پاکستان سے آنا تھا اور مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔اپارٹمنٹ بھی لینا تھا اور گھر کا سارا فرنیچر اور دوسرے ضروری سامان کے لیے بھی ڈالر چاہئیں تھے۔اس لیے مجھے دن رات کام کرنا تھا۔جب سے ہیموسال کی جاب ہوئی تھی تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ ماہانہ دو ہزار ڈالر وہاں سے مل جایا کریں گے۔کینیڈا کی حکومت بچوں کا الاؤنس بھی دیتی ہے اور میرے دو بچوں کو چار سو ڈالر تک ملنے کی اُمید تھی۔اب مالی فکرمندی نہ تھی۔بچوں کے اسپانسر کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔مجھے اُمید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس کینیڈا میں ہوں گے۔سرجی نے بھی فیملی اسپانسر کی ہوئی تھی۔موسم بدل رہا تھا اور مشکل دن بھی بدلنے والے تھے۔

اپارٹمنٹ آٹھ سو سے نو سو ماہانہ کرائے پر ملتا تھا۔گاڑی ابھی میرے پاس نہیں تھی مگر گاڑی خریدنے کی زیادہ فکر نہ تھی بلکہ ڈرائیونگ لائسنس لینا دشوار تھا۔مفتی ڈرائیونگ ٹیسٹ میں

ایک بار اس لیے فیل ہوا تھا کہ کوئی کتا اس کے ٹیسٹ کے دوران کہیں سے نکل آ کر مرتے مرتے بچا تھا۔ اس کے بعد مفتی نے اعلان کر دیا تھا کہ یہاں ڈرائیونگ لائسنس لینا ایسے ہی ہے کہ کسی بھوکے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا جائے۔ مفتی کے اس فتوے کے بعد ہم سب ڈرائیونگ ٹیسٹ دینے سے توبہ تائب ہو چکے تھے۔ ویسے گاڑی خریدنا اتنا مشکل نہ تھا۔ ڈیڑھ سو ڈالر ماہانہ انشورنس دینی ہوتی تھی وہ ایک اضافی بوجھ لگتا تھا۔ اتنا تو ایک ماہ کا گروسری کا خرچ ہوتا ہے۔

شہباز اور سرجی اپنے ایک ہفتے کی سیکیورٹی گارڈ کی جاب کا کوٹہ مکمل کرنے کے بعد آج گھر پر بیٹھے تھے۔ سرجی ڈور وال کے باہر ان سوکھی جھاڑیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے جن پر سے اب برف ہٹ چکی تھی۔ شہباز ان دکھوں کو رو رہا تھا جو اس کی زندگی میں یا کسی کی بھی زندگی میں کبھی بھی آ سکتے تھے۔ مفتی اپنی جاب پر تھا۔ سرجی نے مجھے دیکھ کر اپنی کل فون والی حرکت پر معذرت کی۔ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، میں نسرین سے آج بات کرلوں گا۔“

وہ خوش ہوئے اور کراہتے ہوئے شہباز کو دیکھ کر بولے۔ ”آخر تو کب تک شام کے مردے کو روئے گا؟“ سرجی اپنے محاوروں سے کب باز آنے والے تھے۔

شہباز غصے سے بولا۔ ”اب آپ بددعائیں بھی دینے لگے ہیں۔“ پھر میری جانب دیکھ اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نہیں تھے تو یہ بھی خاموش تھا اور جب سے آپ واپس آئے ہیں ان کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔“

سرجی نے شکایت کی کہ انہوں نے کوئی بددعا نہیں دی بلکہ یہ کہا ہے کہ کب تک اپنے دکھ بیان کرتے رہیں گے۔ شہباز ہر وقت کوئی نہ کوئی شکایت اور اپنا غم کھول کر بیٹھا ہوتا تھا تو سرجی نے ایک طرح سے نصیحت کی تھی۔

مارچ کے درمیانی دن چل رہے تھے۔ موسم بہار کی جانب گامزن تھا۔ امیدوں اور مسرتوں کے پھول کھلنے کو تھے۔ آسمان وقفے وقفے سے آئندہ دنوں کی جھلک دکھلا کر پھر کہیں کھو جاتا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ استعارہ کہ اب آگے کے دن کڑے نہ ہوں گے۔ مجھے وہ کینیڈا دیکھنا تھا جو بہار اور گرمیوں کے دنوں میں وہ نظارے لے کر آتا ہے جو خواب مستی میں نظر آتے ہیں۔ یہاں کی گرمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ درجہ حرارت بیس کے آس پاس بھٹکتا رہتا ہے۔ تیس ہو تو بلا کی گرمی کہلائی جاتی ہے۔ اگر پینتیس ہو جائے تو لوگ بلبلا اٹھتے ہیں۔ پھر قدرت کا یہ ”ستم“ ایک دو دن بعد نرم پڑتا ہے اور بلا کی بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔

آج درجہ حرات غیر یقینی طور پر بیس کے قریب تھا۔ سرجی نے چولہے پر ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ وہ متواتر اسی جانب متوجہ تھے۔ میں نے اعلان کیا کہ نماز جمعہ کے بعد کسی پارک میں جا کر لطف اندوز ہوں گے۔ شہباز پھر کراہا۔ سرجی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ ہمارے کپڑے استری کر دیں گے۔ شہباز اور میں نے انہیں سختی سے ہنڈیا کی جانب توجہ رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ہم اپنے کپڑے خود استری کرلیں گے۔

جمعہ نماز پڑھ کر نکلے تو ہمیشہ کی طرح سرجی نے سڑک پار دیسی دکانوں کی جانب دوڑ لگائی۔ میں اور شہباز ایک دوسرے کو خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اب سرجی کی جلیبیوں پر ہم نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ واپس آئے تو خالی ہاتھ نہ تھے۔ ایک لفافے میں سموسے ڈالے ہمارے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اب جلیبیوں کی جگہ کیا سموسوں نے لے لی ہے؟“

کہنے لگے۔ ”اپنا تو یہ اصول ہے کہ آتا نہ چھوڑیے اور جاتا نہ موڑیے۔“

شہباز اور میں نے اس بار اس مثل کی کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ میں یہ تو سمجھ چکا تھا کہ آج انہیں جلیبیاں نہیں ملیں اور سموسے اٹھا لائے۔ اسی پس منظر میں وہ اب آتا جاتا کر رہے تھے۔

یہاں آپ کسی اسٹور میں آگ جلا کر اس پر کوئی کڑھائی نہیں رکھ سکتے کہ جس میں سموسے یا پکوڑے تلے جائیں یا پھر کوئی اور چیز تیار کی جائے۔ چولہا جلانے کے لیے باقاعدہ ایک لائسنس لینا پڑتا ہے اور لائسنس بھی اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ہمارے ایک جاننے والے نے ریسٹورنٹ کھولا۔ تندور کا لائسنس نہیں ملا۔ سٹی کو اعتراض تھا کہ حفاظتی اقدامات ٹھیک نہیں، جگہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ خطرے کی صورت میں باآسانی باہر نکلا جا سکے۔ میرا دوست چھ ماہ خوار ہوتا رہا اور آخر کار ہتھیار ڈال کر اپنا نقصان کر گیا۔

میں یہ سوچتا تھا کہ دیسی اسٹوروں میں جو سموسے، توے پر روٹیوں کے بنے پیک اور یہ جلیبیاں شاید اسٹور والے اپنے گھر سے بنوا کر لاتے ہوں گے۔ بعد کے دنوں میں یہ عقدہ کھلا کہ کم آمدنی والے لوگ گھروں میں یہ چیزوں بناتے ہیں اور جس قیمت پر اسٹوروں کو سپلائی کرتے ہیں اسٹور والے دوگنی قیمت پر گاہکوں کو بیچتے ہیں اگر کوئی دکان دن میں سو سموسے بیچے

تو بنانے والے کو پچاس ڈالر ملتے ہیں۔ خرچا نکل کر اسے پچیس تیس ڈالر بچتے ہیں۔ یہ امریکا اور کینیڈا ہے جہاں کچھ لوگ اس طریقے سے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ گھروں میں کیٹرنگ کرتے ہیں اگر کسی کے گھر پر پارٹی ہو تو وہ کیٹرنگ کروالیتا ہے۔ بریانی، نہاری، حلیم اور قورمہ کے علاوہ سیخ کباب بھی آپ کو ہوٹل کی نسبت بہت کم قیمت پر پڑتے ہیں۔

صبیحہ خانم ہمارے ملک کی بہت بڑی اداکارہ تھیں۔ ان کی سنتوش کمار سے شادی ہوئی۔ ایک باعزت مقام پایا۔ لاکھوں پرستار تھے۔ لوگ آگے پیچھے پھرتے تھے۔ پچھلے دنوں ایک خبر پڑھی کہ وہ اسٹور پر سموسے بنا کر بیچ رہی تھیں۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر مقامی اخبار کی خبر تھی۔ اس کو میں برا نہیں سمجھتا۔ ہر انسان اپنے موجودہ عہد میں زندہ رہتا ہے اور یہ ان کی بڑائی ہے۔

سرجی سموسوں کا بھرا لفافہ پکڑے مطمئن کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پارک میں بیٹھ کر پکنک منائیں گے۔ سرجی ہر وقت بھلے ہی وہ وقت کتنا ہی کڑا ہو، اس میں مثبت پہلو نکال لیتے تھے۔ یہ صفت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ میرے کچھ پڑھنے والے اس بات پر غصہ کرتے ہیں کہ سرجی آپ کو تنگ بہت کرتے تھے۔ میں انہیں بتاتا چلوں کہ سرجی کی وجہ سے ہم کبھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ جہاں میں ذرا لڑکھڑایا تو سرجی کا ہاتھ میرے کندھوں پر ہوتا۔ جب میری اور ان کی فیملی کینیڈا آئی تو ہم ایک ہی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ ہمارے روکنے کے باوجود ہر روز ان کا کوئی نہ کوئی بچہ کھانے کی ٹرے پکڑے ہمارے دروازے پر آجاتا تھا۔ وہ اپنے گھر جب بھی کھانا بناتے تو ہم کو بھی اس میں ہمیشہ شامل رکھتے تھے۔ سرجی پر مالی مشکلات بہت آئیں مگر وہ خاموشی سے کسی کو کچھ بتائے بغیر اکیلے سہتے رہے۔ میں مالی طور پر بہتر ہوا تو میں نے انہیں کچھ رقم دینا چاہی۔ میری منت سماجت کے علاوہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئی اور انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے حالانکہ معلوم تھا کہ انہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ ایسی خود داری بہت کم دیکھنے میں آتی ہے اور خاص کر جب کسی کے بچے محرومیوں کا شکار ہوں۔ اگر سرجی اپنی کچھ خصوصیات کے حامل نہ ہوتے تو شاید میں اپنے سے انہیں کہیں اور شفٹ کر دیتا۔

ہم اپارٹمنٹ واپس پہنچے تو مفتی کچن میں کھڑا دیگچے میں جھانک رہا تھا۔ مفتی کا کچن سے واسطہ صرف یہی تھا کہ کھانا کھالیا اور اس کو کچن صاف ملے۔ شہباز کو اعتراض ہوتا تو سرجی صفائی کر لیتے۔ مفتی نے ہمیں دیکھا اور پھر سرجی کے ہاتھ میں پکڑے لفافے کو دیکھا۔ پھر وہ لفافے کی جانب لپکا اور سرجی نے لفافہ پیچھے چھپا کر کہا۔ ”یہ پکنک میں کھائیں گے۔“ حیران مفتی کو پھر بتایا گیا کہ آج پہلی بار اچھے موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی پارک میں کھلے آسمان اور فضاء میں بیٹھنے کا ارادہ ہے۔

ٹورنٹو میں آپ کہیں بھی رہیں۔ آپ کے اردگرد متعدد پارک ہوتے ہیں۔ اکثر میں جاگنگ ٹریکس بنے ہوتے ہیں۔ خوب صورت گھاس سے ڈھکے لان اور ان کے کناروں پر رکھی بنچیں۔ ساتھ کوڑے دان رکھے ہوتے ہیں اور اسی لیے ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی آپ کو نظر نہیں آتا۔ ہم بھی ایک ایسے ہی پارک میں گھاس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ ایک تھرماس میں گرم چائے تھی۔ ساتھ چائے کے مگ اور ڈسپوزبل پلیٹیں تھیں۔ شہباز چادر پر لیٹا تھا۔ مفتی اسے گھور رہا تھا بلکہ ہم سب سے ناخوش تھا کیونکہ ہم بینچ کی بجائے گھاس پر بیٹھے تھے۔ پاکستان کی طرح کوئی یہاں گھاس کو نہیں روندتا جس طریقے سے ہم ”جاہلوں“ کی طرح اس کا ستیاناس کر رہے تھے۔ سرجی اور مفتی کی بحث شروع ہو چکی تھی۔ سرجی کہنے لگے۔ ”یہ کیا پکنک کہ اکڑ کر بینچوں پر بیٹھیں۔“ مفتی نے کہا۔ ”لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“ شہباز بولا۔ ”اگر کوئی بینچ پر بیٹھنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں درختوں کے سایوں میں نرم دھوپ پر بیٹھا اس نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں بعد ایک بڑے انتظار کے بعد مجھ پر چھایا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹ میں کچھ بادل ہماری طرح آوارگی سے گھوم پھر رہے تھے۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی مگر ہم اپنی جیکٹوں اور گرم ٹوپیوں کی وجہ سے بے آرام نہ ہو رہے تھے۔ گرم چائے مجھے دلاسے دیتی اور میں بہل رہا تھا۔ مارٹن گرو روڈ پر گاڑیاں اور بسیں آتی جاتی نظر آرہی تھیں مگر ان کا شور ہم سے دور تھا۔ کوئی بے ہنگم ٹریفک نہ تھی اور نہ ہی دھکم پیل۔ سارا نظام ایک قاعدے اور قرینے سے چل رہا تھا سوائے ہمارے، جو قدرے بدتمیزی سے چادروں پر پاؤں پسارے لیٹے تھے۔ کچھ دیر میں مفتی بھی نارمل ہو گیا اور پھر ہماری طرح وہ بھی نظریں چرائے لیٹا تھا۔ مطمئن لمحوں میں نیلے آسمان تلے تیرتے بادل رگ و پے میں کیا کیا مسرتیں بھرتے ہیں، اس کا احساس مجھے پہلی بار کینیڈا میں ہو رہا تھا۔ پہلے ہم چائے اور سموسے کھا کے خاموش پڑے رہے اور پھر ایک دوسرے سے دلوں کے حال جاننے لگے۔ دلوں کے تار چھڑے تو ہماری باتیں سُروں کی طرح بہنے لگیں۔ باتیں کرتے بھی آنکھیں خالی خالی نظر آنے لگتیں اور کبھی مسکرانے لگتیں۔

کسی نے سرجی کو کریدا تو وہ بہنے لگے۔ درد اور دکھ ان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگا۔ باہر کی کھلی صاف ہوا کے جھونکے انہیں بیدار کر گئے۔ وہ کہنے لگے۔ ''میں پاکستان میں بڑی محنت اور مشقت کے بعد اپنے مقام پر پہنچا تھا۔ میں نے پڑھائی کی اور اس کا خرچا اٹھانے کے لیے فٹ پاتھوں پر سامان بیچا۔ شادی ہوئی تو معلوم ہوا کہ میری کوئی سالی امریکا میں عالیشان زندگی گزار رہی ہے۔ میں رشوت اور حرام کی آمدنی پر لعنت بھیجتا تھا۔ اپنی تنخواہ سے گھر جیسے بھی چلاتا مگر اچھا چلا رہا تھا۔ امریکا میں سالی صاحبہ ہر بار فون کر کے بہن کو کہتی کہ آپ لوگ بھی سب چھوڑ چھاڑ کر امریکا آجائیں۔ میں جاب سے گھر جاتا تو ہر وقت یہی سننے کو ملتا۔ اسی جبر کے تحت میں نے کینیڈا کی امیگریشن کے لیے درخواست دے دی۔ امیگریشن ملی تو گھر میں میرے علاوہ سب پر شادی مرگ کی کیفیت تھی۔ سب نے مل کر ''پوگرام'' یہ بنایا کہ میں کینیڈا میں انٹری دوں گا اور فیض صاحب وہیں سے مجھے لے کر امریکا چلے آئیں گے اور پھر میری زندگی بھی انہی کی طرح عالیشان ہو جائے گی۔ مجھے بھی آنے سے پہلے سب نے امام ضامن باندھے۔ داتا دربار بھی گیا۔ بہت سی اُمیدیں لے کر کینیڈا ایئر پورٹ آیا تو معلوم ہوا کہ فیض صاحب تو نہیں آئے۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ندیم بھائی کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میری تو تمام آرزوئیں خاک میں مل گئی تھیں مگر میں اپنے منہ سے کچھ نہ کہتا تھا۔''

پھر وہ کہتے کہتے رک گئے۔ اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ہم تینوں حالانکہ یہ سب جانتے تھے مگر ان کی دل سے نکلتی باتیں سن کر خاموش اور اداس تھے۔

انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی اور پھر آسمان کی وسعتوں میں نظریں گاڑھ کر بولنے لگے۔ ''میں اپنی جاب چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں شاید سیکیورٹی گارڈ کی جاب کے علاوہ مجھے کوئی اور جاب نہ ملے گی۔ فیملی کو اسپانسر بھی کر لیا ہے۔'' وہ پھر خاموش ہو کر سوچوں میں ڈوب گئے۔ پھر سوچوں سے باہر نکلے تو بولے۔ ''کوئی بات نہیں۔ اللہ سب خیر کرے گا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ان پر ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔

سارا ماحول بے رونق ہو گیا۔ مفتی جیسا شخص بھی کھوئی آنکھوں سے انہیں تک رہا تھا۔ ہم دل گرفتہ بیٹھے تھے اور سرجی پھر میری جانب دیکھ کر بولے۔ ''نسرین کو فون نہیں کیا؟ اس معصوم پر کیا گزر رہی ہو گی؟'' اور ہم سب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

☆......☆

شام سے ذرا پہلے ہم اپارٹمنٹ آئے۔ سردی کہیں دبکی پڑی تھی اور سورج کے جاتے ہی وہ باہر آ کر ہم پر برسنے لگی۔ ٹورنٹو کٹر کنے لگا تھا کہ ہم اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ سر جی نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''کمرے میں جا کر نسرین کو فون کرو۔ میں اتنی دیر میں کھانا لگاتا ہوں اور باہر کے فون کو شہباز کی دسترس سے دور بھی رکھوں گا۔''

''فون تو پہلے بھی آپ نے ہی اٹھایا تھا اور اب مجھے بیچ میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔'' یہ شہباز تھا جو سرجی پر لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

میں جب کمرے میں جا رہا تھا تو سرجی شہباز سے یہ کہہ رہے تھے۔ ''تم آڑے ترچھے کیوں ہوتے ہو جب دل میں کوئی میل نہیں ہے؟'' ان کی بات آگے بڑھ رہی تھی کہ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میں نے فون ملایا تو نسرین نے ہی اٹھایا۔ مجھے یہ گمان تھا کہ وہ شکوے شکایتیں میرے سامنے رکھے گی اور میں جواب میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔ مجھے مایوسی ہوئی جب وہ شکوہ طراز نہ بنی۔ میری وضاحتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''کب آئے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''کل میں نے فون کیا تھا تو سعد نے اٹھایا تھا۔''

وہ بولی۔ ''پھر فون بند کر دیا تھا؟''

میں نے سرجی کی غلطی بیان کی تو جواب میں صرف۔ ''ہوں'' کہا۔ میں نے پوچھا۔ ''ناراض ہو؟''

جواب آیا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

جواب دیا۔ ''کچھ نہیں۔''

میرے سوالوں کے اس کے ہاں جوابات ختم ہو گئے تھے۔ میں خاموش رہا تو بولی۔ ''کوئی اور سوال نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی کیا سوال پوچھوں جب کہ تمہارا جواب مجھے معلوم ہے۔'' یہ سن کر اس کی ہنسی مجھے سنائی دی۔ میں نے پوچھا۔ ''ہنس کیوں رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''ہیمو سال کب جوائن کر رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''تین دن بعد منگل کے روز۔''

اس نے جواب میں کہا۔ ''میں نے اپنے سوالات اکٹھے کر رکھے ہیں ملنے پر پوچھوں گی۔'' پھر ایک توقف کے بعد بولی۔ ''کل ویک اینڈ ہے۔ کیا مل سکتے ہو اگر فرصت ہے تو؟''

وہ ایک اکھڑ مزاج شخص تھا۔
باکمال جہازراں کی حیثیت سے اسے بہت شہرت حاصل تھی۔لیکن اس کی یہ خرابی بہت نمایاں تھی کہ وہ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔
اس وقت اس کا دماغ اس لیے آسمان پر تھا کہ اسے دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مضبوط مسافر بردار بحری جہاز کا کپتان بنا دیا گیا تھا۔
اس کپتان کا نام تھا کیپٹن ایڈورڈ اسمتھ اور جہاز کا نام تھا ٹائی ٹینک۔یہ وہی ٹائی ٹینک ہے جو ایک داستان بن کر رہ گیا ہے۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس پر لکھی گئی ہیں۔ایک شاندار فلم بھی بن چکی ہے۔دنیا کا بچہ بچہ اس جہاز کے نام سے واقف ہے۔
کیپٹن ایڈورڈ اسمتھ کو وہ لمحات بہت اچھی طرح یاد تھے جب اس عظیم الشان بحری جہاز کو پہلے سفر پر انگلینڈ سے روانہ کیا گیا تھا۔اس کی منزل امریکا تھی۔
کیا شاندار انداز میں جہاز کی رخصتی ہوئی تھی۔سیکڑوں لوگ بندرگاہ پر موجود تھے۔ہزاروں غبارے اور کبوتر فضا میں چھوڑے گئے تھے۔شاہی بینڈ مسلسل دھنیں بجا رہا تھا۔خود کیپٹن اسمتھ لوگوں سے مبارکبادیں وصول کرتے کرتے تھک چکا تھا۔
اس جہاز کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ اس جہاز کو اگر خدا بھی چاہے تو ڈبو نہیں سکتا (نعوذ باللہ) اس کی بناوٹ اتنی ہی مضبوط اور شاندار تھی۔
بالآخر یہ جہاز اپنے سفر پر روانہ ہوا۔
منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا وہ جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔اس وقت وہ اپنے کیبن میں سویا ہوا تھا۔اور خواب میں بھی وہ یہ

میں چپ رہا تو بولی۔"سعد کے لیے کل بے بی سٹنگ کروالوں گی۔"
میں نے ہامی بھری اور کل کیل سب وے پر گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کیا اور فون بند کردیا۔
آج وہ الجھی ہوئی تھی یا کہ میں، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔میں نے اپنا سر جھٹکا اور سوچوں کو باہر پھینکا۔مجھے معلوم نہ تھا کہ کل کیا بات ہوتی ہے؟ کوئی بات ہوتی ہے یا آج فون والی ہاں ہوں میں بات ختم ہوگی۔میں پرنس چارمنگ سے دوبارہ وہ ندیم بن گیا جو ٹورنٹو کی سختیوں سے لڑتا چلا آرہا تھا۔
میں کمرے سے باہر نکلا تو سرجی اور شہباز کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور میرے جوابات وہی صرف ہوں یا ہاں میں تھے۔ان کی جانب سے کوئی سوال نہ آیا کیونکہ شاید میرے چہرے پر لکھے جوابات انہوں نے پڑھ لیے تھے۔

دوسرے دن کا موسم ویسا ہی تھا جیسا کل تھا۔ٹھہرا ہوا اور خوشگوار۔ہوائیں چل رہی تھیں مگر خوش ہونے والوں کو تسلی دیتی ہوئیں۔نیلا آسمان میرے سر پر چھایا تھا اور وہی بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے ہواؤں کی سمت رواں دواں تھے۔میں نے جیکٹ کی جیب میں نسرین کے لیے خریدا گیا پرفیوم رکھا۔
دوسری جیب میں اونی ٹوپی رکھی اور ناشتا کرنے کے بعد چائے کا ایک کپ پی کر باہر نکل آیا۔مفتی، سرجی اور شہباز کیوں خاموش تھے، مجھے معلوم نہ تھا۔میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔شاید سب جانتے تھے کہ باہر کا موسم میرے اندر آبیٹھا ہے۔
میں کپلنگ سب وے جانے والی بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑا ہوگیا۔شیشے کے کیبن سے ٹیک لگائے میں بس کے انتظار میں تھا۔ویک اینڈ پر بسیں کچھ دیر سے نمودار ہوتی ہیں اور میں اس انتظار میں موسم کو سردی سے باہر آتے محسوس کر رہا تھا۔برف پگھل کر کبھی کی غائب ہوچکی تھی۔درجہ حرارت دس کے قریب تھا اور سب لوگ اسی کو بہار کی آمد بتا رہے تھے۔درخت گو ابھی تک بے برگ تھے مگر اب وہ بھی مسکراتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔لگتا تھا کہ بہار کی آمد کی نوید انہوں نے بھی کہیں سے سن لی ہے۔میرا اپنا دل بھی مجھے نئے موسموں کے استعاروں کی خبریں دے رہا تھا۔آج بھی موسم سرد تھا مگر بے چینی نہ تھی۔اتنے میں ایک مفلوک الحال شخص کوئی پرانی سی جیکٹ اپنے اوپر ڈالے کانپتا ہوا آیا اور شیشے کے کیبن میں رکھی بینچ پر آبیٹھا۔میں بھی کھسک کر کیبن میں آگیا تھا۔اب میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے کیبن کے کونے میں دیکھ رہا

دیکھ رہا تھا کہ جب وہ امریکا کی بندرگاہ پر اترے گا تو وہاں کتنا شاندار استقبال ہوگا۔
بہت سہانا خواب تھا اور اس سہانے خواب میں اس وقت گڑبڑ ہوگئی۔ جب کسی نے دروازے پر زور زور سے دستک دینی شروع کردی۔
وہ بہت جھلایا ہوا بستر سے اترا تھا۔ پھاڑ کھانے والا انداز تھا اس کا۔ اس نے اپنے کیبن کا دروازہ کھولا تو اس کا ایک ماتحت بہت بوکھلایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''کیا بات ہوگئی۔ کیا قیامت آگئی۔'' اسمتھ نے پوچھا۔
''جناب آئس برگز......'' ماتحت نے بتایا۔ ''جہاز کے راستے میں آئس برگ آرہے ہیں۔''
''کس نے بتایا تم کو۔''
''ہمیں اطلاع دی گئی ہے جناب۔''
''بے وقوف انسان۔ کیا تم لوگوں نے ٹائی ٹینک کو معمولی بوٹ سمجھ رکھا ہے کہ آئس برگ سے ٹکرا کر الٹ جائے گی۔''
''پھر بھی جناب۔ خطرہ تو ہے نا۔''
''کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ یہ جہاز خود اپنی رکاوٹ صاف کردے گا۔''
اور کیپٹن اسمتھ اور اس کے عملے کے کچھ افراد کی یہی ایک ایسی زبردست غلطی تھی جس نے ٹائی ٹینک جیسے جہاز کو برف کے تودوں سے ٹکرا کر پاش پاش کروادیا۔
اسمتھ نے مانیٹرنگ کو نظر انداز کرکے تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی کی تھی جس کی وجہ سے ایک اتنا بڑا حادثہ ہوگیا جو داستان بن کر رہ گیا۔

ہے۔ میں ذرا متوجہ ہوا تو وہ سامنے شیشے کے پار سڑک پر آتی جاتی ٹریفک دیکھنے لگ گیا۔ یہ تماشا پھر شروع ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا کہ کیبن کے کونے میں کوئی قیمتی چیز پڑی ہے اور وہ میری نظریں بچا کر اسے اٹھانا چاہتا ہے۔ میں نے غور سے جواب کیبن کے کونے میں زمین پر دیکھا تو دس سینٹ کا سکہ پڑا تھا۔ وہ ''قیمتی چیز'' اس کی نظر میں قارون کا خزانہ تھی جو وہ مجھ سے چھپ کر اسے تھیانا چاہتا تھا۔ میں اندر سے دہل گیا۔ میں دنیا کے ترقی یافتہ ملک میں کھڑا تھا اور وہ ملک جو ناروے اور سوئیڈن کی طرح سوشل امداد دیتا ہے۔ اب اس شخص نے اپنی بائیں ٹانگ کو لمبا کیا اور اپنے پاؤں سے آہستگی سے اس خزانے کو اپنی طرف کھینچنے لگا اور آخر کار وہ کامیاب ہوگیا۔ کینیڈا کی حکومت ناکام ہوئی۔ میرے ذہن میں یہ خیال اسی لمحے اترا کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی ہر ایک کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ بھلے وہ دنیا کے امیر ترین ملک ہی کیوں نہ ہوں۔
بس آئی اور میں کیلنگ سے ہوتا ہوا کیل سب وے پر اترا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا اور سامنے چمکتے فرش پر رکھی بینچ پر دلکش نسرین بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اترتے مسافروں پر تھیں۔ چند لوگ میرے ہمراہ اترے اور ہم اسی لمحے ایک دوسرے کی نظروں کی زد میں تھے۔ آج اس نے سیاہ ڈریس پینٹ پر ہلکی نیلے رنگ کی شرٹ پہنی تھی اور اس پر براؤن جیکٹ۔ بال شانوں پر بکھرے تھے اور رنگ پورے پلیٹ فارم پر حاوی تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی اور ہنستی ہوئی میرے گلے میں جھول گئی۔ میرا اپنا وزن ٹورنٹو کی شدتوں نے بہت کم کردیا تھا مگر میں اس کے وزن کو باآسانی سہہ گیا۔ میں اپنی فطرت کے تحت سہم کر ارد گرد دیکھنے لگا۔ ایک دو لوگ پاس سے گزرے بھی تو ایسے جیسے کچھ دیکھا بھی نہ تھا۔ اس نے پہلے دن مجھ سے کہا تھا کہ نسرین ایران میں ایک پھول کا نام ہے اور اس دن واقعی معلوم ہوگیا کہ نسرین ایک پھول ہے۔ اس پھول کو توڑنے کی بجائے میں نے سونگھ کر احتیاط سے اپنی ٹہنی پر رہنے دیا مگر اس کی خوشبو میرے وجود میں بھر گئی تھی۔
وہ مسکرا رہی تھی، پھر کہنے لگی۔ ''شکر ہے تم نے اپنے جنگلی بال تو کٹوائے۔'' پھر مجھے دیکھ کر بولی۔ ''بال کٹوانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا مگر ٹھیک ہے۔''
میں خاموش کھڑا مسکرانے کی کوشش کررہا تھا۔ دراصل اس کے اس طرح گلے لگنے سے میں ذرا گھبرا گیا تھا۔ کین سینٹر میں تو ایک دو بار کسی نہ کسی وجہ سے ہاتھ پکڑا تھا یا ایک آدھ بار

اس حادثے میں 1514 افراد ہلاک ہوئے اور ایک سو اسّی ملین کا نقصان ہوا تھا۔
انسان اگر غلطیاں نہ کرے تو اتنے بڑے حادثے کیوں رونما ہوں۔ ایسے حادثے یہ یاد دلاتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔
بعض غلطیاں انسان کی اپنی ذات یا اس کے گھر والوں تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن کچھ خطائیں ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں، اور ان کی وجہ سے تاریخ بدل جاتی ہے۔ اور بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔
جوزفین اور ول سن کی جوانی گزر چکی تھی۔ اور اب بڑھاپا آ گیا تھا۔
ان کی شادی کو چالیس سال ہو چکے تھے۔ چالیس سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ نسلیں پیدا ہوتیں اور جوان ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں کبھی وہ دن نہیں آئے تھے جب انہیں معاشی طور پر فراغت حاصل ہوتی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ میکس ویل قصبے میں گزرا تھا۔ وہ اسی قصبے میں بڑھئی کا کام کیا کرتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ فرنیچر بنایا کرتا تو گویا جوانی محنت کرتے ہوئے ہی گزر گئی۔
دونوں میاں بیوی ملازمتیں کیا کرتے اور اچھے دنوں کے خواب دیکھتے۔ بیوی ہمیشہ ایک خواب دیکھا کرتی کہ ان کے پاس اچانک کہیں سے دولت آ گئی ہے۔
وہ جب اپنا یہ خواب اپنے شوہر کو سناتی تو وہ اس پر افسوس ہی کرتا رہ جاتا۔ دن اسی طرح گزرتے چلے گئے۔
اولادیں بھی ہوئیں اور وہ اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بیٹے انگلینڈ سے امریکا چلے گئے اور وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔
اب یہ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے تھے اور اپنے خوابوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ بیوی کو لاٹری کے ٹکٹ خریدنے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کوئی نہ کوئی لاٹری اس کے نام نکل آئے گی۔
اس بار بھی اس نے ایک ٹکٹ خرید کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار ضرور کوئی معجزہ ہوگا۔
وہ اپنے شوہر سے کہتی۔ ''فرض کرو۔ اگر ہمارے پاس ڈھیر سی دولت آ گئی تو ہم کیا کریں گے۔''

مجھ سے ٹکرائی تھی۔ آج کا والہانہ پن میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔
ٹرین شور مچاتی چلی گئی اور ہم ابھی وہیں کھڑے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہیں کھڑے رہنے کا پروگرام ہے؟''
وہ بولی۔ ''آج میں تمہیں کہیں لے چلوں گی۔'' پھر کچھ لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور سوال کیا ''چلو گے؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سب وے کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل آئے۔ موسم ایک دم سہانا ہو گیا تھا۔ میں دونوں ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے کھڑا تھا تو وہ کہنے لگی۔
''خاموش کیوں ہو؟''
میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم تو ہے کہ میں ایسے ہی رہتا ہوں۔''
وہ بجھ سی گئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی۔ ''کبھی تو میرے ساتھ اپنی اس خاموشی کو توڑ دیا کرو۔''
یہ کہہ کر اس نے ایک کیب کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور سے بولی۔ ''ہمبر پارک جانا ہے۔''
ڈرائیور کو گھورا۔ اس نے سر ہلایا اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کیب نے موڑ کاٹا اور جنوبی سمت بڑھتی چلی گئی۔
پندرہ منٹ بعد کیب نے گارڈنر ایکسپریس وے کراس کی اور پارک لائنز روڈ سے ہوتے ہوئے ہم انٹاریو لیک کے سامنے آ رکے۔ جھیل کے بیچوں بیچ ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہمبر پارک میری او جھیل نظروں سے نکل کر اپنے دلکش منظروں میں پھیلتا چلا گیا۔ ہم پارکنگ میں گاڑی سے نیچے اترے اور میری نگاہیں نیلے شفاف آسمان پر تھیں جہاں کہیں کہیں بادل منڈلا رہے تھے۔ جھیل کا پانی برف کی تہوں سے نکل کر آسمان کے رنگوں میں رنگ گیا تھا۔ سردی تھی مگر گداز حدت بھی تھی، اسی لیے ستاتی نہ تھی۔ میں دل میں نسرین کے ذوق پر اسے داد دے رہا تھا۔
کیب چلی گئی تھی۔ نسرین مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''کہیں ان مناظر میں کھو کر مجھے بھول ہی نہ جاؤ؟''
میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب میں کہا۔ ''تمہیں یاد رکھنے کے لیے یہ مقام اور وقت ہی بہت ہے۔''
یہ پارک جھیل کے اندر ایک جزیرہ نما میں بنایا گیا تھا۔ دریا ہمبر ٹورنٹو کے مغربی حصوں سے گزر کر اس میں آ گرتا ہے۔ اس جزیرے میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی شفاف پانیوں والی جھیلیں تھیں۔ ان جھیلوں پر مرغابیاں تیر رہی تھیں اور بہت سے پانیوں پر اپنی پرواز بھر رہی تھیں۔ پختہ اور کچے راستے تھے جن پر کچھ لوگ ہماری طرح چل رہے تھے۔ درخت تھے مگر سوکھے تھے۔ چند ماہ بعد انہی پر سبز لباس اترنا تھا اور وہ مختلف رنگوں اور عکسوں میں پانیوں کے اندر نظر آنے تھے۔ گھاس کے لان

''کرنا کیا ہے۔ دنیا کی سیر کو نکل جائیں گے۔'' شوہر جواب دیا کرتا۔
ایک صبح بیوی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے شوہر کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بےدار کیا۔ ''یہ دیکھو۔ یہ دیکھو۔''
''کیا دیکھوں۔''
''یہ ڈائری۔ یہ اخبار۔'' بیوی نے کہا۔ ''میں نے اس پر لاٹری کے ٹکٹ کا نمبر لکھ لیا تھا۔ یہ نمبر دیکھو۔ یہ اخبار دیکھو۔ ملاؤ نمبر۔ ہمیں پہلا نمبر مل چکا ہے۔''
اب تو شوہر کی بھی نیند ہوا ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی نمبر ملایا۔ دونوں ایک ہی نمبر تھا۔ اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ ''ہاں ہاں۔ وہی نمبر ہے۔ جاؤ، جلدی سے ٹکٹ لے کر آجاؤ۔''
بیوی دوڑتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ''وہ۔ وہ ٹکٹ تو نہیں ہے۔''
''نہیں ہے۔ کہاں رکھا تھا تم نے۔''
''میں نے کافی کی خالی شیشی میں رکھا تھا۔''
''اوہ گاڈ۔'' شوہر نے اپنا سر تھام لیا۔ ''وہ شیشی۔ وہ تو میں ڈسٹ بن میں پھینک آیا ہوں۔''
''کیا۔'' بیوی کے بھی ہوش اڑ چکے تھے۔
''اس کے بعد نہ تو ان بے چاروں کو وہ ٹکٹ مل سکا اور نہ ہی انعام مل سکا۔ آپ کو معلوم ہے۔ انعام کی رقم بنتی تھی۔ 181 ملین۔
جی ہاں 181 ملین۔ میرا خیال ہے کہ کسی انعام کے حوالے سے کسی غلطی کی اتنی بڑی سزا کسی کو نہیں ملی ہوگی۔

نعمان اشرف، راولپنڈی

تھے، جن پر سبزہ اس موسم میں بھی نمایاں تھا۔ بعد کے مہینوں میں انہوں نے کیا کیا رنگ و روپ دکھانے تھے اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ یہاں تنہائی کے گوشے تھے جن میں کوئی مخل نہ ہوتا تھا۔

ہم ایک راستے پر چلے جا رہے تھے۔ اردگرد پانی تھا اور سامنے لیک انٹاریو کا حدِ نگاہ تک نیلا پانی جھلمل جھلمل کرتا نظر آ رہا تھا۔ دوسری جانب اونچی اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں اور دور پڑے ٹورنٹو کا ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتیں آسمان کی بلندیوں کو چھوتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان سی این ٹاور اونچائی میں سب سے یکتا نظر آ رہا تھا۔ جھیل کے پانیوں پر کچھ کشتیاں معلوم نہیں نیلے پانیوں میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ بس ایک منظر تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے جھیل کنارے ایک درخت تلے رکھی بینچ پر آبیٹھے۔ دھوپ ہم پر پڑتی تھی اور آج اس کی ہلکی سی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ آسمان چپ تھا اور سارے نظارے چپ تھے۔ دھیرے سے چلتی ہوا میں ہم خاموش تھے اور ہمارے علاوہ سب ہی ہماری باتیں کر رہے تھے۔ ایسا نظارہ ایک انعام تھا جو مجھے آج نسرین کے ذریعے ملا تھا۔

نسرین نے میرا دیا پرفیوم اپنی جیکٹ کی جیب سے نکالا جو میں نے منہٹن سے نسرین کے لیے خریدا تھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی اور تادیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''کیا تم نے مجھے نیویارک میں یاد رکھا یا پھر سرجی تم کو یاد کراتے رہے؟''
میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم یاد تو تھیں مگر سرجی کو شاید بہت یاد آ رہی تھیں۔ جبھی تو وہ اپنی طرف سے مجھے یاد دلاتے رہے تھے۔''

وہ خاموش ہو کر جھیل کے نیلے پانیوں کے پار ڈاؤن ٹاؤن کی سربلند عمارتیں دیکھنے لگی۔ ایک مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سکوت کی دیوار تھی جو ماحول میں کہیں کھڑی تھی۔ اس فضاء میں بولنا جرم لگ رہا تھا اور ہم بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں کی خاص بات مختلف پرندے اور ان کے گھونسلے تھے۔ پرندے نچلی پرواز بھرتے اور ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ انہی کی آوازیں تھیں جو تنہائی کو زیادہ اجاگر کر رہی تھیں۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں کتنا ڈارک لگتا ہے۔''
میں ہنس پڑا اور کہا۔ ''نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میرے

ہاتھوں میں بھلے لگتے ہیں۔'' بات سمجھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا اور ہمارے سر کے اوپر گزرتے پرندوں نے اس کی ہنسی شاید پہلی بار سنی کیونکہ ایسا لگا کہ وہ ذرا دیر کو تھم گئے ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ''اس پارک کو تم نے کہاں سے ڈھونڈا؟''

وہ جھیل کے نیلے پانی میں کنکر پھینکتے پھینکتے رک گئی۔ کچھ سوچا اور پھر کنکر پھینک کر بولی۔ ''اگر بتا دوں تو میرا یقین کرلو گے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں کرلوں گا۔'' اتنے میں سرد ہوا کا کوئی جھونکا کہیں سے ہمیں ڈھونڈتا آیا اور وہ میرے ساتھ آلگی۔ جھونکا چلا گیا تھا مگر وہ جدا نہ ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''تم ہر وقت مجھ سے کہتے تھے کہ ہائی پارک مجھے لے چلنا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں تنہائی اور خوب صورت مناظر بہت پسند ہیں۔ تم نیو یارک میں تھے اور میں نے تمہارے پیچھے اسے ڈھونڈ نکالا۔'' وہ لحاتی توقف کے بعد بولی۔ ''ایک بار میں یہاں اکیلی آئی تھی۔ یہ دیکھنے کہ کیا واقعی تمہیں پسند آسکتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پھر تم نے کیا ڈھونڈا؟''

کہنے لگی۔ ''میں تین گھنٹے اس میں پھرتی رہی۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی جھیلیں دیکھیں۔ بہت سے پرندے اور خاموشی پھر محسوس کیا کہ تمہیں یہ سب بہت پسند آئے گا۔''

میں حیران ہوا کہ میں بھی اس قابل ٹھہرا کہ ایک مہتاب جیسی لڑکی مجھ جیسے کے لیے یہ سب کرسکتی ہے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں چمک تھی۔ پہلی بار میں نے اپنی گرفت اس کے کاندھوں پر جمائی اور اس نے سر میرے کندھے پر رکھ لیا۔

یادوں کے دریچے پہ وہ دیتی رہیں دستک
کل رات بہت مجھ کو ستاتی رہیں وہ آنکھیں

میں اتنے سالوں بعد یہ یادیں تحریر کررہا ہوں اور اب بھی میرے ذہن کے پردے وہ چمکتی اور مسکراتی آنکھیں نمایاں ہیں۔ ہم بہت دیر بیٹھے رہے۔ زیادہ دیر خاموش رہے مگر کچھ نہ کچھ سنتے رہے۔ شاید کچھ سرگوشیاں، کچھ چاپیں، کچھ سرسراہٹیں اور کچھ ان کہی باتیں۔

وہ اپنے ساتھ کچھ سینڈوچ بنالائی تھی۔ کوک کے دو ٹن پیک اور دو پانی کی بوتلیں۔ مجھے بھوک نہ تھی مگر پھر بھی میں نے اس کے ہاتھوں سے سینڈوچ لے لیا۔ ایران میں مرچ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا کہ نسرین نے بھی نہیں ڈالی تھیں۔

ہم اس لنچ کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کچے اور کچھ پکے راستے تھے۔ مجھے راستے کی ساخت نہیں بلکہ راستہ دیکھنا تھا۔ اس جزیرے میں ایک جھیل کے سبز پانی اور اس پر تیرتی مرغابیاں تھیں۔ ہم وہیں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

میں اب اپنے اصلی سوال پر آیا۔ ''بھائی نے دوبارہ رابطہ کیا؟''

وہ کچھ اداس ہوگئی۔ پھر بولی۔ ''ہاں! کئی بار۔''

''پھر کیا سوچا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چپ ہوگئی۔ میں نے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر نہیں جانا چاہتی تو مت جاؤ۔''

اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''پھر سے ایک بار بتاؤ؟'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے جھیل میں تیرتی مرغابیوں پر نظر ڈال کر کمزور لہجے میں کہا۔ ''تمہارا واپس چلے جانا ٹھیک ہے۔''

وہ رک سی گئی۔ بہت سی پرچھائیں اس کے چہرے پر آئیں۔ اس کی آنکھیں برسنے کو تھیں۔ میں نے اس کا سر تھام کر اپنے کندھے پر رکھ دیا اور پھر وہ آنکھیں برس پڑیں۔ میں خود آبدیدہ ہوگیا تھا۔ میری جیکٹ کندھوں پر گیلی ہورہی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں تھیں اور دائیں ہاتھ اس کے گرد اسے تھامے ہوئے تھا۔ بہت وقت گزر گیا۔ وہ تب تک بہتی رہی جب تک اس کے اندر کا دریا اتر نہ گیا۔ ہم اٹھے تو سائے لمبے ہورہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ کہنے لگی۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم نے ہی تو کہا تھا کہ ڈنر تمہارے گھر پر ہوگا۔''

دو سرخ آنکھیں میری جانب اٹھیں اور بولیں۔ ''نہیں! اب تم گھر جاؤ۔''

میں سمجھ گیا۔ اسے کیب پر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر اتارا۔ جانے سے پہلے وہ بولی۔ ''پھر ملو گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''سعد کا سکول جون تک ہے۔ تب تک مجھے برداشت کرنا اور رابطہ ختم نہ کرنا۔''

میں نے وعدہ کیا اور اس نے اعتبار شاید نہ کیا۔ پھر میری آنکھیں بھر آئیں اور انہی نظروں سے دیکھا تو اسے اعتبار آگیا اور وہ مجھے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ تادیر سسکیاں لیتی رہی اور میں

خاموش کھڑا رہا۔ وہ تھمی تو آہستگی سے اسے اپنے سے جدا کیا۔

پھر سوچوں میں ڈوبا کیب میں آبیٹھا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو ان سوچوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ میں خالی خالی سا اپارٹمنٹ کی جانب بڑھ گیا۔ مڑکر دیکھا تو لان میں کھڑے درخت بھی سوچوں میں ڈوبے تھے۔

☆......☆

مہینوں گزر گئے مگر ہمارے اپارٹمنٹ کا ماحول تبدیل نہ ہوسکا تھا۔ ہم اس ماحول کے عادی ہو گئے تھے بلکہ اس کیفیت سے نکلنا بھی نہ چاہتے تھے جس دن سرجی اور شہباز کے چٹکلے نہ ہوں وہ دن بہت بھاری گزرتا تھا مگر ایسے دن کم تھے جب ہم مسکرائے نہ ہوں۔ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی سمیت تینوں کسی بحث اور شور شرابے میں گھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا اور کوئی میری طرف زیادہ متوجہ نہ ہوا۔

معاملہ یہ تھا کہ شہباز کی Op-Co کے پروگرام کے تحت ایک لیب میں انالسٹ کی جاب ہوچکی تھی۔ وہاں اسے ایک دو ماہ بعد مستقل جاب ملنے کی پوری اُمید تھی۔ وہ سرجی کو کہہ بیٹھے تھے کہ آپ کو اپنی جاب کی فکر بھی نہیں اور ہمیشہ ایسے ہی نہ رہ جائیں۔ ایسے نہ رہ جانے کا مقصد یہ تھا کہ اسی سیکیورٹی گارڈ کی جاب میں پھنسے نہ رہ جائیں۔ سرجی نے اس کو طنز سمجھا اور بہت کچھ اور سنوانے کے بعد یہ بھی بول گئے تھے۔ ''واہ بھائی واہ کیا تھے اور کیا اپنے آپ کو سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ تو ایسے ہوا کہ چھچھوندر کے سر چنبیلی کا تیل۔''

اب آج کے فساد کی وجہ تو چھچھوندر تھی۔ شہباز نے اسے اپنے دل پر لے لیا تھا اور سرجی اپنی بات پر جم چکے تھے کہ انہوں نے صحیح بولا ہے اور ساتھ ساتھ رات کے کھانے پر بھی شہباز پر پابندی لگادی تھی۔ کیونکہ وہ انہوں سے ہمیشہ کی طرح خود بنایا تھا۔ مفتی میٹرس سے ٹیک لگائے سرپنچ بنا بیٹھا تھا۔ شہباز لال بھبھوکا ہوکر کارپٹ پر ہونک رہا تھا اور سرجی اپنے گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھے اپنے چہرے پر آزردگی طاری کیے خفا بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ صورتِ حال کوئی نئی نہ تھی اور اسی لیے میں واش روم میں داخل ہوگیا اور نہا کر تازہ دم ہوا۔ کپڑے تبدیل کیے اور باہر لیونگ روم میں آیا تو سبھی اپنی اپنی پوزیشن پر براجمان تھے۔

سب نے مل کر سارا واقعہ میرے گوش گزار کیا۔ میں نے شہباز کو سمجھایا کہ سرجی نے تمہاری بات کو طنز سمجھا اور محاورہ بول گئے جو تمہاری سمجھ میں نہ آیا۔

شہباز کہتا رہا کہ چھچھوندر ایک گالی ہے۔ میں نے سرجی سے بمشکل اس محاورے کا مطلب پوچھا اور انہوں نے اس کا مطلب غلط بتایا کہ اللہ سب پر ایک نہ ایک دن اپنا کرم کرتا ہے۔ شہباز نے سنا تو اس کے زرد چہرے پر سوچ کی ایک لہر آئی۔ مفتی نے بھی میری بات کی تائید کی تو شہباز بہل گیا۔ حالانکہ سرجی نے بعد میں جو مطلب مجھے سمجھایا وہ یہ تھا کہ چھوٹے آدمی کو بڑا رتبہ مل گیا ہے مگر ہمیں شہباز کو رام کرنا تھا اور وہ ہوگیا۔ جب وہ مسکرایا تو تلخی ڈھل گئی۔ سرجی نے ماحول کو نرم پایا شہباز سے مذاق کے موڈ میں آگئے۔ پہلے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ ''یار مجھے تمہاری عقل کی سمجھ نہیں آتی کہ تم آدمی ہو کہ بے دال کے بودم۔''

مطلب ہم سب کو سمجھ میں آگیا کہ تم تو نرے احمق ہو۔

شہباز جھٹکے سے تو اکھڑا اور ساتھ مفتی بھی۔ پھر کوئی شور اٹھا اور میں سیدھا کمرے میں جا گھسا اور دروازہ بند کرکے لیٹ گیا۔

☆......☆

خان قیصر کا ایک دوست شیخ صاحب پاکستان سے امیگریشن لے کر آیا ہوا تھا۔ اس کا شاید کسی امیر کبیر خاندان سے تعلق تھا اسی لیے خان صاحب اسے ہر وقت آنکھوں پر بٹھائے رکھتا تھا۔ خان صاحب نے اسے اپنے گھر پر رکھا ہوا تھا بلکہ شاید گود لیا ہوا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ رکھتے۔ پہلی بار تعارف اس طرح سے ہوا۔ ''یہ میرے دوست شیخ صاحب ہیں۔ میرے کلاس فیلو تھے۔'' یہ تعارف کرا کر وہ ان کے گن گانے لگتے کہ ان کی اتنی فیکٹریاں ہیں، اتنے پلازے اور اتنے گھر ہیں۔'' یہ سب کہہ کر وہ مرعوب نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھتے اور پھر شیخ صاحب مسکراتی اور تائیدی نظروں سے اس کے بیان کی تصدیق کرتے۔ یہ سب ہو چکا ہوتا تو خان صاحب دوبارہ سے وہی تعارف ایک نئے انداز میں شروع کر دیتے۔ ایک دن میں اس تعارف کا قصیدہ ہمیں ازبر ہوگیا۔ یہ قصیدہ کوئی اتنی بڑھی کہ کئی بار شیخ صاحب اپنے تعارف پر سوچ میں بھی پڑ جاتے تھے۔

شیخ صاحب پہلے بھی کینیڈا آچکے تھے اور ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ وہ کوئی پرانی سی گاڑی خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''شیخ صاحب! کون سی گاڑی لے رہے ہیں؟''

شیخ صاحب نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمیشہ کی طرح خان صاحب بول پڑے۔ ''یہ ہماری طرح کا کنگلا تو نہیں ہے۔ شیخ صاحب نئی گاڑی نکلوائیں گے۔'' پھر خان نے کھی کھی والا مخصوص قہقہہ لگایا مگر شیخ صاحب کی سٹی گم تھی۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خان قیصر کی کھٹارا

گاڑی پانچ چھ سو ڈالر میں لینا چاہتے تھے مگر خان صاحب نے ان کا مرتبہ اتنا زیادہ بلند کردیا تھا کہ وہ اب اس مقام سے باعزت اترنا چاہتے تھے مگر خان انہیں اترنے کا موقع نہیں دے رہا تھا اور شیخ صاحب بہت بے چینی کا شکار تھے۔ میں معاملے کو سمجھ گیا تھا۔ خان اس کی دولت سے ہمیں متاثر کرنا چاہتا تھا جیسے اس کی جایداد میں کچھ خان کو بھی ملے گا۔ شہباز یہ کہتا پایا گیا تھا۔ ''خان اور شیخ کا سیاپا جلد سامنے آجائے گا۔'' بقول شہباز کے کہ شیخ صاحب بس کے کیبن میں اپنا بستر لگالے گا پر نئی گاڑی کبھی نہیں لے گا۔ سرجی پوچھ بیٹھے۔ ''ماشاء اللہ اتنی دولت ہے پھر نئی گاڑی لینے میں حرج کیا ہے؟''

شہباز بولا۔ ''تم یہ نہ دیکھو کہ اس کے پاس دولت ہے۔ بس یہ دیکھو کہ شیخ صاحب شیخ ہیں۔''

دوسرے دن خان صاحب اپنے گم شدہ سے شیخ صاحب کے ساتھ آئے۔ شہباز کو پہلے کچھ گالیاں دیں اور پھر بولے۔ ''شیخ صاحب آئے ہیں اور تم نے ابھی تک چائے کا بھی نہیں پوچھا؟''

سرجی بولے۔ ''ہمیں ان کا چہرہ مبارک دیکھ کر لگا کہ شاید آٹھ پہری روزے سے ہیں۔''

خان صاحب نے ان کے چہرے کو بغور دیکھا اور تادیر دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''پیلاہٹ تو ہے۔ لگتا ہے آج سے انہیں روزانہ اناروں کا جوس پینا پڑے گا۔''

اناروں کے ذکر پر شیخ صاحب اور زیادہ پیلے پڑ گئے۔ اناروں کے جوس کی جگہ چائے نوش کی۔

خان ہم سے مخاطب ہوا۔ ''شیخ صاحب کو نئی گاڑیاں دکھانی ہیں۔ تم لوگ بھی جی ایم موٹرز کے شوروم ہمارے ساتھ چلو۔''

میں نے کہا۔ ''گاڑی شیخ صاحب نے لینی ہے پھر ہم جاکر کیا کریں گے۔''

جواب آیا۔ ''اسی بہانے تم لوگوں کو بھی گاڑیوں کی کچھ سمجھ بوجھ ہوجائے گی۔''

سرجی نے ترنت ہاں کردی۔ میں نے بھی سوچا کہ اسی بہانے پہلی بار کوئی گاڑیوں کا شوروم بھی دیکھ لوں گا۔

ہم تیار ہوئے اور میں نے بھانپ لیا تھا کہ شیخ صاحب گہری سوچوں میں گم ہیں۔ حالانکہ خان نے اسے گھر میں کمرا دیا ہوا تھا، کھانا خود ٹرے میں سجا کر دیتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی استری کردیتا تھا مگر شیخ صاحب ایسے لگ رہے تھے کہ کسی چنگل میں پھنس گئے ہوں۔

ہم خان کی گاڑی میں بیٹھے تو اس نے آگے بڑھ کر شیخ صاحب کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ شیخ صاحب ایسے بیٹھے جیسے انہیں ہم اغوا کرکے لے جا رہے ہوں۔ سرجی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی لگاتے ہوئے میرے کان میں گنگنائے۔ ''یہ خان اپنی آبرو خاک میں ملا رہا ہے۔''

میں نے جواب میں اپنی دھن ان کے کان میں چھیڑی۔ ''مجھے لگتا ہے یہ شیخ کو خاک میں ملا رہا ہے۔''

ہم مسی ساگا میں جی ایم موٹرز کے شوروم کی پارکنگ میں آرکے۔ میں متعجب تھا کہ کسی ایک شوروم میں اتنی زیادہ گاڑیاں ہوسکتی ہیں۔ پارکنگ کا ایک بڑا حصہ گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم تو صرف حیران تھے اتنی ساری گاڑیاں دیکھ کر مگر شیخ صاحب کو تو غش پڑ رہے تھے۔ ایسا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود نہیں بلکہ ہمیں دلانے آئے ہیں۔

خان شیخ صاحب کو پیچھے سے سہارا یا دھکا دے کر شوروم کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر اس ہال میں کھڑے تھے جہاں چھوٹی بڑی کئی گاڑیاں چمکتی دمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ گو دن کا وقت تھا مگر شوروم کا وسیع ہال ٹیوب لائٹوں کی روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا۔ کئی ایک سیلز مین اور سیلز گرلز بھاگی پھر رہی تھیں۔ مردوں نے کالے سوٹ پہنے تھے اور لڑکیاں گھٹنوں سے ذرا نیچے سیاہ اسکرٹس پہنے لہرا رہی تھیں۔

شہباز بولا۔ ''یہاں تو بڑا رونق میلہ لگا ہے۔''

سرجی نے فرمایا۔ ''لگتا ہے میں ٹائم اسکوائر میں آگیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''سرجی! خدا کا خوف کریں۔ کیوں ٹائم اسکوائر کو ایک شوروم سے ملا رہے ہیں؟'' میں اندر سے خود بھی اتنی زیادہ گہما گہمی دیکھ کر خوش تھا۔ ایک نیا تجربہ مجھے درپیش تھا۔ بعد کے سالوں میں یہ بھید کھلا کہ شوروم میں اکثر لڑکیاں خوب صورت اور بے حجاب رکھی جاتی ہیں۔ خان قیصر اب شیخ صاحب کو تھامے کسی سیل گرل کی تلاش میں تھا۔

اتنے میں ہم سب کی دعا قبول ہوگئی۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی شوکیس میں ہونا چاہیے تھا کہیں قریب سے طلوع ہوئی۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں اور رنگت چاندنی جیسی۔ کالے رنگ کے اسکرٹ تلے ننگی ٹانگیں اور بڑی ہیل کی جوتی میں وہ سب سے نمایاں تھی۔

خان بے خیالی میں دو قدم آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب

سرخ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ میں شہباز اور سرجی اپنی اپنی دنیا بسائے کھڑے تھے۔ لڑکی نے چمکتے دانت دکھاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور خان نے اسے اپنے قبضے میں کرلیا۔ خان قبضہ چھوڑنے والا نہ تھا جب تک شہباز نے آگے بڑھ کر اپنا حصہ نہ مانگ لیا۔ شہباز کی بدولت ہم رہ جانے والے بھی سیراب ہوئے۔ شیخ صاحب کی اداسی ذرا دیر کو کم ہوئی مگر پھر دوبارہ سے طاری ہوگئی۔

لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ نام مجھے یاد نہیں آرہا مگر نسل سے مشرقی یورپ کی لگتی تھی۔ اس کا سوال سب سے تھا۔ ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

جواب میں خان صرف بولا اور بات شیخ صاحب کے قصیدوں سے شروع ہوئی۔ ساری فیکٹریاں، پلازے اور سب کچھ گنوا چکا تو لڑکی نے پوچھا۔ ''آپ کو گاڑی چاہیے؟''

شیخ صاحب کی بجائے خان نے زور زور سے سر ہلا دیا۔

اس لڑکی نے اس خیال سے کہ کہیں یہ امیر وکبیر عرب شہزادہ اپنی توہین پر تلملا نہ اٹھے، وہ سیدھے ہم سب کو لے کر آٹھ سیٹر اسکیلیڈ کی طرف آئی۔ وہ کسی بادبانی کشتی کی طرح کشادہ اور وسیع تھی۔ اس گاڑی کی ہوش ربا قیمت اور دل ربا خصوصیات ایک بڑے پوسٹر پر آویزاں تھیں۔ سرجی تو گاڑی کو ہاتھ بھی ایسے لگارہے تھے کہ جیسے وہ چھونے پر کرنٹ مارتی ہے۔ گاڑی کی قیمت دیکھ کر خان بھی گرتے گرتے بچا۔ ہمارے چہروں کے بدلتے رنگ دیکھ کر سیل گرل ہمارے بارے میں شکوک وشبہات میں پڑ گئی۔ وہ شیخ صاحب کو پہلے کوئی عرب شہزادہ سمجھ بیٹھی تھی اور خان کو شاید دربان۔ پھر وہ ہماری ''اصلیت'' سمجھی تو کسی اور کونے میں لے آئی۔

وہ پھر اس سے چھوٹی گاڑی دکھلانے لگی۔ قیمت خان کی نظر میں شیخ صاحب کے لیے مناسب تھی۔ خان انہیں راضی کرنے لگا کہ صرف چالیس ہزار ڈالر قیمت ہے اور ٹیکس وغیرہ ڈال کر پچاس کے قریب کی پڑ جائے گی۔

اب شیخ صاحب نے کلیئر لائن لی اور کہا۔ ''میں نے گاڑی لینی ہی نہیں۔''

خان انہیں سمجھانے کے لیے اس کی جانب بڑھے اور انہوں نے وہیں سے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے انہیں روک لیا۔ وہ لڑکی اب حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہم خفت کے عالم میں اس لڑکی کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز بھی نہ ہوسکتے تھے۔

نہ نہ کرتے ہوئے خان شیخ صاحب کو زبردستی پکڑ کر امپالا کی طرف لے آیا۔ قیمت میں وہ کم نہ تھی۔ شیخ صاحب اب باقاعدہ ناراض نظر آرہے تھے۔ ہم تینوں یہ تو سمجھ چکے تھے کہ شیخ صاحب کسی ہزار پندرہ سو ڈالر کی گاڑی کے پیچھے ہیں۔ خان شیخ صاحب کی یہ ''رسوائی'' برداشت نہ کرسکتا تھا اور خان کے لیے یہ شیخ صاحب کی کسرِ شان کے خلاف تھا کہ وہ پچیس ہزار ڈالر سے نیچے کی گاڑی لیں۔ اس لڑکی نے بھی ہمت نہ ہاری۔ دوسرے بھی مختلف ماڈل دکھائے مگر یہاں اس کی دال گلنے والی نہ تھی۔

آج کی ساری جدوجہد اور مشقت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم سب باہر خان کی گاڑی کے قریب کھڑے تھے۔ اردگرد گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ سرجی دور کسی نامعلوم گاڑی کی جانب اشارہ کر کے یہ بتارہے تھے۔ ''میرے خیال میں وہ ٹھیک رہے گی۔''

شیخ صاحب سرجی کو گاڑی میں دھکا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ میں شیخ صاحب کی جگہ آگے والی سیٹ پر براجمان تھا۔ شہباز ہنسی روکنے کی پھر کوشش کررہا تھا۔

بعد کے سالوں میں مجھے گاڑیوں کی خرید وفروخت کے بارے میں زیادہ معلومات ملنا شروع ہوئیں۔ دنیا میں سب سے کم قیمت کی گاڑی امریکا میں ہے۔ کینیڈا میں ایک تو ٹیکس زیادہ ہے اور ڈالر بھی کمزور ہے جو گاڑی کینیڈا میں پچاس ہزار کی ہے وہ امریکا میں پینتیس کی مل جاتی ہے۔ امریکا کی مارکیٹ اتنی بڑی ہے کہ ڈیلر دو سو ڈالر منافع پر گاڑی سیل کردیتا ہے۔ آپ کینیڈا سے امریکا داخل ہوں تو سب سے بڑا فرق ہائی ویز اور بڑی گاڑیوں کا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہونڈا اکارڈ چھ سیلنڈر فلی لوڈیڈ اور زیرومیٹر کار جو امریکا میں بتیس ہزار ڈالر کی ملتی ہے وہ کوئی بتا رہا تھا کہ پاکستان میں ایک کروڑ کی بکتی جاتی ہے۔ اسی طرح ٹیوٹا کیمری بھی اسی قیمت پر ملتی ہے۔ امریکا میں زیادہ مقابلہ جرمن، امریکن اور جاپانی گاڑیوں کے درمیان رہتا ہے۔ جرمن گاڑیاں اونچے درجے کی ہیں پر مہنگی بہت ہوتی ہیں۔

یہاں آپ گاڑی لیز پر بھی لے سکتے ہیں اور فنانس بھی کرواتے ہیں۔ لیز پر ایسے ہی ہے کہ دو یا تین سال کے لیے گاڑی آپ کو کرائے پر دے دی جاتی ہے۔ سال میں بارہ یا پندرہ ہزار میل سے زیادہ نہیں چلا سکتے۔ آپ ہر ماہ کرایہ دیتے ہیں۔ فنانس اب زیرو فیصد پر ہوجاتی ہے۔ پانچ سالوں میں آپ کو گاڑی کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور کوئی سود نہیں لیا جاتا۔ پاکستان میں تو بینک پاکستانیوں سے تیس فیصد تک سود لے رہے ہیں۔

ہم گاڑی میں بیٹھے تو سر جی نے خان سے کہا۔ ''ہمارے آب وخورش میں آج کل کچھ فرق آرہا ہے، کیا آپ ہمیں البین مارکیٹ اتار سکتے ہیں تا کہ کچھ گروسری کرلی جائے۔''

میں سر جی اور شہباز ایک ساتھ البین مارکیٹ پر اتر گئے۔ البین مارکیٹ ایک دیسی بازار ہے۔ اس میں حلال گوشت کی ایک بڑی دکان ہے جسے افغانی چلاتے ہیں۔ نام المیزان ہے۔ ایک ہی جانور کے مختلف حصوں کے گوشت کے نرخ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ران کا گوشت اور چانپیں سب سے مہنگی ہوتی ہیں۔ سب حصے علیحدہ علیحدہ کر کے شوکیسوں میں سجا کر رکھے ہوتے ہیں۔ قیمہ چربی اور بغیر چربی کے دونوں طرح کا دستیاب ہوتا ہے اور نرخ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شوکیسوں کے پیچھے افغانی سفید اپرن پہنے کھڑے مسکراتے ہوئے ہم سے بات کر رہے تھے۔

بکرے کے پائے بھی صاف و شفاف کر کے رکھے ہوئے تھے۔ سر جی نے پہلے کچھ پائے خریدے۔ شہباز بولا۔ ''اتنے زیادہ پائے کھانے سے نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے۔'' پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا ''میں نہ کھاؤں گا اور نہ ہی میرے حساب میں انہیں درج کرنا۔''

سر جی بولے۔ ''یہ مردوں کی خوراک ہے، مردوں کی۔ تمہارا اس سے کیا لینا دینا۔'' سر جی کا شہباز کو مرد ہونے کا طعنہ دیتے سن کر افغانی بھی زیر لب مسکرانے لگے۔ شہباز طیش میں آچکا تھا اور لال بھبوکا ہو کر سر جی کو کہنے لگا۔ ''میں نام کا نہیں عملوں کا بھی شہباز ہوں۔ کسی کو آزمانا ہو تو آزمالے۔''

سر جی بولے۔ ''ایسے شہباز ہم نے بہت پڑھے ہیں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''پڑھے ہیں یا دیکھے ہیں؟''

بولے۔ ''اقبال نے اسی شہباز کا بولا تھا جس کو ممولے نے مار بھگایا تھا۔''

سر جی کا اشارہ دراصل اقبال کے ساقی نامہ کے اس مصرے کی جانب تھا

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس سے پہلے بات آگے بڑھتی افغانی نے مداخلت کی۔ ''اور کیا کیا چاہیے۔''

سر جی سب بھول کر قیمہ، گوشت اور چکن کے بھاؤ پوچھنے لگے۔

یہ سب سامان خریدا گیا۔ پھر گروسری شاپ سے آٹا، مصالحے، دالیں اور سب کچھ خریدا گیا جو ہم پچھلے ایک ماہ میں ختم کر چکے تھے۔ المیزان سے تازہ بھنی چکن اور چکن لیگ بھی دستیاب تھی۔ سر جی جاتے جاتے وہ بھی لیتے آئے۔ شہباز چیختا رہا کہ بہت خرچا ہو رہا ہے۔ یہ سارا سیاپا سر جی کا پھیلایا ہوا ہے اور یہ بھی دھمکی دی کہ آج وہ مفتی سے بات بھی کرے گا۔

سر جی نے یہ کہہ کر شہباز کو چپ کر دیا۔ ''تو ٹھیک ہے، اپنا کچن علیحدہ کرلو۔'' شہباز فق کھڑا رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شہباز کو سمجھایا۔ ''سر جی کا جو دل چاہے خریدنے دو۔ آخر پکا کر کھلانا تو ہمیں ہی ہے ناں۔''

ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو مفتی جاب سے آچکا تھا۔ ہمیں لدا پھدا دیکھا تو خاصا خفا نظر آنے لگا۔ پھر مجھے یقین دہانی کروائی کہ کل نو بجے سے پہلے ہیمو سال جاب پر بھی پہنچنا ہے۔

رات کو سوئے تو درجہ حرارت سترہ تھا۔ صبح میں جلد اٹھ گیا۔ آج میرا ہیمو سال میں پہلا دن تھا۔ صبح کی نماز پڑھی۔ سر جی نے بھی سیکیورٹی کی جاب پر جانا تھا۔ وہ بھی کلمہ پڑھتے اٹھ گئے۔ ان کا کلمہ مکمل ہونے سے پہلے میں واش روم میں جا گھسا۔ وہ واش روم کے دروازے تک میرا پیچھا کرتے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ میں شاور لے کر تیار ہو کر باہر نکلا تو سر جی کمرے کا پردے ہٹائے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ میری باہر نظر پڑی تو میں بھی ششدر رہ گیا۔ باہر کی ساری زمین اور درخت برف سے ڈھکے تھے۔ رات بھر برف پڑتی رہی تھی۔ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ سترہ درجے سے رات کو یہ منفی دس ہو جائے گا۔ یہ ٹورنٹو ہے۔ موسم بدلتے یہاں چند گھنٹے بھی نہیں لگتے۔ کل تک ہم بہار کی آمد کو محسوس کر رہے تھے اور آج صبح برف نے ایک دلفریب منظر زمین پر بچھا دیا تھا۔ ایک خاموش اور نواں نکور دن جیسے ہمارے انتظار میں تھم کر کھڑا تھا۔ برف کی چادر پر ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔ جیسے کسی مستری نے قرینے سے اس کو ہموار کر دیا ہو۔ درخت برف تھامے جیسے مسکرا رہے تھے کیونکہ آج میری جاب کا پہلا دن تھا۔

سر جی حیرت کے سمندر سے باہر نکلے تو بے لگام بولنے لگے۔ ان کے بولنے پر سوتے شہباز کے جسم نے پہلے جھٹکے لیے اور پھر سیاپا سیاپا کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا ''جاب تمہاری ہے اور سر جی کو کیا خوشیاں چڑھی ہیں؟''

سر جی نے باہر کے منظر اور برف باری کے قصیدے پڑھے تو وہ باقاعدہ گالیاں دینے لگا۔ ''یہ برف کا سیاپا شاید ہمارے مرنے تک جاری رہے گا۔''

سرجی نے قرآنی آیات پڑھ کر ترجمہ کیا۔ ”تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو ٹھکراؤ گے۔“

شہباز نے پل بھر کے لیے باہر کی نعمتیں دیکھیں اور پھر کروٹ لے کر کے بڑبڑاتا ہوا دوبارہ سو گیا۔

لیونگ روم میں سرجی نے ناشتا تیار کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے تئیں اچھا لباس پہنا۔ مفتی کو دوپہر کی شفٹ میں جانا تھا۔ اس نے مجھے کچھ نصیحتیں کیں اور پھر ان نصیحتوں کو مجھ سے زبانی سنا۔ سن کر خوش ہوا اور اسی کے صلے میں اپنا خفیہ پرفیوم نکالا اور ہلکا سے مجھ پر چھڑکا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے اپنے لباس پر جیکٹ ڈالی جس کو میں نے آیندہ کی سردیوں تک کے لیے بھلا دیا تھا۔ سرجی اسی دوران کچھ زیر لب پڑھتے رہے اور میرے اپارٹمنٹ سے نکلنے تک مجھ پر پھونکتے رہے۔

ہیموسال کے مین دروازے کے بائیں جانب ایک آراستہ کمرا تھا۔ ایک بڑی بیضوی میز کے گرد آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں جن پر ہم چھ نئے بھرتی کیے ہوئے لوگ بیٹھے تھے۔ دو فلپائن کے تھے۔ دو چائنا کے اور میرے علاوہ ایک ساؤتھ امریکن ڈیانا تھی۔ ڈیبی (Debby) ہیموسال کی ٹرینر تھی۔ کمرا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ فرش پر دبیز کارپٹ بچھا تھا۔ دیواروں پر گہرے رنگ کا دبیز پیپر لگا تھا۔ ڈیبی اگر آج یہاں نہ ہوتی تو کوئی ماڈل ہوتی۔ دراز قد، نیلی اسکرٹ پر سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ براؤن بال کندھوں تک جھوم رہے تھے اور سبز آنکھوں کے ساتھ گوری رنگت میں وہ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔ میز پر اس نے موٹی موٹی فائلیں رکھیں تھیں۔ پروجیکٹر اور اسکرین کی مدد سے وہ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب خالی خالی نظروں سے اسے ہلتا جلتا دیکھ رہے تھے۔ ڈیبی کے علاوہ جو چیز متحرک تھی، وہ ڈیانا تھی۔ دبلی پتلی، گندمی رنگ اور کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ اس کی یہ خصوصیت مجھے بے چین کر رہی تھی کہ ڈیبی کی ہر بات کو وہ دہراتی اور پھر قہقہہ لگاتی تھی۔ اس کے قہقہے سے جو کچھ میں سمجھ پاتا وہ ہوا میں اڑ جاتا تھا۔ میں یا تو ڈیبی کو مسکرا کر دیکھتا اور یا پھر ڈیانا کو گھور کر۔

یہاں ہر فیکٹری میں ہیلتھ اینڈ سیفٹی لاء پر پورا عمل کیا جاتا ہے۔ قانون حکومت بناتی ہے اور ہر جگہ اسے لاگو بھی کرواتی ہے۔ میں مختصر طور پر بیان کر دیتا ہوں کہ اگر آپ نے فیکٹری میں کسی سیکشن کا دروازہ بھی کھول کر جانا ہے تو اس کا ایک طریقہ کار لکھا ہوتا ہے۔ آپ کو وہ طریقہ سمجھایا جاتا ہے۔ اس کو دہرایا جاتا ہے۔ پھر آپ کی ٹریننگ شیٹ پر آپ کے دستخط لیے جاتے ہیں اور وہ شیٹ آپ کی فائل میں لگ جاتی ہے۔ اگر کوئی دروازہ

سرخ پیاز کینسر کے لیے مفید

نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں پیاز کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے، برگر سے لے کر ہوٹل پر کھانا کھاتے وقت اسے سلاد کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے۔ پیاز کو جہاں گھروں میں کھانے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہیں اسے گھریلو طبی ٹوٹکوں کے لیے آزمایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں پیاز کی کم سے کم 5 اقسام پائی جاتی ہیں جو تقریباً ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر تو سفید پیاز ہوتی ہے، تاہم ملک میں ہلکے سرخ رنگ کی پیاز بھی پائی جاتی ہے... جو طبی حوالے سے پیاز کی دیگر اقسام سے نہایت مفید ہیں۔ ماہرین صحت کے مطابق سرخ پیاز بریسٹ اور کولون سمیت کینسر کی تمام اقسام کے لیے نہایت ہی مفید ہیں۔ سائنس جرنل میں شائع کینیڈا کی یونیورسٹی آف گیولف اونٹاریو کے ماہرین کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق سرخ پیاز میں اینتھو سایانن اور کیوریسٹین کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے، جو کینسر کے سیلز کی افزائش کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ یونیورسٹی آف گیولف کے ماہرین نے پیاز کی 5 اقسام کا تجزیاتی مطالعہ کیا، اور ان کے استعمال کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا۔ مطالعہ سے پتا چلا کہ پیاز کی پانچوں اقسام انسانی صحت کے لیے مفید ہیں، مگر باقی تمام اقسام میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہے، لیکن سرخ پیاز دنیا کی بڑی بیماری کے جراثیم کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں پیاز کی کسی بھی قسم کو نقصان دہ قرار نہیں دیا، جب کہ لوگوں کو تجویز دی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرخ پیاز کا استعمال کریں۔ سرخ پیاز نہ صرف کینسر کے مریضوں کے لیے مفید ہے، بلکہ یہ عام لوگوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کینسر کے امکانات سے محفوظ رکھنے میں بھی مدد فراہم کرتی ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

کھولتے ہوئے اپنے آپ یا کسی اور کو معمولی سازخمی کر بیٹھے تو وہ کمپنی پر کیس کر سکتا ہے کہ مجھے دروازہ کھولنے کی ٹریننگ نہیں دی گئی۔ اس ٹریننگ کا کمپنی کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی کسی مشکل سے بچ جاتی ہے اور ورکر کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ ہر کام ایک ضابطے کے تحت کرنے لگتا ہے۔

جب تک ہماری دو ہفتے کی یہ ٹریننگ ختم نہ ہوتی، ہم کسی بھی طور فیکٹری کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ ٹریننگ آپ کو ہر سال دی جاتی ہے کیونکہ یہاں کا قانون اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

ڈیبی آج ہمیں مختلف چیزوں پر ہیلتھ اینڈ سیفٹی کی ٹریننگ دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ ڈیانا کی بلاوجہ مداخلت پر مسکراتی بھی رہی تھی۔ بہت مشکل ہو گیا تھا میرے لیے کہ ایسے وجود کو نظر انداز کروں جو آپ کے ساتھ بیٹھا ہو اور ان کی ٹانگیں، سر، ہاتھ اور زبان متواتر چل رہی ہو۔ یہ ڈیانا تھی جس کے ساتھ میں نے ڈھائی سال کام کیا۔ ہم سب اس اکتا دینے والے لیکچر سے قدرے بیزار اپنی ٹریننگ شیٹس پر دستخط کرتے جا رہے تھے۔

درمیان میں کافی کا وقفہ ہوا۔ ڈیبی ہم سب کو اپنے پیچھے لگا کر لنچ روم میں ایسے گئی جیسے بطخ کے پیچھے اس کے چوزے چلتے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے لنچ روم تھا جس میں داخل ہوئے۔ پینتیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا لنچ روم تھا جس میں ہم جا بیٹھے اگلے سالوں میں وہ ہمارے لیے ایک بیٹھک کا کام کرتا رہا۔ کئی رنگین میزیں تھیں جن کے گرد کرسیوں پر سفید پینٹ شرٹ میں ملبوس ورکر بیٹھے کافی پیتے تھے اور ساتھ آنکھوں سے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہتے تھے۔ بیشتر گورے تھے۔ دیسی بھی تھے جنہوں نے ایک میز کے گرد اپنا حلقہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں پاکستانی اور انڈین تھے۔ یہ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔ اس میں منظر وائیں بھی بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی تراشیدہ داڑھی، چہرے پر سنجیدگی پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہا۔ منظر نے میرا ریفرنس دیا تھا اور یہ جاب ملنے میں بہت سی وجوہات میں منظر کی سپورٹ بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

دائیں جانب پوری دیوار پر شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پار سڑک پر گری برف نظر آ رہی تھی۔ مکمل سناٹا تھا باہر اور جو شور تھا وہ صرف لنچ روم میں گونجتا تھا۔ لنچ روم کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر رکھا تھا جس پر بائیں جانب ایک بڑی کافی مشین تھی، کونے میں ایک بڑا فریج بھی موجود تھا۔ ساتھ ایک ریک میں مگ، پلیٹیں، چمچ اور کانٹے پڑے تھے۔

ساتھ ایک بڑا سنک تھا جس میں ہر ایک اپنے برتن دھویا کرتا تھا۔ کاؤنٹر کے نیچے ڈش واشر تھا۔ یہاں ہر گھر میں اور کسی بھی لنچ روم میں ڈش واشر کی موجودگی بڑی اہم ہوتی ہے۔ اپنے استعمال شدہ برتنوں پر پانی ڈال کر اسے ڈش واشر میں رکھتے جاتے ہیں۔ جب بھر جاتا ہے تو ایک بٹن دبا کر اس کو چالو کر دیتے ہیں۔ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹا یہ اپنا کام خود کرتا ہے۔ برتنوں کو کئی بار ایک اپنے نظام کے تحت ڈھوتا ہے۔ واشنگ پاؤڈر سے صاف کرتا ہے، پھر پانی بہا کر انہیں چمکاتا ہے اور آخر میں گرم پھونکیں مار کر سب کو خشک کر دیتا ہے۔ آخری زحمت آپ کو یہ کرنی پڑتی ہے کہ انہیں نکال کر دوبارہ ریک میں سجا دیں۔ برتن سجانے کی یہ ڈیوٹی کوئی ورکر انجام نہیں دیتا۔ بلکہ مینیجر اور ڈائریکٹر کی سطح کے لوگ باری باری یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ کس دن کس نے یہ کام سرانجام دینا ہے اس کی لسٹ دیوار پر لگی ہوتی ہے۔

مجھے پہلے دن تو اس ماحول کا ادراک نہ ہوا۔ بعد میں ایک دن میں کافی پی رہا تھا کہ ہمارا ڈائریکٹر آپریشن لنچ روم میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔ اس نے کافی مشین سے کافی نکالنا چاہی تو وہ خالی تھی۔ اس نے اوپر کے شیلفوں کو کھولا۔ کافی کا ایک پیکٹ نکالا، مشین کو کھول کر اس میں کافی ڈالی اور بٹن دبا کر گرم کافی نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر نہ کوئی شکن اور نہ چہرے پر کوئی بیزارگی تھی کہ کافی کیوں ختم ہو گئی ہے۔ اس نے پھر مگ بھرا اور مسکرا کر مجھے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں ششدر بیٹھا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا کہ میں یونیورسٹی میں لیکچرر تھا۔ صبح اپنے آفس میں بیٹھتا تو چپڑاسی میرے پوچھے بغیر چائے بنا کر کپ میرے سامنے رکھ دیتا۔ ہم سب ٹیچرز کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ تو سر اٹھا کر چپڑاسی کا شکریہ بھی ادا نہ کرتے تھے۔ یہاں آپ کو کوئی چپڑاسی نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی ایسی پوسٹ ہے۔ نہ کوئی کسی کا ڈرائیور ہے اور نہ کوئی گارڈ ہے۔ نہ کوئی آپ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے اور نہ کوئی آپ کا بریف کیس تھامے آپ کے ساتھ چلتا ہے۔ کیا نظام ہے جو پُروقار انداز سے چل رہا ہے۔

پہلی بار میں نے ایک ڈائریکٹر کو ڈش واشر سے پلیٹیں اٹھاتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ اس کی مدد کر دوں۔ میں اس کے پاس گیا اور اپنا مدعا بیان کیا تو وہ پہلے تو حیرت سے مجھے تکتا رہا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ ”یہ میری ہی ڈیوٹی ہے۔ آپ کیوں زحمت کرتے ہیں؟“

میں شرمندہ ہوکر واپس اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ بعد میں دیکھا کہ اپنا کھانا یہ خود گرم کرتے تھے۔ کرسیاں بھری ہوتیں تو کوئی ان کے لیے اپنی کرسی نہ چھوڑتا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کچھ نہ کچھ نگل لیتے۔ بعد میں ہم بھی بدتمیز ہوگئے۔ کوئی ڈائریکٹر آکر ہاتھ ہلا کر آپ کی جانب مسکرا کر اشارہ کرتا تو میں دو انگلیاں جوڑ کر بیٹھے بیٹھے جواب دیتا تھا۔ ہم سب کام کرنے والے برابر تھے۔ ہر ایک نے اپنا کام سرانجام دینا تھا نہ کہ افسروں کو خوش رکھنا تھا۔

یہ نہیں کہ یہاں پر سیاست یا گروپ بندی نہ تھی۔ ہر سپروائزر کا اپنا گروپ تھا۔ چغلیاں بھی ہوتی تھیں اور کان بھی بھرے جاتے تھے مگر شاید اپنے ملک کا دس پندرہ فیصد یہ کام یہاں ہوتا تھا۔

ہم لنچ روم میں داخل ہوئے تو دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر تھا جس پر بہت سے لنچ باکس پڑے تھے۔ ایک کمپیوٹر بھی رکھا تھا۔

میں سیدھا اپنی ازلی عادت کے تحت دیسیوں کی ٹیبل پر گیا۔ منظر نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ اس میز پر سب ہم خیال لوگ بیٹھے تھے۔ میرا تعارف ہوا۔ سب نے مبارک باد دی۔ ان میں ایک فزیکا نامی گندمی رنگ کا شخص بھی تھا۔ موٹی عینک کے پیچھے سے مجھے جھانک رہا تھا۔ یہ تنزانیہ کا رہنے والا یہودی تھا۔ وہ دیسیوں کی محفل میں خوش رہتا تھا اور ہماری اردو یا ہندی کو سمجھنے کے باوجود ہمارے لطیفوں پر ہم سے زیادہ ہنستا تھا۔ ایک پاکستانی اختر بھی تھا۔ چہرے پر ہر وقت غصہ چڑھا رہتا تھا۔ گوروں سے بہت متاثر تھا اور اپنا دیسی مذاق اسی وجہ سے ہمارے کانوں میں کرتا اور ہنسنے سے بھی منع کرتا تھا۔ ایک ہندوستانی پٹیک تھا جو سب سے ان کی تنخواہ پوچھتا رہتا تھا۔ ایک سرلیش تھا جو سکھوں کو گالیاں دیتا پایا جاتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ تھے اور ان کی کئی قسم کی باتیں تھیں۔ یہ لنچ روم نہ تھا بلکہ ایک کلب تھا جہاں بیٹھ کر سب ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ لڑتے بھی تھے اور کئی دن خفا رہنے کے بعد مان بھی جایا کرتے تھے۔

پہلے دن منظر نے مجھے کافی بنا کر دی۔ میں میز پر خاموش بیٹھا سب لوگوں کا مزاج پرکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دو گھونٹ بھر کے میں نے کافی کا مگ سنک میں رکھا جس کو منظر نے آکر ڈش واشر میں رکھ دیا۔

ہماری کلاس یا ٹریننگ دوبارہ شروع ہوئی۔ ڈیبی کے انداز اور ڈیانا کی کھلبلی دیکھتا رہا۔ ایک چینی لڑکی کیٹی تھی۔ شکل میں بہت بہتر تھی۔ فلپائن کا فرڈی اور دوسرا فرنانڈس تھا۔ فرڈی شکل سے فراڈی لگتا تھا اور بعد میں میرا اندازہ بھی ٹھیک نکلا۔ چھوٹے قد کا فرڈی جس نے سر کو شیو کیا ہوا تھا۔ تاڑ تاڑ کر ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ پانچ بجے یہ ٹریننگ ختم ہوئی۔ درمیان میں لنچ بریک بھی تھا اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ منظر نے اپنی دو روٹیوں سے ایک مجھے دی اور آدھا سالن دیا۔ میں آج بھی اس کا مشکور ہوں۔

پانچ بجے میں باہر نکلا تو سردی اپنے عروج پر تھی۔ مجھے پیدل آدھا میل چل کر ائرپورٹ روڈ جانا تھا۔ وہاں سے بس لے کر ڈکسن اترنا تھا اور پھر ایک اور بس سے اتر کر اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچنا تھا۔ گاڑی اپنی ہو تو دس منٹ بھی نہیں لگتے مگر ان بسوں سے پینتالیس منٹ کا یہ سفر پڑتا تھا۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو اسے خالی پایا۔ مفتی دوپہر کی شفٹ میں ہیموسال گیا ہوا تھا۔ اس سے وہاں ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ سرجی اور شہباز ابھی اپنی جاب سے واپس آنے والے تھے۔ اگلے ہفتے شہباز کو بھی اپنی Op-Co کی جاب شروع کرنی تھی۔

میں نے خالی اپارٹمنٹ کو اپنے سکون کے لیے غنیمت جانا اور کپڑے بدل کر اپنے میٹرس پر جالیٹا۔ آج مجھے انتہائی خوشی تھی کہ مجھے اللہ پاک نے اتنے کم عرصے میں اتنی اچھی جاب دے دی تھی۔ میری فیملی کی امیگریشن کا پروسس چل رہا تھا اور امید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس ہوں گے۔ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا اپنے ایک ایک اس لمحے کو یاد کر رہا تھا جہاں سے گزر کر آج میں یہاں آپہنچا تھا۔

ٹورنٹو اترنے کے دو دن بعد میں ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ آگے کھائی نظر آتی تھی اور پیچھے کا ہر نشان کھو بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو اور زیادہ کمزور ہونے لگتا تھا۔ سر اور کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ پھر مجھے سرجی اور شہباز کا ساتھ ملا تو آنکھیں اوپر کو اٹھیں۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ ہمت نہیں ہاری۔ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اللہ کی ذات پر مکمل بھروسا کر کے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کین سینٹر میں گزرا وقت اور نسرین کی دوستی نے مجھے بہت سہارا دیا۔ کین سینٹر نے مجھے کینیڈا کے نظام سے مکمل آگاہی دی۔ میں کینیڈا اور اس کے نظام کو سمجھنے لگا۔ نئے آنے والوں کے لیے یہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس چیز کو سمجھنا اور جاننا بھی ضروری ہے کہ یہاں کے لوگ کون کون سے کھیلوں میں دلچسپی

لیتے ہیں۔ آپس میں بیٹھ کر کن چیزوں کو زیادہ موضوع سخن بناتے ہیں اور کن چیزوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا مذاق کیسا ہوتا ہے اور کہاں کہاں کیا کرتے ہیں۔ آپ ان کے ملک میں آتے ہیں تو ان کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ محاوروں میں بات کرتے ہیں اور مذاق بھی محاوروں میں کرتے ہیں۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے کوئی جملہ لگایا لیکن میں نہ سمجھ سکا اور اس پر وہ ردِعمل نہ دیا جس کی وہ توقع کر رہا ہوتا تھا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ درمیان کے فاصلے بڑھتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گورے اور دیسی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے ہوتے جیسے میں ہیموسال میں پہلے دن دیکھ آیا تھا۔ یہ ملک آپ کو اپنا کلچر یا مذہب چھوڑنے کا نہیں کہتے بلکہ یہ دوسرے کلچر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پہلے سرجی وارد ہوئے اور کچھ دیر بعد شہباز داخل ہوا۔ سرجی آج کا احوال پوچھنے لگے۔ جب میں نے یہ بتایا کہ ہماری انسٹرکٹر ڈیبی بہت حسین نازنین ہے تو اس کا شجرہ نسب پوچھنے لگے۔ میں نے جب انہیں کچھ میرے ہمراہ نئے بھرتی ہونے والے ورکروں کے بارے میں بتایا تو بولے۔ ”یہاں کوئی نسرین والا چکر نہ چلا لینا۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا پر خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنا ردِعمل دینا ایسا ہی تھا جیسے آبیل مجھے مار۔ میں تو خاموش رہا مگر شہباز سرجی سے مخاطب ہوا۔ ”آج تو پہلا دن ہے اور ایک دن میں تو ان گوروں کے نام بھی بمشکل زبان پر چڑھتے ہیں۔“

سرجی نے دانشمندی سے سر ہلایا اور شہباز سے بولے۔ ”تم بجا فرما رہے ہو۔ آدمی جانے بسے سونا جانے کسے۔“

شہباز تلملایا اور میں نے بڑھ کر کاپی پینسل اٹھالی۔ مطلب یہ بتایا کہ آدمی کی پہچان ساتھ رہنے سے ہوتی ہے جیسے سونا کسوٹی پر پہچانا جاتا ہے۔ سرجی کے بروقت محاورے محفل کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جب بھی برمحل بولتے تو اس کی بھی توجیح بہت خوبصورت انداز میں کرلیا کرتے تھے۔

شام اتر چکی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر اندھیرا نہ تھا بلکہ لیمپ پوسٹ کی دودھیا روشنیوں میں بے موسموں کی برف زرہ زرہ چمک رہی تھی۔ ٹھنڈ سے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ہم آج سب مطمئن بیٹھے تھے۔ سرجی یہ کہہ کر اٹھے۔ ”کسی کو بھی رات کے کھانے کا احساس نہیں ہے۔“ کچن کی جانب جاتے جاتے شہباز کو بری طرح گھورا اور بولے۔ ”لوگ بھوک لگنے پر میری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے بچہ ماں کی جانب دیکھتا ہے۔“

شہباز کھسیانا ہو کر اٹھا اور بولا۔ ”ہم مل کر کھانا بناتے ہے۔“

سرجی نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور یہ کہہ کر کچن میں گھس گئے۔ ”آپ کام مہا کام“ مطلب یہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے کیا کام سب سے اچھا ہوتا ہے۔ شہباز کو میں نے مطلب بتایا تو وہ کراہتا ہوا دوبارہ کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا اور اپنے پیٹ کو سہلانے لگا۔

سرجی نے آلو قیمہ بنایا اور اسے بھون بھون کر اس کا ملیدہ بنا ڈالا۔ میں نے روٹیاں گرم کیں اور رائتہ بنایا۔ شہباز نے دسترخوان لگایا اور ساتھ پانی کا جگ بھر کر رکھا۔

اتنے میں مفتی آپہنچا۔ پہلے اس نے دیگچے میں جھانکا اور پھر مجھے مبارک باد دینے کے بعد آج کا احوال پوچھنے لگا۔ ڈیبی کی برائیاں پہلے کیں کہ وہ ہم لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ ہنس کر اگر ملے تو اس پر اعتبار نہ کرنا۔ اس نے سب کا ایک ایک کر کے غائبانہ تعارف کروایا اور اس تعارف میں کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔

کھانے کے دوران وہ ان سب کے ”شر“ سے بچنے کی ترکیبیں میرے دماغ میں بٹھانے لگا۔ کون کتنا زیادہ برا ہے اور کس کس سے کیسے بچ کر رہنا ہے، یہ سب میرے گوش گزار کرتا رہا۔ وہ تب خاموش ہوا جب میں نے سرجی کا محاورہ دہرایا۔ ”آدمی جانے بسے سونا جانے کسے“ اس کی تشریح شہباز نے کی اور پھر مفتی سرخ آنکھوں سے بڑے بڑے نوالے لینے لگا۔

مفتی مجھے بتانے لگا کہ ہیموسال میں سب سے زیادہ تکنیکی کام دو ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ ایک کروميٹوگرافی (Chromatography) ہے اور دوسرا ڈیپارٹمنٹ کراس لنکنگ (Linking-Cross) ہے۔ باقی سب ڈیپارٹمنٹ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی برتن دھوئے جاتے ہیں۔ وہ خود کروميٹوگرافی میں کام کرتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”لگتا نہیں کہ تمہیں ان دونوں میں سے کسی ڈیپارٹمنٹ میں بھیجیں اور اگر بھیج دیا تو معجزہ ہی ہوگا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بعد کے دنوں میں معلوم ہوا کہ ہر ایک کی خواہش تھی کہ انہیں ان میں سے کسی ایک ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے۔ یہ دونوں ڈیپارٹمنٹ ہائی ٹیک مشینوں پر کام کرتے تھے جو یہاں کا تجربہ لے لیتا تو اسے کسی بھی بائیو ٹیک انڈسٹری میں باآسانی جاب مل سکتی تھی۔

یہ سب بتا کر مفتی نے میرے اندر خواہشات کے نئے سانپ کھڑے کر دیے۔ انسان کسی ایک مقام کو جب پاتا ہے تو

اگلے دن اس کے آگے کا سوچنے لگتا ہے۔ خواہشوں کے گھوڑے کبھی تھکتے نہیں۔ دوڑ دوڑ کر گر جاتے ہیں مگر ہر وقت سرپٹ بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ میں ذرا تھمنا چاہتا تھا مگر مفتی نے ایک تازہ چارہ میرے آگے ڈال دیا۔ میرے اندر کے ناشکرے انسان کے منہ سے ایک بار پھر رال ٹپکنے لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا، ڈانٹا تو پھر کہیں جا کر ذرا پُرسکون ہوا۔

کھانا کھا کر شہباز نے قہوہ بنایا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ میرا مقام ڈور وال سے ٹیک لگا کر بیٹھنا تھا۔ جہاں موری پیچھے سے لگی ڈک سے گرم ہوا خارج ہو کر کمرے کی حدت بڑھاتی تھی۔ اس ہوا کا لمس میرے پٹھے گرم رکھتا تھا۔ اس جگہ بیٹھ کر میں ہر وقت طمانیت محسوس کرتا تھا۔

قہوے کی چسکی بھر کر مفتی بولا۔ ”پرسوں بقرعید ہے۔“

چھوٹی عید کی خبر بھی مفتی نے ہم پر اسی طرح گرائی تھی اور آج کا بم بھی اس طرح آج ہم پر پھوڑا تھا۔ اس دن بھی ہم سکتے میں آگئے تھے اور آج بھی ہم اسی ماحول میں زرد چہروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ عید کا تہوار ہو اور میں بے خبر رہوں؟ مگر میں بے خبر ہی رہا تھا۔ تہوار ماحول سے جنم لیتا ہے نا کہ کلینڈر سے۔ میرے اور مفتی کے علاوہ سب ساتھیوں کے لیے ضبط ناممکن ہو گیا تھا۔ ہم تینوں پتھرائی نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ آج میں جاب کی خوشی لا کر اپارٹمنٹ پہنچا تھا مگر عید کی ”خوشی“ اسے نگل گئی تھی۔ یہ کیسی عید تھی جو ہمیں افسردہ کر گئی تھی۔

ذوالحج کا چاند نظر آجاتا اور عید کا ڈنکا بجنے لگتا تھا۔ اس عید پر سب سے بڑی خوشی قربانی کا جانور لینے کی ہوتی تھی۔ آج کل جو پیسوں کی ریل پیل جانور لانے میں نظر آتی ہے وہ پہلے نہ تھی۔ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق کوئی جانور خرید لاتا۔ ہم عید سے ایک ہفتہ پہلے بھیڑ لے آتے۔ ہمارے علاقے کے لوگ بکرا نہیں کھاتے ہیں اور اسی لیے بھیڑ کا رواج تھا۔ پہلے ایک نائی کو گھر بلوا کر اس کے بدن کے سارے بال اتارے جاتے۔ بال کاٹنے کے بعد اس کی صحت کا ٹھیک سے اندازہ ہو جاتا۔ پھر اس پر مختلف رنگ لگائے جاتے۔ ایک عدد ہار اس کے گلے میں ڈالا جاتا۔ پھر اسے لے کر بچے بالے گھر گھر گھومتے۔ جس گھر جاتے وہ یا تو ہمیں نظر انداز کر دیتا یا کوئی تبصرہ کرنے کے بعد کہتا۔ ”ماں سے کہنا ہمارے گھر اچھا حصہ بھیجے۔“

یہ پیغام لے کر ہم کسی دوسرے گھر میں داخل ہو جاتے۔ پھر ایسا بھی کئی بار ہوتا کہ ہم ان جانوروں کی آپس میں لڑائی بھی کرواتے۔ جیسے جیسے عید قریب آتی اور ہمارا جوش وخروش بڑھتا جاتا۔ اس عید پر کپڑوں اور نئے جوتوں کی فکر نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ ہم نے خریدنے بھی نہ ہوتے تھے۔ ہم وہی کپڑے پہنتے جو چھوٹی عید پر پہنے تھے۔ ماں انہیں سنبھال کر لوہے کے ٹرنک میں کہیں چھپا کر رکھ دیتی تھیں۔ جوتے بھی کسی خفیہ جگہ پر محفوظ پڑے ہوتے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ سب خفیہ مقامات مجھے معلوم ہوتے۔ اس عید پر میری خوشی یہ ہوتی کہ ماں کی نظر بچا کر میں ان خفیہ خانوں میں اپنے خزانے کو ایک نظر دیکھ کر شاد ہو جاتا۔

عید کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آتے۔ اس عید میں سویاں بہت کم کھاتا کیونکہ کچھ دیر بعد گوشت کھانا ہوتا تھا۔ قسائی کا انتظار بہت بے چینی سے ہوتا۔ میں گلی میں کھڑا ہوتا۔ قسائی لیٹ ہو جاتا اور پھر مایوس ہو کر یہ ”اندوہناک“ خبر سب کو سناتا۔

جانور ذبح سے بوٹیاں بنانے تک کا ایک ایک مرحلہ دیکھا جاتا۔ قسائی چلا جاتا تو میں کوشش کرتا کہ ان گھروں میں گوشت کا حصہ میں لے جاؤں جہاں سے عیدی ملنے کی امید ہوتی۔ بقرعید پر عیدی دینے کا زیادہ رواج نہیں ہوتا تھا مگر میں نے امید کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ کہیں سے کچھ نہ کچھ لے ہی آتا۔

پھر گوشت بھوننے کا مرحلہ آتا۔ کلیجی کی ہنڈیا اماں جی بناتیں مگر وہ اتنے بڑے کنبے پر پوری اترتی۔ گوشت بھونا جاتا اور ہمیشہ کی طرح کچا پکا اتار کر کھاتے۔

پورے علاقے میں گوشت کی ایک مخصوص بو پھیلی ہوتی۔ زیادہ تر کے پیٹ خراب ہو جاتے اور دوسرے دن اکثر ڈاکٹر اپنے متوقع مریضوں کے لیے اپنے کلینک کھولا کرتے تھے۔ ویسے ہی عید میلے ہوتے۔ وہی سنیما گھروں پر رش پڑتا جیسے چھوٹی عید پر ہوتا تھا۔ تین دن خوب گزرتے۔ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ آج کل تو خوشی صرف اپنے اسٹیٹس پر لکھی جاتی ہے۔ ان دنوں خوشی لپٹ جایا کرتی تھی۔ ان دنوں خوشیاں چھوٹی چھوٹی بھی ہوتی تھیں اور بڑی بھی ہوتی تھیں۔ ہر ایک کا اپنا لطف ہوتا تھا۔ ان دنوں ایک چپل بھی خرید لی تو گھنٹوں اسے دیکھتے رہے۔ آج کل کے مہنگے جوتے بھی لے آئے تو انہیں صرف پہنتے وقت ایک نظر دیکھنا ہی بہت ہوتا ہے۔ آج کل سستی چیزیں مہنگی ہو گئیں اور مہنگی سستی ہو گئیں۔ اچھا کھانا ہم دس روپے میں کھا لیتے تھے اور جوتا پچاس روپے میں مل جاتا تھا۔ آج کل کھانا

ڈیڑھ ہزار میں اور جوتا ایک ہزار میں۔

عید کی یاد میں سب کو مفتی نے ڈوبا دیکھا تو سب سے مخاطب ہوا۔ ”میری بہن نے آپ تینوں کو میرے سمیت عید رات کو دعوت دی ہے۔ ہم رات وہیں ٹھہریں گے۔ دوسرے دن عید کی نماز پڑھ کر اور دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آئیں گے۔“

یہ سب سنا کر وہ ہم سب کو خاموش پا کر حیرانگی سے دیکھتا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی کیونکہ ہمیں ردِعمل کے طور پر خوشی سے شور مچانا تھا۔ نعرے لگانے تھے مگر ہم اس لیے خاموش تھے کہ پرسوں سب کی جاب تھی۔ میری تو نئی جاب کا تیسرا دن تھا اور میں چھٹی کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

سب کو اپنی مجبوریاں بتائیں مگر مفتی اڑ گیا۔ سرجی اور شہباز نے تو کہہ دیا کہ ہم کل فون کر کے سیکیورٹی کی جاب سے پرسوں کی چھٹی لے لیں گے۔ اب مسئلہ میرا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جاب کے تیسرے دن اپنی ٹریننگ میں چھٹی نہیں کر سکتا۔ لمبی بحث ہوئی۔ مفتی نے للکار للکار کر مجھے سمجھایا۔ محبت میں اس کی آنکھیں تک سرخ ہو گئیں۔ منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ مجھے وارننگ دی کہ اگر تم نے چھٹی نہ کی تو دوستی ختم۔ میں نے پوچھا۔ ”آخر یہ دوستی کیوں ختم؟“

کہنے لگا۔ ”بہن کے سامنے میری بے عزتی ہوگی۔“ پھر چلا کر بولا۔ ”اس نے رات کے کھانے، صبح کے ناشتے اور پھر عید کے دن کھانے کا سارا انتظام کیا ہوا ہے۔“

مفتی کی بہن اور بہنوئی اکاؤنٹنٹ تھے۔ مالی حیثیت بہت اچھی تھی۔ رہن سہن بہت اونچا تھا۔ مفتی ان سے چھوٹا بھی تھا اور پھر سب کچھ ملا کر وہ ان دونوں کے آگے دبتا تھا۔ اپنی بہن کے سامنے تہذیب و تمدن کا بہت خیال رکھتا تھا۔ خود تو رکھتا اور ساتھ ہمیں بھی یہ سب کرواتا تھا۔ جب اس کی بہن بھی اس سے ملنے آتیں تو یہ پہلے ہمیں لیکچر دیتا۔ سرجی سے تو ایک دو بار ریہرسل بھی کروا چکا تھا۔ مجھے اس ماحول میں رات گزارنا بھاری بھی لگ رہا تھا مگر مفتی نے بقول شہباز ”سیاپا“ ڈال دیا تھا۔ میں نے کل ڈیبی سے چھٹی کی بات کرنے کی ہامی بھر لی مگر اندر سے میں سخت غصے میں تھا کہ یہ مجھ سے زبردستی کروا رہا ہے اور اسے میری نئی نئی جاب کی فکر بھی نہیں ہے۔

میں کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میں غصے میں تھا۔ سرجی پھر سے نازل ہوئے۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔ ”آپ بھی ہمیشہ آٹھ پہر سوگی بنے رہتے ہیں۔“

میں جھنجلا گیا اور غصے میں کہا۔ ”یہ محاوروں کا مذاق ہر وقت نہ چلایا کریں۔“

وہ خاموش ہو کر مجھے تکنے لگے۔ بعد کو میں اپنے اس لہجے پر پچھتایا بھی تھا۔ دوسرے دن ان سے اس کا اظہار... بھی کیا۔ سن کر بولے۔ ”میں بھی سمجھوں کہ کل آپ کیوں آستین چڑھائے بیٹھے تھے؟“

دوسرے دن وہی بخ دن تھا۔ میں وقت سے پہلے ہیموسال پہنچ گیا۔ فلپائن کا فرڈی مجھ سے پہلے آیا ہوا تھا۔ ڈیانا اپنی کرسی پر اسی حالت میں بیٹھی تھی جیسے کل اسے چھوڑ گیا تھا۔ ڈیانا کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک دو بار اچھلی اور پھر مجھے گڈ مارننگ کہہ کر زیادہ اچھلنے لگی۔ میں اسے جواب دے کر فرڈی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ کھڑکی سے باہر سڑک پر بچھی برف کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے گڈ مارننگ کہا تو جواب میں کہنے لگا۔ ”ایک اور لمبا اور بورنگ دن شروع ہونے والا ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواب نہ پا کر فرڈی میری جانب مڑا اور پوچھا۔ ”لگتا ہے تم کو ایسی بورنگ کلاس میں لطف آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں خود لیکچرر رہا ہوں اور کچھ سیکھنے سے میں بور نہیں ہوتا۔“

لیکچرر کا سن کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کہنے لگا۔ ”پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟“

پھر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم کو تو کسی یونیورسٹی میں جاب کرنی چاہیے۔“ میری تعلیم پوچھ کر جواب میں کہا۔ ”ہم میں سے کوئی یہاں پر گریڈ بارہ سے اوپر نہیں ہے۔“

میں خود حیران رہ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بی ایس سی کی ڈگری یہاں سب سے بڑی ڈگری سمجھی جاتی ہے۔ ڈیبی خود بی ایس سی تھی اور سپروائزر لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ ماسٹر ڈگری لے کر اس لیے پیچھے تھے کہ ہماری ایک تو تعلیم مقامی نہ تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ تھا۔ ہمارے مطمئن ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب ہم اپنی تنخواہ کا موازنہ پاکستان سے کرتے تھے تو اسی کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت سمجھ لیتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے۔

دوسرے لوگ بھی آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈیبی کل سے مختلف لباس میں بھاری فائلوں کا بوجھ اٹھا کر ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔ سب کو گڈ مارننگ کہا۔ جواب میں سب نے گڈ مارننگ کہا اور ڈیانا ایک بار کہہ کر دہراتی چلی گئی۔ جب تھمی تو بلاوجہ ہنسنے لگی۔

کلاس شروع ہوئی۔ کچھ نئی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ میں نوٹس

لیٹا رہا۔ فرڈی اونگھتا رہا۔ ڈیانا ہلتی رہی اور کیٹی اپنے چمکدار چشموں کے پیچھے پلکیں جھپکاتی رہی۔

لنچ بریک ہوا اور ہم اسی لنچ روم میں آبیٹھے۔ منظر نے کل کی طرح اپنی ایک روٹی مجھے دی۔ سالن گرم کیا۔ کچھ میری پلیٹ میں ڈال کر چہرے پر سنجیدگی کا ماسک لگائے سر جھکا کر کھانے لگا۔ منظر سے میری زیادہ دعا سلام نہ تھی۔ وہ میرا محسن تھا مگر اتنی سنجیدگی مجھے ہضم نہ ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ کام کرنا تھا۔ مجھی کو یہ کرخت ماحول توڑنا تھا۔ کھاتے کھاتے میں نے منظر سے پوچھا۔ ''ایک روٹی میں تمہارا پیٹ بھر جاتا ہے؟''

اسی متانت سے سر ہلا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔'' جواب دے کر پھر سے کھانا کھانے لگا۔

میں نے خود سے اپنا جواب دیا۔ ''میرا تو گزارہ نہیں ہوتا۔ آپ بھابی سے کہہ کر کل سے تین روٹیاں اور کچھ زیادہ سالن لایا کریں۔''

یہ سن کر اس کا چلتا منہ اور چلتے ہاتھ رک گئے۔ میری جانب دیکھا تو میں مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایک آفت لڑکی لنچ روم میں داخل ہوئی۔ سرخ و سفید رنگت ایسے کہ دودھ میں شہد ملا دیا گیا ہو۔ خاموش چہرہ اور اداس آنکھیں۔ پینٹ پر ایک تنگ جرسی پہنی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ آئی اور سیدھا کافی مشین سے کافی لے کر اسی طرح چلی گئی۔ منظر بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے محویت زدہ دیکھ کر ہنسنے لگا اور بتایا۔ ''یہ کیتھی ہے۔ کوالٹی کنٹرول میں کام کرتی ہے۔''

میں سر جھکائے اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ منظر کچھ اور کھلا پھر ہنس کر بولا۔ ''لگتا ہے۔ کیتھی پسند آگئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی خوب صورت لڑکی کس کو پسند نہ آئے گی؟''

یہ سننے کے بعد منظر کچھ اور کھلا اور اسے بھابی بھابی کہنے لگا۔ آج بھی جب ملتا ہے تو اس کا ذکر بھابی کہہ کر کرتا ہے۔ اگلے چند ماہ میں کیتھی سے اچھی خاصی گپ شپ ہوگئی اور اسے بھی بتا دیا گیا کہ وہ اب بھابی کہلائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب بھی بتا دیا گیا اور پھر اسے باخبر رکھا جانے لگا کہ کہیں بھول نہ جائے۔

منظر کے ساتھ سنجیدگی کا پردہ میں نے پھاڑ ڈالا تھا۔ بعد میں ہماری دوستی اتنی بڑھی کہ آج تک قائم ہے۔ ہم اب بھی بیٹھ کر ہیموسال کے دن اور وہاں کے لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔

کلاس دوبارہ شروع ہوئی۔ میرے سامنے ایک پہاڑ کھڑا تھا کہ کس طرح ڈیبی سے کل بقرعید کی چھٹی کا بولوں؟ آج میرا دوسرا دن تھا اور چھٹی کا کہتے ہوئے شرم آرہی تھی مگر دوسری جانب مفتی کا اصرار تھا کہ چھٹی لینی بھی ضروری ہے۔ اس نے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔

بیچ میں ڈیبی سے میں نے کہہ دیا کہ کل ہماری عید ہے اور اگر ایک دن کی چھٹی مل جائے تو سائل بے حد مشکور ہوگا۔ پہلے تو عید کے نام پر اس نے اپنی سبز آنکھیں سکیڑیں۔ پھر پوچھا۔ ''یہ عید کیا ہوتی ہے؟''

مجھے سمجھ نہ آئی کہ کس طرح اس کی بابت اسے بتاؤں۔ میں نے صرف یہ کہا کہ جس طرح آپ کی کرسمس ہوتی ہے تو مسلمانوں کی عید ہوتی ہے۔ اس کی سکڑی آنکھیں کوئی چمک لیے پھیل گئیں۔ کچھ اور پوچھا میں نے سنت ابراہیمی اور حج کی بابت بتایا اور پھر عید کا ذکر دوبارہ نہایت احترام سے کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا سب مسلمان یہ تہوار مناتے ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں تو ڈر رہا تھا کہ وہ بھڑک نہ جائے مگر اس کا جواب نہایت حوصلہ افزا تھا۔ کہنے لگی۔ ''ہم کو سارے لوگوں کے کلچر اور مذہبی رسومات اور تہواروں کا احترام کرنا چاہیے۔'' پھر اس نے ہیموسال کی پالیسی بتائی کہ کینیڈا کے قانون کے مطابق ہر ایک کو اپنے مذہب اور کلچر کو اپنانے کی مکمل آزادی ہے۔ اس نے پھر میری تعریف کی کہ اس کو اپنے تہوار کے بارے میں بتایا۔ مجھے اس نے کل کی چھٹی دے دی۔ اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ مینجمنٹ سے بات کر کے چھ سات یا جتنے بھی مسلمان ہیموسال میں کام کرتے تھے، ان کی چھٹی بھی منظور کروا دی۔

مفتی تو پہلے ہی اپنی سالانہ چھٹیوں میں سے ایک چھٹی لے چکا تھا مگر منظر کے ساتھ باقی سب کو بھی عید کی چھٹی مل گئی۔

میرا پہلا تاثر بہت اچھا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے اپنائیت ملنے کا احساس ہوا۔ بعد کے دنوں میں اپنی اہمیت کا احساس توانا ہوتا گیا۔ ہر سال ہیموسال کا سالانہ کنونشن ہوتا تھا۔ اتفاق سے وہ جب بھی ہوا تو وہ رمضان شریف کے دن تھے۔ ہیموسال میں کام کرنے والے تمام مسلم روزے سے ہوتے تھے۔ پہلے کنونشن صبح سے شام تک جاری رہا اور بیچ میں لنچ کا وقفہ ہوا۔ ہم تو روزے سے تھے۔ اسی لیے ایک مینیجر سے اجازت لے کر باہر چلے آئے تھے اگر روزے سے نہ بھی ہوتے تو ان کا کھانا ہم سے نہیں کھایا جا سکتا ہے۔ ان کے کھانوں میں سلاد، کچھ کٹے ہوئے پھل، پھیکی کچی سی مچھلی اور اسی ذائقے کی چکن ہوتی لیکن بھی ہوتا جس کی طرف ہم نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

چکن، پیزا بھی ہمارے لیے ممنوع تھا۔ خیر ہم وہاں سے چلے آئے۔ واپس آئے تو کسی نے ہمارے واک آؤٹ کی وجہ پوچھی تو ہم نے رمضان کے مہینے کے بارے میں بتایا اور پھر بھول گئے۔

کچھ دن بعد ہم سب مسلمانوں کو کمپنی کے سی ای او کا لیٹر ملا۔ بہت معذرت کی گئی تھی کہ آپ لوگوں کا مقدس مہینا تھا اور ہم نے لنچ رکھا ہوا تھا۔ بار بار کی معذرت کے بعد آیندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کی یقین دہانی کروائی گئی۔

اگلے سال کونشن سے پہلے مسلمانوں سے رابطہ کیا گیا کہ آپ کس وقت کھانا کھا سکتے ہیں تاکہ ہم کونشن کا ڈنر اسی وقت پر اسٹارٹ کرسکیں۔ ہم نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی افطاری کا ٹائم بتایا اور یہ بھی مطلع کیا کہ ہم حلال فوڈ استعمال کرتے ہیں۔ پھر باہمی مشورے سے ہم نے ایک کیٹرنگ والے کا فون نمبر دیا اور ساتھ ہی دیسی کھانوں کی فہرست دی جس میں بریانی، چکن روسٹ، قورمہ، رائتہ اور ساتھ ساتھ سموسے پکوڑے بھی لکھوادیے۔ اب ہم مسلمان چھ سات سے بڑھ کر پندرہ کے قریب ہوچکے تھے اور انڈین بھی ہمارے ہمنوا بن گئے۔ وہ اپنے ملک میں شاید چکن نہیں کھاتے مگر اکثر باہر کے ملکوں میں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

کونشن شروع ہوا اور ہماری افطاری سے آدھا گھنٹا پہلے ختم ہوا۔ ہم سے ٹائم پوچھا گیا اور ہم نے ٹائم بتادیا۔ اعلان ہوا کہ کوئی غیر مسلم اس ٹائم سے پہلے کھانا شروع نہیں کرے گا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ سب گوروں نے اپنی پلیٹیں پکڑی ہیں اور لائن میں لگے کھڑے ہیں تاکہ افطار کا ٹائم ہو اور وہ کھانا شروع کرسکیں۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ان کی نظر میں ہم غیر مذہب لوگ تھے اور ہمارے مذہب اسلام کا یہ احترام مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہم نے ہی اپنی افطاری کا اعلان کیا اور انہوں نے اپنا ڈنر شروع کیا۔

ہمارا کھانا ایک سائیڈ پر میزوں پر رکھا تھا۔ سب کچھ بڑی مقدار میں تھا جس کی ہم نے فہرست دی تھی۔ دیکھتے دیکھتے تمام گورے ہمارا کھانا چسکے لے لے کر چٹ کر گئے۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ہم بھی بھوکے نہ رہے۔ گورے تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ ہم بھی اس طرح خوش ہو رہے تھے کہ جیسے یہ سب کچھ ہم نے بنایا ہو۔ کچھ انڈین ہماری اتنی پذیرائی پر ناراض بھی نظر آرہے تھے مگر ان کی اتنی جرأت نہ تھی کہ کوئی بات کرسکتے۔ بعد میں جب بھی کبھی کوئی فنکشن ہوا تو حلال فوڈ کھانے والے زیادہ گورے ہوتے۔ وہ اب ہم سے فرمائشیں بھی کرنے لگے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہم لنچ میں ان کے لیے بنا کر لایا کریں۔ میری ایک سپروائزر لوئیس (Louise) تھی۔ اس کو ایک بار میں نے ساتھ مرچ مسالے والے پیاز انڈے کھلائے تو وہ میری گرویدہ بن گئی۔ ایک بار مجھے آفر دی کہ جب میں اسے اپنے گھر کا کھانا لاکر اسے کھلایا کروں گا تو وہ مجھے واڈکا بدلے میں پلائے گی۔ اس آفر پر منظر کے علاوہ سب دیسی میرا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ جب کوئی چیز بنا کر لاتا تو کہتے۔ ”آج واڈ کا پینے کا موڈ ہے۔“

مجھے عید کی چھٹی مل گئی تھی بلکہ مجھے آج۔۔ جلدی جانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ پہنچ کر یہ خبر مفتی کو دی تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔

کچھ دیر بعد ہمیں سب وے سے مارکھم جانا تھا۔ مارکھم میں میکاون سب وے پر ہمیں مفتی کی بہن ملتی جو ہمیں ساتھ لے جاتی۔ کل بڑی عید تھی اور ہم نے اسی حساب سے کپڑے ایک بیگ میں ڈال لیے۔ رات وہیں گزارنی تھی۔ شہباز نے مفتی سے پوچھا۔ ”معلوم تو کرلو کہ کل عید ہے؟“

مفتی بولا۔ ”سارے ٹورنٹو کو پتا ہے کل عید ہے تو میں کس سے کیا معلوم کروں۔“

سرجی کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ بولے۔ ”کیا معلوم مارکھم میں عید نہ ہو جیسے پاکستان میں ہوتا ہے کہ آدھے گاؤں دیوالی آدھے گاؤں ہولی۔“

میں نے کہا کہ یہ کشمکش صرف چھوٹی عید پر ہوتی ہے تو شہباز کے ساتھ سرجی بھی راضی ہوئے۔

میں نے نسرین کو فون کیا۔ اپنے ہیموسال میں جاب جوائن کرنے کی خبر دی۔ مبارک باد وصول کی اور اپنی جانب سے عید کی مبارک باد دی۔ کہنے لگی کہ عید پر میرے گھر آجاؤ۔

میں نے کہا۔ ”اس دن تو گھر کے باہر سے بھگا دیا تھا اور آج بلا رہی ہو۔“

پہلے خاموش رہی اور پھر کہا۔ ”ہاں! اب بلا رہی ہوں۔“

اس آفر پر میں خاموش ہوگیا۔ مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اگر نہ آئے......!“ وہ کچھ اور کہتی کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کل ہمیں مفتی کی بہن کے ہاں جانا ہے......“

میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بولی۔ ”کچھ بھی ہو تمہیں آنا ہے۔“

اس نے مجھے پل صراط پر لاکھڑا کیا تھا۔ ایک جانب مفتی تھا تو دوسری جانب نسرین۔

(جاری ہے)

سلمیٰ اعوان

وہ عالمی شہرت کا حامل ایک بڑا قلم کار تھا۔ اس کی تحریروں کو پسند کرنے والے ہر ملک میں ملیں گے لیکن خود اس کی زندگی الجھی ہوئی تھی اگر اس کے ساتھ اس کی شریکِ سفر نہ ہوتی تو شاید وہ ایسا نامور مصنف بھی نہ بن پاتا۔

ایک بڑے مصنف کی زندگی کا عکس

سچ تو یہی تھا کہ میں اس عظیم ناول نگار کے گھر جانے کی خواہش میں بے حال تھی۔ پر مصیبت یہ تھی کہ میری ساتھی محل میناروں کی شیدائی تھی۔ ونٹر پیلس اور ہرمیٹیج کا سبق گھر سے پڑھ کر آئی تھی۔ میں خود بھی محلات اور چرچوں کے طرز تعمیر کی فنکاریوں، فنون لطیفہ کی گھمبیر تاؤں اور ان کی بوقلمونیوں میں یوں الجھی کہ دوستوئسکی دل سے اوجھل ہوگیا۔

چوتھے دن صبح سویرے مجھے اس کی ہڑک اٹھی تھی۔ میں بک گائیڈ ہاتھ میں پکڑے ریسپشن پر چلی گئی۔ ریسپشن پر ہر

دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔ دوستو وسکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ فضا میں استفہامیہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔

''ٹیکسی۔'' وہ بولی۔

''نیت۔'' (نہیں) میٹرو یا بس۔'' میں نے جواباً کہا۔

گو وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی کہ تم ٹیکسی کرلو ٹھیک رہوگی۔

''ارے مجھے کتے نے کاٹا ہے جو ٹیکسی کرلوں۔ ایک دو کلومیٹر کا راستہ اس نے گھما پھرا کر دس کا کرلینا ہے اور پانچ سو چار سو روبل جھاڑ لیتے ہیں۔ روس کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کائیاں ہیں غیر ملکیوں کو لوٹنا جانتے ہیں۔ ایسی ایسی پھرتیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اوپر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔''

لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔ ''آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ گھبرایا نہ کریں۔''

''بس تم مجھے سمجھادو۔ میٹرو یا بس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔''

''میٹرو سے۔'' اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

اس کی حیرت پر مجھے اچنبھا ہوا۔

''لو یہ ہمیں کیا گاؤدی سمجھ رہی ہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

کچھ زبان اور کچھ اشاروں نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ نکل پڑے۔ سادووایا Sadovya میٹرو سے دوستو وسکی سکایا میٹرو پر اترے۔ باہر آئے۔

گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولادی میر چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کزنچنی لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سا تامل نہیں کرتے تھے۔ پرانی یم سکایا اسٹریٹ جواب دوستو وسکی کہلاتی ہے۔ یہیں کونے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں وہ میرا محبوب لکھاری اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔ گویا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء اور انتہا تھا۔

مین دروازہ بیسمنٹ کی چند سیڑھیاں اتر کر تھا۔ پہلے پوڈے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لمحوں کے لیے چبوترے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلکیں اظہار تشکر کے طور پر بھیگ سی گئی تھیں۔ بھلا میری اتنی اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ وثقافت سے لبالب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے نا۔

اور پھر میں بھاری بھرکم چوبی دروازے کو دھکا دے کر فیدور دوستو وسکی کے گھر میں داخل ہوئی۔ سو روبل کا ٹکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں کرسی میز بچھائے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوں سامنے ایک بڑا کمرا سامنے آتا ہے۔ یہ ہال کمرا تھا جس میں رکھے ٹی وی کی اسکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکومینٹری چل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا۔ صوفے پر ہی آرام کرتا ہوا کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لیے جاتا ہوا، کینڈل پکڑے، برفباری کے دوران بیلچے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہر مہرہ رنگے میٹ پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساؤتھ کوریا کے دولڑکے اور کرسی پر براجمان موٹی تازی روسی نگران خاتون تھی۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیئے جل رہے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی ''اینا'' کی وہ تحریر تھی جس میں ممتا کا وہ دکھ جھلکتا تھا کہ جب ان کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیوشا فوت ہوا۔ اسے مرگی کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو وہ گھر جس کے چپے چپے پر ان کے لاڈلے بیٹے کی یادیں بکھری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اس دکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں انہوں نے گھر بدلا، وہیں وہ ولادی میر سلوویو کے کہنے پر آپٹن مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں ''ایلڈر'' نے ان کی پریشان اور غم زدہ حالت پر اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستو وسکی کا یہ روحانی تجربہ اور قلبی طمانیت اس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں یہی وہ ہال تھا جس کا ذکر اینا نے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں اٹھی۔ سامنے دیوار پر پیٹرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لمبے فراک نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فراک نما میکسیاں، سروں پر اسکارف نما ہڈ اور کوٹ نما گاؤن تھے۔ سینا اسکوائر میں خرید وفروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت اسکیچ پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کتھیڈرل، کرسٹل پیلس، روم کا پیٹرا اسکوائر اور میلان کے کتھیڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھٹک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

"یہ ہینز ہولبین دی ینگر" کی "دی ڈیتھ آف جیسز" The death of jesus پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے جیسز کے پورے وجود پر بکھری موت کی اذیت اور دردناکیوں کو پینٹ کیا تھا۔ جیسز کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پسلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے ستا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلاہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

یہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ خصوصی طور پر باسل سوئیزر لینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

"اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولبین ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔"

انٹرنس ہال میں اس کی چھتریاں، ہیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے نرسری میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیوبو بیٹی نو سال اور بیٹا فیودور سات سال کا تھا۔

کمرا ایک خوبصورت گڑیا، راکنگ ہارس، چند کرسیوں، بچوں کی رائٹنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیٹے کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستووسکی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکر مند رہتا تھا اس کا اظہار اس تحریر سے ہوتا ہے جو اینا نے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے علاج یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو "اینا" کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھرپور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی روسی اور یورپی ادب

نائٹ شفٹ میں کام کرنا امراض کا شکار بنا سکتا ہے

ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ جو لوگ رات میں بھرپور نیند نہیں لیتے ہیں یا نائٹ شفٹ میں کام کرتے ہیں ان میں ڈی این اے مرمت کرنے والا قدرتی نظام متاثر ہوتا ہے جو آگے چل کر کئی امراض کی وجہ بن سکتا ہے۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مطالعہ ہے لیکن اس میں دیکھا گیا ہے کہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے افراد کے جسموں سے ایک خاص کیمیکل 8-OH-dG کم خارج ہوتا ہے جو انسانی جسم میں ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مسلسل یہی عمل جاری رہے تو اس سے موٹاپے، ذیابیطس اور امراضِ قلب کے علاوہ کینسر کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ امریکی شہر سیاٹل میں فریڈ ہچنسن کینسر سینٹر کی پروین بھٹی نے یہ تحقیق کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس تحقیق سے ان امراض کے خطرات کی ایک وجہ سامنے آئی ہے۔ ہمارے جسم میں قدرتی طور پر ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ جاری رہتی ہے لیکن اس کی مرمت کا قدرتی نظام بھی موجود رہتا ہے اور جیسے ہی ڈی این اے کی مرمت ہوتی ہے تو پیشاب میں 8-OH-dG کی زائد مقدار خارج ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی کم مقدار کا خارج ہونا ظاہر کرتا ہے کہ شاید ڈی این اے کی درستگی مناسب نہیں ہو رہی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ڈی این اے متاثر ہونے سے کئی امراض لاحق ہو سکتے ہیں جن میں کینسر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ نائٹ شفٹ میں کام کرنے سے ایک جسمانی ہارمون میلاٹونن بھی کم ہو جاتا ہے، جو جسم کی اندرونی گھڑی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دیگر ماہرین کا اصرار ہے کہ اس تحقیق کی یہ تشریح کرنا درست نہ ہوگا۔ سائنسدانوں کے مطابق اس تحقیق میں میلاٹونن کا کردار واضح نہیں ہو رہا۔ اسی طرح شفٹوں میں کام کرنے سے ڈی این اے متاثر ہونے کے بھی مزید ثبوت درکار ہوں گے، تاہم پروین بھٹی کی ٹیم نے انکشاف کیا کہ تحقیق کے مطابق جب ملازمین رات کی نیند لینے لگے تو... ان میں 8-OH-dG کی شرح واپس بحال ہو جاتی ہے۔

اس تحقیق میں 223 افراد کا جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف شفٹوں میں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے دن کی نیند اور رات کی نیند لینے والوں کے جسم میں 8-OH-dG کا جائزہ لیا گیا۔

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

پڑھانے کا متمنی تھا۔ گوگول، پشکن، ڈکنز اور وکٹر ہیوگو سے تو بچے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اونچی اونچی آواز میں پڑھتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے لکھا۔

''اپنا تم فیودور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپنے سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں۔ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے پڑھانا ہے۔''

اور یقیناً یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیو بو نے بہت سی کتابیں جن میں "Sick Girl" وویمن لائر اور ''دوستووسکی اپنی بیٹی کی نظر میں'' بہت مشہور ہوئیں۔

فیودور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹریز اور ماہر ہارس بریڈر بننے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

نرسری سے ہی میں اپنا کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اپنا جر یجورینا کا کمرا سادگی کا نمونہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما کرسی میز اپنی کہانی خود بیان کر رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ روس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جا بجا صوفے آرام دہ کرسیاں اور بینچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جائیں تو بیٹھیں، ستائیں، سوچیں، خلقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ استنبول میں کہیں بیٹھنا تو دور کی بات کسی دیوار کے ساتھ لحہ بھر کی ٹیکی بھی ڈیوٹی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جاتی ہے اور وہ کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یقیناً میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے اس عورت کی قربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دوگنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حد درجہ پریشان تھا۔

دوستووسکی کے لیے 1854ء کا سال بہت پر آشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی میخائل اور گہرا دوست نامور محقق اور شاعر اپولون جو اس کے ذاتی اخبار ''دی ٹائم'' اور ''دی اپوچ'' میں اس کا معاون تھا یکے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔ ''میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔''

اپنے بھائی کے قرضے اتارنے کے لیے وہ کمیشن پر لکھنے لگا۔ وقت کی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی رائلٹی سے محروم ہو جاتا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

''ایک اسٹینوگرافر رکھو۔'' دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک ابر آلود دوپہر کو کتابی چہرے پر سجے ستواں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور آستینوں پر لگی دیدہ زیب لیسیں لہراتی تھیں، اس کے گھر میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

''The Gambler'' چھبیس دنوں میں مکمل ہو گئی۔

کام کے اختتام پر اسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور ہمدرد لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''میں اس سے کیسے بات کروں؟'' اس کے باریک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال ابھرا جو دل کی سرگوشی میں اپنے آپ سے تھا۔

وہ رد کیے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اس کا عندیہ لینے کے لیے اس نے فرضی ناول کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مریض بھی ہے کا بیس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونا اور اپنا سے یہ پوچھنا کہ ذرا سوچو تو کیا امنگوں سے بھری ہوئی اس نوجوان لڑکی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

''کیوں نہیں۔'' اپنا نے نگاہیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر تفکر بھری لکیریں تھیں۔ ''محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔''

بس تو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کھل اٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

''اپنا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مرد تم جیسی نوجوان لڑکی کے لیے قطعی موزوں نہیں پر پتا نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے بکھرے ہوئے انسان کو سمیٹ لو گی۔ مجھے پیار دو گی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔''

اور اینا نے اس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چمکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہان سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔

تب اس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اس کی خودداری، اس کے پندار اور اس کی عظمت کے لیے کتنا بڑا دھچکا ہوگا۔

"نہیں۔ میں اِسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔ یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔"

بیاہ کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔ اور رسم کی ادائیگی کے لئے ٹرنٹی کھیتڈرل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہوگیا۔ پر کچھ گھمبیر سے مسائل ابھی بھی اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سر فہرست اس کا ویڈنگ ڈریس تھا۔

یہ کیسا ہو؟ اور اس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستووسکی کے لیے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

سمجھدار ذہین لڑکی نے ان بہت سارے سوالوں کو جنہوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا کا جواب دے کر اس کے تفکرات کو تحلیل کر دیا۔

"بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔ اپنا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کروں گی اور اسے خوبصورت ڈیزائنوں سے خود ہی سجالوں گی۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔"

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہوگیا۔ ابھی استقبالیہ دعوت تھی۔ جب نئی نویلی دلہن کو دولہا سنبھالنا پڑا کہ دوستووسکی نے شمپین ضرورت سے زیادہ پی لی تھی۔ مرگی جس کا وہ پرانا مریض تھا اسی کا دورہ پڑا تھا۔ گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہا اور دلہن اسے اپنی بانہوں میں اور کبھی اس کا سر اپنی گود میں رکھے اسے سنبھالتی رہی۔ پہلے ہی دن سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹنے اور اس کے دکھ کو بانٹنے کا یہ کام اسے مل گیا تھا جو اسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔ اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون چوسنے والی جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، ان کا آئے دن تنگ کرنا، اس کی جائیداد ہتھیانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی ان سب کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لیے شوہر کو ان کے چنگل سے نکال کر باہر لے آئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مشکلات اور مصائب سے بھری

بلوچ، پٹھان اور وابستہ نسلیں

دو بڑی قومیں، پٹھان اور بلوچ، پنجاب کے تمام مغربی علاقہ پر محیط ہیں۔ کوہ سلیمان کے مغربی رخ سے لے کر ڈیرہ غازی خان کے سامنے تقریباً کوئٹہ کے مغرب تک کھینچے گئے خط کے جنوب میں بلوچ اور شمال میں پٹھان نسل آباد ہے لیکن سندھ پار کی وادی میں اور کوہ سلیمان کے پنجاب والے رخ پر بلوچ شمال کی طرف اس سے بھی آگے تک ہیں اور ڈیرہ اسماعیل خان تحصیل کی جنوبی حد مشترکہ حد کی مبہم نشاندہی کرتی ہے۔ جب کہ دریا کے اس طرف پھر بلوچی دوسری طرف کی نسبت کچھ اور آگے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی مشترکہ حد پر دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ مخلوط قرابتوں کا حامل قبیلہ کھیتران آباد ہے، جو ڈیرہ غازی خان میں بلوچ، ڈیرہ اسماعیل خان میں پٹھان اور غالباً دونوں ہی میں جٹ ماخذ سے ہے جب کہ تھل میں انتہائی جنوبی پٹھان قبیلہ بلوچ (بل+اوچ) ممکن طور پر بلوچ النسل ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں/از: سر ڈینزل ابٹسن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

ہوئی تھی۔ پیسے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی صلواتیں، دوستووسکی کی خراب صحت، اکثر اس کا جوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔

ان کے پہلے بچے صوفیہ کی سوئیزرلینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مرجانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اینا نے حوصلے اور محبت کے بل پر سہا تو وہیں اس نے Idiot تخلیق کی۔

مہر النساء کوئی دو بار سارے کمروں کا چکر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اس نے کہا۔

"سارا دن یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے کیا؟"

میں چپ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اس عورت کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جس نے بقیہ زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اس پر اپنی محبتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب

کرنے میں گزار دیئے۔

میں خاموشی سے اٹھ کر ملحقہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔

ڈائننگ روم کی سجاوٹ پیٹرز برگ کے روایتی گھروں جیسی تھی۔ دوستو وسکی کے خاندان کا اندازِ زندگی سادگی سے بھرپور تھا۔ میز پر کپ سجے تھے۔ کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا وہ سماوار اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اینا کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔ الماری چینی کے نفیس برتنوں سے سجی تھی۔

خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔ اکثر عزیز دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔ اینا کو اپنے شوہر کا گھر واپسی پر رات کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لانا بہت پسند تھا۔ پر اسے آئے دن دوستو وسکی کا بچوں کو ٹریٹ دے دے کر خراب کرنے پر بھی گلہ رہتا تھا۔

چائے اور اس کا اہتمام دوستو وسکی کی زندگی میں بہت اہم تھا۔ چمکتے پیتل کے سماوار کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے میرے سامنے اینا کی تحریر تھی۔ ”اچھی چائے اس کی کمزوری تھی۔ سونے سے قبل میں سماوار کو ڈائننگ روم میں ضرور چیک کرتی۔ چائے بنانے کا اہتمام خصوصی ہوتا۔ سب سے پہلے وہ ابلتے پانی سے کیتلی کو کھنگالتا، اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پاپا کا چمچ کہتے تھے۔“

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی تھی۔ میں اسے ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکتی تھی کہ آگے حد بندی تھی۔ وہ تین چمچ چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی سے بھر کر اسے نیپکن سے ڈھانپ دیتا۔ پورے تین منٹ بعد وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرتا اور پھر اسے کپڑے سے ڈھانپتا۔

اس کی بیٹی Liubov کا کہنا تھا کہ پاپا ہمیشہ چائے کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

”ہائے۔“ میں نے سرشاری کے سرور آگیں احساس کے زیرِ اثر خود سے کہا۔

چلو اور کچھ نہ سہی پر یہ قدر تو مشترک ٹھہری کہ زندگی میں اچھی چائے کے سوا کوئی دوسرا شوق نہیں رہا۔ چائے کا رنگ کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔

گلاس ہاتھ میں تھامے وہ اسٹڈی روم میں آتا اور لکھنے میں محو ہو جاتا۔ چائے میں چینی کی ہمیشہ دو کیوبز ہی استعمال ہوتیں۔ چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے اکثر کرداروں میں جھلکتی۔ ”The Devils“ کے کردار اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

اس گھر میں سب سے اہم تاریخ ساز جگہ اس کا اسٹڈی روم تھا۔ نشست گاہ سے ملحقہ جو اس کی خوابگاہ بھی تھی۔ نشست گاہ میں دیوار گیر وال کلاک کے پاس کھڑے ہو کر اور کرسیوں پر بیٹھ کر تصویریں بنائیں۔ خوش ہوئے کہ ہم ایک ایسے کمرے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، جہاں روس کے نامور شاعر، فلاسفر، محقق اور حقوقِ خواتین کی تحریک کے علمبردار آتے اور گھنٹوں بیٹھا کرتے۔

اسٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے گزارا۔ کمرے کی کھڑکیاں باہر Kuznechny Lane پر کھلتی تھیں۔ ولادی میر چرچ بھی سامنے تھا جہاں دوستو وسکی اپنے آخری ایام میں عبادت کے لئے جایا کرتا۔

یہی وہ کمرا تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا وہ کلاک تھا جس کی سوئیاں 28 جنوری 1881ء بروز بدھ کی شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے مکین کے ساتھ ہی ساکت ہو گئی تھیں۔

کمرا سادگی کی تصویر تھا۔ عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔ ملمع زدہ فریم میں اس کی تصویر کے عین نیچے لیٹر بکس تھا۔ تین خانے والے ریک کے ہر حصے میں کتابیں تھیں۔ الماری میں بھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ اس سادہ سے کمرے میں اسی میز پر اس نے اپنا آخری شاہکار ناول The Brothers Karamazov تخلیق کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر 1821ء۔ بچپن ہی سے اسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔ سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً اسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پیٹرز برگ بھیج دیا اور گویا اس کی قسمت پیٹرز برگ سے وابستہ ہو گئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے بالآخر ایک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات پر اس کا جواب تھا۔ ”میں اپنے بارے میں پُراُمید ہوں۔ انسان ایک سربستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

آغاز کا کچھ وقت اس نے فرانسیسی لکھاریوں کے ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور روس کے رائٹرز کو پڑھا۔ پڑھنے سے اس نے ہمیشہ ایک روحانی آسودگی محسوس کی۔ ابتداء میں اس کے محبوب ڈکنس، گوگول، شلر اور پشکن تھے۔

پر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ حقیقت بذاتِ خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کر دیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ Poor Folk میں ظاہر ہوا۔ اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منتہا ٹھہرایا۔

اور یہ یہی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پیٹراشوسکائے سے ہوا جو روس کے بہتر مستقبل کے لیے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور روسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر لمبی چوڑی بحثیں کرواتا۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو نکولس اول نے خوف زدہ ہو کر روسی وزارتِ داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لیے کہا جو روس میں سرگرم عمل تھیں.... اور نتیجتاً دوستوسکی سمیت میٹنگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پیٹر اینڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر سائبیریا کے شہر اومسک کی سینٹرل جیل میں منتقلی ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد نکولس اول کا انہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ منظرِ عام پر آ گیا۔

یہ بائیس دسمبر 1849 کی سرد ترین صبح تھی۔ سمینو وسکائے اسکوائر میں ایک بڑے شو کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا اسکرپٹ زار نے خود لکھا اور خود ترتیب دیا تھا۔

اسکوائر کے ڈھلانی چھتوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلاد حاضر۔ نکولس اول بہ نفس نفیس یہاں تھا۔ اس شو کو ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لیے ریاستی فنڈز بھی بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجرموں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوسٹیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤن پہنائے جاتے جن کے ساتھ لمبے لمبے ہڈ ہوتے جو ان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری "کراس" کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تمام کر ملزموں کو پلیٹ فارم پر لایا جاتا۔ فردِ جرم اونچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈرم بجتا

کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (کیلٹیک) میں ایرانی نژاد سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے دنیا کا سب سے پتلا کیمرا ایجاد کر لیا ہے جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی عدسہ موجود ہی نہیں جبکہ عدسہ ہی کیمرے کی روح ہے۔ بغیر عدسے کے کیمرا کام ہی نہیں کر سکتا۔ آپٹیکل سوسائٹی آف امریکا ٹیکنیکل ڈائجسٹ (او ایس اے ٹیکنیکل ڈائجسٹ) میں شائع تحقیق کے مطابق اس ڈیجیٹل کیمرے کو عدسے کی ضرورت سے آزاد کرنے کے لیے انتہائی باریک 'آپٹیکل فیزڈ ایرے' (او پی اے) پر مشتمل ٹیکنالوجی وضع کی گئی ہے جس کا ننھا منا سرکٹ بہت کم جگہ استعمال کرتے ہوئے عین وہی کام کرتا ہے جو دوسرے کیمروں میں عدسے کے ذمے ہوتا ہے یعنی روشنی کو حسب ضرورت کسی خاص مقام پر اور کسی خاص انداز سے مرکوز کرنا، تاکہ عکس حاصل کیا جا سکے۔ اسے کیلٹیک کے تحقیقی انجینئروں رضا فاطمی اور بہروز ابریزی نے پروفیسر علی حاجی میری کی نگرانی میں مشترکہ طور پر ایجاد کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کیمرے کا فوکس (ارتکاز) قریب سے دور کی چیز تک ایک سیکنڈ کے صرف ارب ویں حصے یعنی محض ایک فیمٹو سیکنڈ میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو اس وقت دنیا کے کسی دوسرے کیمرے میں اتنی تیز رفتاری کے ساتھ وجود نہیں رکھتی۔ پروفیسر حاجی میری کہتے ہیں عدسے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اس کیمرے کو اتنا زیادہ مختصر کیا جا سکتا ہے کہ جتنا اختصار کسی اور قسم کے کیمرے کے لیے فی الحال ممکن ہی نہیں۔ علاوہ ازیں جب یہ ٹیکنالوجی پختہ ہو کر تجارتی پیمانے پر پہنچ جائے گی تو امید ہے کہ یہ کیمرے بہت ہی کم خرچ پر تیار کیے جا سکیں گے۔ طبّی شعبے سے لے کر عسکری میدان تک او پی اے ٹیکنالوجی والے کیمرے کے لیے اطلاق کی ایک وسیع دنیا موجود ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح 1980 کے عشرے میں سی سی ڈی (چارج کپلڈ ڈیوائس) کی ایجاد نے آج کے جدید ترین ڈیجیٹل کیمروں کی بنیاد رکھی تھی اسی طرح آنے والے برسوں میں عدسے کی ضرورت سے آزاد او پی اے کیمرا ٹیکنالوجی بھی ڈیجیٹل عکس نگاری کو ایک نئے انقلاب سے ہم کنار کرے گی۔ ایک مسلمان سائنس داں کی اس ایجاد نے ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

اور ''موت فائرنگ اسکواڈ کے ساتھ۔'' الفاظ گونجتے اور زندگی پل جھپکتے میں موت کے ہاتھوں میں جھول جاتی۔

اگلا مجرم نئی فرد جرم کے ساتھ ملایا جاتا۔

دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔ اس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستو وسکی گزرا وہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش تھا۔

سمینو وسکائے اسکوائر کے چرچ کی سنہری چھت اور گنبد، لوگ، دھوپ، چمکتا سورج، ہوائیں، آسمان اور میدان میں موت کے سجے بازار سے پھوٹتی کہیں آس اور امید کی کوئی موہوم سی کرن۔ نکولس اول موت سے خاصا محظوظ ہو چکا تھا۔ بقیہ کے لیے قید بامشقت کا حکم دیتا اٹھ گیا تھا۔

''ایڈیٹ میں پرنس ماشکن کی زبان سے اس نے اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔ زندگی ہمارے اندر ہے۔ باہر نہیں۔''

اومسک جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کاغذ اس کے ہاتھ سے چھننے پر ہوئی۔ اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اس نے کہا۔ ''اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مر جاؤں گا۔ کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔''

بیرکوں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ گزارے۔ ان کرداروں میں جو گہرائی، توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔ ''یہ تو بدصورت سیپیوں میں بند وہ سونا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دکھ ہے۔ میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو تفصیل اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ میرے لیے بہت بڑا اثاثہ ہے۔ میں نے روس کو نہیں پر روسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔ Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔''

اور اگلے چھ سال اس نے سائبیریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے گزارے، پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبیریا میں اس نے

"The Village of Stepanchikovo" اور "My Uncle's Dream" لکھیں۔

نکولس اول کی موت نے ملکی حالات کو تبدیل کر دیا اور وہ اپنے پیٹرزبرگ کے دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا ہو گیا۔ مئی 1854ء میں اس نے ماریا سے شادی کی جو بیوہ تھی۔ اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے لکھا تھا۔ ''وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔ چھ سال کا بیٹا بھی اس کے پاس ہے۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اس کا رجحان بھی روحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مسائل سننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطمع نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اس نے کہا۔ ''آج مجھے مرجانا ہے۔''

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ ولادی میر چرچ کے پادری بھی آئے۔

اٹھائیس 28 جنوری کی صبح اس نے کہا۔ ''اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔ تم انجیل لاؤ۔''

اور اینا اسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبیریا جاتے ہوئے راستے میں اسے فونویزینا Fonvizina نے دی تھی جو 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی ناکام بغاوت کے باغیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبری کہلاتے تھے۔

اس نے ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا اس نے ہمیشہ اسے کھولا اور پڑھا ''پس جیسز نے اسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔''

اور اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اینا تم سنتی ہو۔ Let it be so now''

''تم سمجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔''

اس نے آنکھیں موند لیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور وقت آٹھ بج کر چھتیس منٹ کا تھا۔ جب ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

خالد قیوم

وہ دیوار دو ملکوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس دیوار کی وجہ سے بہت سے خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایسے خاندان کے تمام لوگ صرف ایک ہی دعا کرتے تھے کہ یہ دیوار گر جائے۔ وہ بھی یہی دعا کرتا تھا لیکن جب وہ دیوار گری تو وہ دنیا سے جا چکا تھا۔

دلوں کے بیچ کھڑی ایک دیوار کا تذکرہ

مال بردار بحری جہاز کے عرشے کے غلیظ اور چکنے فرش پر تیل سے لتھڑے ہوئے موٹے رسوں کے بڑے سے بنڈل پر میں اور برائن بیٹھے تھے۔ گو کہ اس وقت ہم تھکے ماندے اور ساری دنیا سے بدظن تھے مگر حیرت سے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے منہ موڑے ہوئے کہ یوں مشقت کا احساس بڑھتا نہیں۔ ہم اپنے اپنے سگریٹ بے دریغ پھونک رہے تھے۔ اس وقت یہ واحد عیاشی تھی۔ کڑوے کسیلے دھوئیں کی عیاشی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیر بہت سے امراض کی نشاندہی کر سکتے ہیں جن میں جان لیوا مرض بھی شامل ہو سکتا ہے۔ایک پیر میں 33 جوڑ، 100 کے قریب پٹھے،عضلات اور لاتعداد خون کی رگیں اور شریانیں ہوتی ہیں جو دل، دماغ، حرام مغز اور ریڑھ کی ہڈی سے جڑی ہوتی ہیں۔

پیر میں اینٹھن اور تکلیف: پیر میں تکلیف اور تناؤ کی وجہ جسم میں پانی کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیروں تک آکسیجن نہیں پہنچ رہی ہے۔اسی طرح پیروں میں تکلیف بعض دواؤں کے سائیڈ ایفیکٹ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس کا حل ہے کہ پانی زیادہ پیا جائے، آرام دہ جوتا پہنا جائے اور باقاعدہ ورزش کی جائے تاکہ دورانِ خون بہتر رہے۔ اگر ہڈیوں میں تکلیف ہے تو یہ یورک ایسڈ کی زیادتی کی طرف ایک اشارہ ہے جس کا ایک حل تو ڈاکٹر کو دکھانا ہے اور احتیاط یہ ہے کہ سرخ گوشت ترک کر دیا جائے۔

پیروں کا غیر معمولی ٹھنڈا ہونا: پاؤں اگر مسلسل سرد رہتے ہوں تو یہ کئی کیفیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو ذیابیطس، خون کی کمی اور دورانِ خون کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

پیروں میں سُوجن: پیروں میں اگر مسلسل سوجن ہو تو یہ کئی سنجیدہ امراض کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔خون کی کمی، کمزور دل، جگر اور گردوں کے امراض سے بھی پیروں پر سوجن آسکتی ہے۔اس کے علاوہ ڈی وی ٹی یا بڑی رگ میں خون کے لوتھڑے بننے یا دوران خون متاثر ہونے سے بھی یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔علاج کے دوران ورزش کریں، نمک کا کم

اکتوبر کی خنکی شب کے اوّلین پہر کی چاندنی اور بپھرا ہوا سمندر۔ جہاز سوئے منزل رواں دواں تھا اور منزل تھی گوئٹے مالا جو کہ دو دن کی مسافت پر واقع تھی۔ بادِ بحری کی بیزار کن نمی سے جسم چپچپے ہو رہے تھے۔ میرے سر کے بال تیل اور ہاتھ انجن کی صفائی کی بدولت جلی ہوئی گریس سے آلودہ تھے جبکہ جوتوں میں پسینے اور نمی سے بھیگی ہوئی بدبودار جرابیں تھیں۔ کئی دن سے شیو نہ بنانے کی وجہ سے داڑھی کے بال کھردرے بے ہنگم اور سیہہ کے کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔

دفعتاً برائن نے بولنا شروع کیا تو باوجود اس کے کہ وہ مجھ سے منہ پھیرے ہوئے تھا مگر اس کی آنکھوں میں جو ایک دائمی سی اداسی اور ہر لفظ کے ساتھ جو نمایاں سی سسکی نما آواز منہ سے خارج ہوتی، مجھے بخوبی محسوس ہوتی تھی۔ میں دل گرفتگی کے احساس سمیت ہمہ تن گوش تھا۔

برائن نے کہا۔’’میں ثابت کر سکتا ہوں۔‘‘

’’کیا؟‘‘ میں نے چاند کے روشن پن کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’یہی کہ دنیا میں سب کچھ برا ہی نہیں ہوتا۔ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔‘‘

’’ہو سکتا ہے۔‘‘

’’تمہیں ماننا ہی پڑے گا خالد!‘‘

’’مان لیا......تو پھر؟‘‘ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا اور ویسے بھی وہ ایک کھرا انسان تھا۔

’’تمہیں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں ایک غریب گھرانے کا فرد ہوں۔‘‘

’’ہاں کئی بار بتا چکے! جو کچھ بھی کہنا ہے بلا توقف کہو برائن، تجسس مت پیدا کرو۔‘‘

’’اس سناٹے اور چاندنی کی قسم، شہر کے مضافات میں ہمارا چھوٹا سا گھر موسم سرما کی بے پناہ برف باری میں تقریباً کھو سا جاتا تھا۔ اس سنگین موسم میں موت کے بھیانک سائے ہمارے اردگرد منڈلانے لگتے تو خوراک کے ایک معمولی سے ذرّے کی توقیر اور قیمت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ تمہیں اندازہ نہیں موت کے مقابل چند بھوکے نادار اور ناتواں انسانوں کی بقا کے لیے جدوجہد کا۔ ایک دفعہ ایسے ہی موسم میں ہمارے پاس خوراک بہت کم رہ گئی۔ بہت ہی کم۔ ماں میرے لیے دودھ کا ایک گلاس لائی اور نہایت ملائمت سے کہ جو اس کا شیوہ ہے مجھے تاکید کی کہ میں پی لوں، لیکن مجھے شک گزرا کہ ماں

استعمال اور وزن گھٹانے کی کوشش کریں۔
پاؤں کے چمچہ نما ناخن: اس مرض میں پاؤں کے ناخن ابھرے ہونے کی بجائے چمچے کی طرح ہوتے ہیں اور یہ غذائی کمی، خون میں فولاد کی کمی یا اندرونی جریان کی علامات ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیر کے انگوٹھے کا چمچہ شکل کا ہونا جینیاتی امراض اور خون میں کمی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔
انگوٹھے کے زرد ناخن: عموماً نیل پالش لگانے والی خاتون کے پیر کے ناخن پیلے ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ دیگر امراض کی علامت بھی ہوسکتے ہیں۔ جگر کی خرابی، ٹی بی اور تھائی رائیڈ غدود میں گڑبڑ کی وجہ سے بھی ناخن پیلے ہوسکتے ہیں۔
پاؤں میں سویاں چبھنا: پاؤں میں سرسراہٹ اور سویاں چبھتی محسوس ہوں تو یہ اعصابی نظام میں خرابی کو ظاہر کرتی ہیں۔
ذیابیطس کے مرض میں اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور سویاں چبھتی محسوس ہوتی ہیں۔
پیروں کے جوڑ میں اینٹھن اور تکلیف: پیروں کی انگلیوں کے جوڑ میں اگر تکلیف اور مستقل اینٹھن ہو تو یہ گٹھیا کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ گٹھیا میں جوڑوں کا استر (لائننگ) سوج جاتی ہیں اور ٹشوز متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اس میں ضروری ہے کہ مریض کو متاثرہ مقام پر برف سے ٹکور کیا جائے اور ادویہ دی جائیں لیکن یہ سب ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد ہی ممکن ہے۔

مرسلہ: ابوعمر۔ ملتان

نے خود کچھ بھی نہیں کھایا...... تو میں نے پوچھ لیا اپنی ماں سے۔"

"بولتے رہو برائن...... رکو مت!" آہ جیسے لفظ میرے لبوں سے نکلے۔

"پوچھا اس لیے کہ مجھے گھر میں موجود خوراک کی مقدار کا خوب اندازہ تھا۔" برائن نے بات جاری رکھی۔ "دراصل خالد، وقت جب کڑا ہو تو آگہی کا کرب کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے اور یہ جو مائیں ہوتی ہیں یہ اپنی اولاد سے کبھی کبھی پورا سچ نہیں کہتیں۔ اس وقت ماں کے چہرے پر غضب کا سکون تھا۔ یقیناً ایثار اور اپنی بھوک پر ضبط کا سکون۔ ماں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے اور پھر میری تسلی کو بھرے پیٹ کی ایک ڈکار کی آواز بھی نکالی لیکن ماں جھوٹ بول رہی تھی۔ دنیا کا سب سے سچا جھوٹ، بتاؤ اگر میں اصرار کرتا تو کیا ماں وہ دودھ پی لیتی؟"

"کبھی نہیں......" میری آواز رندھ گئی۔

"پھر وہ ماں تو نہ ہوئی۔" برائن کی آواز جذبے کی شدت سے تھرتھرا گئی۔ "ایسی ہی ہوا کرتی ہیں مائیں۔ مہربان رحم دل اور وفا پیشہ۔ اس دن ماں کے اس ایثار میں گندھے ہوئے سچے جھوٹ نے مجھے ایک سبق دیا کہ ہمیشہ اپنی ضرورت کو دوسرے کی ضرورت پر فوقیت دینی چاہیے۔ یوں جو ایک لافانی مسرت ملتی ہے وہ انسان کو کبھی غریب نہیں ہونے دیتی۔ غربت وسائل یا آسائشات سے محرومی کا نام نہیں بلکہ جذبہ خدمت اور قربانی کے فقدان کو غربت کہا جاتا ہے۔ ایک سگریٹ دینا پلیز...... میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔"

اس نے سلگتے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "سیڑھیوں کے نیچے جو اسٹور تھا اس میں ہماری پالتو کتیا نے بچے ڈیلیور کیے تھے۔ کتیا بھوکی تھی اور جب کوئی جانور بھوکا ہو تو اس کی درد بھری کراہوں کو صرف اس کا مالک ہی سمجھتا ہے اور اس بے رحم کیفیت میں جانور کی خوشامد بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے اس دن کتیا میرے کیچڑ سے آلودہ جوتے چاٹتی رہی تھی اور آخر کار مایوس ہو کر اپنے نومولود بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔ تو ماں جونہی کمرے سے نکلی تو میں نے دودھ کا وہ گلاس اٹھایا اور اسٹور میں جا کر کتیا کو پلا دیا کیونکہ مجھ سے زیادہ وہی مستحق تھی۔ وہ میری نیکی کا عملی آغاز تھا۔ دنیا میں سب کچھ برا ہی نہیں ہوتا۔"

"تمہیں ماں یاد آتی ہے برائن؟" کتنا فضول سا سوال تھا میرا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔

”ہاں...... بہت زیادہ۔“ اس نے تڑپ کر جواب دیا۔
”میری عزیز ماں جو ساری دنیا میں صرف میری واپسی کے دن گن رہی ہوگی۔“
اور یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ برائن رو رہا تھا اور میں نہ دیکھنے کے باوجود دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی نہ تھی البتہ وہ چمک تھی جو بہادروں کی سونتی ہوئی تلواروں میں ہوتی ہے۔
”میں وہ دن کبھی نہیں بھلا سکتا!“
”کون سے دن؟“ میں نے قریب الختم سگریٹ کو اپنے جوتے کی ایڑی تلے رگڑتے ہوئے پوچھا۔
”جب ماں ہمیں ہر ہفتے کی شام ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد دیوارِ برلن کے پاس لے جاتی۔ ایک بلند چبوترے پر چڑھ کر وہ دیوار کی مغربی جانب نگاہیں جما دیتی۔ میں اور میری چھوٹی بہن ایستھر دونوں ماں کی بے کراں محویت کے احترام میں سانس بھی از حد احتیاط سے لیتے کہ کہیں اس کی توجہ نہ ٹوٹ جائے۔ یکسوئی کے اس عالم میں وقت ٹھہر سا جاتا اور جب بہت دیر بعد ماں اپنی نظر سمیٹ کر ہمیں دیکھتی تو ہم مچل کر اس کے ماموں دامن سے چمٹ جایا کرتے۔ ماں کی مشفق ہاتھ کی لرزیدہ انگلیاں ہمارے سنورے ہوئے بالوں کو سہلانے لگتیں اور ہم اس ہستی کو دیکھتے جس کی آنکھوں میں دنیا کا سب سے قیمتی پانی چھلک رہا ہوتا۔ وہ بہت دھیرج سے ٹھوس اور مصمم لہجے میں کہتی جاتی۔ آخر کب تک؟ کبھی تو جبر کی اس علامت کو گرنا ہوگا۔“
”کیوں کہتی تھیں وہ یہ سب برائن؟“ میں تجسس کے زیرِ اثر پوچھ بیٹھا۔
”اس لیے کہ......“ برائن ذرا سا رکا اور پھر بولا۔ ”میرے باپ کی قبر دیوار کی مشرقی طرف ہے۔“
”اوہ...... افسوس...... تو پھر؟“
”ماں بہت سے پھول اپنے لرزتے ہاتھوں سے دیوار کی دوسری سمت اچھال دیتی اور ہم بوجھل قدم اور خالی پیٹ لیے واپس گھر لوٹ جاتے۔“
خاموشی کا وہ وقفہ نہایت جان توڑ تھا۔
”برائن!“ میں نے ہمدردانہ جذبے کے تحت اسے پکارا۔
”کیا ہے؟“
”کیا ماں اب بھی جاتی ہوں گی؟ اس چبوترے تک جو دیوار کے اِدھر ہے اور پھول اب بھی گرتے ہوں گے اس قبر پر جو دیوار کے اُدھر ہے؟ دو سال سے، گھر تو نہیں گئے تم کیوں؟ اور تمہاری چھوٹی بہن، کیا نام ہے۔ ہاں...... ایستھر...... وہ کہاں ہے؟“ اتنے بہت سارے سوال پوچھے تو برائن تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے پانچ سالہ رفاقت میں اسے پہلی بار روتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی اٹھا اور اس کے بہتے آنسو پونچھنا چاہے لیکن کمال نرمی سے اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ خاموش تھا اور اس کی آنکھوں میں ہنوز بہت سے آنسو تھے۔
”ہوسکتا ہے وہ دیوار اب تک گر چکی ہو۔ معلوم تو کرو۔“
”نہیں......“
”کیوں برائن؟“
”زیادہ سوال مت پوچھو؟“ اس نے پلٹ کر عرشے پر پڑے موٹے تیل زدہ رسوں کے بنڈل کو ناراضی سے ٹھوکر ماری اور ادھ جلے سگریٹ کو سمندر کی طرف اچھال دیا۔ تیز ہوا کی وجہ سے ننھی ننھی چنگاریاں سی اُڑیں جیسے جگنوؤں کا دستہ بکھر جائے۔
پھر یوں ہوا کہ تین سال کوئی سوال پوچھے بغیر گزر گئے۔
برائن کی یاد کبھی کبھار ہی آتی تھی مگر جب بھی آتی تو پیٹ میں ایسی اینٹھن محسوس ہوتی جو بے رحم برفانی موسم میں بھوک سے پیدا ہوا کرتی ہے۔
شام کا وقت تھا۔ میں لان میں بیٹھا اخبار کی بچی کھچی خبریں پڑھ رہا تھا کہ نظر اچانک ایک شہ سرخی پر ٹھہر گئی۔ ”دیوار برلن گرا دی گئی۔“
میں دیوانہ وار اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف لپکا تاکہ برائن کو مبارک باد کا ایک زبردست سا خط لکھوں۔ خط تو لکھ ڈالا مگر اگلی صبح تک مجھے یاد ہی نہ رہا کہ اسے سپردِ ڈاک بھی کرنا ہے۔ مصروفیات کچھ ایسی آڑے آئیں کہ خط کی طرف دوبارہ خیال ہی نہ گیا۔
کوئی ہفتہ بھر بعد دفتر سے تھکا ہارا شام کو گھر پہنچا تو ماں نے پانی کے گلاس کے ساتھ ایک زرد رنگ کا لفافہ بھی تھما دیا۔
بہ عجلت تمام لفافہ چاک کیا مگر وہ خط کیا بلکہ ایک درد ناک اطلاع تھی۔ ”پیارے خالد!“
دیوار برلن تو آخرکار گر گئی لیکن میری عزیز ماں کی موت کے بعد۔
تمہارا۔
برائن (جرمنی)

افتخار مجاز

کہتے ہیں کہ سات سمندر ہیں، سات ہی آسمان ہیں، سات کو لکی نمبر کہا جاتا ہے۔ پاکستان بھی سات حروف سے لکھا جاتا ہے یعنی کہ یہ صرف ایک ملک نہیں برصغیر کے مسلمانوں کو شبِ قدر میں دیا گیا باری تعالیٰ کا تحفہ ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کررہے ہیں۔

پاگل خانے میں مقید ایک شخص کا دکھ بھرا پیغام

قیام پاکستان کا مقصد محض ایک الگ تھلگ خطہ ارض کا حصول نہیں تھا بلکہ ایک ایسی نظریاتی مملکت کو وجود میں لانا تھا جہاں کے رہنے والے نہ صرف اپنے عقائد نظریات اور مذہب کے مطابق اپنی ترقی خوشحالی کے خواب دیکھ سکیں بلکہ ان خوابوں کی عملی تعبیر بھی پائیں۔ یہی وہ نصب العین تھا جس کے لیے قوم نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھیں مگر ہماری بدقسمتی کہ قیام پاکستان کے بعد اس پاک سرزمین پر خودغرضی نفسانفسی اور لوٹ کھسوٹ کا ایسا سلسلہ شروع ہوگیا کہ برائی برائی نہ رہی، نیک وبد، خیر وشر، آدم وابلیس، حق و باطل اور حلال وحرام کی تمیز ختم ہوگئی۔ جذبہ ملک وملت سے سرشار پاکستانی پر اس صورت حال کے باعث کیا کیا گزر جاتی ہے اس کا اندازہ آپ کو اس واقعے سے ضرور ہو جائے گا جو پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

یہ غالباً نومبر 1982ء کے دنوں کی بات ہے میں راولپنڈی اسلام آباد سینٹر سے تبدیل ہو کر نیا نیا، لاہور ٹی وی سینٹر پر تعینات ہوا تھا انہی دنوں مجھے نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر رشید چوہدری کے زیر انتظام چلنے والے ذہنی معذور افراد کی بحالی کے ادارے ''فاؤنٹین ہاؤس'' کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اپنے اس فرض کی بجا آوری کے دوران مجھے تین چار روز تک مسلسل پاگل، نیم پاگل اور ذہنی طور پر بیمار افراد کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے اور انہیں قریب سے دیکھنے پرکھنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر کچھ تلخ مگر ضمیر کو جگا دینے والے واقعات بھی دیکھنے کو ملے اور بعض ذہنی بیمار، پاگل افراد کی ہوشمندانہ گفتگو بھی سننے کا اتفاق ہوا۔

فاؤنٹین ہاؤس میں تین چار روزہ شوٹنگ کے دوران میں نے اکثر ممبران (یہاں مریضوں کو ممبر کہا جاتا ہے) کو اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے دیکھا اور ان کی بے معنی و لایعنی گفتگو سنی لیکن اس سارے عرصے کے دوران اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے والوں کے درمیان صرف ایک رکن ایسا تھا جسے میں نے مسلسل گم صم سنجیدہ اور نارمل Behave کرتے ہوئے پایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہماری شوٹنگ کے دوران وہ کیمرے کے سامنے آنے سے مسلسل گریز کرتا رہا ہے جب کہ باقی ممبران کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر اپنی تصویریں بنواتے اور ذہنی مریض ہوتے ہوئے بھی مسلسل کیمرے کے سامنے رہنے کی کوشش کرتے۔ یہ گم صم رہنے والا شخص مجھے سب سے مختلف لگا اور میرے ذہن پر سوار ہو گیا کہ آخر یہ ممبر سب سے منفرد کیوں ہے؟

فاؤنٹین ہاؤس میں زیر علاج ان مریضوں کو بطور علاج سیر و تفریح کے لیے بھی لے جایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری شوٹنگ کے دوران اس Sequence کی فلمبنگ کے لیے انہیں ایک روز باغ جناح لاہور لے جایا گیا، یہاں بھی جب ہم شوٹنگ کر رہے تھے تو تقریباً سب ممبران بے معنی اچھل کود اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہے مگر وہ واحد شخص تھا جو الگ تھلگ بیٹھا فلک کی جانب معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے چپ چاپ اور اکیلا پا کر میں اس کی جانب بڑھا، وہ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''آئیے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی بھی تھوڑی سی فلم بنائیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''یہ فلم کہاں چلے گی؟'' پیشتر اس کے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا۔ کیمرا مین بولا۔ ''پاکستان۔''

ابھی کیمرا مین پاکستان ٹیلی ویژن کے الفاظ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ متذکرہ ممبر جسے میں کئی دن سے مسلسل خاموش دیکھ رہا تھا نے پاکستان کا نام لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اگرچہ میں نے فوری طور پر شدید ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ مادرِ وطن کو گالی نہیں دینی چاہیے۔ میری سرزنش پر وہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے تحمل سے اسے وطن کی اہمیت اور مقام و مرتبہ بتا کر سمجھانا شروع کیا کہ یہ وطن تو ہماری ماں کی طرح مقدس اور قابل احترام ہے۔ اسے ہم نے لاتعداد قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے لہٰذا اسے گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔''

وہ میری یہ جذباتی اور روایتی گفتگو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا، پھر یکدم اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے میری طرف دیکھا اور گویا ہوا۔ ''یقیناً یہ جدوجہد اور قربانیاں قیام پاکستان کے لیے تھیں مگر مجھے بتائیں کہ وہ پاکستان ہے کہاں جس کے لیے اتنی ڈھیر ساری قربانیاں دی گئی تھیں۔ کیا یہ نہیں گمان تھا کہ نئے خطہ ارض میں جہاں ہم آزاد ہوں گے کوئی ہمارا استحصال نہ کر سکے گا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی، ہر شخص بلاامتیاز انصاف حاصل کر سکے گا۔ ہم آزاد بھی ہوں گے اور خودمختار بھی۔'' مجھے ہمہ تن گوش دیکھ کر اس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور گفتگو میں زیادہ سنجیدگی در آئی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم کہتے ہیں یہ وطن قربانیوں اور جدوجہد سے بنا ہے جب کہ ہمارے مخالفین ہندو سکھ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ ملک لوٹ مار کر کے لوٹ مار کرنے کے لیے حاصل کیا ہے اور آج جب میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے مخالفین کا موقف درست لگتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''برادر عزیز! مجھے آپ سے اختلاف ہے۔'' میں نے بہت ہی ملائمت اور نرم لہجے میں کہا۔ ''بھائی اگر ایسا ہو رہا ہے تو یہ قصور پاکستان کا نہیں۔''

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے بات کاٹ دی اور بولا۔ ''آپ اختلاف کریں۔ یہ آپ کا حق ہے بلکہ میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ نہ بھولیے گا کہ آپ ایک پاگل سے محوِ گفتگو ہیں۔ برادرم!'' وہ زور دے کر گویا ہوا۔ ''اگر میری باتیں آپ کو بری لگیں تو انہیں ایک پاگل کی گفتگو سمجھ کر نظرانداز کر دیں۔''

اس کا یہ جملہ سن کر میں تقریباً سکتے میں آ گیا تھا۔ تاہم اس کے متوجہ کرنے پر میں اس کیفیت سے باہر نکلا۔ وہ کہنے

لگا۔ ”آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہاں اکثریت لوٹ مار میں لگی ہوئی ہے اور اگر کوئی اس دوڑ میں شریک نہ ہو تو اس کا حال مجھ جیسا ہو جاتا ہے۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا؟“

اس نے گفتگو کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک مجھے پاگل قرار دے کر مینٹل اسپتال میں داخل نہیں کرا دیا گیا تھا میں بھی لاکھوں حساس اور آپ جیسے دردمند پاکستانیوں کی طرح پاکستان کے حوالے سے بڑی جذباتی سوچ رکھتا تھا مگر جب میں اپنے معاشرے خصوصاً اپنے گھر والوں کے لیے اپنی اسی حب الوطنی اور پاکستان سے وابستہ بے حد جذباتی سوچ کی وجہ سے ناقابلِ برداشت ہو گیا تو انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر یہاں داخل کرا دیا۔ یوں میں اب باقاعدہ ڈکلیئرڈ اور Bonafide رجسٹرڈ پاگل ہوں، گویا میں اگر پاگل کے اعزاز سے بہرہ مند ہوں تو یہ اعزاز مجھے پاکستان کی محبت ہی میں ملا ہے۔ میں پاکستان کی محبت ہی میں پاگل ہوا ہوں۔“

اس نے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے، میں ایک ایماندار، دیانت دار، راست گو اور بے باک سچا محب وطن جذباتی پاکستانی نوجوان تھا۔ معاشرے میں موجود بدعنوانیاں، بے ایمانیاں، بدعہدیاں، جھوٹ فراڈ اور سب سے بڑھ کر منفی انداز نظر رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ میں اس صورتِ حال پر کڑھتا، لڑتا، احتجاج کرتا کیونکہ حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران بتایا گیا تھا کہ جب ہم آزاد ہوں گے تو ہمارے اپنے وطن میں یہ برائیاں نہیں ہوں گی۔ وہاں انصاف بھی ہوگا اور دیانت بھی ہوگی مگر مروج قدریں اور صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ میری ہر صبح کا آغاز ہی اس صورت حال پر میرے احتجاج سے ہوتا۔ ان دنوں میں ایک سرکاری ادارے میں ذمہ دار پوسٹ پر تعینات تھا۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں بازار سے دودھ لینے جاتا تو دودھ فروش سے جھگڑا ہو جاتا۔ سبب اس روز کی چخ چخ اور بک بک کا یہ ہوتا کہ دودھ فروش پانی ملا ملاوٹ شدہ دودھ دیتا۔ میں احتجاج کرتا کہ میاں! جب تم نے دودھ کا ایک ریٹ مقرر کر رکھا ہے، دعویٰ بھی خالص دودھ بیچنے کا کرتے ہو تو پھر پورے پیسے لے کر خالص کی بجائے پانی والا دودھ کیوں دیتے ہو۔ المیہ یہ تھا کہ ہر روز میں اکیلا ہی احتجاج کرتا، چنانچہ وہ بدتمیزی پر اتر آتا مگر کوئی اسے نہ روکتا ٹوکتا سب مجھے ہی ٹھنڈا رہنے کی تلقین کرتے بانداز دیگر بھی غلط کام کرنے والے ہی کی طرف داری اور حمایت کرتے جب کہ وہ خود بھی اس کی زیادتی کا نشانہ بن رہے ہوتے۔ بہرطور اسی صورتِ حال میں جلتا، بھنتا، کڑھتا گھر آتا اور ناشتا زہر مار کر کے تیار ہو کر دفتر کے لیے روانہ ہو جاتا۔ یہاں میرا جھگڑا بس کنڈیکٹر سے ہوتا، جو ٹکٹ کے پورے پیسے لینے کے باوجود اکثر مسافروں کو ٹکٹ جاری نہ کرتا۔ چنانچہ میں حسب عادت یہاں بھی احتجاج کرتا مگر ستم یہ کہ یہاں بھی ساتھی مسافر میرے ہمنوا ہونے کی بجائے اسی کا ساتھ دیتے اور کہتے چلو یار جانے دو بے چارہ غریب آدمی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے اس کام کے عوض ہی تنخواہ وصول کرتا تھا مگر وہ اسی ادارے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف نظر آتا جو اس کے اور اس کے اہل خانہ کے رزق کا باعث تھا۔ چنانچہ جب میں اسے دیانت داری سے فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتا تو لوگ یعنی ساتھی مسافر مجھے اس فعل سے روکتے ٹوکتے اور میری دیانتداری کا تمسخر اڑاتے، یوں میں بھی غصے میں آ جاتا اور ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہو جاتی بعض اوقات لڑائی جھگڑے کی صورت بھی پیدا ہو جاتی اور ہمیشہ مجھے ہی سرنڈر کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ بہرطور اس دلدل میں لتھڑنے کے بعد جب میں اپنے دفتر میں داخل ہوتا تو یہاں بھی مجھے ایک ایسی ہی دنیا سے واسطہ پڑتا جو ان خوابوں کی تعبیر نہیں تھی جن کی خاطر ہم نے یہ الگ تھلگ خطۂ ارض یعنی پاک سرزمین حاصل کی تھی۔ قصہ مختصر میرے دفتر میں جب سائل اپنے کام کی غرض سے میرے پاس آتے تو میں ان کے کام نمٹانے کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے دفتری اوقات کار کے بعد بھی اپنے ضمیر کی آواز پر دیر تک بیٹھ کر کام کرتا لیکن میرے رفقاء کو میرا یہ رویہ برا لگتا۔ وہ مجھے سائلوں سے نذرانہ وصول کیے بغیر انہیں فارغ نہ کرنے کے مشورے دیتے گویا بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کی حصار میں مجھے جکڑنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے مگر جب میں یہاں بھی قابو میں آنے سے انکار کر دیتا بلکہ اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو افسران بالا سے میری شکایات لگا کر مجھے تنگ و پریشان کیا جاتا۔ دو مرتبہ جواب طلبی تک کرا دی گئی۔ تاہم میں اپنے ضمیر کے مطابق ہر جگہ دیانتداری کے لیے سرگرم عمل رہا اور جہاں بھی کوئی ناانصافی یا بددیانتی دیکھتا سراپا احتجاج بن جاتا کیونکہ میرے نزدیک پاکستان کا قیام لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے اور انہیں لوٹنے کے لیے عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ اس خطے کے رہنے والوں کے لیے دارالامان اور دارالرحمت کے طور پر حاصل کیا گیا تھا۔

بہرطور میں بات کررہا تھا ہر ناانصافی اور غلط بات پر لازماً React کرنے کی۔ میرے اس طرزِ عمل کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھر میں میری مشکلات بڑھنے لگیں۔ افسوس یہ کہ ہر شخص مجھے ہی اپنا رویہ اور طریقہ کار تبدیل کرنے پر مجبور کرتا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ انصاف کا راستہ وہ ہے جس کے لیے میں لڑ رہا ہوں اور یہ درست ہے، ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جو قیام پاکستان کی اس حقیقی منزل کی طرف جاتا ہے جو ظلم، استحصال، ناانصافیوں، بداعمالیوں اور بدعہدیوں سے بہت دور ہے۔ بہرطور قصہ مختصر جب گھر میں میری شکایات کی تعداد بڑھنے لگی تو میں جو پہلے معاشرے کے لیے ناقابل قبول تھا اب گھر والوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا تو انہوں نے اس مسئلے کا فوری حل بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ مستقل حل ڈھونڈ لیا تو غلط نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک روز ایک اسپتال کی انتظامیہ کو کچھ دے دلا کر انہوں نے مجھے پاگل خانے جسے مہذب زبان میں مینٹل اسپتال کہتے ہیں، میں داخل کرادیا۔ پہلے چند سال میں وہاں کے پاگل خانے میں رہا اب کچھ برسوں سے یہاں فاؤنٹین ہاؤس میں ہوں۔ آپ یقین کریں کہ جب مجھے پاگل ڈکلیئر کر کے مینٹل اسپتال میں داخل کرایا گیا اس وقت میں واقعتاً پاگل نہیں تھا لیکن اب میں پاگلوں کے ساتھ اتنے برس گزارنے کے بعد حقیقتاً پاگل ہوچکا ہوں۔ آپ بتائیں مجھے پاگل کس نے کیا، کیا پاکستان کی محبت نے؟ کیا میں پاکستان اور اہل پاکستان کے ہاتھوں نہیں لٹا؟ کیا اپنی زندگی کے پندرہ قیمتی سال پاگل خانوں میں گزارنے کے باوجود بھی میں پاکستان سے محبت کروں؟"

وہ دلیل کے ساتھ بات کررہا تھا اور مجھے اس کی باتوں میں ترشی نہیں کڑواہٹ محسوس ہورہی تھی کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فرض کرو اگر اپنی ماں اچھی نہ ہو تو کیا ہم الزبتھ ٹیلر کو اپنی ماں کہنا شروع کردیں۔ وطن تو ماں کا ہی ایک دوسرا روپ ہے۔

دلیل سے بات کرنے والا وہ پاگل اس لمحے مجھے لاجواب نظر آیا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں اختلاف کے ڈورے اب بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بہرطور میں فاؤنٹین ہاؤس میں اپنی شوٹنگ مکمل کر کے دیگر مصروفیات میں لگ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مجھے فاؤنٹین ہاؤس ہی میں یوم پاکستان کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ جو کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کا نام سننا تک گوارہ نہ کرتا تھا سینے پر پاکستان کا بیج آویزاں کیے بار بار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوا رہا تھا۔ اس کے طرزِ عمل میں ایسی تبدیلی سے مجھے ایک عجیب سا سرور اور شادمانی کا تاثر ملا۔

تقریب ختم ہوئی تو میں آگے بڑھ کر اس سے ملا، اس نے فوراً مجھے پہچان لیا اور بولا۔ "الزبتھ ٹیلر بھی تو کسی کی ماں ہے اور ماں کبھی بری نہیں ہوتی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے احساس دلایا تو میرے اندر سے یہ آواز اٹھی کہ اولاد میں سے اگر کچھ بچے ماں کی خواہشوں کی تکمیل نہیں کررہے تو فرمانبردار بچوں کو نافرمان بچوں کے رویے کی گالی ماں کو تو نہیں دینی چاہیے بلکہ انہیں تو ماں کی اور بھی زیادہ فرمانبرداری کرنی چاہیے تاکہ ایک تو نافرمانوں کے رویے اور عدم توجہ کی بھی تلافی ہو اور دوسرے ممکن ہے کہ اچھے بچوں کا رویہ اور طرزِ عمل دیکھ کر نافرمان خود یا ان کی آئندہ نسل اپنا طرزِ عمل بدل لے اور اچھے و مثبت رویے کا اظہار شروع کردے۔" وہ رکا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "سر میں پاگل ہوں ناں! ڈکلیئرڈ پاگل، اس لیے اگر آپ کو میری باتیں اچھی نہ لگیں تو نظرانداز کردیں۔"

وہ بظاہر تو پاگل تھا کہ اسے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ میں یہ اعزاز مل چکا تھا مگر اس کی باتوں میں بلا کی سنجیدگی اور ذہانت تھی، کہنے لگا۔ "برسوں پہلے جب کبھی میں نارمل لوگوں میں رہتا تھا تو میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا تو موذن کا یہ کام نہیں کہ وہ اذان دینا چھوڑ دے۔ آپ نے فاؤنٹین ہاؤس میں مجھ سے ہونے والی گفتگو کو ایک پاگل کی گفتگو سمجھ کر نظرانداز کردیا ہوتا تو شاید آج کی تقریب میں پاکستان زندہ باد کے نعرے اتنے جوش و خروش سے سنائی نہ دیتے۔ آپ یقین کریں یہاں ہیں تو بظاہر سب پاگل مگر آپ کی دی ہوئی روشنی میں، میں نے انہیں پاکستان کی جو اصل تصویر دکھائی ہے اس کی بناء پر اب یہ آپ سے زیادہ اور پہلے سے بہتر پاکستانی ہیں، میرے ساتھ آواز ملا کر دیکھ لیجیے۔ چنانچہ ہم دونوں نے باآواز بلند کہا۔

"پاکستان" اُدھر سے پُرجوش جواب آیا۔ "زندہ باد"

قارئین محترم! سطور بالا کا مرکزی کردار اب بھی گاہے بگاہے مجھے ملتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا نے مجھے موقع اور وسائل دیے تو میں آنے والے وقت میں ایک ایسی دستاویزی فلم بناؤں گا جسے دیکھ کر آئندہ نسلوں میں سے ہر بچہ اس فلاحی اور استحصال سے پاک معاشرے کا اہم کردار ہوگا جس کی نوید بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر قائدین نے قیام پاکستان کے وقت دی تھی۔ انشاء اللہ ہم اس کو ویسا ہی پاکستان بنا کر دم لیں گے۔

نظریہ

ایاز راہی

اس دنیا میں مذاہب کی ایک قطار ہے۔ عجیب عجیب سے نظریہ پر چلنے والے لوگ ہیں۔ کوئی ایک خدا کی پرستش کرتا ہے تو کسی مذہب میں کئی کئی خدا کی پرستش ہوتی ہے۔

دلچسپ تحقیق پر مبنی ایک مختصر سی تحریر

عبد و معبود، ساجد و مسجود، بت اور پجاری کا موضوع تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ آدمی۔ شاید حضری (تمدنی۔ شہری) زندگی سے پہلے آدمی جب غاروں اور درختوں پہ بسیرا کرتا تھا تب وہ غالباً مذہب سے ناآشنا تھا۔ آزاد ذہن و دہن کے ساتھ کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ ذہنی ارتقا اور بڑھوتری کا آغاز ہوا تو سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت نے جنم لیا۔ ساتھ ہی رفتہ رفتہ زمینی اور آسمانی آفات و حادثات نے اسے خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان آفات کے آگے بے بس ہو کے ان کی پوجا شروع کر دی اور بالآخر مختلف خداؤں دیوتاؤں کا پجاری بن بیٹھا۔ ان کے آگے جھکنا۔ ڈنڈوت یا سجدہ کرنا۔ دان پن یا نذر نیاز گزارنا حتی کہ اپنے آدمیوں، بچیوں اور اپنی قربانی بھی بہ طیب خاطر دینا اس کا وتیرہ ٹھہرا۔ اپنی اور اپنی نسل کی بقا کا خیال۔ مر مٹنے کا خوف۔ عجیب و غریب معبودوں اور دیوتاؤں کا جواز بنا۔ معروف مفکر سگمنڈ فرائیڈ کے بہ قول مذہب بنیادی طور پر خوف ہی کی پیداوار ہے۔ اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو خوف زدہ آدمی اپنے خدا یا دیوتا کو راضی کرنے کے لیے ہی بہادر بنتا ہے۔ اس حد تک کہ اپنی جان سے بھی گزر جاتا ہے، اس صلے کی تمنا میں کہ وہ امر ہو جائے گا۔ تمام مصائب، تکالیف اور خوف سے اسے نجات مل جائے گی اور ہمیشہ کی آسودہ زندگی (سورگ۔ جنت) اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ وہ آزاد رہے گا۔ خود کو قربان کرنے اور معبود پہ مر مٹنے کا جذبہ بالآخر اس حد تک بڑھا کہ غالب جیسا دانا و بینا آدمی بھی بے اختیار کہہ اٹھا کہ۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اسی چیز کو شاعر مشرق علامہ اقبال کچھ اس رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

پوجنا، بندگی، مآل کار، آسودگی، آزادی اور دوام۔ جس طرح کرۂ ارض کی تقسیم تین حصے پانی اور چوتھا حصہ خشکی (ربع مسکوں) ہے اسی طرح دنیا کا غالب حصہ کسی نہ کسی مذہب (دھرم) کے زیر اثر ہے۔ بہت کم آبادی مذہب (دھرم) کی پابندیوں سے آزاد (دہریہ) ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال ہی

کی زباں میں۔
"سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بے زار بھی ہیں۔"
(شکوہ)

دھرم والوں نے بھی اپنے خداؤں یا دیوتاؤں کے ساتھ عجیب متضاد بلکہ دلچسپ رویہ اپنا رکھا ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے قربانی، خیر خیرات اور دان پن کو لازم و فرض قرار دیا اور دوسری طرف معبودوں (مسجودوں۔ بتوں) کو مکمل طور پر بے نیاز گردان کر ایک طرح سے آدمیوں سے لاتعلق اور علیحدہ کر ڈالا۔ کچھ اس بحث میں بھی الجھے (اب بھی ہیں) کہ خدا نے آدمی کو تخلیق کیا یا آدمیوں نے اپنے اپنے خدا گھڑے ہیں۔ ایک اور بات کہ تمام مذاہب (دھرم) میں خدا یا دیوتاؤں کا تصور و خیال آتے ہی آدمی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں یا اپنے معبود کی جانب اشارہ کرتے اس کی انگلی بے اختیار اوپر آسمان کی طرف ہی اٹھ جاتی ہے، چاہے وہ بھگوان، خداوند، ربی یا یزداں ہو، اوپر والا ہی کہلاتا ہے جب کہ اسے ہر جگہ موجود بھی کہا اور مانا گیا۔ بہ قول علامہ اقبال

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے۔ (شکوہ)

یہاں لفظ۔ ہرجائی۔ ہر دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی بے وفا اور ہر جگہ موجود۔ ایک اور شاعر کے بہ قول۔

ہو بھی نہیں اور ہر جا ہو

اسی طرح اَن دیکھے خدا کی عبادت بھی حضرت انساں کے لیے اک مسئلہ تھا اور ہے۔

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر
(شکوہ از اقبال)

سو، خوف زدہ اور فریب خوردہ آدمی نے اس کا حل یہ نکالا کہ چاند، سورج، ستارے، حجر و شجر اور مظاہر کائنات کی پوجا شروع کر دی جن میں جانور۔ چرند پرند اور درندے بھی شامل ہو گئے۔ یوں بے شمار دیوتاؤں کا اک سلسلہ سا بن گیا۔ وہی بات کہ دھرم خوف کی پیداوار ثابت ہوا۔ عقل انسانی نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ پر پرزے نکالے تو اس نے ڈھیروں خداؤں سے جان چھڑانے کی سوچی اور بالآخر سمٹا کر تین۔ دو۔ اور پھر ایک خدا پہ آن ٹھہرا۔ گو کہ ان گنت خداؤں کی پوجا آج بھی جاری ہے۔ مگر ان میں توحید (ایک خدا) تثنیث (دو خدا) اور تثلیث (تین خدا) کے پیروکار نمایاں ہیں۔ توحید میں یہودی اور مسلمان۔ تثنیث میں پارسی، مجوسی یا آتش پرست اور تثلیث میں عیسائی دنیا شامل ہے۔ عیسائی پیروکاروں کی

تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے صدیوں پہلے ایران میں مجوسی مذہب (دو خدا) نے جنم لیا جو غالباً یہودی توحید کا ردِعمل تھا اس سلسلے میں حتمی بات کا تعین تاحال ناممکن ہے۔ اہل ہندان گنت دیوی دیوتاؤں کی کثرت کا شکار تھے اب بھی ہیں یہی صورتِ حال روم اور یونان کی بھی تھی مگر یونان میں عقل و خرد کی شمع روشن ہو چکی تھی جو مذہبی جہالت (دیوی دیوتاؤں) کے مقابل علم کی روشنی بکھیر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت اور یہودی توحید خود پرست علما اور پیشواؤں کے ہاتھوں مسخ ہو چکی تھی۔ ایسے میں انسان کا بنیادی مسئلہ خیر اور شر تھا۔ خیر و شر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کی ماہیت اور حدود کیا ہیں؟ یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں تک دراز ہے؟ خیر اور شر میں آدمی کی حیثیت کیا ہے؟ آدمی خیر ہے یا شر؟ یہودی اور بعد میں عیسائی و اسلامی توحید کے مطابق اس کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔ تو خیر اور شر اسی ایک خالق سے منسوب ہیں؟ خیر اگر حسن ہی حسن ہے تو اس کے مقابل شر (بدصورتی) کا وجود کیوں عمل میں لایا گیا؟ یہ اور ان جیسے بے شمار سوالات کی بھول بھلیوں میں انسانی ذہن گم تھا۔ بھٹک رہا تھا۔ اسی جھنجٹ سے نجات کے لیے عقل کے پجاریوں اور مادہ پرستوں نے آخر کار خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور صرف مادیت تک ہی محدود ہو کے رہ گئے۔ چناں چہ اسی کارگاہ فکر و خیال میں اک نئے مذہب نے جنم لیا جس نے انسانی فکر اور رویے پہ بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور صدیوں حکم رانی کی۔ آج سے چھبیس صدیاں یا اڑھائی ہزار سال پہلے 600 (قبل از مسیح) ایران میں پارسی مذہب منصۂ شہود پہ آیا۔ جس کی بنیاد دو خداؤں پہ تھی اس مذہب کا بانی زرتشت 600 ق م تا 551 ق م تھا یہ کسی بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا اصل اور خاندانی نام۔ اشتاما۔ یا اسپتامہ تھا۔ اس نے بھی گوتم بدھ 563 (ق م تا 483 ق م) کی طرح شادی کی مگر پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جنگلوں میں نکل گیا۔ دنیا ترک کر دی اور غور و فکر میں اتر گیا۔ آدمی ذہین اور اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ واپس آیا تو منوچہر بادشاہ کی کونسل کا رکن منتخب ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق مشہور فلسفی فیثاغورث 580 (تا 500 قبل از مسیح) کا شاگرد بھی رہا۔ یہ شخص جنگل کی تنہائی میں گہرے سوچ بچار کے بعد روشنی لے کے آتا ہے۔ زرتشت کے لفظی معنی ہی سنہری روشنی کا مالک۔ ہیں۔ زر یعنی سنہری اور تش بہ معنی روشنی۔ سو۔ سورج پوجا کی بنیاد پڑی The Crisis of the Modern World کے مصنف

رین گیناں (Rene Guenon) کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے منصب کا نام ہے جس میں نبوت اور قانون سازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے زرتشت بہت سے گزرے ہیں جن میں آخری زرتشت کا زمانہ۔ 600 قبل از مسیح ہے۔ زرتشتی ان کا نام ابراہیم بتاتے ہیں۔ بہرحال زرتشت نے دو خداؤں کا تصور پیش کیا کہ یزداں خیر کا خدا ہے اور اہرمن شر کا خدا۔ لہٰذا دونوں خدا ایک دوسرے کے مقابل ہیں، کبھی یزداں غلبہ پاتا ہے تو کبھی اہرمن کا زور ہوتا ہے ان دونوں خداؤں کی یہ کش مہ کش روز محشر تک رہے گی لیکن بالآخر فتح یزداں یعنی خیر کے خدا کی ہوگی۔ خیر کا بول بالا ہوگا۔ زرتشت کی اپنی کتاب تو نہیں البتہ اس سے منسوب پارسیوں کی مذہبی کتاب کا نام ''اوستا'' ہے جو ژند زبان میں تھی اب بھی شاید ہوگی۔ ژند زبان پہلوی زبان سے پہلے فارس (ایران) میں رائج تھی۔ آج کل اس کا شمار مردہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ مذہبی کتاب اوستا کی تفسیر پاژند کے نام سے ہے۔

اردو شعر و ادب میں خیر کے خدا یزداں کا نام اور ذکر تو بہت ہے مگر شر کے خدا ہرمن کا ذکر کم یاب ہے۔ اردو زبان اور ادب فارسی کا خوشہ چیں ہے۔ پارسی اپنے مردوں کو دفناتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ ایک مخصوص اونچی جگہ پہ نعش کو چھوڑ آتے ہیں اس جگہ کو ''منارِ خاموشی'' کہا جاتا ہے جہاں یہ میت حیوانوں کی خوراک بن جاتی ہے۔ یہاں مجوسیوں کے دو اہم تہواروں کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک جشن سدہ ہے جو ماہ بہمن (غالباً۔ اگست) کی دسویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ سدہ کے معنی بھڑکتی ہوئی آگ کے ہیں۔ یہ جشن نہایت پرانا ہے اور اس کی بنیاد یوں پڑی کہ ہوشنگ بن سیامک (سیامک بہت زیادہ دودھ پینے والا) نے ایک بڑے کالے سانپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر پتھر مارا۔ پتھر بہ جائے سانپ کے دوسرے پتھر پہ لگا اور اس سے آگ پیدا ہوکر اردگرد کے خس و خاشاک میں لگ گئی۔ سانپ جل مرا۔ بس اسی وقت آگ کی پوجا شروع ہوگئی کیوں کہ اسے خدا کا نور اور دشمن کو ہلاک کرنے والا گردانا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس سے پہلے آگ کا ظہور بھی نہ ہوا تھا (وہی یونانی دیومالا پرومیتھئس کی کہانی)۔ دوسرا بڑا تہوار جشن نوروز ہے اس کے معنی نیا دن کے ہیں یعنی وہ دن جس سے نیا سال شروع ہوتا ہے اور سورج برج حمل میں آتا ہے (بیس بائیس مارچ) فارس والے دو۔ نوروز مانتے ہیں۔ (1) نوروز عامہ (2) نوروز خاصا۔ نوروز عامہ پارسی جنتری کے پہلے مہینے۔ فروردیں۔ کا پہلا دن (بیس بائیس مارچ) ہے (موسم بہار کا آغاز) مجوسیوں کا عقیدہ کہ اس دن دنیا کو پیدا کیا گیا سیاروں کو حرکت کا حکم ہوا حضرت آدم کی تخلیق ہوئی۔ ایک اور روایت کہ بادشاہ جمشید جسے پہلے صرف جم کہتے تھے دنیا کی سیر کررہا تھا۔ آذربائیجان پہنچا تو حکم دیا کہ ایک مرصع تخت کسی اونچی جگہ پہ مشرق کے رخ بچھایا جائے۔ خود تاج پہن کے تخت پہ بیٹھا۔ جوں ہی صبح سورج نکلا اس کے عکس سے تاج و تخت جگمگا اٹھے لوگ بڑے خوش ہوئے کہ آج نوروز (نیا دن) ہے۔ پہلوی فارسی میں۔ شید بہ معنی۔ شعاع (کرن) آتا ہے پس جم کے نام میں شید اور بڑھا دیا گیا (جمشید) اور اس دن بھاری جشن منایا گیا اور پھر مستقل طور پہ نوروز عامہ قرار پا گیا۔ نوروز خاص وہ دن جسے یوم خرداد (خوشی دینے والا) بھی کہتے ہیں جو نوروز عامہ کے بعد ساتویں دن منایا جاتا ہے اسے جشن نیلوفر بھی کہتے ہیں اس دن بھی جمشید تخت پر بیٹھا اور خاصان شاہی کو بلا کر عمدہ عمدہ رسمیں جاری کیں، فرمایا کہ آج ہی کے دن خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو۔ پاکیزہ پانی سے غسل کرو۔ خوب نہاؤ دھوؤ اور خدا کے شکر میں نماز و سجود ادا کرو۔ ہر برس آج کے دن عید مناؤ۔ کہتے ہیں اس کاسرہ یعنی شہنشاہ نوشیرواں کی اولاد اور اس کے خاندان والے ہر سال نوروز عامہ سے نوروز خاصا (سات دن) تک لوگوں کی مرادیں پوری کرتے۔ قیدی چھوڑتے، مجرموں کے گناہ معاف کرتے عید مناتے۔ شاہان دہلی اور مغل بادشاہ (شاہی خاندان) بھی آج کے دن خوشی مناتے اور انڈے لڑایا کرتے تھے۔ جب کہ مسلمان عورتوں کے نام بھی نوروزی خانم۔ نوروزی بیگم۔ نوروزی بی بی اور مرد نوروز خان، نوروز بیگ وغیرہ ہوتے۔ اس ثنوی (دوخدائی) مذہب نے بہت عروج پایا۔ ایران اور افغانستان کے آتش کدوں میں صدیوں تک آگ مسلسل روشن رہی۔ پارسی پیشوا یا ملا کو۔ موبد۔ کہا جاتا ہے (جمع موبداں) آج اس مذہب کے پیروکار پارسی لوگ ممبئی (بھارت) اور کراچی (پاکستان) تک ہی سمٹ کررہ گئے ہیں۔ کثرت معبود (دیوی دیوتاؤں) تین خدا (عیسائیت) دو خدا (مجوسیت) اور ایک خدا (مسخ یہودی توحید) کے مقابل دین فطرت اسلام نے جب سیدھی سادی باعمل توحید پیش کی تو صدیوں سے فریب خوردہ انسانی ذہن پھر بھی نہ سنبھل سکا۔

کچھ نہیں جانتا کہاں ہوں میں
ہوش آئے گا تو بتاؤں گا
دو خداؤں کے درمیاں ہوں میں

قسط نمبر: 8

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس پر اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف پھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او ولادر خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا پھر رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلو خلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زونیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواہ کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔

اب آگے پڑھیں

میں اس حسینہ کی بات پر بری طرح ٹھٹکا تھا۔ کالیا کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹ بھینچے اسی لڑکی کی طرف گھورے جا رہا تھا پھر تیزی سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ کھل کر کہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں“ اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کالیا کی طرف دیکھا۔ ”اس نے عاصمہ نامی اس لڑکی کو گلشن حدید والے مکان میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ یرغمال بنا رکھا ہے اور جو راجو نامی شخص یہاں پہنچنے والا ہے اس کے ساتھ عاصمہ نہیں بلکہ اس کے مسلح ساتھی ہوں گے۔“

اس لڑکی کے اتنے بڑے انکشاف پر میں ہی نہیں کالیا بھی چونک پڑا تھا۔ پہلی بار میں نے کالیا جیسے جغادری کو بھی الجھا ہوا پایا۔

”کیا بکواس کر رہی ہے تو؟“ سیٹھ ستار کھا جانے والی نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تم اپنا منہ بند رکھو ذلیل آدمی!“ میں نے سیٹھ ستار کو جھڑکا۔ وہ ہنوز قہر آلود نظروں سے لڑکی کو گھورے جا رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے سوال کیا۔ ”تم یہ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہی ہو؟ تم خود اس کی ساتھی بلکہ داشتہ لگ رہی ہو۔“

”میں اس شخص کی داشتہ ضرور ہوں مگر ساتھی نہیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ میں نے کچھ اور کہنا چاہا تھا کہ کالیا نے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس بار خود اس لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رو...... روزی، روزینہ......“ اس لڑکی نے ہکلاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

”تمہیں کیسے پتا ہے کہ راجو عاصمہ کی بجائے اپنے مسلح ساتھیوں کو یہاں لا رہا ہے؟“

”یہ شخص، تم لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ چالاک اور مکار ہے۔“ وہ لڑکی سیٹھ ستار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”اس نے ایسے نازک مواقعوں کے لیے کچھ کوڈ ورڈ

رکھے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ شخص اپنے لہجے سے بھی اپنے زرخرید ساتھیوں کو خبردار کردیتا ہے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ تم دونوں خود بھی ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ اس وقت سیٹھ ستار خاں کا اپنے آدمی کو فون کر کے یہ کہنا کہ اس لڑکی کو لے کر فوراً اس کے کلفٹن والے بنگلے پر پہنچو، کیا انہیں چونکا دینے کا باعث نہیں بنا ہوگا اور پھر تم نے اس کے الفاظ پر بھی غور نہیں کیا جب یہ اپنے راجو نامی ساتھی سے بات کر رہا تھا تو اس نے تمہاری ہدایت کے برعکس پہلا جملہ ہکلاتے ہوئے ادا کیا تھا۔ یہی اس کا پہلا کوڈورڈ تھا۔"

مجھے اس لڑکی کی بات سمجھ میں آرہی تھی، کھٹک تو میں بھی گیا تھا اس بات پر راجو نے بھی سوچا ہی ہوگا کہ آخر سیٹھ ستار اس وقت کیوں ایک اغوا شدہ لڑکی کو اپنے ہاں لانے کا حکم دے رہا تھا اسے..... مگر میں نے دیکھا کہ کالیا کچھ زیادہ اس کی بات پر بھروسا کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ روزی سے بولا۔ "ایک بات بتاؤ، تمہیں ہماری مدد کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ ہمیں یہاں آئے تھوڑی ہی دیر گزری ہے اور تم اتنی جلدی ہماری خیر خواہ بھی ہوگئیں؟ کیا تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ اس غداری پر یہ ظالم اور سنگدل شخص تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا؟"

کالیا کی بات پر روزی نے نفرت انگیز نظر سیٹھ ستار پر ڈالی اور جواباً بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے یہ شخص واقعی بہت ظالم اور بے رحم ہے۔ میں اس ظالم اور خونی شخص کے لیے اب تک آستین کا سانپ بنی ہوئی تھی اور اسے ڈسنے کے لیے موقع کی منتظر تھی۔ آج مجھے اس کا شاید موقع مل رہا ہے۔ وقت کم ہے، باقی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتادوں گی مگر خدا کے لیے پہلے میری بات کا بھروسا کرو، ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔"

اس کا اشارہ بھانپ کر کالیا نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا، کیونکہ لڑکی کا جھوٹ سچ چھپنے والا نہیں تھا۔ راجو کی آمد ہی اس کے سچ اور جھوٹ کی گواہی قرار پاسکتی تھی۔

کالیا نے لڑکی کو لباس پہننے کا حکم دیا اور مجھ سے کہا کہ میں کوئی رسی تلاش کر کے سیٹھ ستار کو رسن بستہ کر ڈالوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے کمرے سے مجھے نائلون کی ڈوری مل گئی اور میں نے اسی سے سیٹھ ستار کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اسے باتھ روم کے اندر اسی حالت میں ہی دھکیل دیا۔

اس کے بعد کالیا مجھ سے بولا۔ "جگری! اپنا سیل آن رکھنا۔ میں باہر جا رہا ہوں، تم ادھر رکے رہو اور میرے فون کا انتظار کرنا۔" میں نے اس کی بات پر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ جاتے وقت میں نے اسے اپنا ٹی ٹی پسٹل نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا جبکہ سیٹھ ستار کا سیاہ پستول میرے پاس تھا۔

اب میں اور روزی تنہا خواب گاہ میں موجود تھے۔ روزی نے کپڑے بدل لیے تھے۔ میں نے اس کی طرف قدرے شاکی نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری سیٹھ ستار سے کیا دشمنی تھی؟" میرے سوال پر اس نے ایک گہری ہمکاری خارج کی تھی اور بولی۔

"یہ میری باجی سمیرا کا قاتل ہے اور میں اپنی بہن کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے اس کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔ اس رذیل شخص سیٹھ ستار نے میری بہن کو شادی کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ ملایا اور پھر ایک دن اس کی عزت سے بھی کھیل گیا اور یہ شرمناک کھیل اس نے کافی عرصے تک جاری رکھا تھا یہاں تک کہ میری باجی بن بیاہی حاملہ ہوگئی۔

میری باجی نے جب یہ دیکھا کہ سیٹھ ستار شادی کے نام پر اسے اب تک ٹالتا چلا آرہا ہے اور نوبت یہاں تک آگئی ہے تو اس نے سیٹھ ستار کو خودکشی کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی لاش پر ایک پرچہ لکھ کر چھوڑ جائے گی، جس میں سیٹھ ستار کے کرتوتوں کی ساری کہانی لکھ ڈالے گی تو اس ظالم نے میری بہن کو ہی مروا دیا۔

باجی میری رازداں تھیں۔ ہم دونوں یتیم و لیسیر تھے اور اپنی ایک بیوہ خالہ کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا دنیا میں باجی کے سواء اور کون تھا، میں نے اس کا انتقام لینے کی ٹھانی اور سیٹھ ستار کو اپنے حسن کے جال میں پھنسایا اور اس کے سارے رازوں سے کسی حد تک واقف ہونے لگی مگر یہاں مجھے اور بھی کچھ تلخ حقیقتوں کا اندازہ ... ہونے لگا کہ سیٹھ ستار کوئی معمولی آدمی نہیں، دولت تو اس کے پاس بے حساب ہے ہی مگر اس کے پاس خطرناک آدمیوں کا ایک پورا ٹولہ بھی ہے، نیز یہ بہت اثر و رسوخ کا مالک بھی ہے۔

غرض یہ کہ مجھے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل پارہا تھا۔ میں بہت مایوس ہوگئی تھی کہ شاید میں اب اپنی باجی کا انتقام نہ لے سکوں، بالآخر مایوسی اور آتش انتقام نے مجھے مجبور کر ڈالا کہ میں خود ہی ایک موقع پا کر اسے اپنے ہاتھوں سے ہی جہنم واصل کردوں اور...... آج میں یہی کچھ

کرنے والی تھی کہ تم لوگ یہاں آگئے۔ میں اس کے ہی پستول سے اس کا خون کرنے والی تھی آج......''
وہ اتنا بتا کر چپ ہوگئی اور ہولے ہولے سسکنے بھی لگی۔
مجھے اس کی باتیں قابلِ اعتبار محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔
''کیا تم جانتی ہو کہ میری بہن عاصمہ کو اس خبیث نے کہاں یرغمال بنا رکھا ہے؟''
''بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ پورے اعتماد سے بولی۔ ''کیونکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں اس کے قریب رہتے ہوئے اس کے بہت سے رازوں سے واقفیت حاصل کرنے کی اسی لیے ہی کوشاں رہتی تھی کہ شاید کہیں مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے اسے فون پر اپنے کچھ ساتھیوں کو تحکمانہ ہدایت دیتے ہوئے سنا بھی تھا۔ تمہاری بہن کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں یرغمال بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔''
میں اس کی بات کر چونکا تھا مگر کالیا کی طرح اتنی جلدی اس کی باتوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا بولا۔ ''دیکھو اگر تمہاری کوئی بھی بات جھوٹ ثابت ہوئی تو پھر تم ہمارے ہاتھوں زندہ نہیں بچو گی۔ کیونکہ راجو کی یہاں آمد کے بعد تمہارا جھوٹ بھی کھل ہی جائے گا۔''
وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک کالیا کا فون آگیا۔
میں نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا۔ کال کالیا ہی کی تھی۔ اپنے کان سے لگا کر میں نے کہا۔ ''ہاں، کالیا! کیا خبر ہے؟''
''ابے لے...... جگری! اس لڑکی روزینہ کی بات تو سینٹ پرسینٹ درست ثابت ہوئی۔ راجو کے ساتھ عاصمہ بہن نہیں بلکہ اس کے دو مسلح ساتھی ہیں۔''
اس کی بات پر میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ بولا۔ ''کالیا! تو ان سے بھڑے بغیر یہاں چلا آ...... سیٹھ ستار کو گن پوائنٹ پر لے کر انہیں با آسانی جھکایا جاسکتا ہے۔''
''میں اپنا کام نمٹانا جانتا ہوں، جگری! تو بے غم ہو جا۔ میں گھات میں ہوں اور دشمن مات میں ہیں۔ دیکھتا جا۔''
دوسری طرف سے کالیا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔ میں فکر مند سا ہوگیا۔ کالیا کا سیٹھ ستار کے تین خطرناک بدمعاشوں سے تن تنہا نمٹنا آسان نہیں ہوسکتا

تھا، اس کی مدد کے لیے مجھے بھی جانا چاہیے تھا۔ چونکہ روزینہ کی بات سچ ثابت ہوئی تھی اس لیے میں نے اسے وہیں خواب گاہ میں ہی رک کے رہنے کی ہدایت کی اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ کالیا نے اس کوٹھی کے کس حصے کی طرف گھات لگائی ہوگی، تاہم ایک محتاط اندازے سے میں نے گیٹ کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں پہنچا تو گارڈ کیبن سے ایک مسلح شخص باہر نکل رہا تھا، وہ شاید گیٹ کھولنے کے لیے نکلا تھا۔
میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ دبکا کھڑا رہا اس کے بعد جب گیٹ کھلا تو میں نے ایک نیوی بلیو کلر کی کیڈلس کو اندر داخل ہوتے دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے گارڈ کو اپنی طرف بلایا تھا کیونکہ کار اندر داخل ہوتے ہی وہ اس کے اشارے پر فوراً آگے بڑھا تھا اور اب کار کی کھڑکی کے سامنے جھکا اس کی کوئی بات سن رہا تھا۔
میں نے بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑ کر کار کی طرف دیکھا تو اس کے اندر مجھے دو مزید افراد سوار دکھائی دیئے۔ ایک تو ڈرائیونگ سیٹ والے کے برابر ہی بیٹھا تھا جبکہ دوسرا عقبی نشست پر براجمان تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیے اور سوچنے لگا کہ کالیا کہاں ہوسکتا تھا؟
اچانک کار آگے بڑھی اور پورچ سے ذرا پرے ہی رک گئی اس کے اندر سے وہ تینوں باہر نکلے، ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں اور گارڈ بھی اپنی گن نکال کر وہیں اپنے کیبن کے پاس چوکس کھڑا ہوگیا تھا، اس کی نظریں بار بار بالکونی کی طرف اٹھ رہی تھیں، جس کا صاف مطلب تھا کہ آنے والوں نے اسے بھی اندر کی صورتِ حال سے ''باخبر'' کردیا تھا اور وہ محتاط ہوکر کھڑا ہوگیا تھا۔
وہ تینوں افراد تیزی کے ساتھ مگر آواز پیدا کیے بغیر مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔
میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ کالیا کہاں چھپا کھڑا ہوسکتا تھا۔ میں پلٹ کر نیچے اترا اور اسی دروازے کی طرف بڑھا جدھر سے وہ تینوں اندر داخل ہونے والے تھے، اطراف میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ تینوں اندر داخل ہوئے، میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ابھی ایک فینسی طرز کے ستون کے پیچھے کھڑا یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے سب سے آخر میں داخل ہونے والے شخص پر کسی کو بجلی کی

سی تیزی سے ٹوٹتے پایا۔ کمال مہارت سے ہی اس نے کچھ
اس خاموشی اور کسی قسم کی بھی ''کھڑبڑاہٹ'' پیدا کیے بغیر اس
نے اپنے شاہکار کو اس طرح نہ صرف قابو کیا تھا بلکہ شاید اسے
انٹا غفیل بھی کر ڈالا تھا کہ صرف چند قدم آگے جانے والے اس
کے دونوں ساتھیوں کو اپنے اس تیسرے ساتھی کے حشر کا پتا
بھی نہ چلا، اب وہی سایہ دبے پاؤں دوسرے کی جانب لپکا تھا
کہ نجانے دوسرے مسلح شخص کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا
احساس ہوا اور اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا تو اس کے تعاقب
میں آنے والے سائے نے جو بلاشبہ کالیا ہی تھا، یک دم اچھل
کر اس پر جست لگادی اور اس کی ہوا میں اٹھی ہوئی لات
دوسرے کے سینے پر اس زور سے پڑی تھی کہ وہ خاصا اچھل کر
آگے جاتے ہوئے اپنے تیسرے ساتھی پر جا پڑا۔ دونوں
دھڑام سے فرش پر آرہے اور اسی وقت کالیا نے ان پر اپنا
پستول تان لیا مگر دوسرے والے نے بھی بہ سرعت غیر معمولی
پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنی لات چلادی۔ میں نے کالیا
کو گرتے دیکھا اور ان دونوں کو اٹھتے تو میں خود کو نہ روک سکا۔
کیونکہ ان دونوں میں سے ایک نے اپنا پستول کالیا پر تان لیا
تھا، کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس پر فائر بھی کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے
پستول پر مجھے ایک لمبی نال اٹیچڈ دکھائی دی تھی۔ یقیناً کالیا بھی
پل کے پل اس طرح خود کو موت کے سامنے دیکھ کر گنگ ہوگیا
ہوگا۔ میں پلر سے ابھرتے ہی چلایا۔ ''خبردار! گولی مت
چلانا۔''

وہ آدمی ٹھٹکا اور میری طرف متوجہ ہوگیا۔ بے شک یہ
اس کا ایک غیر ارادی ردِعمل ہی رہا ہوگا کہ اس نے اپنے پستول
کا رخ بھی میری جانب موڑ لیا تھا جب کہ میرے پستول کی
نال کا رخ بھی اسی کی طرف تھا۔

مجھے پستول چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بس تانے کھڑا تھا
اور یہی میری بے وقوفی تھی، تاہم اس بے وقوفی نے مجھے
خطرے میں ڈال کر کالیا کی زندگی بچالی تھی۔ کیونکہ اس شخص
نے اپنے پستول سے مجھ پر گولی چلادی تھی۔ ''چزز'' کی آواز
ابھری اور اس کے ''خاموش'' پستول کی گولی میرے دائیں
شانے پر لگی، مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کوئی سلاخ۔ سلگتے
ہوئے انگاروں سے اٹھا کر میرے شانے میں گھونپ دی ہو۔
میرے حلق سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ ابھری اور آنکھوں
تلے اندھیرا سا چھانے لگا، میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے اور
اسی دھندلاتی آنکھوں سے میں نے کالیا کو اس پر جھپٹتے دیکھا۔
سائلنسر لگا پستول حملہ آور کی بجائے اب کالیا کے ہاتھ
میں تھا جس سے اس نے فائر کیا تو مذکورہ حملہ آور کربہ ناک
چیخ کے ساتھ گرا، اس کے آخری ساتھی نے زمین پر پڑے
پڑے لوٹ لگائی اور دروازے کی طرف بھاگا تو کالیا نے پیچھے
سے کھڑے کھڑے اس پر گولی چلادی۔ خاموش پستول کی گولی
اسے بھی چاٹ گئی، وہ اپنے حلق سے آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر
ہوگیا۔

میں اپنا زخمی شانہ پکڑے فرش پر گرسا گیا تھا۔ شانے
سے اب بھل بھل خون بہے چلا جارہا تھا۔

''ابے لے...... جگری! یہ کیا کیا تو نے......'' کالیا یک
دم میری جانب بڑھا اور مجھے زخمی دیکھ کر کرب انگیز لہجے میں
بولا۔ سیٹھ ستار کا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر
لڑھک گیا تھا۔ وہ مجھے سنبھالنے لگا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر
اپنے مختل پڑتے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش چاہی تھی اور
دانتوں تلے تکلیف کو سہتے ہوئے میں نے کالیا سے کہا۔

''مم...... میں ٹھیک ہوں...... مم...... مگر آگے کی
صورتِ حال خراب ہے۔''

''دیکھ لیتے ہیں، پہلے تیری پٹی کرنا ضروری ہے۔'' اس
نے تفکر سے کہا ''پر تو پریشان نہ ہو مولا کا کرم ہے کہ گولی
خطرناک جگہ پر نہیں لگی ہے۔''

اس نے سائلنسر لگا پستول اپنی پینٹ کی بیلٹ میں
اڑوسا اور میرا پستول فرش سے اٹھا کر اسے بھی دوسری طرف
اپنی بیلٹ میں اڑوس لیا اس کے بعد مجھے سہارا دے کر اٹھا لیا
اور خواب گاہ کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھٹک کر رکا۔ میں نے بھی
اپنی نیم بازسی نظروں سے سامنے دیکھا۔ روزی کھڑی تھی۔

''اوہو...... اسے اندر لے چلو، میں تب تک ڈریسنگ کا
سامان لاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھ
گئی۔ کالیا مجھے سہارا دیے اندر خواب گاہ میں آگیا جہاں خاصی
روشنی تھی۔ اس نے میرے زخم کا جائزہ لیا اور بولا۔

''شکر ہے گولی گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے۔ ہڈی
کو نقصان نہیں پہنچا ہے مگر زخم گہرا ہے۔ خون روکنا ضروری
ہے۔''

تب تک روزی فرسٹ ایڈ کا ایک بکس اٹھا لائی۔ وہ
جانے کب سے اپنے مقصد کی برآوری کے لیے سیٹھ ستار کی
رکھیل بنی ہوئی تھی جو اسے یہاں کی پوری آگاہی تھی۔

''تم ایک طرف ہوجاؤ۔'' اس نے باکس میرے
قریب قالین پر رکھتے ہوئے کالیا سے کہا۔ ''میں ایک
کوالیفائڈ نرس ہوں۔''

کالیا ایک طرف ہوگیا۔ روزی نے اپنا کام شروع کردیا۔ اس نے چند منٹوں میں میری ڈریسنگ کردی ساتھ ہی پین کلر بھی کھلادی۔ ایک انجیکشن بھی بھر کر اس نے میری نس میں لگادیا۔ پھر کالیا کی طرف متوجہ ہوکر بولی۔ ''شکر ہے گولی گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے، اب جو کرنا ہے جلدی کرلو، ہم ابھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔''

کالیا ایک طرف کھڑا تھا۔ بولا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو عاصمہ کو یرغمال بنا کر کہاں رکھا ہوا ہے؟''

''میں نے تمہارے ساتھی (مجھے) کو بتایا تھا کہ اس کی بہن عاصمہ کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں رکھا ہوا ہے مگر اس کا پتا مجھے نہیں معلوم۔''

کالیا کچھ سوچ کر طوفانی بگولے کی مانند پلٹا اور اٹیچ باتھ کے دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد وہ سیٹھ ستار کے بھاری بھر کم وجود کو یوں گھسیٹتا ہوا خواب گاہ میں لے آیا جیسے قسائی کٹے کو رسی باندھ کر مذبح خانے میں کھینچ لاتا ہے۔ کالیا نے فرسٹ ایڈ باکس سے وہ خالی سرنج اٹھالی جس کے ذریعے مجھے انجیکشن لگایا تھا۔ اس میں سوئی (نیڈل) لگی ہوئی تھی۔ وہ اٹھالی اور رسن بستہ حالت میں فرش بوس پڑے سیٹھ ستار کے سینے پر سوار ہوگیا پھر نفرت انگیز انداز میں ہونٹ سکیڑے سیٹھ ستار کو گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''رذیل کتے! اس چالاکی کی میں تجھے سزا ضرور دوں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے سرنج کو اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو کھولا اور سرنج کی سوئی سے اسی آنکھ کو پھوڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سیٹھ ستار مارے دہشت کے گھگیانے لگا۔

''نن..... نہیں خ خ..... خدا کے لیے، یہ مت کرو..... مم..... میری غلطی تھی، میں معافی مانگتا ہوں۔ مم..... میں اب سچ ہی بولوں گا۔''

''غلطی تھی تو پہلے تجھے اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔ باقی سچ تو اب تجھے بولنا ہی پڑے گا۔ وہ بعد کی بات ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے سرنج کی نڈل سیٹھ ستار کی بائیں آنکھ میں گھونپ دی۔ خون کی دھار سی بہہ نکلی اور سیٹھ ستار کا وجود کالیا کے نیچے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

قریب کھڑی روزی کے حلق سے سسکاری سی نکل گئی۔ خود میں بھی ایک لمحے کے لیے کالیا کی اس بربریت پر دم بہ خود سا رہ گیا تھا لیکن سیٹھ ستار کے کالے کرتوتوں کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس خبیث نے جانے کتنے غریبوں کے خون پسینے کی کمائی ''اپنا گھر'' دلانے کے نام پر ہڑپ کی تھیں اور کتنوں کی جانوں اور عزتوں سے کھیلا تھا، عاصمہ کو اغوا کروانے والا بھی تو یہی ذلیل شخص تھا۔

''آہ..... ظالم! تت..... تو نے مجھے ایک آنکھ سے کانا کردیا..... آہ..... میں مرگیا۔ میں دل کا مریض ہوں، یہ تکلیف نہیں برداشت کرسکتا۔'' وہ چیخنے لگا۔ ''مم مجھے اسپتال لے چلو۔''

''قبرستان جانے کی تیاری کر بے رحم اور بے حس آدمی!'' کالیا نے پُرطیش لہجے میں اس سے کہا۔ ''اپنی ایک ذرا سی تکلیف اور ایک آنکھ سے محرومی پر تو یوں بلبلا اٹھا ہے اور جو دوسروں کے ساتھ تو نے حرام پائیاں کر رکھی ہیں اسے تو کس کھاتے میں ڈالے گا؟''

سیٹھ ستار کے پاس اس کا جواب نہیں ہوسکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رسن بستہ حالت میں اور بھی زیادہ اپنی آنکھ کی تکلیف کو محسوس کررہا تھا کیونکہ وہ اپنے زخم کو چھو نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اپنی زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ پاتا تھا۔ خون اس کی پھوٹی آنکھ سے بہے جارہا تھا۔

کالیا نے روزی کو اشارہ کیا جسے سمجھتے ہی اس نے ایڈ باکس سے روئی کا ایک بڑا سا پھایا نکال کر کالیا کی طرف بڑھایا جسے اس نے تھوڑا گول کرکے اس کی آنکھ پر رکھ دیا تاکہ جریان خون بند ہوسکے۔

''بس سیٹھ! اب تیرا کھیل ختم ہوا۔ لیاری کے کون سے مکان میں تو نے ہماری بہن عاصمہ کو رکھا ہوا ہے؟ ہاں یا نہ میں جواب سنوں گا میں، اس سے زیادہ نہیں۔'' کالیا نے حتمی لہجے میں کہا اور اس کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مم..... مجھے پپ..... پہلے اسپتال.....'' سیٹھ ستار نے کراہتے ہوئے صرف اسی قدر ہی کہا تھا کہ کالیا کے پاؤں کی ٹھوکر اس کے پہلو میں لگی اور وہ بیل کی طرح ڈکرایا۔

''عاصمہ بہن کے سواء کوئی اور بات نہیں سنوں گا کتے! تو اسپتال کی امید کیسے لگا رہا ہے؟ کیا سمجھتا ہے تو ہم تجھے زندہ چھوڑ دیں گے، اب بھی تیرے اندر اتنا گھمنڈ ہے؟'' کالیا نے خون خوار لہجے میں کہا تو اس نے تکلیف سے ہانپتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر الفاظ بے ربط سے برآمد ہونے لگے۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ جیسے اسے دل کا دورہ پڑنے لگا ہو۔

میری پیشانی پر بیک وقت الجھن اور فکرمندی کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔ کالیا مگر اس کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر اس کے

پہلو میں رسید کر ڈالی اور دوسری پیٹ پر تو سیٹھ ستار نے اپنی اداکاری بند کردی۔

وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ کالیا جیسے جغادر کو ڈاج دینے کا مطلب تھا کہ خود کو اس کے زیرِ تشدد رکھتے ہوئے واقعی ایک عدد ہارٹ اٹیک کو دعوت دینا تھا۔ وہ بولا۔ ”بب...... بتاتا ہوں۔“

اس نے لیاری کے اس مکان کا پتا بتا دیا جو کالیا کے ساتھ میں نے بھی ذہن نشین کرلیا۔ اس کے بعد کالیا نے سیٹھ ستار کو تہدید کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس بار یہ سب جھوٹ نکلا تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تجھے صرف موت میں ہی پناہ نظر آئے گی اور وہ تجھ سے دور ہوگی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ہم تیری بات کی تصدیق کیے بغیر تجھے چھوڑ دیں، ابھی صبح کی گھما گھمی ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ تب تک ہم تیرا سچ جھوٹ جان لیں گے، بات سچ ہوئی تو ہم یہاں کا رخ نہیں کریں گے اور تجھے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب کوئی ملازم تجھے دیکھے گا۔ بہ صورت دیگر ہم دوبارہ یہاں آئیں گے اور پھر...... آگے تو جانتا ہے۔“ کالیا نے کہتے ہوئے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور آخر میں بولا۔ ”اب بھی وقت ہے سچ بتادے، سمجھ لے کہ تو برا پھنسا ہے۔ سچ بولے بغیر مکتی نہیں ملے گی تجھے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ مم...... مگر مجھے اس حالت میں تو چھوڑ کر مت جاؤ، صبح تک جانے کیا ہوجائے میرے ساتھ، میں شوگر اور دل کا مریض ہوں۔“

اس نے کالیا کی منت کی جسے کالیا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے روزی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟“

میں نے روزی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے ملے جلے تاثرات ہویدا تھے۔ کالیا کا سوال اس نے جیسے خالی الذہنی کے عالم میں سنا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ کچھ ”آں...... ہاں......“ کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مم...... میں کہاں جاسکتی ہوں اب؟ اپنے گھر ہی جاؤں گی مگر......“ کہتے ہوئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور فرش پر جکڑ بند پڑے سیٹھ ستار کی طرف دیکھنے لگی۔ کالیا اس کی الجھن سمجھ گیا۔ فوراً اس سے بولا۔

”تم ہمارے ساتھ آؤ اور یہاں سے اپنی تمام اشیاء بھی اٹھالو جو یہاں بعد میں تمہاری آمد یا شناخت کی نشانی بن سکتے ہیں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ کر جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان سمیٹنے

ایک طبی تحقیق میں بتایا گیا کہ ایک ہفتے کے دوران بستر کی چادر ڈسٹ مائٹس، فنگل، فضلے کے اجزائی، پولن اور مردہ انسانی خلیات سے بھر جاتی ہے اور اس طرح وہ ٹوائلٹ سے بھی زیادہ جراثیموں سے بھر سکتی ہے۔ دن بھر میں اوسطاً ہر انسان سے 500 ملین خلیات کا اخراج ہوتا ہے جبکہ دیگر اجزا بھی رات بھر بستر کی چادر پر جمع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ڈسٹ مائٹس انسانی مردہ خلیات کو کھانا پسند کرتے ہیں۔ اگر چادر کو ہر ہفتے نہ دھویا جائے تو آپ خود کو سنگین وائرس اور انفیکشن کے خطرے کی زد میں لا رہے ہوتے ہیں۔ جن میں جلد یا زخم کا انفیکشن، پیشاب کی نالی کی سوزش، نمونیا اور دوران خون کا انفیکشن قابلِ ذکر ہے۔ تحقیق میں ہر ہفتے ایک بار چادر کو دھونے کا مشورہ دیا گیا ہے یا یوں کہہ لیں ہفتے میں ایک بار اسے بدل ضرور دیں تاہم ایسا بہت کم افراد کرتے ہیں۔ چادر کو دھونے کے لیے گرم پانی کا استعمال کرنا چاہیے تاہم ایسا کرنے سے پہلے اس پر دیئے گئے لیبل پر ہدایات کو بھی ضرور دیکھ لیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ گرم پانی بیشتر جراثیموں کو ختم کرنے کے ساتھ ڈسٹ مائٹس کو نکال دیتا ہے۔ یہ تحقیق طبی جریدے جرنل آف الرجی اینڈ کلینیکل Immunology میں شائع ہوئی۔

مرسلہ: ابوعمر۔ ملتان

پین یونیورسٹی کی تحقیق میں بتایا گیا کہ شام ڈھلتے ہی کھانا نہ کھانا جسمانی وزن میں اضافے، فیٹ میٹابولز، اور امراض قلب سمیت ذیابیطس کا خطرہ بڑھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس تحقیق کے دوران دو ماہ تک صحت مند افراد کے غذائی اوقات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رات گئے کھانا کھاتے ہیں، ان میں انسولین کی مزاحمت، کولیسٹرول میں اضافہ اور ٹرائی گلیسیڈر کی سطح بدتر پائی گئی۔ اسی طرح ہارمونز کے نظام میں بھی منفی اثرات دیکھنے میں آئے اور بھوک کو بڑھانے والے ہارمونز کی سطح میں تاخیر سے اضافہ دیکھا گیا۔ تحقیق کے مطابق نیند میں کمی کے اثرات تو جسمانی وزن اور میٹابولزم پر پڑتے ہی ہیں مگر رات گئے کھانا بھی صحت کے لیے فائدہ مند نہیں۔ محققین کا کہنا تھا کہ شام میں جلد کھانے سے مختلف امراض کا خطرہ کم کیا جاسکتا ہے جبکہ جسمانی توانائی اور ہارمونز کے نظام کو بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تاخیر سے کھانا جسم میں گلوکوز اور انسولین کی مقدار بڑھاتا ہے جو کہ ذیابیطس جیسے مرض کا باعث بن سکتا ہے جبکہ کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسیڈر امراض قلب، فالج اور ہائی بلڈ پریشر جیسے جان لیوا امراض کا خطرہ بڑھانے والے عوامل ہیں۔

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

لگی، جس میں پرس اور ہینڈی بیگ اور باتھ روم میں جھولتے اس کے کپڑے وغیرہ تھے۔

کالیا پُرسوچ انداز میں میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شاید کچھ سمجھتے ہوئے اپنی ایک آنکھ کی بھنوؤں کو اچکایا۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا، جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد ہم کوٹھی سے باہر تھے اور اس سے آگے تقریباً دوڑتے ہوئے اس جگہ پر جا پہنچے جہاں ہم نے اپنی بائیک ایک تاریک گوشہ میں چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی۔

"جگری! تو زخمی ہے۔ پہلے تجھے!" کالیا نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "کسی اور جگہ جانے کا وقت نہیں ہمارے پاس، روزی نے میری پٹی کردی ہے اور فرسٹ ایڈ دے دی ہے۔" پھر میں قریب فکرمند کھڑی روزی سے بولا۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ہم بائیک کے پاس ہی کھڑے تھے۔ کالیا گردشی نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

"میں گلستان جوہر بلاک فور میں رہتی ہوں لیکن آپ میری فکر نہ کریں اور پلیز اپنی بہنا کو بچانے کی فکر کریں، میں چلی جاؤں گی اپنے گھر۔" روزی بولی تو میں نے کہا۔

"تمہیں تو رات کے اس پہر میں کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نہیں ملے گی؟"

"ابے لے! جگری! وقت گزرا چلا جا رہا ہے، جلدی کوئی ایک فیصلہ کر لے میں بائیک اسٹارٹ کرنے لگا ہوں۔" کالیا اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور اس نے اپنی جی ٹو او۔ ون ٹو فائیو اسٹارٹ کرلی جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ یہ بائیک بیک وقت کک اور سیلف اسٹارٹ تھی۔

کالیا کا صاف مطلب تھا کہ اس نے روزی کی "سر دردی" میرے سپرد کردی تھی لیکن کالیا بھی شاید اس دوراندیشی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا جس کا مجھے ہونے لگا تھا۔

روزی میرے لیے سیٹھ ستار کے خلاف ترپ کا پتا ثابت ہوسکتی تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ کھوٹے سکے سے کھرا ہوسکتی تھی لیکن ایک تلخ حقیقت اور بھی اس کی ذات سے نتھی تھی کہ اس کی اپنی جان بھی اب سخت خطرے میں تھی اس نے ہماری بہرحال مدد کی تھی اور اگر ہم آج کے آج عاصمہ بہن کو بازیاب کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو لامحالہ اس کا سہرا روزی کے ہی سر جاتا۔

"بیٹھو بائیک میں میرے پیچھے...... جلدی۔"

پل کے پل میں نے مزید کوئی لمحہ بھی ضائع کیے بغیر روزی سے کہا اور کالیا کے پیچھے بیٹھ گیا۔

جی ٹو او۔ ون ٹو فائیو کا واسا کی (اولڈ ماڈل) کی سیٹ خاصی دراز اور چوڑی تھی۔ کالیا کے پیچھے میرے بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ خالی تھی کہ روزی بھی پھنس پھنسا کر سہی خالص "نسوانی انداز" میں یعنی دونوں ٹانگیں ایک ہی سائیڈ پر رکھ کر بیٹھ گئی اور سہارے کے لیے اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے نرم و نازک وجود کا احساس ہوتا رہا مگر مجبوری کا نام "شکریہ" کے مصداق چل سو چل۔

میرا خیال تھا کالیا، روزی کو ساتھ لے جانے پر معترض ہوگا مگر اس نے کچھ کہے بغیر ہی بائیک آگے بڑھا دی۔ بائیک چلانے میں وہ ماسٹر پیس تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے بائیک آگے بڑھائی تھی کہ روزی میرے ساتھ مزید چپک گئی۔

بائیک ذرا ہی دیر میں ویران اور تاریک سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

لیاری میں ان دنوں حالات یوں بھی بہت کشیدہ تھے۔ جہاں مختلف اور بدنام زمانہ مجرم تنظیمیں جو لیاری میں ہی نہیں بلکہ پورے کراچی میں "لیاری گینگ وار" کے نام سے جانی جاتی تھیں، اس کی دہشت اسی نام سے پورے کراچی پر طاری تھی۔ بلکہ اب تو اس کی شہرت کراچی سے باہر اور دیگر صوبوں تک میں پھیل چکی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔

یہاں ہر ایک نے اپنا علاقہ بانٹا ہوا تھا، جو دوسرے کے لیے "نو گو ایریا" کہلاتا تھا۔

دیگر علاقوں کے عام لوگ تو اس علاقے میں جانا تو کجا اس کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے اور ہم رات میں اس طرف جا رہے تھے، جہاں دن میں بھی کوئی جانے سے گھبراتا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ میرے ساتھ کالیا تھا۔ جو بذاتِ خود بھی ایک "گینگ وار" ہی تھا۔

رات کے اس پہر ویران سڑکوں پر سناٹا چمک رہا تھا۔ کالیا بائیک کو طوفانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ وہ مائی کولاچی روڈ سے کیماڑی جانے والی سڑک پر آیا اور یہاں سے سیدھے ہاتھ کو ٹاور جانے والی روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا نکلتا چلا گیا۔

راستے میں ایک دو پولیس موبائلوں نے راستہ روکا تھا ہمارا۔ کالیا نے ان کے کان میں جانے کیا کہا تھا کہ انہوں نے کچھ زیادہ تنگ نہیں کیا اور ہم آگے نکل لیے تھے۔

تھوڑا اور آگے جا کر ہم پھر دائیں جانب مڑے، اب ہمارے الٹے ہاتھ پر لیاری ایکسپریس وے تھی اور ہم نیچے والی روڈ پر تھے۔ کیونکہ اس ہائی وے پر موٹر بائیکس کا داخلہ ممنوعہ تھا۔ یوں بھی ہم نے اس طرف جانا نہیں تھا۔ ہم میرا ناکہ جانے والی سڑک سے دائیں جانب بہار کالونی کی طرف مڑ گئے۔

علاقے میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ یوں بھی یہاں کے حالات کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا طاری ہونے لگا تھا۔

اس کے بعد ایک گلی میں بائیک گھمانے لگے تو دو مسلح نوجوانوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس علاقے کا خوف میرے دل میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کالیا نے بائیک روک دی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' ایک نے تو باقاعدہ اپنی گن کالیا کے سینے کی طرف تان لی تھی۔ میرا منہ خشک ہونے لگا۔ میرے پیچھے بیٹھی روزی بھی میرا کاندھا تھامے کچھ اور دبک گئی۔

''ہم مہمان ہیں فیاض جمالی کے، اس کے پاس آئے ہیں۔'' کالیا نے بلاخوف اور سنجیدگی سے کہا۔

''کون فیاض جمالی؟'' دوسرے نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ کالیا بولا۔

''لاڑکانہ والے..... ساتھ ہی اس نے ایک اور نام بھی بتایا تو ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔''

''کمال ہے یار! رات کے اس پہر بھی یہ لوگ اس طرح پہرے پر ہیں جیسے یہاں رن پڑا ہوا ہے؟'' بائیک ذرا آگے نکلتے ہی میں نے ہولے سے کالیا کے کان میں تبصرہ کیا تو وہ بولا۔

''یہ لوگ صرف اپنے اپنے علاقے تک محدود بلکہ محبوس رہنے پر مجبور ہیں۔'' کالیا نے ایک تنگ سی گلی میں بائیک موڑتے ہوئے بتایا۔

''انہیں مطمئن کرنا آسان نہیں ہوتا جگری! اگر ذرا سی غلطی سے بھی ان کے مخالف علاقے کے آدمی کا بھی نام لے لیا تو یہ ہمیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے اور پھر ہماری واٹ لگا کر رکھ دیتے۔ ہمارا ایک آدمی محض اسی ذرا سی غلط فہمی میں مارا گیا تھا اور آج تک اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ اسی لیے یہاں آنے سے پہلے ہر علاقے کے کسی آدمی کا بغیر جانے... صرف نام ہی کافی ہوتا ہے۔ جوان کے علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہو، چاہے وہ نیوٹرل ہی بندہ کیوں نہ ہو۔ اسی لیے اپنے استاد بھابھا کو جب بھی لیاری میں کسی کو بھیجنا ہوتا ہے وہ مجھے ہی یہاں بھیجتا ہے۔''

''اوہ!'' میرے ساتھ اس صوتی تبصرے میں پیچھے بیٹھی روزی نے بھی ساتھ دیا تھا۔

''اب کیا آگے بھی ایسے ہی لوگ ملتے رہیں گے؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''ضروری نہیں۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''ہماری منزل اسی علاقے میں ہے یا......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ہاں! بس، آ گئی منزل!'' اس نے جواب دیتے ہوئے ایک چھوٹی اور تنگ سی بند گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی بائیک روکے بغیر ہی اس کا انجن آف کر دیا اور بائیک خاموش روی سے اپنے زور پر چلتی ہوئی مذکورہ گلی میں داخل ہو گئی، پھر ایک کونے میں لے جا کر اس نے روک دی۔

پہلے میں اور روزی نیچے اترے، اس کے بعد کالیا اترا اور اس نے بائیک کو سائیڈ اسٹینڈ میں کھڑا کر کے مجھے اور روزی کو ایک طرف کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر بند گلی کے سیدھے ہاتھ والے آخری مکان کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہلکے سے دستک دی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں گلی کے سرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے دیکھا مکان کے باہر دو تین اور بھی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔

''یہ سالے تاش کی بازی جما رہے ہیں شاید۔'' کالیا زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس نے دوسری دستک ذرا زور سے دی تو اس کے چند ہی سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔

ایک ادھیڑ عمر سی کالی اور دبلی پتلی فاقہ زدہ عورت برآمد ہوئی، اس کے ایک ہاتھ میں بیڑی دبی ہوئی تھی۔ کالیا کو پہچان کر بولی۔

''اڑے چھوکرا یہ تو ہے، کالیا؟''

''ہاں! ماسی میں ہوں، ہٹ پرے اندر آنے دے۔ جینگو اندر ہی ہے ناں؟'' کالیا نے کہتے ہوئے ہمیں بھی آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سوکھی سڑی عورت ایک تیز سی نظر روزی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد ایک طرف ہوتے ہوئے جواباً کالیا سے بولی۔

''ہاں! وہ اندر ہی ہے۔ آ جاؤ۔''

عورت صاف اردو بول رہی تھی مگر اس کا لب لہجہ سندھی اور بلوچی کا امتزاج محسوس ہوتا تھا۔ کالیا کے ساتھ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

سامنے مختصر سا صحن تھا۔ سامنے چھپرا سا برآمدہ اور اس

کے ساتھ ساتھ دو کوٹھڑی نما کمرے تھے۔ دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جبکہ ایک میں اندھیرا اور دوسرے میں روشنی تھی۔ سامنے سے ہی اندر فرشی نشست بچھائے چار، پانچ افراد بیٹھے تاش کھیلنے میں مگن تھے۔ اندر سگریٹ کا دھواں گردش کررہا تھا۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا تھا، پھر ایک شخص جلدی سے ان کی محفل سے اٹھ کر کوٹھڑی سے باہر نکلا۔

"اڑے کالیا! تو؟ خیریت......!" وہ خاصا دراز قامت اور دبلا پتلا مگر جنگجو سا دکھائی دیتا تھا۔ یہی شاید جینگو تھا۔

"خیریت ہوتی تو اس وقت تیرے پاس کیوں آتے؟" کالیا نے اس سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوتے ہوئے کہا اور جینگو نے ایک نظر روزی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد ہمیں ساتھ والی کوٹھڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

ہم اندر داخل ہوگئے۔ جینگو نے اندھیرے میں ہی کوئی سوئچ ٹٹولے بغیر ہی فوراً آن کردیا اور بلب کی روشنی میں مجھے سائیڈ میں ایک چارپائی بچھی نظر آئی۔ دو پھیچی سی کرسیاں اور ایک بینچ نما صوفہ سے مشابہ کوئی شے بھی رکھی تھی۔

کالیا نے روزی اور مجھے دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود جینگو کے ساتھ اسی بینچ نما صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ شاید پرانی سی کوئی "سیٹی" تھی۔

"ماسی!" جینگو نے آواز لگائی۔ تھوڑی دیر میں وہی ادھیڑ عمر سوکھی عورت بیڑی کے کش لگاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"دوستوں کے لیے چائے تیار کر فٹافٹ اور پاپے بسکٹ بھی لے آنا۔"

وہ یہ سن کر دروازے سے ہی پلٹ گئی۔

"یار، جینگو! یہ میرا دوست ہے نومی۔" کالیا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میری طرف تعارفاً اشارہ کیا۔ "اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا ہے ہم اس کا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں، وہ مکان جہاں اس کی بہن کو یرغمال بنا کر رکھا ہوا ہے، وہ اس سے تین گلیاں چھوڑ کر چوتھی گلی میں واقع ہے۔ میں چاہتا تو وہاں اپنے بل بوتے پر بھی کارروائی کرسکتا تھا مگر تو جانتا ہے کہ اس علاقے کا معاملہ اور ہے، پرائی فلم گلے پڑتے دیر نہیں لگتی، اسی لیے سوچا پہلے تیرے سے مشورہ کرلیا جائے۔ بول، کیا کہتا ہے؟"

جینگو بڑے غور سے اس کی بات سنتا رہا تھا پھر ایک نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد کالیا سے بولا۔ "یہ بجن ڈاڈا کا پاڑہ ہے، بدقسمتی سے یہ ہمارا حلیف ہے، بدقسمتی اس لیے کہ اپنے دوست کے پاڑے میں اس طرح کی کارروائی سے تعلقات خراب ہونے کا خدشہ ہوتا ہے......اور......"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "پھر تو رہنے دے یار! میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔"

"اڑے بابا! بیٹھ تو سہی، اتنا غصہ کیوں کرتا ہے۔ میں نے کوئی انکار تو نہیں کیا ہے۔ اپنا ہی پاڑہ ہے ناں، میں بات بنالوں گا۔ لے چائے آگئی۔" اس نے آخر میں اس ادھیڑ عمر عورت کو ایک بڑی سی تھالی میں چار چائے کے کپ رکھے ہوئے، تھامے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

کالیا سر جھٹک کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ہم سب نے چائے کا ایک ایک کپ اٹھالیا اور خاموشی سے اس کی چسکیاں لینے لگے۔

"یار جینگو! جو کرنا ہے، صبح کی پہلی کرن پھیلنے سے پہلے ہی کرنا ہے، اس کی مجبوری بتانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے، نہ ہی وقت ہے۔"

کالیا نے چائے کی جلدی جلدی چند بڑی چسکیاں لینے کے بعد اس سے کہا تو جینگو نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنی قمیص کی پہلو والی جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

رابطہ ہوتے ہی وہ بلوچی میں کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔ یہ گفتگو بہ مشکل پانچ، چھ منٹوں تک جاری رہی اس کے بعد وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بولا۔

"یہ مکان مجو کا ہے۔ ڈاڈا کا خاص آدمی ہے اور جو لوگ لڑکی لے کر وہاں آئے ہیں۔ وہ دو افراد ہیں، پرویز اور لالی۔ یہ دونوں مجو کے دوست ہیں۔ مجو خود اس وقت وہاں نہیں ہیں اور ان دونوں میں سے بھی صرف ایک ہی وہاں موجود ہے، یعنی لالی۔ موقع اچھا ہے اگر ہم خفیہ کارروائی کریں تو یہ معاملہ رازداری سے ہی نمٹ جائے گا۔"

"تب پھر، میں تیرے ساتھ ہوں۔" کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کالیا مجھ سے بولا۔

"تو ادھر ہی ٹھہر جگری! زخمی ہے تو۔"

"نہیں میں بھی چلوں گا، ٹھیک ہوں میں۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

جینگو کھڑا ہوگیا۔ کالیا نے اس سے روزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ روزی ہے، ہماری ساتھی سمجھ لو۔ یہ ادھر ہی بیٹھے گی اگر ہمیں صبح ہوگئی تو اس کے گھر بھجوانے کا بندوبست کرلینا۔"

''اس کی فکر نہ کر، سمجھو یہ باخیریت پہنچ گئی اپنے گھر۔''
جینگو روزی کی طرف دیکھ کر بولا۔ پھر کالیا نے ابھی روزی سے مخاطب ہو کر کہا۔
''ہمیں نہیں معلوم کہ اس کام میں ہمیں کتنا وقت لگ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں آئے بغیر ہم آگے نکل جائیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، صبح ہوتے ہی یہ تمہیں، تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے۔''
روزی نے ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ میں نے احتیاطاً روزی کا کونٹیکٹ نمبر لے لیا تھا اور اسے اپنا دے دیا تھا۔
اس کے بعد ہم تینوں صحن میں آگئے۔ جینگو دوسری کوٹھڑی میں گیا جہاں اس کے دوست تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جب دوبارہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا سا لڑکا تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ یعنی جینگو کے ہاتھ میں بھی اب ایک پستول نظر آرہا تھا جسے وہ اپنی کھلے گھیر والی قمیص کو اٹھا کر نیفے میں اڑوس رہا تھا۔
مجھے اب اپنے بازو کے زخم میں تکلیف کم ہی محسوس ہو رہی تھی۔
ہم چاروں مکان سے باہر آگئے۔ مکان سے باہر کھڑی دو تین چائنا کی یونیک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک پر وہ دونوں سوار ہو گئے اور اپنی بائیک کالیا نے سنبھال لی۔
لیاری کا علاقہ تنگ اور بھل بھلیوں پر مشتمل ہے۔ دو گلیوں کے بعد بہ قول جینگو کے، ان کے حلیف کا علاقہ شروع ہو چکا تھا مگر جینگو ہمیں ایسے راستے سے لے کر نکلا تھا جہاں ہم میں سے کوئی بھی ان کے کسی جاسوس کی نظروں میں نہ آسکیں۔
بالآخر ایک گلی میں داخل ہوئے تو اس کے سرے پر ہی ایک مکان کے سامنے ہم نے اپنی بائیکیں روک لیں اور نیچے اتر آئے۔
گلی سنسان اور تاریک تھی۔ کالیا نے ہی نہیں بلکہ اس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق جینگو بھی اس مکان کو پہچان چکا تھا جو کسی مجو نامی شخص کی ملکیت تھا۔
جینگو نے اپنے آدمی اور مجھے ادھر ہی کھڑے رہنے کا کہا اور اپنے چہروں پہ نقاب چڑھانے لگے تو میں نے فوراً کہا۔
''میں بھی تمہارے ساتھ اندر چلوں گا۔'' کالیا تو خاموش رہا مگر جینگو مجھے سمجھاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دوست! تمہیں یہاں کی خطرناکی کا اندازہ نہیں ہے، ذرا سی بھی گڑبڑ سے یہاں گینگ وار چھڑ سکتی ہے۔ پورا علاقہ میدان جنگ بن جائے گا۔ ہم الگ مارے جائیں گے۔ یہ کراچی کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف علاقہ ہے اور پھر ہم اپنے ہی ایک حلیف پاڑے میں موجود ہیں۔ اصولاً یہی ہوتا ہے کہ اس نازک معاملے کے لیے پہلے ڈاڈا سے بات کرنی چاہیے ہمیں مگر اس میں رسک ہے کہ کام ہوتا ہے نہیں، اسی لیے یہ خطرہ بھی میں نے محض دوستی سے مجبور ہو کر صرف کالیا کی خاطر مول لیا ہے، ڈاڈا کو اگر معلوم ہو گیا کہ اس کے علاقے میں یہ کارروائی میں نے کی تو ہماری یہ دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔''
اس کی بات پر کالیا نے بھی مجھے سمجھایا اور میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد جینگو نے کالیا سے کچھ کہا اور اپنے چہرے پر آنکھوں کے نیچے رومال باندھ لیا۔ کالیا نے بھی یہی کیا اور پھر وہ اس مکان کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
میری اپنی دھڑکتی نظریں اس منحوس مکان کے بند دروازے پر جم کر رہ گئی تھیں، جس کے اندر مبینہ طور پر عاصمہ یرغمال بنا کر رکھی گئی تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی آگے بڑھ کر اس مکان کو آگ لگا دوں۔
بڑی عجیب و غریب ذہنی کیفیات سے میرا دل و دماغ دوچار تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی مجھے ہول سے آرہے تھے کہ اس خبیث مردود نے میری معصوم بہن کو کیسے خطرناک علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اب جانے وہ بے چاری اندر کس حال میں ہوگی۔ میں اس کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا اور کالیا بھی شکر گزار ہو رہا تھا کہ اس کی مدد سے بالآخر ہم اب عاصمہ کو اس جہنم سے باہر نکالنے ہی والے تھے۔
میں، جینگو کے ساتھی کے ساتھ ہی کھڑا تھا اور دروازے سے زیادہ دور نہیں تھے۔
جینگو کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں نے بھی اپنے چہرے رومال سے ڈھانپ لیے تھے۔
میں نے دیکھا کہ جینگو نے دروازے پر دستک دی تھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد اندر سے شاید کسی کی آواز ابھری تھی جس کے الفاظ تو میں نہیں سمجھ پایا تھا مگر آہنگ سے اندازہ لگایا تھا کسی نے کچھ پوچھا تھا جس کے جواب میں جینگو نے اپنی آواز بدل کر مجو کے حوالے سے کچھ کہا تھا، اس کے بعد دروازہ جیسے ہی کھلا میں نے جینگو اور کالیا کو بیک وقت پستولیں نکال کر اندر گھستے دیکھا اور عقب میں دروازہ بند کر لیا گیا۔
میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور متوقع طور پر اپنی

بہن کو جلد بازیاب کرانے کی اس کوشش پر میں خوشی بھی محسوس کررہا تھا۔ تاہم دل کو نامعلوم اور اندیشناک خطرات کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔

وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے اور میں جینگو کے ساتھی کے ساتھ گلی کے اندر ہی ذرا سرے پر ہو کر کھڑے تھے۔ البتہ ان کے جاتے وقت جینگو نے اپنے ساتھی کو یہ ہدایت کردی تھی کہ ذرا سی بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو ہمیں سیل پر اطلاع کر کے خود اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور کھڑے ہو جانا۔

ایک ایک لمحہ بھاری سل کی طرح گزرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کچھ گڑبڑ ہونے والی ہو۔

کالیا اور جینگو کو اندر گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دفعتاً ہی ہمیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں، میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ساتھ کھڑے جینگو کے ساتھی کی طرف دیکھا، وہ بھی روشنی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور جلدی سے قریب ایک پان سگریٹ کے کیبن کی طرف سرک گیا، جو بند پڑا تھا، میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی اور ہم دونوں اس کی آڑ میں جا کھڑے ہوئے۔

روشنی قریب آتی گئی اور خیال تھا کہ وہ کسی بھی گاڑی کی ہوگی تو وہ آگے نکل جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ پرانے ماڈل کی کار تھی اور اندر ہی اسی گلی کی طرف مڑ رہی تھی اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میں دھک سے رہ گیا اور ساتھی کی طرف دیکھنے لگا، وہ خود پریشان نظر آرہا تھا جبکہ اس نے کار کے اندر گلی میں مڑتے ہی اپنا سیل نکال لیا تھا، وہ شاید اندر کالیا کے ساتھ موجود اپنے ساتھی جینگو کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔

رابطہ ہوتے ہی اس نے سرگوشیانہ سے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے ہیں، باہر کار میں موجود ہیں، اس میں تین افراد سوار نظر آرہے ہیں۔ ایک تو مجو ہی لگتا ہے، دوسرا اس کا ساتھی بنٹو بابا ہے۔ تیسرا اجنبی ہے کوئی، وہ شاید مکان کے اندر کے موجود لالی نام کے آدمی کا ساتھی پرویز ہی لگتا ہے، او...... ہوشیار باشد! یہ تینوں کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک دم محتاط نظر آرہے ہیں لگتا ہے، انہیں کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے، انہوں نے اب پستولیں بھی نکال لی ہیں۔ کیا؟ اچھا...... ٹھیک ہے۔“

یہ سب بتانے اور دوسری جانب سے کچھ سن کر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم اپنے ساتھی کی بائیک سنبھالو مگر اسٹارٹ کیے بغیر اسے گلی سے باہر لے چلو، جلدی۔“ یہ کہتے ہی وہ کیبن کی آڑ سے نکلا اور میں بھی۔ ہم نے اپنی اپنی ساتھیوں کی بائیکس سنبھالیں اور ہینڈل سے تھامے ایسے ہی گلی سے باہر کھینچتے ہوئے چل پڑے۔

میں بری طرح تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔ اندر میرے ساتھیوں کی ہی نہیں بلکہ میری معصوم بہن عاصمہ کی زندگی بھی داؤ پر لگ چکی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت کوئی گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔ دونوں بائیکیں گلی سے باہر لے جا کر ذیلی سڑک کے کنارے کھڑی کرنے کے بعد ہم دوبارہ گلی میں پلٹے تو اس نے اپنا پستول نکال کر مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تم پھر ادھر ہی ٹھہرو۔“ اس نے مجھے گلی کے نکڑ پر کھڑے رہنے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی، میں بھی اس کے پیچھے دوبارہ اندر گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا جارہا تھا، اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ مکان کی طرف دیکھا تو اس کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ میرا ساتھی بہت دھیرے دھیرے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسی وقت تلے اوپر دو تین اور فائر ہوئے۔ میری تشویش و پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔ میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ گلی کی دیوار سے لگا مکان کی طرف سرکتا چلا گیا۔ میں بالکل نہتا تھا۔ اندر میری بہن اور کالیا کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

اسی وقت مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی اور میں نے پھر ساری احتیاط اور خوف بھلا کر مکان کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ کوئی مجھ سے ٹکرا کر گرا۔ وہ زخمی اور خون میں لت پت تھا۔ میری پھیلی ہوئی آنکھیں اس پر جم گئیں، وہ مخالف پارٹی کا کوئی شخص تھا۔

ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اندر سے مزید دو افراد فائرنگ کرتے ہوئے نکلے میں کیبن کی طرف بھاگا اور اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔

وہ متوقع طور پر مجو اور اس کا کوئی ساتھی دونوں مکان کے اندر کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے اور دائیں بائیں پوزیشنیں سنبھال لیں۔

اب انہوں نے اندر کالیا وغیرہ کو گویا محبوس رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ نہیں پتا تھا کہ مکان کے اندر کتنی لاشیں گری

ہوں گی جبکہ میں عاصمہ اور کالیا کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ رہا تھا۔

مجو اور اس کا ساتھی لب گلی کے باہر سے فائرنگ کر رہے تھے۔ یہی دھڑکا مجھے بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے، مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ مجو اپنی جیب سے فون نکال کر کسی سے باتیں کرنے لگا، وہ شاید مدد کے لیے اپنے ساتھیوں سے رابطے کی کوشش میں تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی فائرنگ کرتا رہا اور ساتھ ہی وہ اسی جانب سرک آیا جدھر میں اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔

مجھ سے اب ہاتھ پر ہاتھ باندھے کھڑا نہیں ہوا جاسکا وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور یہی وہ وقت تھا جب میں اس پر حملہ کرنے کا کوئی حربہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ میری جانب گھوما اور اسی وقت میری ایک لات حرکت میں آئی، وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا، یہی سبب تھا کہ میری لات ٹھیک اس کے پیٹ پر اس زور کی پڑی تھی کہ وہ لڑکھڑا کر گلی کی دیوار سے ٹکرا کر گرا تو اس کا پستول چھوٹ گیا۔

میں اس کے پستول پر جھپٹا، اس نے لات چلادی، جس سے الجھ کر میں اس کے بالکل قریب گرا۔ وہ کوئی زیادہ تگڑا نہیں تھا، تاہم بیدار مغز اور پھرتیلا ضرور تھا۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے ہی تڑپ کر مجھ پر جھپٹا مارنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے دوسری لات اس کے چہرے پر رسید کردی اور اسی وقت میرا ہاتھ زمین پر گرے پستول سے ٹکرایا، جو میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اٹھالیا اور اس کی نال کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔

بلاشبہ یہ میرا اپنے تحفظ کے لیے ایک غیر ارادی ردِعمل تھا۔ ٹھائیں کی آواز سے گولی چلی جو اس کے پہلو میں لگی، وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ حوصلہ پاتے ہی میں پستول ہاتھ میں لیے اٹھا تو مجو کو اسی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ میں نے اس پر بھی گولی چلادی۔

وہ چیخ مار کر لڑکھڑا کر گرا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے تاریکی میں جا گرا۔ مجو بھی کم ہوشیار نہ تھا، وہ اٹھ کر پھر دوڑا مگر اس بار وہ لنگڑا کر دوڑ رہا تھا اور بار بار گردن موڑ کر میری جانب بھی دیکھتا جاتا تھا، میں نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی ہدایت کے مطابق چہرے پر رومال کا نقاب باندھ رکھا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا مگر سامنے آنے سے پہلے میں نے کالیا کو آواز دی تھی، تاکہ وہ کسی شبے کی بناء پر مجھ پر ہی گولی نہ چلادیں۔

اندر سے کالیا نے بھی مجھے آواز دی اور پھر میں اندر داخل ہوگیا۔ سامنے صحن میں ہی دو لاشیں پڑی نظر آئیں، تیسرا کوئی زخمی حالت میں بے ہوش تھا۔ جینگو نے اپنے ایک زخمی ساتھی کو سنبھال رہا تھا جبکہ کالیا نے عاصمہ کو تھام رکھا تھا، وہ بری طرح خوف زدہ اور ڈری سہی ہوئی نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ”بھائی جان“ کہہ کر میری جانب لپکی۔

”جلدی نکل چلو، اس سے پہلے کہ ان کے ساتھی یہاں پہنچ جائیں۔“ جینگو نے کہا۔

میں نے عاصمہ کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر ہم باہر آگئے۔ بائیک پر کالیا اور میں سوار ہوگئے، عاصمہ کو میں نے اپنے پیچھے بیٹھا لیا تھا جبکہ جینگو اپنے زخمی ساتھی کو جو ہوش میں ہی تھا، بائیک پر بیٹھا کر فوراً روانہ ہوا تو کالیا نے بھی اپنی بائیک بھگائی۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس کے مکان میں تھے۔

اب مسئلہ روزی کا تھا۔ جینگو نے اپنی ایک اضافی بائیک ہمیں دے دی جو کالیا نے سنبھال لی۔

جینگو نے ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کی تھی، کالیا کی بائیک میں نے سنبھال لی تھی اور عاصمہ کو پیچھے بیٹھا لیا تھا۔ جینگو نے کالیا کو یہاں سے نکلنے کا ایک سیدھا اور محفوظ راستہ بتادیا تھا۔

ہم اسی راستے پر روانہ ہوگئے۔ آگے جا کر کالیا گلستان جوہر کی طرف مڑ گیا اور میں نے ملیر کا راستہ پکڑا۔ کالیا نے مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ وہ روزی کو چھوڑ کر سیدھا وہیں پہنچے گا۔

سڑکیں سنسان تھیں اور میں کالیا کی طاقتور بائیک دوڑاتا ہوا ملیر پہنچا اور اپنے گھر کے دروازے پر ہی بائیک لے جا کر دم لیا۔ زخمی بازو کے باوجود مجھے بائیک چلانے میں کوئی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔

میں نے جلدی سے عاصمہ کو اترنے کا کہا اور پھر خود اتر کر بائیک کو سائیڈ اسٹینڈ پر لگایا اور پھر اسے لاک کر کے عاصمہ کو سنبھالے گھر کے دروازے پر لگے تالے کو کھولا پھر دروازہ دھکیل کر عاصمہ کو اندر کیا اور اس کے بعد خود بھی جلدی سے اندر آگیا۔ دروازہ عقب میں بند کر کے ہم کمرے میں آگئے اور پھر عاصمہ بے اختیار وفورِ جذبات تلے میرے سینے میں اپنا سر رکھے زاروقطار رودی۔

میں اس کا سر پیار و شفقت سے تھپکتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھا دیا۔ خود میری اپنی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہم دونوں بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لگے، غموں اور دکھوں کے خاروخس آنسوؤں میں بہا کر نکلاتے رہے، جب دل و دماغ کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے اسے سہارتے ہوئے دھیرے سے الگ کیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا جو چند ہی روز میں کملا کر رہ گیا تھا۔

بہن کا ستا ہوا چہرہ، بکھرے ہوئے کھچڑی سے بال اور اس کی اجڑی اجڑی سی آنکھوں کے میں آباد گم شدہ سے ویران مسکن کو دیکھ کر میں کچھ سوچ کر اندر سے دہل بھی گیا اور اسی وقت میں نے قسم اٹھالی کہ اگر میری معصوم اور پاکیزہ بہنا کی عصمت پر ذرا بھی کسی نے شب خون مارا ہے تو میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر ہلاک کروں گا۔

''بھ...... بھائی جان! آپ زخمی ہیں؟'' معاً ہی اس کی نگاہ میرے دائیں شانے کے زخم پر بندھی پٹی پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

''معمولی زخم ہے، پٹی کرلی ہے۔ کافی افاقہ ہے۔ فکر نہ کرو۔''

''بھ بھ...... بھائی جان! وہ...... فف...... فہیم بھائی نظر نہیں آرہے ہیں؟'' وہ پھر متلاشی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے ہولے سے مستفسر ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

''عاصمہ! وہ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ فون بھی نہیں ریسیو کررہا ہے، شاید اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ہوا ہے، تم فکر نہ کرو میں کسی دن جا کر اسے لے آؤں گا۔ تم بتاؤ بہنا! تم ٹھیک تو ہوناں؟''

''میں ٹھیک ہوں بھائی جان!'' وہ دھیرے سے اپنا سر جھکا کر بولی تو میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم بہ خیریت گھر پہنچ گئیں۔ تم اب پہلے غسل وغیرہ کر کے کپڑے بدل لو، میں تب تک تمہارے لیے کھانا لگاتا ہوں۔''

میں نے ابھی اپنا ہاتھ منہ دھو کر لباس بدلا، کیونکہ میری قمیص میں خون لگا ہوا تھا۔ پٹی اب نئی قمیص کے اندر چھپ گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد کالیا بھی آگیا۔ اس کے پاس جینگو کی دی ہوئی بائیک تھی۔

گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہی رہتا تھا۔ میں نے انڈے بنالیے تھے اور روٹیاں بھی اتارلی تھیں، بریڈ بھی تھی اور رات کا بچا ہوا سالن بھی تھا۔

ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کالیا نے جانے کی اجازت چاہی۔ عاصمہ نے ہی نہیں بلکہ میں نے بھی کالیا کا ساتھ دینے پر شکریہ ادا کیا تو وہ اپنا سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جگری! دوستوں میں اس طرح کی شکریئے شکایتیں والی مروتیں نہیں چلتیں، بس ایک دوسرے کے کام آتے رہنا ہوتا ہے۔ اور پھر دیکھا جائے تو عین آخر میں جب کام بگڑنے لگا تھا، تم نے ہی اسے سنبھالا تھا اگر تم مجو کو بروقت زخمی کر کے بھاگنے پر مجبور نہیں کرتے تو صورتِ حال شاید اس سے مختلف ہوتی۔ خیر! اسی طرح مل جل کر کام چلتا ہے جگری! چلتا ہوں، کل ملوں گا اور بہت سی باتیں کرنا ہیں، میں بھی ذرا جا کر آرام کرلوں۔''

وہ چلا گیا۔ میں اور عاصمہ کمرے میں آگئے۔ میں نے چائے بنالی تھی، غسل کرنے اور کچھ کھا پی کر اس کی حالت بھی کافی سنبھل گئی تھی مگر تھکن اور پیش آمد حالات ناساعد کے باعث اس پر بری تھکن اور بے آرامی کے آثار کا غلبہ نظر آرہا تھا، خود میں بھی تھکا ہوا تھا، اب تو صبح بھی ہونے والی تھی۔ اس لیے میں نے عاصمہ کو آرام کرنے کا کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی، عاصمہ جاگ گئی تھی۔ وہ میرے لیے ناشتا بنا کر لے آئی۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر رسٹ واچ میں وقت دیکھا دن کے بارہ بج رہے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے پہلے ایک دو فون کیے اور کالیا سے بھی رابطہ کیا اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میری (اس کی) بائیک لاری اڈے پر ہی لے آئے جبکہ جینگو کی بائیک وہ خود جا کر اسے دے آیا تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے عاصمہ سے کہا۔

''عاصمہ! یہ سب کچھ بہت اچانک ہی ہوا تھا کہ مجھے کافی دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ تم اس طرح یک دم گھر سے غائب ہوگئی ہو، مجھے یقین تو تھا کہ کسی نے بڑی پلاننگ کے ساتھ تمہیں اغوا کیا ہے مگر......''

''مگر کیا بھائی جان؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''مگر میرے سمجھانے کے باوجود، فہیم کو اس کا یقین نہیں آیا تھا۔''

''میں جانتی ہوں بھائی جان کہ وہ کیا سمجھ رہا ہوگا مگر اصل حقیقت وہی ہے جس کا آپ کو ادراک ہوا تھا۔'' عاصمہ

نے دکھی دکھی سے لہجے میں اپنا سر جھکا کر کہا تو میں نے اسے ازراہ تشفی کہا۔

"تم پریشان نہ ہو، اب تو فہیم کو یقین آ جانا چاہیے۔" پھر.... ذرا ایک توقف کے بعد اس سے مستفسر ہوا۔ "یہ بتاؤ آخر یہ سب ہوا کیسے تھا؟ مجھے تو حیرت ہے کہ ہمارے گھر میں اس طرح چھپ چھپاتے کس طرح اغوا کاروں نے نقب لگائی تھی کہ ہم تینوں میں سے کسی کو اس کی کانوں کان تک خبر نہ ہو سکی؟"

میں نے عاصمہ کو بتا دیا تھا کہ اس کے اغوا کے پیچھے کس شخص کا ہاتھ تھا اور نیز یہ بھی کہ میں نے کس طرح اپنے دوست کالیا کی مدد سے یہ مہم سر کی تھی، وغیرہ۔

عاصمہ نے اپنے تئیں کچھ صراحت بتانے سے پہلے دکھی سے لہجے میں کہا۔ "بھائی جان! مجھے آپ پر تو یقین تھا کہ آپ وہی سمجھیں گے جو حقیقت تھی مگر فہیم بھائی کی سوچ کا مجھے پہلے ہی ادراک تھا۔ کیونکہ وہ بہت پہلے ہی میری طرف سے اسی غلط فہمی کا شکار رہتے تھے، بالآخر انہوں نے یہی سمجھا جو ان کی سوچ تھی جبکہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، اب میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور آگے بولی۔ "یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی روز کاشف بھی مجھ سے ملنے آیا تھا مگر یہ کوئی باقاعدہ ملاقات نہ تھی۔ بس! وہ دروازے پر ہی آیا تھا اور یہ خوش خبری دینے کے لیے کہ اس کے والدین اگلے دن شام ہمارے ہاں آنے والے تھے۔ میں خوش تھی۔ اس کے جاتے ہی، ایک اور شخص دروازے پر آیا میں یہی سمجھی کہ شاید کاشف کوئی بات بھول گیا تھا اور دوبارہ کچھ بتانے آیا تھا، اسی لیے میں ہی دروازے پر گئی تھی، وہ اجنبی ہی تھا اور مجھ سے کسی کا پتا پوچھا، میں اسے نہیں بتا سکی وہ چلا گیا، اس کے بعد رات کو سونے کے لیے میں اپنے کمرے میں آئی، آپ اور بھائی سو چکے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں رات دیر تک جاگتی رہی، مجھے جانے کیوں اس رات نیند ہی نہیں آ رہی تھی اور دل بھی نجانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ خوشی کا بھی عنصر تھا کہ کل کاشف اپنے والدین بھیجنے والا تھا اور میں اس مخمصے میں تھی کہ پتا نہیں ان کی بات آپ اور بھائی فہیم قبول کرتے بھی ہیں کہ نہیں، تاہم مجھے اُمید تو تھی کہ کم از کم آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کا شاید وہ آخری پہر تھا جب کسی کھٹکے پر میں چونکی تھی، آواز صحن سے ہی آئی تھی، پہلے تو میں یہی سمجھی کہ کوئی بلی وغیرہ کودی ہے مگر دوبارہ کھٹکے کی آواز پر میں بستر سے اٹھ کر صحن میں گئی تو دو انسانی سائے بیک وقت مجھ پر جھپٹے، میں نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نے کسی دوا میں بھیگا ہوا رومال میری ناک سے لگا دیا، پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ بس، بھائی جان! اس کے بعد تب سے اب تک میرا وقت خوف و دہشت میں بیتتا رہا۔ کتنے ہی عذابوں سے میں گزری لیکن بھائی جان! خدا گواہ ہے میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا، اگر ایسا ہوتا تو، میں خودکشی کر لیتی۔"

اتنا بتا کر وہ سسکنے لگی، میں نے پیار اور حوصلہ آمیز انداز میں اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔

"بھائی جان! فہیم کو فون تو کریں، انہیں بتا دیں کہ میں گھر آ چکی ہوں اور میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟" عاصمہ نے آخر میں ذرا سنبھلتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں بولا۔ "میں کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، میں اب صرف میسج کر رہا ہوں اسے کہ تم گھر آ چکی ہو۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان! جیسا آپ بہتر سمجھیں۔" عاصمہ نے اترے اترے چہرے سے کہا، میں جب فہیم کو ایس ایم ایس کر چکا تو عاصمہ مغموم سے لہجے میں بولی۔ "بھائی جان! یہ فہیم بھائی آخر اتنا بدل کیوں ہو گئے ہیں؟ پہلے تو ایسے نہیں تھے وہ؟"

میں نے بھی ایک آزردہ سی ہمکاری بھر کر کہا۔ "ہاں! لیکن اس میں بدقسمتی سے قصور کچھ ہمارے حالات کا بھی ہے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہی دنوں محلے میں منے میاں (خورشید خاں) کی بیٹی ثوبیہ کا بھی اسی طرح کا چکر اور پھر اغوا ہوا تھا، بعد میں وہ ماری گئی یا اس نے خودکشی کر لی۔ واقعہ بہرحال لرزہ خیز ہی تھا، فہیم کا خیال یہی تھا کہ یہ منے میاں کی بیٹی کے ساتھ سوچی سمجھی اسکیم کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا اور یہ آوارہ اور اوباش لڑکوں کا کوئی ٹولہ ہے، جن کا کام ہی یہی ہے، ابھی اس واقعے کو ایک آدھ دن ہی گزرا تھا کہ تمہارا ایشو اٹھ کھڑا ہوا تو فہیم بری طرح خائف ہو گیا۔"

عاصمہ بولی۔ "آپ کی بات صحیح بھی لگتی ہے بھائی جان کہ فہیم کا اسی لیے مجھ سے اس قدر دل خراب ہوا۔"

"تم سے ہی نہیں مجھ سے بھی ہوا تھا اور اس قدر کہ اس نے...... اس نے، اس روز صبح جب تم گھر سے اچانک غائب کر دی گئی تھی، اس نے میرے چہرے پر ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا تھا۔" میں نے کہتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ بتاتے ہوئے میرا لہجہ بھرّا گیا تھا۔ فہیم میرا چھوٹا بھائی تھا، باپ کی پھانسی کے بعد میں نے ہی عاصمہ اور فہیم کو سنبھالا دیا تھا

اور انہیں ایسا کچھ، کبھی بھی محسوس ہونے نہیں دیا تھا کہ انہیں باپ کے نہ ہوتے ہوئے کسی قسم کا عدم تحفظ محسوس کرتے۔

میں نے ہر طرح سے اپنے ان دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی اور کر رہا تھا۔

''کک... کیا... پی پی... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟'' دفعتاً عاصمہ جیسے ایک دم تڑپ کر بولی۔ ''فہیم بھائی نے آپ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا؟ کیا آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟ اپنے بڑے بھائی کے منہ پر اس نے تھپڑ مارا؟''

عاصمہ کو جیسے اس بات پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا، وہ دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات تلے سرخ ہو رہا تھا۔

''آپ نے وہ تھپڑ سہہ لیا ہوگا میری خاطر بھائی جان!'' عاصمہ میری طرف دیکھ کر بولی تو میں نے کہا۔

''ہاں! میں اگر لڑتا تو شور چہار دیواری سے باہر جاتا، دو بھائیوں کے درمیان لڑائی یہ راز کھول دیتی جس کے بعد ہم سب کی عزت داؤ پر لگ جاتی۔ فہیم غصے میں تھا اور میں نے اس وقت یہی بہتر سمجھا کہ غصہ پی لیا جائے۔''

''بھائی جان، مجھے فہیم بھائی سے اس بات کی توقع ہرگز نہ تھی، میری ذات سے متعلق انہوں نے جو شک کیا وہ میں بھی سہہ گئی تھی مگر اس نے آپ کو تھپڑ مار کر خود کو اب ساری زندگی کے لیے میری نظروں سے گرا لیا ہے۔''

''نہیں بہنا! ایسا نہیں کہتے۔'' میں نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ''کوئی بات نہیں، وہ غلط فہمی کا شکار...''

''نہیں بھائی جان! بھائی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے کسی پر بلا جواز شک کرے اور اپنے سے بڑے بھائی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دے۔'' عاصمہ نے میری بات کاٹی۔ ''وہ خود غرض ہے، اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ ایک ہی خاندان کا معاملہ ہے تو اسے بھی اس نازک وقت میں آپ کا ساتھ دینا چاہیے تھا، اصل میں وہ کم ہمت اور بزدل تھا، یہ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے مجھے اپنی جان پر کھیل کر بچایا۔ خود فہیم تو محض اپنا غصہ دیکھا کر اور ایک طرح سے اپنی جان چھڑا کر نجانے کہاں غائب ہو گیا ہے اگر بہن کی اسے اتنی فکر ہوتی تو وہ بھی آپ کی طرح اپنی جان داؤ پر لگاتا، مجھے تو بھائی جان! اب فہیم بھائی کو بھائی کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے، میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' کہتے کہتے وہ سسک پڑی۔ میں اسے تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے عاصمہ کو کاشف کے بارے میں بھی بتایا۔

''کک... کاشف آیا تھا یہاں؟'' عاصمہ نے چونک کر کہا۔

''ہاں! وہ بہت پریشان تھا، تم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کا اور پھر یہاں گھر پہ بھی تالا لگا رہتا تھا تو بہت فکرمند ہوا اور بالآخر وہ مجبور ہو کر ایک رات یہاں آگیا، کیونکہ میں صبح کا گیا رات کو ہی گھر آتا تھا، مجھ سے ملا تو میں نے اسے ساری حقیقت بتا دی۔ لگتا ہے تمہاری اس سے اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے، وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ایک اچھا اور شریف لڑکا محسوس ہوا تھا۔''

''جی بھائی جان!'' عاصمہ اپنا سر جھکا کر ہولے سے بولی۔ ''وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔''

''میرا خیال ہے اب تم اسے بتا ہی دو کہ تم بالکل خیریت کے ساتھ گھر آچکی ہو۔'' میں نے آخر میں اس سے کہا۔

''بھائی جان! میں بتا دوں گی۔ ممکن ہے وہ آپ سے بھی کوئی بات کرنا چاہے۔'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر بردباری سے بولا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں، وہ بے شک مجھ سے بات کر سکتا ہے، یوں بھی وہ مجھ سے مل چکا ہے۔''

''جی بھائی جان!''

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، مجھے اور بھی کام نمٹانا تھے۔ ایڈووکیٹ زنیرہ کی خیریت پوچھنے جانا تھا اور لاری اڈّے کے بھی معاملات وغیرہ دیکھنا تھے۔ کالیا نے بھی وہاں آنا تھا مگر اس واقعے کے بعد میرا اب عاصمہ کو اس طرح گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، فہیم ہوتا تو اور بات تھی، اسے عاصمہ بہن کی یہ خیریت واپسی کا میسج کرنے کے بعد مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ میسج ملتے ہی گھر پہنچ جائے یا مجھ سے رابطہ کرلے مگر اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

عاصمہ میری فکر بھانپتے ہوئے بولی۔ ''بھائی جان! آپ شاید کہیں جانا چاہ رہے ہیں؟ آپ جائیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اب محتاط ہوں۔''

میں اب اسے کیا بتاتا کہ ہمارے دشمن کس قدر زیرک اور طاقت ور ہیں، جو گھر میں گھس کر ایک بار نقب لگا سکتے ہیں وہ دوبارہ بھی یہی حرکت کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''ایسے نازک وقت میں فہیم کی ضرورت بہت محسوس ہو رہی ہے۔ کاش! وہ اب اپنی ناراضگی بھلا کر ہی واپس لوٹ

آئے۔"

"بھائی جان! اس بے حس انسان کو تو ابھی تک اس بات کا ہی احساس نہ ہوسکا کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کے منہ پر تھپڑ مار کر کتنا بڑا گناہ کیا ہے، اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہوتی تو وہ میرے بہ خیریت لوٹ آنے سے پہلے ہی گھر آکر آپ کے قدموں پر گر معافی مانگ چکا ہوتا تو اب کیا آئے گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں بھائی جان! میں اکیلی گھر پر رہ لوں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔"

"میرا خیال ہے میں حاجی صاحب سے کہہ جاؤں کہ وہ گھر کا خیال رکھیں۔" میں نے پُرسوچ سے لہجے میں کہا تو عاصمہ بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں بھائی جان! جس راز کو آپ نے ابھی تک اپنے سینے سے لگا کر ایک طویل کرب انگیز گھڑیاں گزار دیں، اسے اب راز ہی میں رہنے دیں۔"

میں نے کہا۔ "پگلی! میں انہیں اصل حقیقت تھوڑی بتاؤں گا، یہی کہوں گا کہ فہیم اپنے کسی کام سے کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔"

یہ سن کر عاصمہ خاموش ہو رہی، میں باہر آگیا اور کالیا کی بائیک میں سوار ہو کر سب سے پہلے حاجی صاحب کے ہاں پہنچا وہ بیٹھک میں بیٹھے تھے، وہاں ایک دو اور افراد بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں بیٹھک سے باہر بلا کر وہی کہہ دیا تو وہ بڑے پُرشفقت لہجے میں بولے۔ "ارے میاں! فکر کیوں کرتے ہو۔ بے فکر ہو جاؤ، یہ پورا محلہ میرا خاندان ہے، ان کی بہو بیٹیوں کی عزت ہماری عزت ہے۔ کسی کی کیا جراَت ہے کہ ان کی طرف کوئی نظر بھی اٹھا کر دیکھے۔ ویسے میں اسلم مو کا کو بجھتا رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

ان کی بات سن کر میں اندر ہی اندر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا کہ اب میں حاجی صاحب کو کیا بتاتا کہ چند ہی روز پہلے ہم پر کیا قیامت گزری تھی۔

بہر کیف...... میں حاجی صاحب کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا اور اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایڈووکیٹ زنیرہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

میں وہاں سے سیدھا اس کی رہائش گاہ پر پہنچا تو خالہ نجو سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ زنیرہ کی حالت اب کافی بہتر تھی اور وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بیڈ پر لحاف اوڑھے ایک بڑے سے تکیے پر نیم دراز بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک ٹرے تھی، وہ سوپ پی رہی تھی۔

اس کے چہرے کی زردی مائل رنگت اب کچھ گلابی سی ہونے لگی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے بھی ماند پڑنے لگے تھے۔ ان میں اب مردنی کی بجائے حیات بخش چمک پھوٹتی محسوس ہونے لگی تھی جوان کا خاصا رہ چکی تھی۔ گداز لبوں پر نرماہٹ بھی لوٹ آئی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں، بغیر دستک کے اندر آنے پر۔" میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے شستہ لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑی۔ اس کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔

"ارے تم...... آؤ...... تمہیں بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے، آجاؤ، پلیز!"

وہ ٹرے کو سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "مجھے تمہارا ہی تو انتظار تھا۔"

میں مسکراتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب دھری ایک چیئر پر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو تم؟" اس نے مترنم سے لہجے میں پوچھا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

"مجھے چھوڑو، پہلے تم بتاؤ، کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟"

"ظاہر ہے ٹھیک ہی ہوں تو اسپتال والوں نے میری جان چھوڑی!" وہ ہنسی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں کی شوخی لوٹ آئی تھی۔ اسے ہنستا اور مطمئن دیکھ کر مجھے بھی تسلی ہوئی تھی۔

جانتا تھا میں کہ یہ ساری تکلیف اس نے میری خاطر ہی بھگتی تھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنی فیس کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ بس، ایک اچھے دوست کی حیثیت سے وہ میری مدد کے لیے میری ذاتی جنگ میں وہ شامل تھی، یہی نہیں وہ آئندہ بھی اسی طرح پوری پامردی کے ساتھ عزم صمیم بھی کیے ہوئے تھی حالانکہ میں اسے پہلے اشاروں کنایوں میں اور بعد میں اس کی جان کو پوری خطرے میں محسوس کر کے اسے واضح لفظوں میں بھی کہہ چکا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مجھے اپنی موکلیت سے ہٹا دے۔ مجھ سے اپنا راستہ جدا کرلے۔ مجھے اپنی یہ جنگ خود ہی لڑنے دے مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج میں وہی بات دوبارہ اس سے کرنے والا تھا۔

"زنیرہ! مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے تمہیں یوں بھلا چنگا دیکھ کر۔"

"اور مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر!" وہ اسی شوخی سے بولی تو

میں نے تھوڑا سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔
''زنیرہ! اگر تمہیں خدانا خواستہ کچھ ہوجاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔''
''ارے...... وہ کیوں؟'' اس کی کشادہ اور دلکش آنکھیں شرارتی انداز میں پھیلیں، بڑا پیارا انداز تھا اس کا یہ...... جو ایک سنجیدہ مزاج وکیل کا لگتا ہی نہ تھا مگر وہ ایسی ہی تھی۔ ہر صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کر لیتی تھی۔ کمرا عدالت میں ہوتی تو اس سے بڑا جغادری وکیل کوئی اور دکھائی نہیں دیتا تھا اور میرے ساتھ ہوتی تو ایک شوخ اور کھلنڈری ساتھی کے سوا کچھ نہیں لگتی تھی۔
''مذاق میں مت ٹالو میری بات......'' میں نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا۔ ''میں تمہیں اپنی وکالت سے سبکدوش کر رہا ہوں۔'' میں نے جیسے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ بولی۔
''ارے بابا! یہ ظلم مت کرنا مجھ غریب کے ساتھ...... ایک ہی تو کیس ہے میرے پاس، جس سے میری دال روٹی چل رہی ہے، کیا اس سے بھی مجھے محروم کردو گے، بھوکی مرجاؤں گی میں۔''
میرا اندر اسے سلام کرنے کو چاہا۔ میری وجہ سے ہی وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی اور اب اس کی جی داری دیکھنے والی تھی۔
''میں نے کہا ناں زنیرہ! مذاق مت کرو میرے ساتھ، پلیز! میرے دشمنوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔'' میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش چاہی اور آگے بولا۔
''میرے دشمن میرا تو کچھ نہیں بگاڑ پارہے ہیں مگر وہ اب بزدلانہ حرکتوں پر اتر آئے ہیں۔
وہ اب مجھے جھکانے اور مجھے اپنے زیردست کرنے کے مذموم ارادوں سے، میرے چند قریبی ساتھیوں اور مددگار وبہی خواہوں کی جانوں کے دشمن بننے لگے ہیں۔ تم پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد تو وہ اب میرے گھر تک بھی پہنچ گئے ہیں۔''
یہ کہتے ہوئے میں نے اسے رازداری کی تلقین کرتے ہوئے عاصمہ کے اغوا اور پھر اس کی برآمدگی کے بارے میں بھی بتا دیا۔ جسے سن کر زنیرہ کی ساری شوخی ہوا ہوگئی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے خوفزدہ ہوگئی تھی۔
''کک...... کیا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی تو میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے کہا۔

''ہاں! زنیرہ! ایسا ہو چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دشمن اب اس غلیظ حرکت کے بعد کوئی اور حرکت بھی کریں گے۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم......''
''نعمان!'' معاً ہی زنیرہ نے میری بات کاٹی اور میں رک کر مستفسرانہ انداز میں اس کا چہرہ تکنے لگا وہ بولی۔ ''تم اللہ پر یقین رکھتے ہو؟''
''نعوذ باللہ...... یہ کیسا سوال کیا تم نے؟ بھلا اللہ پر مجھے کیوں نہ یقین ہوگا، جس پاک ذات کے ہاتھوں میری جان ہے اور جس کی مرضی کے بغیر میں دوسری سانس بھی لینے کا مجاز نہیں۔''
''تو پھر اپنی اس حق و انصاف کی جنگ سے کیوں ڈرتے ہو؟ تم نے حق کے لیے باطل کے خلاف علم بلند کیا ہے تو اللہ کی مدد کو کیوں فراموش کررہے ہو۔ تمہارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ اللہ کا ساتھ حق و راستی پر چلنے والوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بے شک اس میں کڑی آزمائشیں بھی آتی ہیں اور......''
''مجھے انہی آزمائشوں سے ڈر لگتا ہے، زنیرہ!'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔
''میں شاید اس معاملے میں بزدل اور کمزور انسان ہوں۔''
''وہ ہر کوئی ہوتا ہے۔'' وہ بھی ترنت بولی۔ ''ثابت قدمی کے لیے ایک ایسے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر لمحہ ربّ کریم سے اپنی سی کوششوں کے ساتھ دعا گو بھی رہے اور ہر ساعت اس پاک اور رحیم ذات سے مدد کا طلب گار بھی رہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم بے حوصلہ اور بے عزم ہو لیکن تم ایسی باتیں کر کے خود کو بے حوصلگی کی طرف لے جاؤ گے۔ چلو! مجھے چھوڑو، تمہارے دشمن تو اب تمہارے گھر والوں کے پیچھے بھی پڑ چکے ہیں، جس کا تازہ ثبوت تمہیں عاصمہ کے اغوا کی صورت مل بھی گیا، تو کیا اب تم اپنی بہن سے یہ کہو گے کہ وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے؟''
بڑے عجیب مگر کچھ ایسے انداز میں زنیرہ نے دلیل دی تھی کہ میں لاجواب سا ہو کر رہ گیا تاہم پھر میرے منہ سے نکل گیا۔ ''میرا اس سے ایک رشتہ ہے، جو اٹوٹ ہے۔''
''اور دوستی کا رشتہ تمہاری نظروں میں اٹوٹ نہیں ہوتا؟'' وہ یک دم شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور...... تمہارے نزدیک جسے جب جی چاہا توڑ کر پھینک دیا جائے؟'' میں گڑبڑا سا گیا۔

’’مم...... میرا مطلب یہ نہیں تھا زنیرہ!‘‘ میں نے صفائی پیش کرنی چاہی۔ ’’دوست تو میرے اور بھی ایسے ہیں جن کا میرے ساتھ رشتہ اٹوٹ ہے جیسا کہ چاچا انور شاہ اور شیراز کا لیا اور...... اور......‘‘ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر زنیرہ نے میرا جملہ اچک لیا۔ ’’اور......! اور...... کون؟‘‘

’’فوزیہ......‘‘

’’فوزیہ......؟ کون ہے یہ خاتون؟‘‘ اس نے اپنی نگاہیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے لیے یہی بہتر موقع تھا کہ میں اسے بتا دوں فوزیہ کے بارے میں آج کیونکہ میں زنیرہ کی اس دوستی کو کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ میری اور زنیرہ کی دوستی مغربی معاشرے کی دوستی نہیں تھی جہاں ’’سب چلتا ہے‘‘ جبکہ مشرقی معاشرے میں یہ سب نہیں چلتا۔ ہمارے سماج میں اس طرح کی دوستی از خود معنیٰ تراش لیتی ہے اور مجھے بھی اب تک یہی اندازہ ہوتا رہا تھا کہ کہیں زنیرہ میری اس دوستی کے سلسلے میں از خود اس جذبہ دوستی کو کوئی ایسا سنجیدہ معنیٰ نہ پہنا ڈالے تو آج میں یہ پیچ بھی ختم کر ہی ڈالوں کہ شاید اگر اس کے دل میں بھی ایسی کوئی بات ہو بھی تو یہ سن کر خود ہی میرے راستے سے ہٹ جائے۔ لہٰذا بولا۔

’’میں اس سے محبت کرتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے میں نے زنیرہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو مجھے ایکا ایکی اس کے چہرے کی گلابی رنگت میں پھیکے پن کا شائبہ سا اترتا محسوس ہوا، اس کی کشادہ آنکھوں کے کشکول میں مجھے خالی پن کے کرب کی ایسی جھلک سی نظر آئی، جس میں کسی کھوٹے سکے کی ’’چھنک‘‘ سی گونجی ہو۔

ویران کھنڈروں کی بازگشت دیتی اس کے چہرے کی اس کیفیت کو میں نے بس، پل کے پل ہی محسوس کیا تھا اور پھر جیسے سب کچھ نارمل ہو گیا۔ وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ میں بھونچکاں سا ہو کے اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس کی کھنکتی ہنسی میں ایک خاموش دکھ کی معصوم سی ادا جھلکتی محسوس ہوئی۔

’’تو جناب! کسی خاتون سے عشق بھی فرما چکے ہیں۔‘‘ وہ اسی لہجے میں بولی۔ میں نے اس بار پُرغور سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی، شوخی کی تہہ میں مجھے بحرِ غم کا ایک طوفان تلاطم میں مطلق دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔

’’اچھا ہی ہے یہ...... اسے بھی سب پتا چل جانا چاہیے کہ شاید اسی طرح ہی یہ مجھ سے خود ہی دور ہو جائے۔‘‘

’’بہت خوشی ہوئی مجھے نومی! یہ جان کر...... خیر، تم اب میری روزی کے پیچھے مت پڑو اور ہاں کل مرحلہ وار میری فیس کا ایک حصہ تم پر واجب الادا ہے۔ پلیز، وہ دے دینا۔‘‘

میں جانتا تھا کہ اسے میرے کیس سے متعلق اپنی فیس سے کوئی دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ تاہم میں کبھی دیر سویر اس کی فیس ادا کر دیا کرتا تھا، جسے وہ بڑی ردو کد کے بعد ہی لیا کرتی تھی۔

’’تم ابھی تک میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔‘‘ میں نے بدستور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

’’ارے......! مذاق کیسا بھئی؟ روزی کے سلسلے میں بھی کوئی مذاق کرتا ہے بھلا؟‘‘

وہ بڑی صفائی سے ہر اس معاملے سے پہلو تہی کیے جا رہی تھی جس کی حساسیت سے میں اسے پوری شدومد کے ساتھ آگاہ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

’’اچھا سنو تو...... کبھی ملاؤ ناں اسے، دیکھوں تو آخر تمہاری پسند کیسی ہے۔‘‘

وہ اسی طرح مسکراہٹ کے پردے میں درد کو چھپاتے ہوئے بولی۔

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گویا اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ ’’اچھا ملوا دوں گا تمہیں کبھی، پہلے تم پوری طرح ٹھیک تو ہو جاؤ۔‘‘

اس نے بھی موضوع سے گویا پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔ ’’فرحانہ کے سلسلے میں کیا رہا؟ کوئی نئی بات یا نیا انکشاف سامنے آیا؟‘‘

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ متحیر سی ہو گئی۔ فرطِ جوش سے بولی۔ ’’پھر تو سمجھو یہ پرانا کیس حل ہوا چاہتا ہے۔‘‘

’’ہاں! ابتداء میں مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔‘‘ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

’’جس شخص کی ٹائی پن ملی ہے وہ اپنے والدین سمیت ملک سے باہر گیا ہوا ہے، یعنی جرمنی!‘‘

’’مگر رانا بشیر تو انہیں جانتا ہی ہوگا؟ اگر رفعت خانم مرڈر کیس ری اوپن ہوتا ہے تو تفتیش کے لیے ان تینوں کو انٹرپول کے ذریعے جرمنی سے یہاں پاکستان بلایا جا سکتا ہے۔‘‘

"بتایا نا میں نے ابھی تمہیں کہ یہ رانا بشیر کا بزنس پارٹنر ہے، تمیزالدین اور اس کی بیوی اور ان کا اکلوتا جوان بیٹا خرم!" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ رفعت خانم کے قتل میں اس نوجوان خرم کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم ضروری نہیں ہے کہ یہ ٹائی پن صرف خرم ہی لگاتا ہو، یا پھر یہ ٹائی پن اس کے باپ یعنی رانا بشیر کے بزنس پارٹنر تمیزالدین کے بھی استعمال میں رہی ہو؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پوری فیملی ہی اس مرڈر میں شریک ہو لیکن!" زنیرہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

"لیکن کیا.....؟"

"پہلے ایک بات بتاؤ، اس سارے گھن چکر میں کیا تمہیں رانا بشیر پر بھی کوئی شبہ ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا رہا ہے اور میں اس کا شاید تمہارے سامنے اظہار بھی کر چکا ہوں۔" میں نے بلا دیر اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"تب پھر میں تم سے یہ کہنے والی تھی کہ تمہیں رانا بشیر پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔"

"اس پر تو اس کی بیٹی فرحانہ ہی نظر رکھ سکتی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر تمہیں رانا بشیر کے بیرونی معمولات سمیت اس کے دفتری روز و شب پر اور کن سے ملتا جلتا ہے کیا کرتا ہے، یہ سب نگاہ میں رکھنا ہوں گے۔"

"اب میں یہی کروں گا۔" میں نے کہا۔

"ویسے اگر تم اس سلسلے میں فرحانہ کو اپنی بگ انڈراسٹینڈنگ میں لے لو تو میرا خیال ہے کہ یہ کام اور بھی آسان اور حل طلب ہو جائے گا۔" زنیرہ نے مشورہ دیا۔

اثنائے گفتگو خالہ نجو چائے کے برتن لے آئی اور بیڈ اور میری چیئر کے درمیان میں دھری تپائی پر رکھ دی اور چلی گئی۔

"میں اس کوشش میں ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں فرحانہ کے ذہن کو بھی اس طرف سوچنے کا قائل کرنے والا ہوں۔ تاہم تمیزالدین کے سلسلے میں بھی میں نے کچھ اقدامات اٹھانے ہیں اور دونوں ملنے والی ڈائریوں کے مندرجات کو ایک بار پھر بڑے غور سے پڑھنا بھی ہے مگر کیا کروں، میں خود اپنے کچھ تازہ ترین نامساعد حالات میں اس قدر پھنس گیا ہوں کہ وہ سارے سوچے گئے باریک نقطے میں فراموش کر چکا ہوں، اب ڈائریاں دوبارہ پڑھوں گا تو یاد آجائیں گے اور انہیں اس بار اپنی ایک الگ ڈائری میں رقم بھی کرتا جاؤں گا۔"

"تمہیں پہلی فرصت میں فرحانہ سے وہ دونوں ڈائریاں لے لینی چاہیے تھیں۔" زنیرہ بولی۔ "بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوبارہ پڑھنے سے کئی نئے نقطے ذہن میں آجاتے ہیں۔"

"میری تو کوشش یہ بھی ہے کہ دوسری ڈائری جو ہاتھ لگی ہے فرحانہ کے وہ ہی سب سے زیادہ اہم ہے، میں اس ڈائری کے جو الفاظ مٹے ہوئے ہیں انہیں قابل مطالعہ بنانے کی کوشش کروں گا۔"

"ایگزیکٹلی! میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی کہ رفعت خانم مرڈر کیس کھلنے لگا ہے۔ تمہیں اس پر اب جزوقتی نہیں بلکہ کل وقتی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔" زنیرہ چہک کر بولی۔

میں نے بھی اس کی بات پر پُرسوچ انداز میں اپنا سر ہلا دیا اور پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب ایسا ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ چائے کا شکریہ، میں اب چلوں گا۔"

میں وہاں سے چلا آیا اور جب لاری اڈے پہنچا تو وہاں کالیا کو پہلے ہی سے اپنے انتظار میں موجود پایا۔ میں نے اسے زنیرہ کی خیریت وغیرہ سے آگاہ کیا اور صرف یہی بتایا کہ وہ اسپتال سے ڈسچارج کر دی گئی ہے۔

"سیٹھ ستار کی کوئی خبر؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو کوئی خبر نہیں، تاہم میں نے اس کی ریکی اور معمولات کو نظر میں رکھنے کے لیے اپنے دولڑکے پیچھے لگا دیے ہیں۔ آگے تم بتاؤ، کیا نئی پلاننگ ہے؟"

میں نے اس کی بات پر دھیان دینے کے انداز میں کہا۔

"کالیا میرے اس وقت دو بڑے دشمن گروپ میدان میں اتر آئے ہیں۔ ایک لینڈ مافیا گروپ۔ ہے جو پہلے ہی سے میدان میں میرے خلاف اترا ہوا ہے۔ ان میں سیٹھ ستار اور حاجی میران خان ہے۔ دوسرا گروپ جس نے اب تک خود کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اب بھی ظاہر تو نہیں ہوا ہے مگر غائبانہ طور پر اس نے اپنا تعارف ابھی کچھ ہی روز پہلے کروا دیا تھا۔ جس کا مطلب ہے میرا رانا بشیر اور اس کی بیٹی فرحانہ سے ملنا جلنا اور رفعت خانم مرڈر کیس سے متعلق میری کاوشوں نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ یہ دوسرا دشمن چھپا ہوا

ہے۔ میں اسے ظاہر کرنا چاہتا ہوں آخر یہ ہے کون؟''

''ابے لے...... جگری! تو تو ڈبل او سیون کی طرح کا جاسوس بنتا جارہا ہے۔'' کالیا میری بات سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ڈبل او سیون نہیں، ڈبل زیرو سیون ......'' جواب میں تصیح کرتے ہوئے، میں بھی مسکرادیا تو وہ بولا۔

''میں جیمز بانڈ کی بات نہیں کررہا، میجر پرمود کی بات کر رہا ہوں، جیمز بانڈ تو سالا خون خرابے پھیلا کر کوئی ماورائی قوت ہی بن جاتا ہے مگر یہ اپنا میجر پرمود بالکل تمہاری طرح چالاکی اور مکاری سے اپنے چھپے ہوئے دشمنوں کے گرد پہلے جال بنتا ہے اور پھر جھپٹ پڑتا ہے۔''

''لگتا ہے تم آج کل ابن صفی اقبال اور ایس قریشی کی سیکریٹ سروس زیادہ پڑھنے لگے ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کام تو عملی طور پر تم نے ہی سارا کیا ہے۔''

''لیکن اس کی پلاننگ اور دماغ تم نے ہی لڑایا تھا۔ خیر! اب آگے کے کیا ارادے ہیں؟'' اس نے آخر میں پوچھا تو میں نے پُرسوچ لہجے میں اس سے کہا۔

''میں روزی اور فرحانہ کے ساتھ اپنے راہ و رسم کو بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں کردار میرے دونوں قسم کے دشمنوں ...کی شہ رگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ روزی سیٹھ ستار کی بہت سے رازوں سے واقف ہوگی جبکہ فرحانہ کو میں نے ایڈووکیٹ زنیرہ کے مشورے کے مطابق قائل کرنا ہے کہ وہ اپنے باپ رانا بشیر پر بھی نگاہ رکھے۔''

''روزی والی بات تو ٹھیک ہے پر یہ فرحانہ والا معاملہ ایسا نہیں بھلا وہ کس طرح اپنے باپ کے خلاف کوئی کام کرسکتی ہے؟''

''میں بے وقوف ہوں جو اس سے ایسا کہوں گا۔'' میں گہرے انداز میں مسکرا کر بولا۔

''تو پھر کیسے کہو گے؟'' وہ حیرانی سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ میرا کام ہے، تم صرف حرکت کرنے کے لیے تیار رہنا، جال میں بنوں گا۔''

''ابے لے جگری! اسی لیے تو تجھے میجر پرمود کہتا ہوں۔'' وہ ہنسا۔

اسی دوران چاچا انور شاہ آگئے، میں انہیں عاصمہ سے متعلق بتا چکا تھا وہ فکرمند بھی تھے اور خوش بھی۔

''تمہیں فوراً پولیس کو انفارم کرنا چاہیے تھا بیٹا!'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''نہیں چاچا! یہ رات کی تاریکی میں ہوا تھا اور اسی تاریکی میں یہ معاملہ ہم نے نمٹا دیا۔ دشمنوں کے ساتھ اب انہی کے ہتھیاروں اور طریق سے ہی نمٹنا ہوگا۔'' میں نے گہری متانت سے کہا تو وہ بولے۔

''تو اس طرح پھر سیٹھ ستار کے گرد قانونی گھیرا کیسے تنگ کیا جائے گا؟''

''اس کے لیے میرے پاس ابھی ایک ترپ کا پتا موجود ہے، میں ابھی کچھ ہی دیر میں وہیں جانے والا ہوں، آپ مجھے ذرا احسان جمالی گڈز کے بارے میں بتائیں۔''

''یہ سپرہائی وے پر ہے، سبزی منڈی کے پاس۔'' انہوں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں! خیریت ہی ہے، بس ذرا وہاں جانا ہے میں نے۔ آپ کی احسان صاحب سے کوئی دعا سلام ہے؟'' میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میری تو نہیں ہے، البتہ عطا صاحب کی ضرور ان سے بات چیت ہے۔ کیوں خیریت؟'' انہوں نے آخر میں پوچھا اور میں نے انہیں انسپکٹر کامران سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتادیا۔

اس کے بعد میں نے اسی وقت عطا صاحب کے سیل پر ان سے رابطہ کیا اور انہیں صرف یہی بتایا کہ کاروباری سلسلے میں مجھے احسان جمالی سے ملنا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں ان سے کل مل لوں وہ انہیں فون کرکے میرے بارے میں بتا دیں گے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کالیا کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

ہم دونوں بائیک پر سپرہائی وے میں واقع جمالی گڈز پہنچے تو وہاں ایک خاصے گیم تیم آدمی سے ملاقات ہوئی، جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہی احسان جمالی تھا۔ یہ ایک ساٹھا پاٹھا شخص تھا۔ عطا صاحب انہیں میرے بارے میں فون کرچکے تھے۔ اس نے بے داغ شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سر پہ ٹوپی تھی۔ میں اس سے سندھی میں ہی مخاطب ہوا اور اس سے کہا کہ ملوک کی شخصی ضمانت میں نے ہی کروائی تھی تو وہ بہت خوش ہوا اور مجھ سے ممنون بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی سائیں! یہ آپ کی خدا ترسی ہے آپ نے ایک غریب اور سادہ لوح انسان پر ترس کھایا، حالانکہ آپ اسے جانتے بھی نہیں تھے مگر آپ کی مردم شناسی کی یہ عمدہ مثال ہے

کہ آپ نے کھرے کھوٹے کی پہچان خوب کی تھی۔"

"جمالی صاحب! بسا اوقات اصل مجرم اسی لیے قانون کے شکنجے سے بچ جایا کرتے ہیں کہ ان کی جگہ بے گناہ اندر ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میری چشم تصور میں اپنے بے گناہ باپ کا چہرہ گردش کرنے لگا۔

"ایک دم سولہ آنے درست بات کی ہے بابا تم نے۔" احسان جمالی بولا۔ "میں اب آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"یاسر کو آپ جانتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کس نے اسے نوکری پہ یہاں رکھا تھا؟"

"یہ چھوٹے موٹے آدمیوں کو رکھنا ہمارے منشی نواز کا کام ہی ہوتا ہے۔"

"ہمیں منشی نواز سے ہی ملوا دیں۔" میں نے کہا۔

احسان جمالی نے اسی وقت ایک آدمی کے ذریعے اسے اپنے کمرے میں طلب کروالیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا، اس کی عمر کا اندازہ یہی ہوسکا تھا مجھے۔ اس نے شلوار قمیص پر عام سی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع سے منشی ہی دکھائی پڑتا تھا۔ تاہم صورت سے خاصا خرانٹ اور اکھڑ مزاج نظر آتا تھا۔

"نواز! یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، یہاں بیٹھ جاؤ اور ان کے ساتھ پورا تعاون کرنا۔" احسان جمالی نے اس سے کہا پھر معذرت خواہانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "آپ لوگ چائے پی کر جانا، میں ابھی بھجواتا ہوں مجھے ذرا ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔" اس پر میں نے جمالی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر نواز سے مخاطب ہوا، جو اب میرے اور کالیا کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم منشی نواز ہو؟"

"جی سائیں؟" اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن ہویدا تھی۔ جمالی صاحب کی وجہ سے وہ طوعاً کرہاً ہی سہی اپنے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ سمونے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"نواز! یاسر نامی شخص کو تم نے ہی یہاں نوکری پر لگایا تھا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔

"جج..... جی ہاں!"

"تم کیا اسے پہلے سے جانتے تھے؟"

"جانتا تو نہیں تھا..... مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور الٹا اس نے مجھ پر سوال داغ دیا۔ "کیا آپ پولیس والے ہیں؟"

"نہیں مگر انہی کی طرف سے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم میرے اس سوال کا جواب دو گے جو میں نے پوچھا ہے تم سے؟ تم یاسر کو جانتے تک نہیں تھے اور تم نے اسے بغیر کسی کی ضمانت پر نوکری پر رکھ لیا تھا۔"

میرے لہجے میں درشتی عود آئی تھی۔ جس نے اس کی کرخت مزاجی کو ہوا بھی دی تھی، تاہم وہ بھی اس بار بے پروانہ لہجے میں بولا۔ "سائیں! یہ کوئی سرکاری ادارہ تو ہے نہیں کہ یہاں ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔ نہ ہی کوئی بڑا عہدہ ہوتا ہے یہاں۔ وہ ایک غریب اور ضرورت مند آدمی بن کر آیا تھا اور مجھے بھی ایک چائے وغیرہ لانے کے لیے ایک نوکر کی ضرورت تھی سو میں نے رکھ لیا اسے۔"

"تمہیں پتا ہے اس غریب آدمی نے کتنا بڑا جرم کیا تھا بعد میں؟" میں نے اس کی طرف آنکھیں سکیڑ کر گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے جی! پر اس میں سارا قصور ملوک کا تھا۔ اسے اپنی مصیبت پڑی ہوئی تھی، اس نے اس سے بچنے کے لیے اپنا ٹرک اس کے حوالے کیوں کیا تھا پھر؟" منشی نواز نے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

"ملوک نے بھی اس آدمی پر اسی لیے ہی اعتبار کیا تھا کہ اسے تم نے نوکری میں رکھا تھا۔ انسان جہاں کام کرتا ہے تو وہاں سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔" میرے اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ ابھی وہ اس کا کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ملازم ہاتھوں میں چائے کی ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ میں نے.....سرسری سی نظر اس پر ڈالی تھی۔ ہماری طرح یہاں بھی چائے کا ادھر ہی بندوبست کیا جاتا تھا، یعنی ہوٹل وغیرہ سے نہیں منگوانی پڑتی تھی۔ اس نے میز پر ٹرے رکھی اور ہمارے لیے چائے ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا وہ منشی نواز کو بھی تکے جا رہا تھا اور ہماری طرف بھی۔

"مگر ملوک کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ خود ایک ڈرائیور ہے اور اگر اسے اپنا ٹرک کسی مجبوری کی بناء پر کسی کے حوالے کرنا ہی تھا تو وہ اپنے جیسے کسی ڈرائیور کے ہی حوالے کرتا۔ نا کہ ایک چائے والے کے۔"

منشی نواز نے ایک جواب سوچ کر دیا تو میں نے اس

آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے لیے چائے لایا تھا۔ ''اگر اسے ٹرک چلانا آتا ہو اور تمھیں کوئی مجبوری ہو اور دوسرا ڈرائیور بھی دستیاب نہ ہو، مال پہنچانا بھی ضروری ٹھہرے تو کیا تم ٹرک اس کے حوالے نہیں کرو گے، منشی نواز؟''

''ہرگز نہیں۔'' منشی نواز نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلایا۔

میں نے یوں ہی کن انکھیوں سے چائے والے کی طرف دیکھا جو منشی نواز کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پہ بھی کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔

ہم چائے پینے لگے۔ منشی نواز نے جانے کی اجازت طلب کی اور کرسی سے کھڑا بھی ہو گیا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چائے والا نواز کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا پھر جب وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ''سائیں! یہ بہت لالچی آدمی ہے، اس نے پیسے لے کر یاسر کو رکھا تھا۔''

میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ فوراً اس سے کہا۔

''یہاں بیٹھو۔''

''نہیں صاحب! میں بیٹھ نہیں سکتا۔'' وہ انکار کرتے ہوئے بولا تو میں نے جلدی سے اسے پوری بات بتائی تو وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔

''سائیں! ملوک میرا بہنوئی ہے، آپ نے اس کی ضمانت کروا کر بہت نیک کام کیا ہے۔ وہ بہت سادہ لوح انسان ہے۔ مجھے یاسر نامی اس آدمی پر بہت پہلے شبہ تھا کہ وہ نوکری کرنے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔''

''اسی بات کا تو ہم کھوج لگانا چاہتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ مجھے یہ آدمی کام کا لگا تھا مگر وہ گھبرا بھی رہا تھا، صاف لگتا تھا جیسے وہ منشی نواز سے خوف زدہ بھی ہو۔ یوں بھی جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ ملوک اس کی بہن کا شوہر بھی تھا تو میں نے اسے مزید رام کرنے کے لیے تھوڑا سا ڈرایا۔

''دیکھو! ملوک ابھی صرف ضمانت پر ہی رہا ہوا ہے اس پر ایکسیڈنٹ کا کیس ختم نہیں ہوا ہے اگر اصل مجرم یعنی یاسر نہ ملا تو اس کا گناہ ملوک کے ہی سر جائے گا اور پولیس اسے دوبارہ گرفتار کر سکتی ہے، یعنی جب تک یہ کیس سے بری نہیں ہو جاتا پولیس کی تلوار ملوک کے سر پر لٹکتی رہے گی، ضمانت منسوخ بھی ہو جایا کرتی ہے کیونکہ ایکسیڈنٹ کسی معمولی شخصیت کا نہیں ہوا ہے بلکہ ہائی کورٹ کی ایک ایڈووکیٹ کا ہوا ہے۔ تم اگر تعاون کرو گے تو یہ سب راز میں رکھا جائے گا اور اصل مجرم تک پہنچنا ہمارا کام ہو گا۔ کیا کہتے ہو اب؟''

اب میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا، وہ فوراً تعاون پر رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے صاحب! اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے مکمل تعاون کروں گا۔ مگر یہاں نہیں۔'' پھر اس نے کہا ہم باہر جا کر ایک جگہ پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کریں۔ وہ ابھی چند منٹوں میں ہم سے آ ملے گا۔

میں اور کالیا وہاں سے نکل گئے۔ اس شخص سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس کا نام پوچھ لیا تھا جو اس نے رحیم بخش بتایا تھا۔

وہ جلد ہی مطلوبہ مقام پر ہم سے ملنے آ گیا اور ہم کھڑے کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یاسر کو نوکری میں رکھنے کے لیے یاسر نے نہیں بلکہ کسی اور شخص نے منشی نواز کو رشوت کے طور پر پیسے دیئے تھے۔

رحیم بخش اور اس جیسے اور بھی جمالی گڈز میں کام کرنے والے کچھ ملازم اس سے خوش نہیں تھے۔ رحیم نے ہی اس کی اپنے موبائل فون پر رشوت لیتے ہوئے تصویر بنا ڈالی تھی جو اس نے بلیوٹوتھ کے ذریعے مجھے اسی وقت سینڈ کر دی۔ میں نے اپنے سیٹ پر جب اس شخص کی تصویر کو انلارج کر کے دیکھا تو مجھے اس شخص کا چہرہ شناسا سا محسوس ہوا، یہی سبب تھا کہ میں چند ثانیوں کے لیے گنگ سا ہو گیا۔

وہ شخص بے داغ پتلون شرٹ میں ملبوس تھا۔ اسے پہچاننے کی ایک بڑی وجہ اس کی جسمانی ساخت تھی جو مجھے نہیں بھولی تھی۔ جسم اس کا چھریرا تھا مگر سر اس کی مناسبت سے غیر معمولی بڑا اور چوڑا تھا۔ بال بھی گھنے تھے اور مونچھیں چٹ تھیں۔ میں اپنے ذہن پر زور ہی دیتا رہ گیا تو رحیم بخش نے جانے کی اجازت لی، میں نے اس کا نمبر لے لیا اور پھر کالیا کے ساتھ ایک طرف جا کھڑا ہوا۔

''ابے لے...... جگری! تجھے تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ کہاں سے کہاں بال کی کھال نکال لی تو نے۔'' کالیا نے کہا تو اسی وقت میرے سوچتے ذہن میں ایک جھما کا ہوا اور پھر میں معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''ابھی کہاں کالیا! بال کی کھال تو ابھی اور نکلے گی۔ یہ بتا کوئی بھیس بھرنے کا سامان ہو سکتا ہے؟''

مجھے یہ مذکورہ شخص یاد آ گیا تھا اسے میں نے سیٹھ ستار کی بلڈر کمپنی ''بلیو مون ہائٹس'' کے دفتر میں دیکھا تھا۔ وہاں یہ

کاؤنٹر ٹیبل پر بیٹھا تھا اور کسی پارٹی کو کوئنس کرنے میں مصروف تھا۔

"لگتا ہے تیرے مفکروں والے دماغ میں کوئی کلیو آن اٹکا ہے۔" کالیا ہنس کر بولا۔

"بھیس بدلنے کے لیے اڈے پر چلنا ہوگا۔" اس نے کہا اور بائیک سنبھال لی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور ہم روانہ ہوگئے، راستے میں ہی میں نے سیل فون پر روزی کے نمبر پنچ کیے اور رابطہ ہوتے ہی میں نے اس کی خیر خیریت پوچھی۔

اس نے بتایا کہ اس نے سیٹھ ستار کے کرائے کے گماشتوں کے خوف سے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا ہے، اب وہ کہاں ہے، اس کے بارے میں اس نے کہا کہ جب میں اس سے ملنے آؤں گا تو تب ہی وہ بتائے گی۔

میں نے کہا۔ "درحقیقت میں تمہاری حفاظت کا کوئی خفیہ بندوبست کرنے کا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ رات والے واقعے کے بعد تم اب اس بلڈر مافیا کی ہٹ لسٹ میں شامل ہو چکی ہو۔"

وہ بولی۔ "مجھے اس کا احساس ہے۔ اسی لیے تو میں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ بھانڈا تو میرا ابھی پھوٹ ہی چکا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کمینے سیٹھ کے بہت سے اہم رازوں سے واقف ہوں مگر میرے ہاتھ ابھی کمزور ہیں، ڈرتی ہوں کہ وقت سے پہلے ہی نہ کاٹ دیے جائیں۔"

"مس روزی! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں، ہمیں سیٹھ ستار کے ان اہم رازوں سے آگاہ کریں، باقی کا کام ہم سنبھال لیں گے۔"

"وہ تو ظاہر ہے کہ اب اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔" وہ بولی۔ "تم لوگوں کی صورت میں مجھے بھی اس خونی شخص سے اپنی بہن کا انتقام لینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اس موقع کو بھلا کیوں کر ضائع جانے دوں گی مگر احتیاط کے ساتھ۔"

"اوکے!" میں نے کہا۔ "ابھی تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میں رات کو تم سے مل لوں۔"

"آنے سے پہلے مجھے فون کر دیجیے گا نعمان صاحب!" وہ آخر میں بولی اور میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہم استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے۔ وہاں کے لوگ اب مجھے بھی پہچاننے لگے تھے۔ کالیا مجھے اوپری منزل کے ایک کوٹھڑی نما کمرے میں لے آیا اور بولا۔

"یہ لے...... جگری! یہ ہمارا ڈریسنگ روم ہے، جو چاہے بھیس بھر لے۔"

"تو کہاں چلا؟" میں نے اس سے کہا۔ "تو نے بھی بھیس بدلنا ہے۔"

"میں ابھی آتا ہوں، جب تک تو اپنا کام نمٹا، استاد بھابھا کو میں ذرا سلام کر آؤں ذرا......" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔

یہاں مختلف الماریوں میں بھانت بھانت کا سامان موجود تھا۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر آدمی کا بہروپ بھرا۔ اتنی دیر میں کالیا بھی آ گیا، میں.... اسے دیکھ کر تھوڑا چونک سا گیا۔ وہ کچھ فکرمند سا دکھائی دے رہا تھا مگر مجھے ایک ادھیڑ عمر کے بھیس میں دیکھ کر اپنی تفکیر چھپاتے ہوئے فوراً ہنس کر بولا۔ "ابے لے...... جگری! تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے، کیا بھیس بھرا ہے۔"

"کیا بات ہے کالیا؟ تو کچھ فکرمند نظر آ رہا ہے؟" میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"سجن ڈاڈا کا آدمی آیا ہوا ہے اپنے استاد بھابھا کے پاس...... خاصا گرم لگ رہا ہے۔"

"اوہ......" کچھ بھانپتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔

"کیا انہیں ہم پر شبہ ہوا ہے؟"

"شبہ نہیں، یقین کہو۔"

"دلل...... لیکن کیسے؟ ہم نے تو ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تفکر سے کہا تو وہ بولا۔

"گینگ وار سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں کے بڑے زیرک دماغ لوگ ہوتے ہیں یہ ایک دوسرے کا سایہ بھی پہچان لیتے ہیں جو ان کے علاقوں کے قریب سے بھی گزرتا ہے۔"

"اچھا یار! تو ان کی تعریفیں کر کے مجھے ڈرانے کی کوشش مت کر یہ بتا تیرے استاد بھابھا نے سجن ڈاڈا کے آدمی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟"

میں نے بہ ظاہر بیزاری سے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا۔

اگرچہ اندر سے میں خود بھی اس نئی صورتِ حال سے ڈر سا گیا تھا۔ کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ پورے کراچی میں لیاری گینگ وار کی دہشت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ یہ بہت سفاک اور

ظالم لوگ تھے۔ ایک بار اپنے کسی دشمن کو نشانے میں لے لیتے تو مرتے دم تک نہیں چھوڑتے تھے۔

میری بات پر کالیا بولا۔ ''ابھی تو دونوں کے درمیان اس موضوع پر بات چیت ہو رہی ہے مگر سجن ڈاڈا کا آدمی بہت گرم ہے۔ وہ تو اسی وقت پیشی کی ضد کیے بیٹھا ہے۔ اس کے ہمراہ جینگو بھی ہے۔ وہ اپنی صفائی پیش کر رہا ہے۔''

''تو نے اپنے استاد بھابھا کو اس کارروائی کے بارے میں بتا دیا تھا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں جگری وہ تو میں نے کل ہی بتا دیا تھا۔'' کالیا جواباً بولا۔ ''اسی لیے تو وہ دفاعی گفتگو کر رہا ہے۔''

''کیا ہمارا نام بیچ میں آیا ہے؟''

''نہیں۔''

''آخر کس برتے پر انہیں یعنی سجن ڈاڈا کو ہم پر شبہ ہوا ہے؟''

''ان کا آدمی بھی تو مارا گیا تھا ہماری اس کارروائی میں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہیں کس وجہ سے ہم پر شبہ ہوا۔ ان کے جانے کے بعد ہی استاد بتائے گا ہمیں۔'' پھر تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''جگری! ہمیں ابھی شاید نیچے استاد کے پاس جانا پڑ جائے، اس لیے ابھی تم اپنی اصل صورت میں ہی آ جاؤ۔''

میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ بھیس کیا تھا۔ فقط ایک چھدری سی سفید داڑھی تھی اور اسی طرح کی گھنی بھوئیں، جو میں نے اتار لیں۔ چہرے پہ کچھ مصنوعی ''وارٹس'' لگائے تھے، وہ بھی اتار لیے، رنگ چہرے کا تھوڑا سانولا کر رکھا تھا وہ بھی دھو کر صاف کر لیا۔

کالیا کا خیال درست ثابت ہوا۔

تھوڑی دیر گزری تو ایک لڑکے نے اوپر آ کر کالیا اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم دونوں کو استاد بلا رہا ہے نیچے۔''

کالیا نے میری طرف دیکھ کر شانے اچکا دیے۔ اس کے بعد ہم نیچے آ گئے۔

استاد بھابھا کے ساتھ جینگو بھی بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ استاد بھابھا نے ہمیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم خاموشی سے بیٹھ گئے تو استاد بھابھا نے خود سے پہلے کوئی بات کرنے کی بجائے جینگو سے مخاطب ہو کر گمبھیر سی آواز میں کہا۔ ''تم بتاؤ پہلے انہیں کیا معاملہ ہوا ہے۔''

جینگو نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی پھر بتانے لگا۔ ''کل رات والی کارروائی پر سجن ڈاڈا کو ہم پر شبہ ہو چکا ہے۔ آج صبح وہ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ ہمارے اڈے پر آیا تھا۔ صاف اور سیدھے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے علاقے سے جو دو تین افراد باہر سے آئے تھے (یعنی میں، کالیا اور روزی) انہیں ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اس سے کم پر ہرگز کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''تم نے انہیں کیا جواب دیا؟'' میں نے فوراً اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھ لیا۔

''میں تو خود پریشان ہو گیا تھا کہ انہیں آخر کیسے شبہ ہو گیا تھا ہم پر۔'' جینگو جواباً بولا۔

''حالانکہ ہم نے ہر طرح سے رازداری برتی تھی مگر ان لوگوں نے تو یہاں تک یقین سے کہہ دیا تھا کہ دو مرد اور ایک جوان عورت باہر سے علاقے میں داخل ہوئے تھے جبکہ کارروائی کرتے وقت جوان عورت (روزی) کو میرے اڈے پر ہی رکھا گیا اور باقی لوگوں نے ان دونوں نواردوں کے ساتھ مل کر اس کے آدمی مجو کے مکان پر خفیہ دھاوا بول کر وہاں یرغمال بنی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ آخر انہیں کیسے شبہ ہوا ہم پر؟'' کالیا نے اس سے پوچھا۔ استاد بھابھا خاموشی کے ساتھ اپنی مٹھی میں دبی خاص قسم کی بیڑی کے گہرے گہرے سوٹے لگاتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

جواب میں جینگو بولا۔ ''کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے گروپ کے ماہر کھوجی کے ذریعے فوری طور پر ''پیرا'' (قدموں کے نشانات وغیرہ) تلاش کر لیا ہوگا۔''

''ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے اس شبے کی۔'' میرے ذہن میں فوری ابھرنے والے ایک خدشے نے مجھے بولنے پر اکسایا۔ ''جب میں اور کالیا اور روزی نامی وہ لڑکی لیاری میں داخل ہوئے تھے تو دو مسلح افراد نے ہمارا راستہ روکا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں سے بھی سجن ڈاڈا والوں نے انفارمیشن لی ہو۔''

''یہ بھی ممکن ہے۔'' جینگو نے اثبات میں سر ہلایا تو استاد بھابھا نے اپنی مٹھی میں دبی بیڑی کی راکھ کو چٹکی بجا کر جھٹکا اور گمبھیر لہجے میں جینگو سے بولا۔ ''یہ بتاؤ تم نے پھر اس مسئلے کا حل کیا نکالا ہے کہ ان کے ایک آدمی کو لیے یہاں میرے اڈے پر آ گئے۔ یعنی تم نے خود ہی ان کے شبے کی تصدیق کر دی۔''

''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن

اس کی بھی ایک وجہ تھی کہ میں انہیں مطمئن کر سکوں۔'' جینگو نے جواب دیا۔

''مجھے یہ تو اعتراف کرنا ہی پڑا تھا کہ میرے پاس واقعی تین افراد باہر (بیرونی علاقے) سے آئے تھے مگر وہ کوئی کارروائی کرنے نہیں بلکہ ہمارے ہی کہنے پر ایک طوائف کو ساتھ لائے تھے جس کے ساتھ ہم نے رات گزاری اور صبح سویرے انہیں چلتا کر دیا۔''

اس کے اس جھوٹے جواز پر میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ وہ روزی کو طوائف کہہ رہا تھا اگرچہ مجبوراً سہی، تاہم اس نے اپنے تئیں جواز معقول ہی گڑھنے کی کوشش چاہی تھی۔

وہ آگے بتانے لگا۔ ''جہاں تک سجن ڈاڈا کے آدمی کو یہاں لانے کا سوال تھا تو وہ میں نے اپنی بات میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کہا تھا کہ وہ دو آدمی یہاں سے تعلق رکھتے تھے۔ اب انہوں نے کہا ہے کہ ان دونوں آدمیوں کو پیش کرو، ہم ان سے خود ہی پوچھ گچھ کریں گے۔ یہ آخری مطالبہ اس نے کیا اور چلا گیا یہاں سے۔ اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟''

ہم تینوں استاد بھابھا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی مٹھی میں دبی بیڑی کی راکھ جھٹرکتے ہوئے بولا۔ ''ہم دو جعلی آدمی بھیج دیں گے ان کے پاس اور ایک لڑکی کا بھی بندوبست کر دیں گے۔ ہم ان تینوں کو سکھا سمجھا دیں گے کہ انہوں نے وہاں کیا کہنا ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے اب تک کی ہونے والی گفتگو کی صراحت پر تیزی سے غور کرتے ہوئے ذہن سے کہا تو وہ سب قدرے چونک کر میرا چہرہ تکنے لگے۔

''اب اس نازک معاملے میں زیادہ جھوٹ نہیں چل سکتا اور حالات ہم سب کے لیے خراب ہو جائیں گے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں، تم ہی اس مسئلے کا کوئی حل بتا دو۔'' استاد بھابھا نے کہا۔

''اب تک کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ سجن ڈاڈا والوں کا ریکی گروپ بڑی ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسے ڈمی آدمیوں سے نہیں بلکہ اصل آدمیوں کے ذریعے ہی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں کالیا اور وہ لڑکی روزی، ہم تینوں اسی بائیک پر وہاں جائیں گے اور جینگو ہمارے ساتھ ہوگا۔ ہم خود اس کے بیان کی تصدیق کریں گے۔''

''لیکن جگری! استاد کے کہنے کے مطابق اگر یہی کام ڈمی آدمیوں سے کروا لیا جائے تو کیا برائی ہے؟''

''تم نے میری بات پر غور نہیں کیا کالیا!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ استاد بھابھا اور جینگو اپنی پُرغور نظریں بدستور میرے چہرے پہ جمائے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور آگے بولا۔ ''ان کی ریکی بہت ٹھوس اور مضبوط لگتی ہے۔ ابھی اور بھی بہت سی باتوں کا ان لوگوں کو پتا ہوگا جنہیں ان لوگوں نے ابھی اپنے ذہن تک ہی محدود رکھا ہوگا۔ وہ عین وقت پر ہمارا کوئی جھوٹ پکڑنے پر ہی ظاہر کریں گے، جس کا جواب ہم ہی دے سکتے ہیں اور اس کا راستہ بھی اسی وقت باتوں کے دوران ہم ہی تلاش سکتے ہیں کہ ہمیں اپنی گلوخلاصی کے لیے اور کیا بولنا ہے وہاں جبکہ ڈمی آدمی اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے، کیونکہ بہت سی ایسی باتوں کا انہیں علم نہ ہوگا اور یہ مارکھا جائیں گے۔''

''لیکن جگری!'' کالیا نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو اچانک استاد بھابھا بولا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اس پر جینگو نے بھی تائید کی تو بالآخر میری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جینگو مطمئن ہو کر استاد بھابھا کے اڈے سے چلا گیا۔ اس نے اب سجن ڈاڈا سے ہمارے ملنے کا وقت لے کر ہمیں بتانا تھا۔

اس کے بعد میں اور کالیا اوپر آ گئے۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ تاہم ہم دونوں نے بھیس بھرا اور بائیک پر نکل گئے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ سیٹھ ستار کی بلڈر کمپنی ''بلیو مون ہائٹس'' کے نام سے موسوم تھی جو بوٹ بیسن کے ایک بڑے گنجان آباد کمرشل علاقے میں تھی۔ یہاں کئی لگژری اور سپر لگژری اپارٹمنٹ اور ڈپلیکس بنے ہوئے تھے اور کلفٹن کا یہ ایک خاصا متمول علاقہ کہلاتا تھا۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں کم و بیش ایک گھنٹا تو لگ ہی گیا تھا۔ میں نے تو ادھیڑ عمر شخص کا بھیس بھر رکھا تھا جبکہ کالیا نے اپنی ہی طرح کے ایک نوعمر لڑکے کا بہروپ بدلا ہوا تھا۔

اس عالیشان دفتر کے وسیع و عریض احاطے کے گیٹ پر ایک باوردی چوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ بائیک کالیا ہی چلا رہا تھا۔ گارڈ نے ہمیں روک لیا۔ میں نے بڑے بوڑھوں جیسی کھنکھارتی آواز میں اس سے کہا۔ ''میاں! ہمیں ایک بڑے پروجیکٹ کے سلسلے میں یہاں کسی سے ملنا ہے۔ تم ہی ہماری رہنمائی کر دو کہ کس سے ملیں ہم؟'' میری بات پر اس گھاگ سے دکھائی دینے والے گن بردار گارڈ نے کچھ طنزیہ سی نظر ہماری بائیک پر ڈالی اور پھر اسی لہجے میں

بولا۔ ''بڑا پروجیکٹ اور اس سواری میں!''

''میاں! عجیب نامعقول آدمی ہو تم۔'' میں نے خرانٹ بوڑھوں کی طرح اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے صاحب یہاں آکر بات کر چکے ہیں، اس وقت میں بھی ساتھ تھا، ان کے ہم تو بس ان کے ملازم ہیں اور عمومی نوعیت کی باتیں کرنے آئے ہیں، جو آخری مراحل میں ہیں۔ وہ کون صاحب ہیں جو اندر دائیں جانب ایک کائنٹر ٹیبل پر بیٹھتے ہیں، بڑے سر اور بڑے بالوں والے لگر وبلے پتلے سے۔'' میں نے اسی آدمی کا حلیہ بتا دیا جو احسان جمالی گڈز کے ملازم اور ملوک کے سالے رحیم بخش نے بتایا تھا۔

''اچھا...... اچھا! آپ شاید ثاقب صاحب کی بات کر رہے ہیں۔'' گارڈ یک دم بولا۔ ''جائیے...... جائیے، وہ موجود ہیں اپنی سیٹ پر۔'' کہتے ہوئے اس نے ہمیں راستہ دے دیا۔

میری چال سے نہ صرف مطلوبہ آدمی کا نام معلوم ہو گیا تھا ہمیں بلکہ اس کی اندر موجودگی کی تسلی بھی ہو گئی تھی۔

اندر بائیک سے اترتے وقت کالیا نے میرے کان میں توصیفی سرگوشی کی تھی۔ ''ابے لے...... جگری! تو تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے۔''

ہم دونوں شیشے کے بڑے سے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئے اور میری متلاشی نظروں نے دائیں جانب میز پر اسی ثاقب نامی شخص کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ اکیلا بیٹھا کسی فائل پر جھکا ہوا تھا، پھر یکدم فائل بند کر کے اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تو میں نے فوراً اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر ٹھہر گیا اور چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سموئے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فرمائیے جناب! کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟''

''ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا تھی۔''

''جی جی! تشریف رکھیے۔'' کہتے ہوئے وہ بھی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی اور کالیا میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''جی فرمائیے! کس قسم کے پروجیکٹ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟ رہائشی یا کمرشل۔''

''کمرشل ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ دراصل ہم چند ڈاکٹرز مل کر ایک میڈیکل سینٹر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں کم از کم دو ہزار گز کا پلاٹ درکار ہے۔'' میری بات پر تگڑے کمیشن کے لالچ پر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

وہ اسی طرح باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''بہت عمدہ، پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ پر تشریف لائے ہیں۔''

''جی ہاں! میرے دوست نے ہی آپ کے ہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ آپ سے ایک لگژری اپارٹمنٹ کی خریداری کے سلسلے میں کامیاب ڈیل کر چکا ہے، آپ شاید ڈاکٹر شاہد اقبال کو جانتے ہوں۔'' میں نے بھی دانستہ جھوٹ بولتے ہوئے ایک عام فہم نام لیا تو میرے اندازے کے مطابق وہ بھی اپنی تعریف پر اسی طرح ہی اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل جناب! ہم تو ایسے بہت سے لوگوں کو کامیاب سودا کروا چکے ہیں جنھوں نے ابھی تک ہمیں یاد کر رکھا ہے۔''

''تو کیا آپ ابھی کوئی ہمارا مطلوبہ پلاٹ دکھا سکتے ہیں ہمیں؟'' میں نے فوراً پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اس ایریے میں تو مشکل ہے، تھوڑا ذرا باہر کی طرف ہو تو قباحت نہیں، ویسے آپ کی رینج کتنی ہے؟''

''آٹھ سے نو کھوکھے...... ایک دو کھوکھا بڑھ بھی سکتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھوں کی چمک مزید گہری ہو گئی۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ''کھوکھے'' کا مطلب کروڑ ہی تھا۔ ''لیکن ہماری فرسٹ چوائس یہی علاقہ ہے۔ کیونکہ ایک بڑے پرائیوٹ اسپتال کے لحاظ سے یہی علاقہ قدرے بہتر لگتا ہے۔ ویسے آپ بھی کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔''

میں نے آخر میں گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی۔

وہ مزید خوش ہو گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''ارے جناب! یہی تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اس سے زیادہ اچھی لوکیشن میں پلاٹ دلوا دوں گا۔ آپ بس مجھے ہوم ورک کے لیے صرف ایک دن عنایت کر دیں۔''

''نو پرابلم!'' میں نے کہا۔ ''ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے لیکن ذرا جلدی ہو جائے تو اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ اس پر ہم نے اسپتال بھی تعمیر کروانا ہے اپنی مرضی سے اس کے لیے بھی کسی کنسٹرکشن کمپنی سے رجوع کرنا پڑے گا اور آرکیٹکچر سے رابطہ بھی نہیں ہو سکا ہے ابھی تک ہمارا۔''

وہ جھٹ بولا۔ ''ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروفیشنل آرکیٹکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

”لو بھئی! اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، پھر تو آپ نے اِدھر بیٹھے بیٹھائے ہمارے سارے مسائل حل کر ڈالے اور کیا چاہیے ہمیں بھلا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر میری طرف بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش خلقی سے بولا۔

”اِٹس مائی پلیژر ٹو! ہمیں فخر ہوگا آپ جیسے معزز افراد کے کام آتے ہوئے۔“

”سو نائس آف یو! میں پھر کل آجاؤں گا بلکہ ہوسکتا ہے میرے ساتھی بھی آئیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”شیور! انہیں بھی ضرور لائیں۔ مجھے خوشی ہوگی مگر یہ کیا آپ تشریف تو رکھیں کوئی ٹھنڈا وغیرہ منگواتے آپ کے لیے۔“

”آپ پر ادھار رہی، کل ہی یہ سب ہوجائے گا۔ آپ ذرا اپنا کارڈ عنایت کردیتے تو زیادہ بہتر تھا۔“

”شیور، شیور، وائے ناٹ سر!“ اس نے کہتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے تھما دیا اس کے بعد میں اور کالیا نکل آئے۔ بائیک پر سوار ہونے سے پہلے میں نے دھیان رکھا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ نہ پائے۔ ورنہ اسے شبہ ہوسکتا تھا کہ اتنا بڑا سودا کرنے والا ایک ڈاکٹر بائیک پر یہاں آیا تھا۔ چونکہ وہ پہلے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کر کسی اور طرف جارہا تھا اسی لیے نکلتے وقت میں نے کن انکھیوں سے اسے دوسرے کمرے کی طرف لپکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر جلدی سے بائیک نکال کر میں گیٹ سے باہر آگیا۔ کالیا پیچھے سوار ہوگیا تھا۔

”ابے لے! جگری یہ تو ہاتھ آگیا سمجھو۔“ کالیا نے میرے پیچھے سے کان میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تسلی تھی کہ جس کام سے آیا تھا وہ ہوچکا تھا۔ میری جیب میں اٹکے ہوئے اسپائی قلم نے ثاقب کی مختلف زاویوں سے تصاویر بنا ڈالی تھیں۔

ہم احسان جمالی گڈز پہنچے مگر اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوکر میں نے بائیک روک کر رحیم بخش سے رابطہ کیا اور اس نے تھوڑی دیر میں پہنچنے کا کہا تو میں نے تب تک اپنے اسپائی پین سے ثاقب کی تصاویر نکال کر اپنے اسمارٹ فون میں منتقل کرلیں تاکہ اس کی اسکرین میں رحیم بخش کو تصاویر آسانی سے دکھا سکوں۔

جب تک وہ ہمارے پاس پہنچا میں اپنا یہ کام بھی کرچکا تھا۔

”بالکل یہی شخص ہے صاحب!“ رحیم بخش تصویر کو پہچانتے ہی بولا۔

”اسی آدمی کو ہی میں نے منشی نواز کو رشوت دیتے ہوئے یاسر کو نوکری پر رکھواتے دیکھا تھا۔“

”گڈ!“ میں نے کہا۔ ”اب تم اپنے اس بیان پر قائم رہنا۔“

”میں قائم رہوں گا جی! آخر کو یہ میری بہن کے شوہر کی زندگی کا معاملہ ہے۔“ وہ جوش سے بولا تو میں نے مطمئن ہوکر اس کا کاندھا تھپتھپا دیا۔

اس کے بعد ہم استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے اور اپنا حلیہ درست کر کے اصل حلیے میں آگئے اور پھر وہاں سے سیدھا ملیر کے متعلقہ سیکشن پہنچے جہاں انچارج انسپکٹر کامران تھا۔

اس سے مل کر میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ حیران ہوگیا اور توصیفی لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے واہ نعمان صاحب! آپ نے تو ہمارا کام آسان کردیا۔ اصولاً یہ کام تو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”ایک اچھے شہری کے ناطے ہمیں بھی پولیس سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔ آپ اپنی کارروائی جلد نمٹائیں، گواہ تیار ہے، بلکہ جمالی گڈز کے منشی نواز کو بھی بلا کر چابی گھمائیے گا۔ ایک گواہ اور مل جائے گا آپ کو۔“

”ہمم......“ انسپکٹر کامران نے ہنکاری بھری۔ ”اسے وعدہ معاف گواہ بننے کا لالچ دیا جائے گا، تب مزید ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔“

”لیکن انسپکٹر صاحب! یاد رہے کہ اس شخص ثاقب کی ضمانت بالکل نہیں ہونا چاہیے یہ بہت اہم کیس ہے اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ مس زنیرہ کے ساتھ یہ واقع ہوا ہے۔ ذہن میں رہے، جس کا کیس عدالت میں چل رہا ہے۔“

”بے فکر رہیں آپ! میں ابھی پولیس پارٹی تیار کرتا ہوں، آپ نے اپنا کام کردیا اب ہمارے کرنے کی باری ہے۔“

میں نے ثاقب کا وزیٹنگ کارڈ اور اس کی تصاویر انسپکٹر کامران کو دے دی تھیں۔ جنہیں اس نے وہیں موجود اپنے پرنٹر سے نکلوالی تھیں۔

اس کے بعد میں اور کالیا واپس آگئے۔

”اب کدھر کا ارادہ ہے جگری؟“ کالیا بولا۔

”لیاری جارہے ہیں ہم تجن ڈاڈا سے ملنے۔“

”جگری! تو نے ویسے اچھی طرح سوچ لیا ہے ناں! کیونکہ ہم بھیڑیوں کے بھٹ میں جارہے ہیں۔“ کالیا نے کہا۔

”کالیا! میرے یار! یہ مسئلہ ہمارے گلے آن پڑا ہے، اس کے حل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اسے فیس کریں، اس سے بھاگیں گے تو یہ گلے ہی پڑا رہے گا، پہلے ہی ہم اتنے مسائل کا شکار ہیں۔“

”بات تو تیری بھی صحیح ہی ہے، جگری! پر روزی سے تو بات کرلے ناں، اسے بھی تو ساتھ لے جانا ہوگا۔“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا ہی سچ کھل جائے (یعنی ہم دونوں ہی اصل میں وہاں تھے) تو یہی بہت ہے، ہم سے مطمئن نہیں ہوئے تو پھر روزی کو بھی لے آئیں گے۔“

”چل پھر سو پر رکھ لے کانٹا۔“ کالیا نے کہا اور میں نے بائیک کی رفتار بڑھادی۔

لیاری پہنچ کر ہم نے سیدھا پہلے جینگو کے اڈے کا رخ کیا۔ وہ وہیں موجود تھا۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ تجن ڈاڈا کے پاس جانے سے پہلے ایک بار پھر میں اچھی طرح سوچ لوں، میں نے اسے بھی وہی جواب دیا جو کالیا کو دے چکا تھا۔

جینگو نے اسی وقت تجن ڈاڈا کا نمبر ملایا اور اس سے بات کی۔ اس نے فوراً ہمیں بلوالیا مگر اس شرط کے ساتھ جینگو ہمارے ساتھ نہیں ہوگا نہ ہی اس کا کوئی ساتھی۔ اس پر جینگو کو اعتراض ہوا مگر میں نے کہا کہ میں اور کالیا ہی جائیں گے۔

تجن ڈاڈا نے ہمیں جگہ بتادی اور ہم وہاں پہنچے۔ یہ لیاری کا مشہور چوراہا ”چیل چوک“ تھا، یہاں پہنچے تو دو ٹڑ کے ایک بائیک پر ہمیں لینے آن پہنچے۔ ہم ان کے اشارے پر ان کے پیچھے بائیک لگا کر روانہ ہوگئے۔

مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے، بارہا میرے دل و دماغ میں یہ خیال آتا رہا کہ کہیں میں کوئی بھیانک غلطی تو نہیں کررہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تجن ڈاڈا کو مطمئن نہ کرسکیں اور اس کے اڈے پر ہی بے موت مارے جائیں۔

بلاشبہ یہ میرا بہت خطرناک فیصلہ تھا اور علاقہ بھی اس سے زیادہ خطرناک۔ کون ہمارے جھوٹ کو تسلیم کرتا لیکن مجھے دماغی خرچ پر یقین بھی تھا کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا، کیونکہ میرا اس طرح رضامندی سے ان کے پاس آنا بھی مجھے بے قصور بناتا تھا۔

جلد ہی ہم ایک بڑے سے چوبی گیٹ سے اندر داخل ہوگئے۔ گیٹ فوراً بند کردیا گیا۔

اس کے عقب میں مجھے دو مسلح افراد نظر آئے تھے۔

سامنے بڑا سا نا پختہ احاطہ تھا اور ایک بیٹھک سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے بڑا سا چھپر نما سائبان تھا جس تلے تین چار کرسیاں اور ایک لکڑی کی بینچ دھری ہوئی تھی، بینچ پر دو افراد براجمان تھے اور کرسی پر صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا۔

ہمیں بیٹھنے کا کہا گیا اور ایک ہمارے ساتھ والی کرسی پر جبکہ دوسرا اندر بیٹھک میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لمبا تڑنگا بلوچ ٹائپ شخص کھلے گھیر اور پائنچوں والی شلوار اور اسی طرح کی قمیص میں نمودار ہوا۔ اس کے سر پر شیشوں کے کام والی زرد بلوچی ٹوپی تھی۔

چہرہ لمبوترا اور رنگ گندمی تھا۔ آنکھوں سے کرختگی اور چہرے پر کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والی رعونت اُمڈتی نظر آتی تھی۔ مجھے یہی سجن ڈاڈا لگا تھا۔

’’سلام سائیں!‘‘ میں نے اٹھ کر اسے سلام کیا اور کالیا نے بھی یہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دے گا نہ ہی ہم سے ہاتھ بھی ملائے گا مگر باوجود ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کی کرختگی سوا ہونے کہ اس نے ہم سے ہاتھ بھی ملایا اور سلام کا جواب بھی دیا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر اس نے ہمیں سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی اشارہ کر دیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

چند ثانیے تک یہ گینگ وار لیڈر مجھے اور کالیا کو گھورتا رہا اس کے بعد اس نے اپنے اریب قریب کھڑے ساتھیوں میں سے ایک سے بلوچی میں کچھ کہا۔ وہ سر کو ہلکے سے خم کر کے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس کے بعد سجن ڈاڈا نے اپنے حلق سے ایک طویل ہمکاری خارج کی اور میرے چہرے کی طرف گھور کر بولا۔ ’’جینگو کو کب سے جانتے ہو؟‘‘

’’کل رات سے۔‘‘ میں نے پہلے سے سوچے سمجھے اس کے متوقع سوالات کے جواب میں کہا۔

’’اور تم؟‘‘ اس نے کالیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’جی سائیں! کل رات سے ہی۔‘‘

’’وہ چھوکری کدھر ہے، جو کل رات تمہارے ساتھ تھی؟‘‘ سجن ڈاڈا نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے جواب میں اسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’وہ دھندے پر گئی ہوئی تھی۔‘‘

’’کیا نام تھا اس کا؟‘‘

’’روزی۔‘‘

’’تمہارا کیا نام ہے؟‘‘

’’احمد نعمان۔‘‘ میں نے دانستہ اپنا الٹا نام بتایا۔

’’اور تمہارا؟‘‘

’’شیرازی!‘‘

اسی وقت وہ آدمی دوبارہ نمودار ہوا جسے سجن ڈاڈا نے کہیں بھیجا تھا۔ اب اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ سجن ڈاڈا نے اس بار سندھی میں اس سے جو کہا وہ میں سمجھ گیا۔ اسے ’’پیرا‘‘ لینے کو کہا گیا تھا۔ وہ سندھی بوڑھا ایک دم جھک گیا اور پھر جہاں ہم بیٹھے تھے، وہاں سے زمین کو جھک جھک کر دیکھتا ہوا گیٹ تک گیا اور اسی طرح دوبارہ لوٹا تو اس نے

****

دلی کے ایک ہند و پاک مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل سنا رہے تھے کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ ’’واہ حفیظ پیارے! کیا گلا پایا ہے۔ یار میرا سارا کلام لے لو اور اپنی آواز مجھے دے دو۔‘‘ حفیظ فی الفور شعر ادھورا چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے۔ ’’جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیاز مند ہوں۔ میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجیے۔ لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا کلام نہ دیجیے۔‘‘

****

ہماری اطراف دیکھتے ہوئے، سجن ڈاڈا کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں نے اندر ہی اندر سکون کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ یہاں تک ہم سچے ثابت ہوئے تھے۔ بات گہری تھی مگر نفسیاتی مار کی تھی۔ مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ جو لوگ اتنے زیرک دماغ تھے کہ انہیں ہمارا پتا چل گیا تھا، وہ ڈمی افراد کو فوراً بھانپ لیتے اور ہمارا جھوٹ پکڑا جاتا۔ اسی سبب میرے ذہن طباح میں یہی خیال آیا تھا کہ جھوٹ کو حقیقت کے پردے سے ہی چھپانا ممکن تھا اور وہ میں کر رہا تھا۔

سجن ڈاڈا نے اس بوڑھے سندھی کھوجی کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے مجھ سے بولا۔ ’’دیکھو! ہم دوست اور دشمن کی بو دور ہی سے سونگھ لیا کرتے ہیں۔ تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی جینگو سے، ہم محض ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اپنے تعلقات نہ خراب کرنا چاہتے ہیں نہ ہی دوستی کو دشمنی میں بدلنا ہمارا شیوا رہا ہے۔ اس لیے میں صرف سچ ہی سنوں گا۔ کیا کل رات تم نے ہمارے آدمی مجو کے ایک مکان پر ہلہ بولا تھا اور ایک یرغمالی لڑکی کو چھڑا کر لے گئے تھے؟‘‘

’’یہ غلط ہے۔‘‘ میں نے فوراً کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس گینگ وار لیڈر کی ’’اپروچ‘‘ بس ادھر ہی تک تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں اور جہاں تک تھی وہاں تک میں نے اسے اپنی عقل سلیم اور ذہنی فراست تلے کچل ڈالا تھا لہٰذا پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولنا جاری رکھا۔

’’آپ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو بھی اتنی مردم شناسی تو ہو گی ہی کہ آپ جنگجو اور عام آدمی کی پہچان کر سکیں۔ ہم ’’مال‘‘ سپلائی کرتے ہیں۔ (یہ کہتے ہوئے میں نے اشارتاً اپنی ناک پر دستک دی تھی اور یہاں بھی میری

طبیعت منغض سی ہوئی تھی مگر کیا کرتے مجبوری تھی اور جان پہ بھی بنی ہوئی تھی، سوخود کو عورتوں کا سپلائر رکھنا پڑا تھا) اگر یقین نہیں آتا تو آپ بھی حکم کریں اور میرا فون نمبر نوٹ کر لیں، آپ کے بھی کام آ کر خوشی ہوگی ہمیں لیکن...... دام کھرے ہونے چاہیں۔'' میں نے آخر میں دانستہ حریصانہ لہجے میں کہا تو میرے سامنے بیٹھا سجن ڈاڈا ایک دم گم صم سا ہو کر مجھے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ ہماری طرف بڑھا۔ ہم بدک سے گئے۔

''چلو، اٹھو اپنا راستہ پکڑو...... شکر کرو سائیں نے تمہیں چھوڑ دیا۔''

کالیا اور میں نے سجن ڈاڈا کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہم واپس بائیک پر بیٹھ کر جینگو کے پاس آ گئے۔

وہ اول تو ہمیں اتنی جلدی اور صحیح سلامت دیکھ کر حیرت زدہ ہوا، اس کے بعد خوش ہو کر بولا۔ ''لگتا ہے تم لوگ سجن ڈاڈا کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکے ہو۔''

''ہاں!'' کالیا نے سر جھٹک کر کہا۔ ''یہ اپنے اس جگری! نعمان کا کمال ہے، بڑی زیرک دماغی سے اس نے اس جغادر کو چکما دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے اس نے ہمیں صحیح مشورہ دیا تھا۔'' جینگو میری طرف خفیف سی مسکراہٹ سے تکتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ اس بات پر تو میں نے بھی غور کیا تھا کہ اگر تم دونوں کی بجائے ڈمی آدمی بھیجتے تو معاملہ اور بھی بگڑ جاتا۔''

''ہاں! اس نے تو ہم سے کوئی بات کرنے سے پہلے اپنے اسی کھوجی کو بلوا کر ہمارا پیرا چیک کروایا تھا۔'' میں نے کہا۔

پھر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم دونوں جینگو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''اب کدھر کا ارادہ ہے جگری؟'' کالیا نے مجھ سے پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ بائیک وہی چلا رہا تھا۔ بولا۔ ''لیکن ابھی میں تجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ تیری مرہم پٹی ضروری ہے۔''

وہ مجھے اپنے کسی جاننے والے ڈاکٹر کے کلینک میں لے گیا، جو اسی کے علاقے میں ہی تھا لیکن اس ''ڈاکٹر'' اور اس کی ''کلینک'' کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ''کویکس'' یعنی عطائی ڈاکٹر تھا۔ تاہم بعد میں کالیا نے مجھے بتایا کہ یہ خاصا تجربہ کار تھا اور اس نے میڈیکل ٹیکنیشن کا کورس بھی کر رکھا تھا۔

یوں بھی ہم کسی مستند ڈاکٹر کے پاس ایسا زخم دکھانے سے کترا بھی رہے تھے، کیونکہ وہ اسے دیکھتے ہی بھانپ لیتا کہ یہ زخم گن شاٹ وونڈ ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے روزی کا نمبر ملایا اور اس سے ملاقات کرنے کا پوچھا تو اس نے اپنا موجودہ پتا بتا دیا جو یونیورسٹی روڈ، موسمیات کے علاقے میں تھا۔

میں اور کالیا اس کی طرف روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر ہم یونیورسٹی روڈ پہنچے اور سیدھا نکلتے چلے گئے۔ اس کے دس پندرہ منٹ بعد ہم موسمیات کے علاقے میں تھے۔ یہاں ایک بلڈنگ تھی، جس میں بہت سے فلیٹ تھے۔ یہ خاصی پرانی مگر مضبوط کنسٹرکشن تھی۔ ایسے ہی ایک ڈی سینٹ اپارٹمنٹس والے پروجیکٹ کے سامنے ہم رکے اور گیٹ سے اندر داخل ہونے لگے تو وہاں موجود چوکیدار نے ہم سے پوچھا کس سے ملنا ہے؟ روزی نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ہم نے کیا کہنا ہے۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''کریمی بھائی کے فلیٹ میں جانا ہے۔'' اس نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔

کالیا نے بائیک اندر گھما لی۔ اندر وسیع کار پارکنگ تھی۔ ایک طرف بائیک کھڑی کرنے کی بھی خاصی کشادہ جگہ تھی۔ لائن سے بائیکس کھڑی تھیں۔ کالیا نے بھی اپنی بائیک اس میں گھسا کر کھڑی کر دی۔ اس کے بعد جب وہ اسے سائیڈ اسٹینڈ کر رہا تھا تو میری عقب میں گیٹ پر نظر پڑی تو ایک سفید رنگ کی کلٹس کار کو چوکیدار نے روکے رکھا تھا۔ اس کے ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر میں ایک شخص براجمان تھا۔ ڈرائیور تو چوکیدار سے باتیں کرنے میں مصروف تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو میں نے اپنی طرف گھورتے پایا۔ اس کی صورت خاصی کریہہ تھی۔ ناک موٹی اور چہرہ بھاری تھا۔ اس کی جسمانی ساخت کا بھی میں نے کچھ اسی طرح کا ہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور کو چوکیدار نے اندر نہیں آنے دیا تھا اور وہ کار کو واپس موڑ رہا تھا۔

''آگے چل جگری! کیا دیکھ رہا ہے؟'' اتنے میں کالیا نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ میں اسی طرف ہی متوجہ تھا۔ کلٹس اب گیٹ کے باہر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی مگر اس کے اندر سے وہ دونوں برآمد ہو رہے تھے۔

چوکیدار نے انہیں کار سمیت اندر آنے کی اجازت نہیں دی، البتہ وہ دونوں اندر آ چکے تھے۔ تب تک میں اور کالیا۔ بلڈنگ اے، ٹو کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں فرسٹ فلور پر مطلوبہ

فلیٹ تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کے احساس تلے بے چین سا کر دیا تھا۔

''کیا بات ہے جگری! تو کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا ہے۔''

''خطرہ۔'' میں نے ہولے سے مگر سرسراتے لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اسی لہجے میں بولا۔

''خطرہ......! کیسا خطرہ؟''

''چلتے رہو مگر اپنے مطلوبہ فلیٹ کے سامنے ابھی مت رکنا اور اوپر نکلتے جانا۔''

ہم دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اپنے مطلوبہ فلیٹ کے فلور پر میں تھوڑا رکا اور عقب میں نیچے جانے والے زینے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں افراد بھی اوپر آ رہے تھے۔ میں فرسٹ فلور چھوڑ کر سیکنڈ پر آ گیا اور دانستہ کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت وہ دونوں مشکوک افراد نمودار ہوئے۔ وہ دونوں اسی فلور پر آ کر رکے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دونوں ہمیں گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے اوپر نکل گئے۔ میں نے اپنی سانسیں جیسے سینے میں روک لی تھیں۔

''کوئی ملاقاتی ہوں گے۔ چل نیچے۔'' کالیا نے کہا۔

میں نے ایک نگاہ اوپر جاتے زینے پر ڈالی تو انہیں بدستور اوپر جاتے دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر پلٹا۔ اب ہم دوبارہ نیچے زینے اترتے ہوئے فرسٹ فلور والے اپنے مطلوبہ فلیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون ہے؟'' ذرا ہی دیر بعد اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

اس شناسا آواز کو میں ہی نہیں بلکہ کالیا بھی پہچان گیا۔

''دروازہ کھولیں مس روزی! ہم آ گئے ہیں۔ نعمان اور کالیا۔''

یہ سنتے ہی روزی نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ روزی نے فوراً ہمارے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ مجھے وہ کچھ ہراساں سی دکھائی دی تھی، ڈری ہوئی تو وہ پہلے ہی سے تھی۔ اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم تھی۔ وہ سیٹھ ستار سے ہی خوف زدہ تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے سے خوف اس طرح جھلک رہا تھا جیسے ابھی اس کی قضاء آنے والی ہو۔

شعراء

ہندوستان کے مشہور شاعر روش صدیقی پست قامت انسان ہیں۔ ایک روز مجاز سے کسی بات میں الجھ پڑے۔ زعم میں آ کر بولے۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ہندوستان کا شاعر اعظم ہوں۔'' مجاز نے برجستہ جواب دیا۔ ''جی! مگر پہلے آپ قد آدم تو ہو جائیے۔''

***

ایک بوڑھے، سفید ریش شاعر، جرأت و داغ کے رنگ میں بڑے شوخ قسم کے اشعار کہتے تھے۔ کسی کالج کے مشاعرے میں غزل سنانے کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے۔ جونہی مطلع کا پہلا مصرع پڑھا:

''نکلنے کو تر حسرت وصل کی اے نازنین نکلی!''

طلبہ نے یک زبان ہو کر دہرایا ''نازنین نکلی!'' انہوں نے مصرع ثانی پڑھا:

''مگر جیسی نکلنی چاہیے ویسی نہیں نکلی!''

کالج کے ایک ذہین اور زندہ دل طالب علم نے برجستہ کہا: ''لیکن قبلہ! اس میں نازنین کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

***

کسی مشاعرے کی ایک مخصوص نشست میں کوئی صاحب ذوق شعرا کے ہر اچھے شعر پر برمحل اور برجستہ داد دے رہے تھے۔ ان کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جو اپنی سخن شناسی کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ صاحب ذوق کسی شعر پر یوں داد دیتے۔

''واہ وا! شعر میں لفظوں کا دروبست کیا خوب۔''

تو وہ دہرا دیتا۔ ''سبحان اللہ، کیا لفظوں کا دروبست ہے۔''

جب وہ کہتے۔ ''بہت خوب کیا معنی ہیں آفرینی ہے۔'' وہ کہتے۔ ''تشبیہہ کی جدت قابل داد ہے۔''

یہ کہنے لگتا۔ ''بالکل نئی تشبیہہ ہے۔ لاجواب تشبیہہ ہے۔''

جب شاعر نے غزل کا مقطع پڑھا تو ان صاحب کو شوخی سوجھی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''واہ کیا ایطاء جلی ہے۔'' اب اس کی باری تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاٹ دار آواز میں داد دی۔ ''اے سبحان اللہ! کیا خوب ایطاء جلی ہے۔''

(واضح ہو کہ ایطاء جلی اصطلاح میں قافیے کے ایک نمایاں عیب کو کہتے ہیں)

یہ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل فلیٹ تھا۔ چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ ہم صوفے پر براجمان ہو گئے جو ایک ٹو سیٹر اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا، سامنے ہی چار کرسیوں والا ڈائننگ ٹیبل تھا۔ کچن بھی اسی سے ہی ملحقہ تھا۔

''خیریت تو ہے مس روزی! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان اور گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے کو بہ غور تکتے ہوئے کہا تو وہ ہمارے سامنے والی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

''مجھے سیٹھ ستار کے کسی کتے کا دھمکی آمیز فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں یہ شہر چھوڑ جاؤں۔''

''تو پھر آپ نے کیا سوچا مس روزی؟'' مجھ سے پہلے کالیا نے اس کا عندیہ جاننے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ جواباً اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا۔''

''یہ تم نے ٹھیک کیا۔'' میں نے کہا اور اس کے سراسیمہ سے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''آپ کیا چاہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے اگر آپ سیٹھ ستار سے خوف زدہ ہیں تو ہم آپ کو بحفاظت اور انتہائی رازداری کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھجوانے کا بندوبست کر سکتے ہیں؟'' میری بات پر روزی کو تو نہیں البتہ کالیا کو ضرور حیرت ہوئی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں ترپ کے اس پتے سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے ''چلتا'' کیوں کرنا چاہ رہا تھا مگر میں دراصل یہ بات کہہ کر روزی کی اپنی مرضی جاننا چاہتا تھا۔ وہ اگر جان کے خوف سے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو کم از کم ہم ضرور آگاہ ہو سکیں، کیونکہ ایک تو اگر وہ خود سے یوں فرار ہونے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا، سیٹھ ستار کے گرگے اسے جان سے مار ڈالتے، ہم اگر اسے روانہ کرتے تو اس سے کسی نہ کسی طرح رابطے میں ضرور رہتے اور یوں یہ ترپ کا پتا ہمارے ہی ہاتھ میں رہتا اور اس کی جان بھی محفوظ رہتی۔

''میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی۔'' چند سیکنڈوں بعد اس نے جواب دیا۔ ''میں بس یہ چاہتی ہوں کہ بے موت نہ ماری جاؤں، مروں تو کم از کم سیٹھ ستار کو کوئی بھاری نقصان پہنچا کر ہی مروں۔''

مجھے اس کا جواب بے حد پسند آیا تھا، جو میرے لیے حوصلہ افزاء بھی تھا، لہٰذا میں نے اس سے توصیفی لہجے میں کہا۔ ''تم نے بہت اچھی بات کہی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے تم ایک بہادر، باہمت اور پُرعزم لڑکی ہو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب لکھی ہوگی وہ اس وقت آکر رہے گی۔ چاہے انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں نکل جائے، سیٹھ ستار جیسے جلادوں کی رسی اللہ نے دراز ضرور کی ہوتی ہے مگر وہ جلد اپنے انجام کو پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔ ضرورت بس پامردی کی ہوتی ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے، سیٹھ ستار جیسے ایک بڑے بلڈر مافیا اور مجرم ذہنیت رکھنے والے کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ لیکن مجھے اپنے خدا پر یقین ہے کہ وہ نیک راہ پر چلنے والوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔ بس! یہی میرا ایمان ہے اور میں نے سیٹھ ستار جیسے مگرمچھ سے بیر لے رکھا ہے۔ تم فکر نہ کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

تھوڑے توقف کے بعد میں نے اس سے دوبارہ کہا۔ ''تم یقیناً اس آدمی کے کئی اہم رازوں سے واقف ہو۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے جس میں کاتبِ تقدیر کا دخل تھا کہ ہماری اس رات اچانک یوں ملاقات ہوگئی، اس طرح تمہیں ہماری صورت میں اور ہمیں تمہاری صورت میں ایسا راستہ سجھائی دیا کہ ہم مل کر سیٹھ ستار جیسے سماجی ناسوروں کا خاتمہ کر سکیں۔''

میں نے دیکھا میری باتوں سے روزی کا تھوڑی دیر پہلے ہراساں سے ستا ہوا چہرہ کچھ طمانیت اور ایک عزمِ صمیم کی جھلک پیش کرنے لگا تھا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی نعمان صاحب کہ مجھے آپ جیسے باہمت انسان کا سہارا ملے تو میں سیٹھ ستار جیسے مگرمچھ کی قبر کھود سکوں جس نے میری باجی کی زندگی برباد کی اور بھی نجانے کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی اس شیطان نے تباہ کی ہوں گی۔''

وہ ذرا ٹھہری پھر آگے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

ہم سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں نے مستفسرانہ نظروں سے روزی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

''یہ میری ایک سہیلی کا فلیٹ ہے۔ شاید وہی آئی ہو، آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر دروازہ کھولنے کے لیے بڑھی۔ نجانے کیوں میرا دل بے چینی سی محسوس کرنے لگا، جیسے کچھ ہونے والا ہو...... پھر چپکا مجھ سے بھی بیٹھا نہ گیا، میں بھی کسی احتیاط کے پیشِ نظر اس کے پیچھے دروازے کی طرف لپکا تو کالیا نے بھی میرے محتاط انداز کو بھانپتے ہوئے اپنا پستول نکال لیا۔

(جاری ہے)

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ارتضیٰ ملک......لاہور

مشاہدوں کے قلم سے لکھا گیا ہے مجھے
میں ایسا لفظ ہوں جس کو کوئی مٹا نہ سکے

منشی عزیز منے........لندن

میں اسے مانگ تو لوں رب سے جاکر
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

مرزا جہان بیگ.........حیدر آباد

رونقِ شہر کی خاطر یوں جنوں زار نہ بن
میں اس شہر کے پہلو میں ہوا گرد و غبار

عندلیب مظہر..........ملتان

رسم دنیا ہے کسی طرح نبھاتے رہیے
دل نہ ملتا ہے مگر ہاتھ ملاتے رہیے

(نائیلہ منصور کوئٹہ کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..........فورٹ عباس

یہ عذرِ امتحانِ جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

(نزاہت افشاں فتح جنگ کا جواب)

اختر شاہ عارف.........جہلم

میں اب جیت بھی جاؤں تو دل خوش نہیں ہوتا
جس شخص کو ہارا ہے وہ انمول بہت تھا

سدرہ بانو ناگوری..........کراچی

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوار کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائیں جنہیں زندگی ہے پیاری

(نجمہ توفیق کراچی کا جواب)

نزاہت افشاں..........فتح جنگ

ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے
ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

سعید احمد چاند.........کراچی

قفس قفس میں رونق یہ چمن ہے اجڑا اجڑا
غمِ دوست یہ بتا دے کہاں تو نے ہم کو چھوڑا

(ماہ نور تبسم ملتان کا جواب)

رفیق احمد ناز..........ڈی جی خاں

ایسا بکھرا ہوں کہ اب سمٹ سکتا نہیں
کرچیاں وجود سے لپٹ کر رہ گئیں

(ماہین فاطمہ شاہین لیہ کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری.........لاہور

اک حسنِ زندگی ہی تو شہکار ہے
قدرت کی مصوری میں عجب طلاطم کے ساتھ

شہناز فرحت.........لاہور

آپ کے اس التفات برملا کا شکریہ
یہ گزارش ہے مگر دیکھیں نہ یوں دل کی طرف

نیاز احمد..........کراچی

آمدِ فصل بہاراں کا نظارہ توبہ
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریبان کوئی

(زاہد رفیق لاڑکانہ کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری.........سرگودھا

وہ کون ہے جو تمہارا نہیں تمنائی
ہر ایک دل میں چھپا داغ آرزو دیکھا

(ملک فیصل لاہور کا جواب)

شبیر شاہ...........کشمور

یہ تیری جدائی کی یادگار ہے ورنہ
اک زخم کو بھرنے میں کتنی دیر لگتی ہے

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

فیروز احمد..........ڈی آئی خان

یہ ندی پار کرو گے تو نظر آئے گا
اک چتا اور سلگتی ہے مرے تن کی طرح

شگفتہ یاسمین..........کراچی
یقین نہ آئے تو اک بات پوچھ کر دیکھو
جو ہنس رہا ہے وہ زخموں سے چور نکلے گا
بے بی شگفتہ..........جہلم
یاد ماضی کے وہ افسانے بھلا ڈالوں گی
تیری تصویر ترے خط کو جلا ڈالوں گی
الیاس حسن..........روہڑی
یہ آن بان لے پڑی سرمایۂ حیات
انسان کھو گیا اسی ردوبدل کے بیچ
عبدالسلام..........جدہ سعودی عرب
یوں تو دنیا ہی ایک جنت ہے
دوست یہ مے کدہ غنیمت ہے
(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)
اشفاق احمد..........کراچی
نظر آتی ہے جس میں زندگی کی موہنی صورت
کسی قیمت پر ہم اے دوست وہ درپن نہ بیچیں گے
(ناصر احمد دینہ کا جواب)
نیلوفر شاہین..........اسلام آباد
مل جائے تجھے کوئی جب وفا شعار
لے سر اٹھا رہے ہیں تیرے آستاں سے ہم
(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)
ناہید فروغ..........کراچی
اِدھر تو تیر ستم دل پہ کھا رہی ہوں میں
اُدھر خبر بھی نہیں کس پہ ہے یہ مشق عتاب
(عبدالستار ساہیوال کا جواب)
نسیم اختر..........حیدر آباد
یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
(مرزا جہان بیگ لطیف آباد کا جواب)
انس فاروقی..........لیہ
یہ اور بات کی دل کی اجاڑ بستی میں
ترا خیال گلِ تر دکھائی دیتا ہے
(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)
احمد علی..........سانگھڑ
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

(وحید جہاں کراچی کا جواب)
رضا احمد اعوان..........دریا خان
ہم نہ ہوں گے تو بھلا کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو
(قمر جہاں کراچی کا جواب)
مریم بنت کاشف..........حیدر آباد
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا
اظہر الدین..........کراچی
اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پہ مسند بچھائے بیٹھے ہو
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)
اکبر حیات..........لاہور
یہ سوچ کر پلکوں میں چھپا لیتا ہوں آنسو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں
(مریم بنت کاشف حیدر آباد کا جواب)
احمد علی..........پشاور
یہ ریت سی مرے ہونٹوں پہ جم گئی کیسی
مجھے گماں تھا کہ دریا ہوں میں تو پیاسی ہے تو
(اختر علی لاہور کا جواب)
ڈاکٹر ادیب عبدالغنی..........ملتان
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
ناعمہ تحریم..........کراچی
کہاں سے سیکھ لی تم نے یہ بے رخی کی ادا
کبھی تو ہم سے ملو تم بھی دوستوں کی طرح

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) 102

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 141

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

24 نومبر 1952ء میں پیدا ہوئی۔ اسلامیہ کیمرج اسکول پھر رائزنگ سن اسکول سے اکتساب کیا اور رضویہ گرلز اسکول سے میٹرک۔ سرسید کالج سے جامعہ کراچی پہنچیں۔ سرکاری ملازمت حاصل کی۔ شعروشاعری میں نام پیدا کیا

علمی آزمائش 139 کا جواب

امتیاز احمد 5 جنوری 1928ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے اندرون بھاٹی گیٹ میں بچپن گزرا۔ عبدالحفیظ کاردار کے پڑوسی تھے۔ مشتاق احمد اور افتخار احمد کے بھائی تھے۔ دنیائے کرکٹ میں بہت نام کمایا۔

انعام یافتگان

1- حسن کاظمی، حیدرآباد　2- ندین محمد، سیالکوٹ　3- ناصر عباس، بہاولنگر
4- ظفر مینگل، اسلام آباد　5- عبدالخالق، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔
کراچی سے ناعمہ تحریم، خادم حسین، نوید سراج، محمد فرحان، شاہد اقبال شاہد، امبر مظاہر، نبیل اختر، عنایت گجر، فرحت عباس نقوی، عنایت مسیح، سبطین سید، الیاس محمد خارج، غلام حسن، طفیل احمد، باسط فاروقی، نذر حسین، انعام گل، صباحت مرزا، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، قیام الدین انصاری، وردہ بتول، اکبر علی ریئسانی، ارشد علی، عنبرین اختر، اسرار احمد، مولی بخش بٹ، تنویر حسین، ہارون محمد، فتح یاب خان اچکزئی، انیس بھٹو، فہیم بٹ، سعیدالدین مروت، صوفی تبسم، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، مہوش علی خان، فرحین بشیر، فیروز رحمانی۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، جمیل احمد، انور یوسف زئی، فرمان حسن، محمد ذیشان، خالد عثمانی، نشاط بانو، ماہ جبین فاطمہ، نعیم اختر، عزیز الحسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، توصیف حسین، طارق ظفر، مسعود اظہر، معین انور، افتخار حسن خان،

کاظم زیدی، حضور خان، عتیق الرحمن خان، برجیس مرزا، ذکی سید، تقی عباس تقی، قادر علی قادری، نوید حسن خان، کاظم جعفری، مہدی علی خان، صابر علی، محمد اسلام الدین انصاری۔ لڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز مئے۔ کشمور گڈو بیراج سے شبیر شان۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، محمد فیض، عتیق احمد، ذیشان مرزا۔ ملتان سے محمد معین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد افتخار، فرحین گل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، رخسانہ یاسمین، خالد حسن توصیفی، نسیم احمد، نصیر احمد، فوزیہ اختر، بیگم الطاف گوہر، ذکیہ احسن کمال، نفیسہ جمال انصاری، گل باز خان، خالد حسن، ارشد آفاق، ممنون الحسن، پیام احسن، مظہر قادری۔ لاہور سے نیاز چوہان، کائنات مرزا، فہد علی خان، عباس رضا سید، اقبال اصغر، عبدالخالق، احمد علی بٹ، توصیف باری، آل پنجتن نقوی، اصغر علی اصغر، نواز کبیر، یاسمین فرحت، مصباح الرضا، کاظم حسین رضوی، نوید احسن، نعیم عباس، علی نواز کارگلی، صابر علی خان، سلمان احمد، تاثیر احسن، سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جنوٹی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہٰ یاسین، دعا زہرا۔ میر پور خاص سے مجاہد علی ایس بنسی۔ کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ مظفر آباد سے کے نٹائے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ رحیم یار خان سے عتیق الرحمن، اسرار احمد، فہیم الدین، بخشش حسین، ثنا مرزا، ملک یاسین، حبیب علی، ذکی حسن، ابرار بھٹ ڈرائیور، ارباز حسن زئی۔ ساہیوال سے صوفی مقبول احمد نقشبندی، صفی مبارک علی نقشبندی، حکیم اللہ، کاظم علی، مختار قاضی، فہیم عباس، نعمت اللہ۔ کوہاٹ سے ابرار اچکزئی، فدا حسین طوری، نصیر عباسی، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے پروفیسر عبدالوحید خان، ثریا فاطمہ، عقیل احمد، معیب بٹ، ناصر حسن، عرفان قاسمی۔ پشاور سے خاقان خان، قیام احمد، مہناز عرفان، ظہیر الدین، نجم شاہ، اصغر شاہ، زاہد حسین طوری بنگش، فدا حسین زیدی، ارباب خان۔ جہلم سے کنیز کبریٰ، فہد علی خان، حکیم صدر الدین، ناصر کوکب خان۔ بہاولپور سے مسرت اسلم ملک، مہوش خان، فطرت عباس، نور علی، اقبال احمد، تقی حسن، جاوید تقی عثمان، اکرام ملک، نواز کھوکھر، امتیاز حسن، محمد فہیم، نوشین ملک، صفی اللہ خان۔ بہاولنگر سے صغریٰ بیگم، انتخاب الحسن، افضال محمد، ذکیہ امتیاز، ملک امتیاز، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، آفتاب احمد، عثمان مضطر، یاور علی سید۔ مظفر گڑھ سے ارباب رضا، نعمان ملک، چودھری فیض اللہ، ساجد علی، عنایت فاطمہ، نیاز حسین، فاروق نیازی، ارباز خانزادہ، فصیح الدین، جاوید حسن خان، کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ جامشورو سے راشد مغل، حیدر علی بھٹو، مدحت لاشاری، ایاز سومرو۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندوری، عباس علی، ماہ رخ، امجد بٹ، محمد محی الدین خان، احمد لون، فیصل شیخ۔ سکھر سے شیخ یاسر، نجم الدین ثاقب، بیاس گل، اقبال انصاری۔ جیکب آباد سے امین عباسی، ذوالفقار خان، فہد شیخ، کائنات یاسمین۔ میر پور خاص سے سدرہ ناصر علی، پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکھیو، نصیر بابانی۔ میر پور ماتھیلو سے فہد سومرو، عباس حسن، سلیم شانی۔ میر پور آزاد کشمیر سے جمیل اختر، یوسف خان، اطہر عباس، نینا بٹ۔ خیر پور سے احمد علی زیدی، عباس ماتھی۔ گجرات سے انیس طاہر ناگی۔ شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے ناہید عباسی۔ ڈی آئی خان سے سید نسیم، مغنی ایاز، محمد شاد خان، خالد یوسف۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز، یوسف شاہ، کنول، ظاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفی، ناصر قاضی، التماس عباس، ظاہر شاہ، ضیاء الحسن، علیم الدین۔ شجاع آباد سے غلام جیلانی، وزیر محمد، غلام الثقلین، خالد یاسر۔ چنیوٹ سے سہیل آفندی، خورشید رضوی۔ تلہ گنگ سے شاہ زیب، وصی الحق۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، ہارون محمد، انیس احمد، فیض محمد، نگار سلطانہ، رشید تبسم، شکیب آفاقی، فرخندہ یاسمین، آذر لودھی۔ راجن پور سے علی احمد، ملک محمد ظفر اللہ۔

بیرون پاکستان سے عنبرین عظمت، اشرف زیدی (شارجہ)۔ آصف علی (عمان سعودیہ)۔ نثار حسن، انصار ملک (العین)۔ محمد جنید انصاری ہندی، صادق خان (دبئی)۔ امتیاز علی (فرینکفرٹ)۔ ایاز سومرو (بیڈفورڈ)۔

ٹھکرائی ہوئی لڑکی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
میں نے اپنی حالات زندگی لکھ تو لی ہے اب پتا نہیں یہ سرگزشت کے معیار کی ہے یا نہیں لیکن ایک بات بتا دوں کہ اس سچ بیانی کو ہر ایک پسند کرے گا۔ اس لیے کہ میری حالات زندگی سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس سے بہتوں کو سبق حاصل ہوگا، بلکہ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک کے لیے یہ سبق ہے۔

سیما
(فیصل آباد)

اس روز بابا گھر واپس آئے تو ان کا اترا ہوا چہرہ اور مری ہوئی چال دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ خالی ہاتھ آئے ہیں۔ آج بھی انہیں کام نہیں ملا۔ انہوں نے ایک نظر امی پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر کمرے میں چلے گئے۔ میں اس وقت برآمدہ میں بیٹھی چھوٹے بھائیوں کو پڑھا رہی تھی۔ امی نے پہلے بابا اور پھر مجھے دیکھا اور بولیں۔ "بیٹی چائے کا پانی رکھ دو۔ میں یہ ترپائی مکمل کرلوں پھر روٹی ڈالتی ہوں۔ نہ جانے انہوں نے دن میں کچھ کھایا بھی ہے یا یونہی بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔"

مجھے امی کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ جب کام ہی نہیں ملا تو کھانا کہاں سے کھاتے؟ آج کل دال روٹی بھی ساٹھ ستر سے کم میں نہیں آتی۔ حالانکہ امی کئی بار بابا سے کہہ چکی تھیں کہ وہ صبح کھانا ساتھ لے جایا کریں۔ بازار کا کھانا مہنگا ہوتا ہے اور صحت کے لیے بھی ٹھیک نہیں لیکن بابا ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ان کا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں۔ دن میں کئی بار جگہ بدلنا پڑتی ہے۔ وہ کھانے کی پوٹلی لیے کہاں پھریں گے۔ ویسے بھی عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں ایک وقت کھانا پکتا جس سے دونوں وقت بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ بابا کے لیے کہاں سے بچتا۔ اتنی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں روٹی کے ساتھ انڈوں کا آملیٹ یا سینڈوچ بنا کر دیئے جاتے۔ اس لیے وہ ایک چائے کی پیالی پی کر گھر سے چلے جاتے اور دن بھر بھوکے پیاسے رہ کر شام کو خالی ہاتھ واپس آجاتے۔ اگر کبھی چھوٹا موٹا کام مل جاتا تو ہمارے گھر دو چار دن چولہا جل جاتا ورنہ مہینے کے باقی ایام جس طرح گزرتے تھے۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے بابا کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا۔ وہ ابھی پچاس کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن دیکھنے میں ستر سے زیادہ کے لگتے تھے۔ بیماری اور پریشانیوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ ان کے کندھے ڈھلک گئے تھے اور سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہوچکے تھے۔ وہ کئی کئی دن شیو نہ بناتے جس کی وجہ سے چہرے پر ویرانی برستی رہتی تھی۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے رنگ ساز تھے اور یہ فن انہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کے نام کی بڑی دھوم تھی۔ لوگ دور دور سے رحمت علی کا پتا پوچھتے ہوئے آتے اور انہیں اپنے ساتھ کام کے لیے لے جاتے گو کہ اس وقت بھی ہمارے گھر میں بہت زیادہ خوش حالی نہیں تھی لیکن پھر بھی بابا مہینے میں پندرہ بیس دن مصروف رہتے تھے۔ ان کے کام میں بڑی نفاست تھی۔ ایک بار جو ان سے کام کرواتا وہ دوبارہ بھی انہیں ہی بلایا کرتا تھا بلکہ اپنے جاننے والوں کو بھی ان سے کام کروانے کے لیے کہا کرتا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بابا کا کام رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی بیماری تھی اور دوسرے بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ انہیں سانس کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ ماسک لگا کر کام کیا کریں کیونکہ ڈسٹمپر اور پینٹ کی بُو ان کے لیے نقصان دہ ہے لیکن انہوں نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ماسک لگا کر ان سے کام نہیں ہوتا اور ان کی رفتار سست ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیماری بڑھتی گئی۔ وہ دو دن کام پر جاتے اور چار دن گھر میں پڑے رہتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے باقاعدگی سے علاج بھی نہیں کروایا۔ جب تکلیف زیادہ بڑھتی تو ڈاکٹر

کے پاس چلے جاتے ورنہ گھریلو ٹوٹکوں سے ہی بیماری بھگانے کی کوشش کرتے۔

اس بیماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جگہ دوسرے کاریگروں نے لے لی جو ان کے مقابلے میں کم تجربہ کار تھے لیکن انہیں کام پکڑنے کا ہنر آتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر نے رنگ کی دکان والوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ صبح سیدھے دکان پر آکر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی گاہک رنگ ساز کی تلاش میں دکان پر آتا تو دکان دار انہی میں سے کسی ایک کو آگے کر دیتا۔ اس میں دونوں کا فائدہ ہوتا۔ دکان دار گھٹیا کوالٹی کا رنگ فروخت کر کے اپنا منافع کھرا کر لیتا اور اس میں سے رنگ ساز کو بھی کمیشن دیتا۔ بابا کے بھی کئی دکان داروں سے تعلقات تھے لیکن وہ کبھی اس کھیل کا حصہ نہیں بنے۔ وہ ہمیشہ گاہک کو اس دکان پر لے کر جاتے جہاں اچھی کوالٹی کا مال ملتا پھر وہ دکاندار سے بھاؤ تاؤ کر کے قیمت بھی کم کرواتے۔ اس طرح اس کا منافع کم ہو جاتا۔ اس میں سے بابا کو کمیشن ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اس کے قائل تھے۔ وہ ہمیشہ گاہک کا فائدہ دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکان داروں نے انہیں منہ لگانا چھوڑ دیا۔

کچھ رنگ سازوں نے مکان بنانے والے ٹھیکے داروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کی اپنی ٹیم ہوتی ہے جس میں میسن، پلمبر، الیکٹریشن، ٹائل فکسر اور رنگ ساز وغیرہ شامل ہیں۔ ٹھیکے دار انہی لوگوں سے کام لیتا ہے اور ان سے اپنا کمیشن وصول کر لیتا ہے۔ امی نے بابا کو بھی مشورہ دیا کہ وہ کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کسی کو اپنی حق حلال کی کمائی میں سے حصہ نہیں دے سکتے۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنا معاوضہ بڑھانا پڑے گا جو گاہک کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

بہت سے کاریگر اپنے کام کو وسعت دینے کے لیے دور جدید کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں سے

زیادہ تر کے پاس اپنی موٹر سائیکل اور موبائل فون ہے۔ انہوں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوا رکھے ہیں وہ روزانہ شام کو زیرِتعمیر مکانوں کا چکر لگاتے ہیں اور مالک یا ٹھیکے دار سے مل کر کام پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بابا ان سب تکلفات سے بے نیاز ہیں۔ وہ ابھی تک اسی زعم میں ہیں کہ لوگ رحمت علی کو ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے اور انہیں اپنے ساتھ کام کروانے لے جائیں گے۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی بھی بابا کے کام پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ پہلے لوگ سال دو سال بعد اپنے مکان پر رنگ و روغن کروا لیا کرتے تھے لیکن اب پانچ دس سال تک کوئی نام نہیں لیتا۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں اور لوگوں کی قوت خرید دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ بمشکل تمام گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ رنگ کروانے کی عیاشی کون کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بابا دن بھر مصروف چوراہوں اور فٹ پاتھوں پر بیٹھنے کے بعد شام کو منہ لٹکائے خالی ہاتھ گھر آجاتے۔

اس صورت حال میں بھی امی نے ہمت نہ ہاری اور سلائی کی مشین لے کر بیٹھ گئیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوچکی تھی۔ اس لیے میں نے کچن سنبھال لیا تاکہ امی یکسوئی سے اپنا کام کرسکیں حالانکہ میری بڑی خواہش تھی کہ آگے پڑھوں لیکن گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لہٰذا میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ موقع ملا تو انٹر کا امتحان پرائیویٹ دے دوں گی۔ ابتداء میں تو امی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اور اِکا دُکا عورتیں ہی ان کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آئیں کیونکہ آج کل درزی سے کپڑے سلوانے کا رواج بڑھ گیا ہے اور معمولی گھرانوں کی لڑکیاں بھی ٹیلر کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے تھے اور ان کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ درزی سے کپڑے سلوا سکیں۔ لہٰذا بڑی عمر کی خواتین اور انتہائی غریب لڑکیاں امی کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آنے لگیں۔ اس طرح ہمارے حالات کچھ بہتر ہوگئے۔

میں چائے لے کر کمرے میں گئی تو بابا اوندھے منہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ شاید وہ رو رہے تھے۔ میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔ ''بابا! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے حالات جلد بہتر ہوجائیں گے۔''

''کب آئے گا وہ وقت؟'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولے۔

''بہت جلد۔'' میں نے کہا۔ ''بس آپ حوصلہ کریں۔ اپنے اوپر مایوسی طاری نہ ہونے دیں۔''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو جب میں شام کو گھر خالی ہاتھ لوٹتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کسی بس کے نیچے آجاؤں یا سمندر میں چھلانگ لگادوں۔''

''کیسی باتیں کررہے ہیں؟'' میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔''

''نہیں بیٹی، اس ناکارہ وجود کے ساتھ یہ زندگی ایک بوجھ لگنے لگی ہے۔''

''کس نے کہہ دیا کہ آپ کا وجود ناکارہ ہے۔'' میں نے انہیں چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''آپ آج بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں سے بہتر ہیں۔ زندگی میں اونچ نیچ تو آتی رہتی ہے۔ آج ہمارے حالات خراب ہیں تو کل بہتر بھی ہوسکتے ہیں۔''

''تم جھوٹی تسلی دے رہی ہو۔ مجھے تو بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔''

''اس میں تھوڑا سا قصور آپ کا بھی ہے۔ آپ اپنی صحت پر توجہ نہیں دیتے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنا علاج کروائیں۔ صحت ٹھیک ہوگی تو کام بھی کرسکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ آپ بھی زمانے کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ ناتجربہ کار اور اناڑی کاریگر آپ سے زیادہ کما رہے ہیں۔ فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بیٹھنے کی بجائے کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ اگر وہ کمیشن مانگتا ہے تو دے دیں۔ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ آئے گا۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''شاید یہی کرنا پڑے گا۔''

میں خوش ہوگئی۔ کم از کم میری باتوں سے ان میں اتنی ہمت تو آئی۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھنے کا سوچا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''بابا اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''کہو، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔''

''بات یہ ہے کہ میرے امتحانات ختم ہوگئے ہیں۔

سارا دن فارغ رہتی ہوں۔ بہت بوریت ہوتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کوئی جاب کرلوں۔''

ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جیسے انہیں میری بات سے شدید دکھ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے جیتے جی یہ نہیں ہوسکتا۔ ابھی تمہاری پڑھائی باقی ہے۔ کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کرو۔''

''بابا کیا ملے گا آگے پڑھ کر۔ میں چاہے ڈاکٹر انجینئر بن جاؤں، ماسٹرز کرلوں۔ شادی کے بعد تو چولہا ہی جھونکنا ہے پھر میں اپنا وقت اور آپ کا پیسا کیوں ضائع کروں۔ ویسے بھی ہمارے حالات ایسے نہیں کہ کالج کی پڑھائی کا خرچ برداشت کرسکیں۔''

''یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ تیز لہجے میں بولے۔

میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''بابا آپ جذباتی نہ ہوں۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ میں بچی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں۔ اولاد ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے۔ آپ نے ساری عمر ہمارے لیے کام کیا۔ اب ہماری باری ہے۔ آپ مجھے کام کرنے سے نہ روکیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے میں پڑھائی دوبارہ شروع کردوں گی۔''

وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔ ''لیکن تم نے ابھی صرف میٹرک کیا ہے۔ تمہیں کہاں نوکری ملے گی۔''

''آپ مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے۔ میں دوسرے دن سودا لینے کے بہانے قریبی پی سی او پر گئی اور طاہر کو فون کر کے کہا کہ وہ فوری طور پر مجھ سے ملے۔ وہ میرا چچازاد بھائی تھا اور ٹیکنیکل کالج سے ڈپلوما کرنے کے بعد لانڈھی کی کسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام کررہا تھا۔ چچا کے مالی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے لیکن وہ ہمارے مقابلے میں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی لیکن چچی اپنے آپ کو سیٹھانی سمجھتی تھیں اور طاہر کی ملازمت کے بعد تو ان کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا تھا۔ وہ بے حد فضول خرچ تھیں اور چچا کی آمدنی کے علاوہ طاہر انہیں جو کچھ دیتا اسے بھی وہ بے دردی سے اڑا دیتیں۔ طاہر کے علاوہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ چچا نے بچپن میں ہی مجھے طاہر کے لیے مانگ لیا تھا۔ اس لیے میں بھی اسے اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی اور اپنے ہر کام کے لیے اسی کی طرف دیکھتی۔

وہ شام کو چھٹی کے بعد میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ابھی تم اٹھارہ سال کی نہیں ہوئیں۔ تمہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔''

میں نے جل کر کہا۔ ''اور یہ جو ورکشاپوں اور گیراجوں میں بارہ بارہ سال کے لڑکے کام کرتے ہیں۔ ان پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔''

''بالکل ہوتا ہے لیکن یہ ورکشاپ اور گیراج لیبر ڈیپارٹمنٹ میں رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔''

''تم مجھے کسی غیر رجسٹرڈ ادارے کا پتا بتا دو۔ میں وہاں چلی جاتی ہوں۔''

''بچوں جیسی باتیں مت کرو سیما۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم صرف میٹرک پاس ہو۔ تمہیں کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ اگر پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتیں تو کوئی کورس کرلو۔''

''مثلاً؟''

''آج کل کمپیوٹر کی بہت مانگ ہے اگر تم نے چھ مہینے کا بھی کورس کرلیا تو چانس بن سکتا ہے۔''

''لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یہاں فیسیں بھی علاقوں کے حساب سے مقرر ہیں۔ اگر ڈیفنس میں یہ فیس دس ہزار ہے تو ملیر میں زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہوگی۔ میرے ایک دوست کا انسٹی ٹیوٹ ہے اس سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کچھ رعایت کردے۔''

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اگر اس کے دوست نے رعایت کر بھی دی تو میں وہ فیس کہاں سے دوں گی۔ میرے پاس تو سو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ دوسرے دن میں اس اسکول میں گئی جہاں میں نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ وہاں سب ٹیچرز مجھے جانتی تھیں بلکہ ہیڈ مسٹریس کی تو میں چہیتی تھی۔ میں نے انہیں مختصراً اپنے حالات بتائے اور کہا کہ میں کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔

انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگیں۔ ''تم جیسی ذہین اور باصلاحیت لڑکی کی تعلیم ختم ہونا ایک المیہ ہے۔

دیکھو میں اسکول کے مالک سے بات کر کے تمہارے لیے کوئی جگہ نکالتی ہوں۔ تم دو دن بعد آنا۔"

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھے مددگار ٹیچر کی جاب دے دی۔ تنخواہ تو کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا اور میں کم از کم کمپیوٹر کورس کی فیس با آسانی دے سکتی تھی۔ میرے ذمہ مختلف نوعیت کے کام تھے۔ مثلاً طالب علموں سے فیس وصول کرنا، اہم کاغذات کی فائلیں بنانا اور کسی ٹیچر کی غیر موجودگی میں اس کی کلاس لینا۔ میں صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اسکول میں رہتی اور شام کو کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی۔ اسکول کے دفتر میں بھی کمپیوٹر تھا اور میں فارغ وقت میں اس پر پریکٹس کرتی رہتی۔

پہلی تنخواہ ملنے پر میں بابا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور ان کا مکمل چیک اپ کروایا۔ اس نے باقاعدگی سے دوا استعمال کرنے کی ہدایت کی اور ماسک لگا کر کام کرنے کے لیے کہا۔ میں نے بابا سے ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کا وعدہ لیا۔ میرے نزدیک ان کا صحت مند ہونا زیادہ اہم تھا۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ کام کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔

میرا کمپیوٹر کورس مکمل ہو گیا تو میں نے مختلف کمپنیوں میں ملازمت کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ طاہر کا خیال تھا کہ مجھے ایڈوانسز کورس بھی کر لینا چاہیے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ ہی فرسٹ ایئر کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی۔ میں ہر اتوار کو اخبار میں اشتہار دیکھ کر دو چار جگہ ملازمت کے لیے درخواست بھیجتی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آتا۔ البتہ میڈم میرے کام سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے دفتر کا سارا کام مجھے سونپ دیا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور اب میں نسبتاً پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس روز طاہر آیا تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ اسے دبئی میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ ایک ہفتہ بعد جا رہا ہے۔

یہ سن کر میں صدمے کی کیفیت میں آگئی اور بولی۔ "یہاں بھی تو اچھی خاصی ملازمت تھی۔ پھر دربدر کی ٹھوکریں کھانے کیوں جا رہے ہو؟"

"یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "جو کماتا ہوں۔ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ نہیں ہے۔ ہر مہینے پوری تنخواہ نکال لیتا ہوں اور کچھ نہیں بچتا۔ مجھ پر بہت ذمے داریاں ہیں۔ بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے اور امی ابو کو حج کروانا ہے۔ تم ہی بتاؤ یہاں رہ کر میں یہ سب کر سکتا ہوں؟"

اس کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں اس پلان میں کہیں نہیں تھی۔ جی چاہا کہ پوچھوں میرے بارے میں کیا سوچا ہے لیکن خودداری آڑے آگئی۔ اسے صرف اپنے گھر والوں کی فکر تھی۔ میرا کوئی خیال نہیں تھا۔ لہٰذا منہ پھیر کر بولی۔ "جاؤ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

طاہر کے جانے کے بعد زندگی بے کیف لگنے لگی۔ گو کہ وہ کئی کئی دن بعد آیا کرتا تھا لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آتی تھی۔ میں اسے جتنا بھلانے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ یاد آنے لگتا۔ میں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ صبح اسکول جاتی۔ شام کو انسٹی ٹیوٹ اور رات کو پڑھائی کرتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ میں نے انٹر کامرس کے ساتھ کمپیوٹر کا ایڈوانس کورس کر لیا اور شدت سے بہتر ملازمت تلاش کرنے لگی۔

طاہر اس دوران ایک دفعہ چھٹیوں پر گھر آیا تو اس نے کچھ دیر کے لیے ہمارے یہاں آنے کی زحمت بھی ادا کر لی۔ اس نے رسماً بابا کی خیریت دریافت کی۔ امی سے کچھ باتیں کیں اور پھر میرے پاس چلا آیا۔ وہ خاصا کمزور اور دبلا لگ رہا تھا۔ اس نے کھسیانے انداز میں کہا۔ "کیسی ہو سیما؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ لگتا ہے بہت زیادہ کام کر رہے ہو یا کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتے۔"

"دونوں ہی باتیں ہیں۔" وہ پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔ "زیادہ کھانے کے لیے زیادہ محنت کرنا ہوتی ہے اور وہاں کون ہے جو میرے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ بس جو مل جائے کھا لیتا ہوں۔"

"پھر بھی تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ صحت سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن ہمت نہ پڑ رہی ہو۔

کچھ دنوں بعد اس کی بے چینی کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ وہ ایک مہینا رہ کر دبئی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد چچا اور چچی ہمارے گھر آئے۔ چچی نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور گلے میں لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ ان کی سج دھج دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی ہیں۔ وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی تھیں۔ چچا نے بھی بہت مہنگا کرتہ شلوار کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور بابا ان کے سامنے کم حقیقت لگ رہے تھے۔ مجھے چچی اپنی چھچھوری طبیعت کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں لگیں۔ اس لیے میں چائے دے کر وہاں سے ہٹ گئی البتہ یہ جانتی تھی کہ ان کی آمد بے مقصد نہیں۔ اس لیے دروازہ کی اوٹ سے ان کی باتیں سننے لگیں۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چچی اپنے مطلب کی بات پر آگئیں اور گلا صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''بھائی صاحب! میں تو چاہ رہی تھی کہ اس بار کوئی رسم ادا کر دیتی لیکن آج کل کے لڑکے ہماری کہاں سنتے ہیں۔ اس نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' بابا بولے۔ ''اگلی بار آیا تو دیکھ لیں گے۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''مجھے تو اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' چچی بولیں۔ ''جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ بولا کہ وہ فی الحال اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ ابھی اس پر بہت ذمے داریاں ہیں۔ بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔''

''احمق ہے وہ۔'' چچا غصے سے بولے۔ ''یہ تو دس سال کا پروگرام لگتا ہے۔ کیا اتنا عرصہ سیما اس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہے تو ہمیں یہ رشتہ ختم کر دینا چاہیے۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کیا چاہ رہا ہے۔''

میرے اندر کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی۔ یوں لگا جیسے مجھ پر آسمان آن گرا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ طاہر نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔ یہ سب چچی اپنی طرف سے کہہ رہی تھیں۔ دراصل پیسا آنے کے بعد ان کی نگاہیں بدل گئی تھیں اور وہ ہم لوگوں کو بہت حقیر و کمتر سمجھنے لگی تھیں۔ لالچ نے ان کی آنکھوں پر پٹی ڈال دی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میری اور طاہر کی شادی سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ جس گھر میں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہوں وہاں سے بھاری بھر کم جہیز کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔''

اب امی کے بولنے کی باری تھی۔ انہوں نے چچی کو کڑی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ''کتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا کہ رشتہ ختم کر دو۔ پورے خاندان کو معلوم ہے کہ سیما اور طاہر ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ انہیں کیا وجہ بتائی جائے گی؟''

''کچھ بھی کہہ دینا۔'' چچی بے نیازی سے بولیں۔ ''کئی کئی سال پرانی منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہاں تو صرف بات ہی طے ہوئی تھی۔''

بابا نے پُرامید نظروں سے چچا کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''سیما مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بلاوجہ ہی انتظار کی سولی پر لٹکتی رہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دو۔''

''تمہارے مشورے کا شکریہ۔'' بابا نے تلخی سے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کا برا بھلا خود سمجھ سکتا ہوں۔''

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ پیسے کے سامنے خونی رشتے بھی ہیچ ہیں۔ چچا کے گھر میں چار پیسے کیا آئے کہ انہوں نے سگے بھائی کے ارمانوں کا بھی خون کر دیا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک ہو گیا کہ آج کے دور میں پیسا ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور لوگ پیسے والوں کی چوکھٹ پر ہی سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے طاہر کا نام اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک دیا اور فیصلہ کر لیا کہ پیسے کو ہی اپنی طاقت بناؤں گی تاکہ کل کوئی اور نودولتیا میرے گھر آ کر مجھے یا میرے باپ کو ذلیل نہ کر سکے۔

پیسا کمانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ جائز اور ناجائز۔ میری رگوں میں شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے ناجائز کمائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جائز طریقے سے پیسے حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس تعلیم یا کوئی ہنر ہو۔ بہت سوچنے کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا ہنر ہے جس کے ذریعے میں زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکوں۔ چنانچہ میں نے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں دوسری ملازمت کا خیال دل سے نکال دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اسکول کی جاب پر اکتفا کرتے ہوئے بی کام میں داخلہ لے لیا پھر

میں گھر کے قریب واقع ایک کوچنگ سینٹر میں گئی۔ انہوں نے مجھے نویں اور دسویں جماعت کی کلاسیں دے دیں۔ اس طرح مجھے وہاں سے بھی آمدنی ہونے لگی۔

بابا کے حالات ویسے ہی تھے۔ کبھی کام مل جاتا اور کبھی خالی ہاتھ واپس آجاتے۔ پھر بھی امی کی سلائی اور میری ملازمت سے کچھ سہارا ہو گیا تھا۔ اب میں پوری لگن اور محنت کے ساتھ بی کام کی تیاری کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد مجھے کسی بینک یا پرائیویٹ فرم میں اچھی جاب مل جائے گی۔ پھر اچانک ہی بابا کی روٹھی ہوئی قسمت ان پر مہربان ہو گئی۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق صفورا چورنگی پر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کار ان کے پاس آکر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش آدمی اتر کر ان کے پاس آیا۔ بابا اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

اس آدمی نے کہا۔ ''رنگ کا کام کرتے ہو؟''

''جی جناب۔'' بابا نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

اس آدمی نے انہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اپنے ساتھ گلستان جوہر کے ایک بنگلے پر لے گیا۔ وہ چار سو گز پر دو منزلہ بنا ہوا تھا اور ابھی اس کی فنشنگ باقی تھی۔ اس نے بابا کو وہ بنگلا دکھانے کے بعد کہا۔ ''کب سے یہ کام کر رہے ہو؟''

''صاحب! تیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔ میرے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے۔''

''تعجب ہے۔ اتنے تجربہ کار ہونے کے باوجود تم فٹ پاتھ پر بیٹھے گاہک کا انتظار کر رہے تھے۔ تمہارے پاس تو کام کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔''

''بس جی قسمت کی بات ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''دراصل مجھے وہ ہتھکنڈے نہیں آتے جو کام پکڑنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اور نہ ہی میں دکان داروں اور ٹھیکے دار کو کمیشن دیتا ہوں۔''

''تم مجھے ایمان دار اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہو۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''دراصل میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا ٹھیکے دار اور کاریگر عید کی چھٹیوں میں پنجاب گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے کام رک گیا ہے۔ یہ مکان اپنے ایک دوست کے لیے بنا رہا ہوں اگر وقت پر اسے قبضہ نہ دے سکا تو میری بات خراب ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم رنگ و روغن کا کام شروع کر دو۔''

''جو حکم آپ کا۔'' بابا دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''ویسے تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے کام میں صفائی اور نفاست ہو گی لیکن اپنے اطمینان کے لیے میں پہلے تم سے ایک کمرا کرواؤں گا۔ اگر مالک کو پسند آگیا تو پھر پورے بنگلے کا کام تم ہی کو کرنا ہو گا۔ تم کل صبح سے ہی کام شروع کر دو۔ رنگ کے ڈبے میں نے منگوا لیے ہیں۔ باقی جو سامان چاہیے وہ تم میرے سپروائزر کو بتا دینا وہ بھی آجائے گا۔''

اس وقت غالباً دو بج رہے ہوں گے جب بابا گھر آئے۔ میں اور امی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں کیونکہ وہ شام سے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی لیکن بابا کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے پہلے ایک گلاس پانی مانگا اور پھر پورا قصہ سنا دیا۔ ہاشمی صاحب شہر کے بہت بڑے بلڈر تھے۔ ان کے کئی پروجیکٹ مکمل ہو چکے تھے اور اس وقت بھی ان کا ایک پلازہ زیر تعمیر تھا۔ اگر انہیں کام پسند آجاتا تو بابا کی پریشانی دور ہو جاتی کیونکہ ہاشمی صاحب کا کوئی نہ کوئی پروجیکٹ چلتا رہتا تھا۔

دوسرے دن بابا نے اپنے ایک پرانے شاگرد کو ساتھ لیا اور بنگلے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے سپروائزر کو سامان لکھوایا اور کام شروع کر دیا۔ شام تک کمرا تیار ہو گیا۔ ہاشمی صاحب شام کو مالک کے ساتھ آئے اور دونوں کو کام پسند آگیا۔ ہاشمی صاحب نے بابا سے معاوضہ کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ وہ جو معاوضہ دوسرے کاریگروں کو دیتے ہیں وہی دے دیں۔ انہوں نے جو معاوضہ بتایا۔ وہ بابا کی توقع سے زیادہ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ٹھیکے دار بیچ میں اچھا خاصا کمیشن بنا رہا تھا۔ غرض یہ کہ بابا سے معاملات طے ہو گئے اور بابا نے دوسرے دن سے کام شروع کر دیا۔

ہاشمی صاحب کی خواہش تھی کہ رنگ و روغن کا کام جلد از جلد مکمل ہو جائے تاکہ وہ اپنے دوست کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ اس لیے بابا نے اپنے ساتھ ایک کی بجائے دو شاگرد لگائے تاکہ کام جلدی نمٹ جائے۔ اتفاق سے تیسرے روز ٹھیکے دار اور اس کی پارٹی بھی واپس آگئی لیکن

ہاشمی صاحب نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ ان کے پاس آدمیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی سائٹ پر درجنوں لوگ کام کررہے ہوتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت ان کے پاس کوئی دوسرا رنگ ساز نہیں تھا۔ اس طرح بابا کا کام بن گیا۔

بابا نے اپنا کام وقت پر مکمل کیا تو ہاشمی صاحب بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے معاوضہ کے علاوہ بابا کو ایک موبائل فون بھی تحفے میں دیا تھا اور وعدہ کیا کہ جیسے ہی ان کے زیرِ تعمیر فلیٹوں میں رنگ کا مرحلہ آئے گا وہ انہیں بلالیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس دوران اگر ان کے کسی جاننے والے کو رنگ ساز کی ضرورت پیش آئی تو وہ بابا کا نام ہی تجویز کریں گے۔ اس کام میں انہیں اتنے پیسے مل گئے کہ وہ دو مہینے تک گھر بیٹھ کر کھا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور اگلے کام کی تلاش میں لگ گئے۔ میرے کہنے پر انہوں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوائے اور مارکیٹ میں تمام رنگ کی دکانوں پر دے دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دونوں شاگردوں کی بھی ڈیوٹی لگادی کہ وہ جہاں کہیں کوئی زیرِ تعمیر عمارت دیکھیں، اس کے چوکیدار کو ان کا کارڈ دے دیں۔

ایک ہفتہ بعد ہی ہاشمی صاحب کا فون آگیا۔ اس بار انہیں اپنے ایک دوست کے لیے رنگ ساز کی ضرورت تھی جس کی ایک ہزار گز کی کوٹھی ڈیفنس میں زیرِ تعمیر تھی۔ ہاشمی صاحب نے بابا کے کام کی اتنی تعریف کی کہ وہ دوست انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے پر تیار ہوگیا۔ یہ بھی بہت بڑا کام تھا اور اس میں بابا کو اچھی خاصی آمدنی ہوتی۔ اس کے بعد ہاشمی صاحب نے بابا سے کہا کہ وہ گھر پر آرام کریں کیونکہ چند روز بعد ان کی فلیٹ سائیٹ پر کام شروع ہونے والا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ اس وقت وہ کسی دوسری جگہ پھنسے ہوئے ہوں۔

بابا کی تو لاٹری نکل آئی۔ اس پروجیکٹ میں سو سے زیادہ فلیٹ تھے۔ اگر بابا چار آدمیوں کے ساتھ کام کرتے تب بھی تین چار مہینے لگ جاتے۔ یہ سب اوپر والے کا کرم تھا۔ بابا اب پوری طرح فارم میں آچکے تھے۔ ان کی صحت بھی بحال ہوچکی تھی۔ ہاشمی صاحب کا ساتھ انہیں خوب راس آیا تھا۔ ان کا ایک کام ختم نہ ہوتا کہ دوسرا شروع ہوجاتا۔ درمیان میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے کام بھی نکلتے رہتے تھے۔ اب انہوں نے ایک موٹر سائیکل بھی لے لی تھی اور کاریگر کی بجائے ٹھیکے دار بن گئے تھے۔

میرا بی کام مکمل ہوا تو مجھے ایک بینک میں جاب مل گئی۔ بابا نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ ملازمت کروں۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن میری نظر اپنے مستقبل پر تھی۔ بی کام کی ڈگری میری منزل نہیں تھی چنانچہ میں نے بابا کو مجبور کیا کہ وہ مجھے ملازمت کرنے سے نہ روکیں۔ میری ضد کرنے پر وہ راضی ہوگئے لیکن یہ شرط عائد کردی کہ میں اپنی تنخواہ کا ایک پیسا بھی گھر پر خرچ نہیں کروں گی بلکہ اپنے اخراجات کے بعد جو بچے گا وہ سب میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ میں نے ان کی شرط مان لی اور بینک جانا شروع کردیا۔

کچھ دن بعد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ آگے بڑھنے کے لیے بی کام کی ڈگری کافی نہیں۔ برانچ میں بڑی پوسٹوں پر سب بی بی اے یا ایم بی اے تھے چنانچہ میں نے بھی اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کے بارے میں سوچا اور ایگزیکٹو بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کی کلاس صرف اتوار کو ہوتی تھی۔ باقی پڑھائی میں گھر پر ہی کرتی۔

طاہر کو دبئی گئے چار سال ہوگئے تھے لیکن ابھی تک اس کی کسی بہن کی شادی ہوئی، مکان بنا اور نہ ہی گاڑی آئی۔ سب کچھ ویسے ہی تھا۔ وہ جو کچھ کماتا۔ سب اس کے گھر والے اللوں تللوں میں اڑا دیتے۔ اس کے برعکس ہمارے گھر کے حالات کافی بہتر ہوگئے تھے۔ بابا نے نئے سرے سے گھر کی تزئین و آرائش کروائی۔ نیا فرنیچر، پردے، کراکری، فریج، ٹی وی، واشنگ مشین، اوون غرض ضرورت کی ہر چیز ہمارے گھر میں تھی۔ میں نے ضد کر کے ان کے کمرے میں اے سی بھی لگوا دیا تھا۔ میرے دونوں بھائی کالج میں پہنچ چکے تھے اور میری خواہش تھی کہ وہ بھی ایم بی اے کریں۔

ایک دن غیر متوقع طور پر چچا چچی آگئے۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی اور اس کی شادی کا بلاوا دینے آئے تھے۔ وہ ہماری کایا پلٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عین اسی وقت میں بھی گھر میں داخل ہوئی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں بینک میں ملازمت کررہی ہوں تو ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر اچانک ہی چچی کی محبت جوش میں آگئی۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگالیا اور میرا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔ ''شاباش بیٹی۔ تم نے خاندان کا نام روشن

کر دیا۔ ایک ہماری بیٹیاں ہیں۔ انہیں بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں۔ بھائی کے پیسے پر عیش کر رہی ہیں۔''

امی نے مجھے اشارہ کیا اور میں ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے کچن میں چلی گئی لیکن میرے کان وہیں لگے ہوئے تھے۔ چچی نے رازدارانہ انداز میں امی سے پوچھا۔ ''اس کی کہیں بات چلی؟''

''نہیں ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔'' امی نے جواب دیا۔

''اے ہے اور کتنا پڑھے گی۔ بس ایک ڈگری کافی ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' امی نے تنگ کر کہا۔ ''ابھی تو وہ چوبیس کی ہے۔ اچھا ہے اپنی پڑھائی مکمل کر لے شادی دو چار سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔ تم بتاؤ طاہر کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھی؟''

عین اسی وقت میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے حسرت سے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ''وہ شادی کے لیے تیار تو ہو، اس نے تو ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد شادی کرے گا۔ دیکھو اس مرتبہ آئے گا تو اسے پھر سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

طاہر بہن کی شادی میں آیا تو وہ پہلے سے بھی کمزور اور دبلا لگ رہا تھا۔ گال پچکے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ شادی کے ہنگاموں میں تو اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا لیکن جب وہ جانے سے پہلے بابا سے ملنے آیا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ''تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے طاہر؟''

''تم تو جانتی ہو سیما کہ پیسے درختوں پر نہیں لگے ہوتے کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لو۔ اس کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں لیکن کسی طرح پورا نہیں پڑتا اگر میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح نارمل ڈیوٹی کرتا تو شاید میرا یہ حال نہ ہوتا لیکن مجھے تو اوور ٹائم کے لیے سپروائزر کی خوشامدیں کرنا پڑتی ہیں۔''

''دیکھو طاہر پیسا صحت سے بڑھ کر نہیں ہوتا، تم اتنا ہی کام کرو جتنا کر سکتے ہو۔ تمہارے گھر والوں کو بھی اپنے اخراجات کم کرنا چاہئیں۔''

''یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم تو خوش ہو نا؟''

''ہاں بہت۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جینا سیکھ لیا ہے۔''

ایک دن میں نے اخبار میں ہاشمی صاحب کے نئے پروجیکٹ کا اشتہار دیکھا اور بابا کے سر ہو گئی کہ وہ مجھے ہاشمی صاحب کے پاس لے چلیں۔ میں ایک اپارٹمنٹ بک کروانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں اتنے مہنگے فلیٹ کی قسطیں نہیں دے پاؤں گی لیکن میں نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بابا کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اس بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں بینک سے بھی لون لے سکتی ہوں۔ میرے بے حد اصرار پر وہ مان گئے۔

ہاشمی صاحب کا دفتر ایک شاندار عمارت میں واقع تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں ان کے نئے پروجیکٹ میں اپارٹمنٹ بک کرانا چاہتی ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میرے سامنے تین پلان رکھے کہ ان میں سے جو منتخب کروں گی وہ اسی کا پے منٹ شیڈول بنوا دیں گے۔ میں نے درمیانے سائز کا فلیٹ منتخب کیا۔ اس میں تین بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، امریکن کچن اور دیگر تمام سہولیات تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ویسٹ اوپن اور کارنر فلیٹ کی بھی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ راحت علی کی بیٹی میرے پاس سے خالی ہاتھ واپس جائے۔ میں تمہیں قیمت میں تین لاکھ کی رعایت دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ پیمنٹ شیڈول بھی تم اپنی مرضی سے بناؤ گی۔ تمہیں یہ قیمت تین سال میں ادا کرنی ہے۔ اس کے بعد یہ فلیٹ تمہارا۔ فی الحال تم کچھ پیسے ٹوکن منی کے طور پر جمع کروا دو تاکہ تمہاری فائل بن جائے۔''

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک لاکھ کا چیک کاٹ کر ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے مینیجر کو بلا کر وہ چیک اسے دے دیا اور میری فائل بنانے کی ہدایت کی۔ اس نے چند منٹ بعد فائل میرے حوالے کر دی اور اس طرح وہ فلیٹ میرے نام ہو گیا۔ بابا حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیا بتاتی کہ جس دن مجھے اسکول سے پہلی

تنخواہ ملی۔ تب سے ہی کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہی تھی۔
گھر آ کر بھی بابا بڑبڑاتے رہے۔ انہیں یہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ اگر میں تین سال میں قسطیں ادا نہ کر سکی تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اوّل تو ایسا ہوگا نہیں چھ مہینے بعد میری پروموشن ہونے والی تھی۔ اس کے بعد تنخواہ بھی بڑھ جاتی اور اگر بالفرض محال میں قسطیں ادا نہ کر سکی تب بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہی ہاشمی صاحب مارکیٹ ریٹ پر میرا فلیٹ لے لیں گے اور مجھے کچھ فائدہ ہی ہو جائے گا۔

میرا کوئی خاص خرچ تو تھا نہیں سوائے ٹرانسپورٹ کے، کپڑے بنانے کا بھی شوق نہیں تھا۔ اس لیے تقریباً پوری تنخواہ ہی بچ جاتی۔ البتہ یونیورسٹی کی سمسٹر فیس دینا پڑتی تھی۔ میں نے بی بی اے کیا تو مجھے آفیسر گریڈ تو بنا دیا گیا۔ تنخواہ میں خاصا معقول اضافہ ہوا اور مجھے بینک سے گاڑی بھی مل گئی۔ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اور وہ دونوں برسرِ روزگار تھے۔ اب مجھے گھر کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی اور میری پوری توجہ ایم بی اے پر تھی۔

طاہر کی دوسری بہن کی بھی شادی ہو گئی۔ ایک بار پھر اس سے میرا سامنا ہوا۔ جب میں مہندی کی تقریب میں شرکت کرنے گاڑی چلاتی ہوئی اس کے گھر پہنچی تو سب کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس میٹرک پاس لڑکی کو انہوں نے غریب ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اس مقام تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ چچی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے سر پر بٹھا لیں۔ سب مہمانوں سے فخریہ انداز میں میرا تعارف کرواتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ میری بھتیجی ہے۔ بینک میں افسر لگی ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت ترقی کی ہے اس نے۔“

چچا بھی پھولے پھولے پھر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے مجھے اس مقام تک پہنچانے میں انہی کا ہاتھ ہو۔ مجھے ان لوگوں کی منافقت پر غصے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جب ہم کچھ نہیں تھے تو یہ ہمیں ٹھکرا کر چلے آئے اور اب یہ ہمارے تلوے چاٹنے پر تیار نظر آ رہے تھے۔ یہ پیسے کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ واقعی یہ دنیا چڑھتے سورج کی پجاری ہے۔ رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ ہنسنے والے کا ساتھ سب دیتے ہیں لیکن ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور بھی منزلیں سر کرنا تھیں۔ میں ان لوگوں کو دکھانا چاہ رہی تھی کہ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے۔

طاہر پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ دو بہنوں کی شادی اور اس کے گھر والوں کے شاہانہ اخراجات نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”کامیابی کا سفر مبارک ہو سیما۔ ماشاء اللہ خوب ترقی کی ہے۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ اس کامیابی کا کریڈٹ بھی تمہیں ہی جاتا ہے۔ اگر تم مجھے نہ ٹھکراتے تو میں کبھی آگے بڑھنے کے بارے میں نہ سوچتی لیکن وہ موقع ایسی باتوں کا نہیں تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ”لگتا ہے کہ تم نے میرے مشورے پر دھیان نہ دیا۔ اس لیے پہلے سے زیادہ کمزور نظر آ رہے ہو؟“

”میں کیا کروں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اتنا کام کرنے کے باوجود بھی پورا نہیں پڑتا۔ ابھی بہنوں کی شادی سے فارغ ہوا ہوں تو مزید ڈیمانڈ سامنے آ گئی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم تو جانتی ہو کہ امی میں حرص کا مادہ بہت ہے۔ تمہاری گاڑی دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہ خواہش جاگ گئی ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اپنے ذاتی مکان میں رہنے کی بھی آرزو ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ گاڑی مجھے بینک سے ملی ہے۔“ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”خواہشیں انسان کے دل میں خودرو پودوں کی طرح اگتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر تم انہیں پورا کرتے رہے تو ساری عمر کولہو کے بیل کی طرح چکر کھاتے رہو گے۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”اپنے کان بند اور ہاتھ روک لو۔ صرف اتنے پیسے بھیجو جن سے گھر کا خرچ چلتا رہے۔ میرے خیال میں گاڑی سے پہلے مکان کا بندوبست ہونا چاہیے۔ جب تم اگلی بار آؤ گے تو اس کا حل بھی بتاؤں گی۔“

میں یہ سب باتیں اس کی ہمدردی میں کر رہی تھی۔ بہرحال وہ میرا کزن اور بچپن کا دوست تھا۔ اس نے یا ان کے گھر والوں نے جو کچھ کیا وہ ان کا فعل تھا لیکن میرے دل میں اس کے لیے کوئی بغض نہیں تھا۔ ہر انسان کی اپنی مجبوریاں اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے کوئی

شکایت نہیں تھی بلکہ میں تو ایک طرح سے ان کی احسان مند تھی۔ اس ایک ٹھوکر نے مجھے گر کر سنبھلنے اور آگے بڑھنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔

دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے ایم بی اے کرلیا تو مجھے برانچ مینیجر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی بینک نے مجھے زیرو میٹر ہنڈا سٹی بھی دے دی۔ میں نے پرانی گاڑی بک ویلیو پر بینک سے خرید لی اور ایک ڈرائیور رکھ لیا تاکہ بابا کو کہیں آنے جانے کا مسئلہ نہ ہو۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ اب آرام کریں لیکن بابا اس پر تیار نہ ہوئے انہیں روزانہ گھر سے نکلنے اور کام پر جانے کی عادت تھی۔ البتہ اب وہ صرف رنگ کا ٹھیکا لیتے تھے اور اپنی نگرانی میں کاریگروں سے کام کرواتے۔ ہاشمی صاحب نے انہیں اجازت دے رکھی تھی کہ وہ فارغ وقت میں دوسری کمپنیوں کے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔

میں باقاعدگی سے اپارٹمنٹ کی قسطیں ادا کر رہی تھی اور بالآخر ایک دن مجھے اس کا قبضہ مل گیا۔ وہ ایک یادگار دن تھا۔ مجھے بینک سے ہاؤس فرنشنڈ الاؤنس ملتا تھا۔ اس سے میں نے فلیٹ کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کروائی۔ امریکن کچن ہاشمی صاحب نے بنوا کر دیا تھا۔ میں نے نئے فرنیچر، قیمتی پردوں اور دیگر آرائشی اشیاء سے اسے آراستہ کیا اور گھر والوں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس دن میں بہت خوش تھی میں نے چھبیس سال کی عمر میں وہ سب کچھ حاصل کرلیا جس کی لوگ برسوں تمنا کرتے ہیں۔

چچا اور چچی مبارک باد دینے آئے تو اپارٹمنٹ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چچی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ صرف دس سال کے عرصہ میں کرلیا ہے۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن یہ مالک کا کرم تھا جس نے مجھے اتنی ہمت اور حوصلہ دیا۔ اس وقت مجھے طاہر کا خیال آیا۔ اسے بھی دبئی گئے ہوئے اتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا لیکن وہ زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چچی بار بار پُرامید نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ شاید ان کے دل میں پرانا رشتہ جوڑنے کی خواہش سر اٹھا رہی تھی جسے وہ دس سال پہلے بڑے نخوت سے ٹھکرا چکی تھیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی کوئی بات منہ سے نکالی تو وہ جواب دوں گی کہ ساری عمر یاد رکھیں گی۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی امی اور بابا میری طرف سے غیر مطمئن تھے۔ اب انہیں میری شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ میں ستائیس کی ہونے والی تھی اور امی کا خیال تھا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے، میں خود بھی گھر بسانا چاہ رہی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ خاندان برادری میں کوئی لڑکا میرے ہم پلہ نہ تھا۔ سب ہی کم تعلیم یافتہ، ہنرمند اور چھوٹی موٹی ملازمتیں کر رہے تھے اگر کسی کو میرا خیال آیا بھی ہو تو میری تعلیم اور اسٹیٹس دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہو۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ ایک کلائنٹ مجھ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ بہت ہینڈسم اور ڈیشنگ بندہ تھا اور امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ وہ اکثر اپنے کاموں کے سلسلے میں بینک آتا تو کچھ دیر میرے پاس بھی ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ ایک بڑی آسامی تھا اور برانچ مینیجر کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ اس کی ہر ممکن مدد کروں۔ ایک دو معاملات میں، میں نے اسے فیور بھی دیا جس کے بعد وہ میرے اور قریب آ گیا۔

عورت کو قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مرد کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیتی ہے۔ شارق نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کی نگاہوں کا پیغام پڑھ چکی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اس کی شوخی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ گھنٹوں بیٹھا رہ جاتا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا لیکن اس دن وہ مطلب کی بات پر آ ہی گیا۔ اس دن وہ کسی کام کے سلسلے میں بینک آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ بولا۔

''آپ کی شام میں کیا مصروفیت ہوتی ہے؟''

''کچھ نہیں، یہاں سے سیدھی گھر جاتی ہوں اور فیملی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن آپ میرے ساتھ ڈنر پر چلیں؟''

''سوری، اس کے لیے مجھے اپنے گھر والوں سے اجازت لینا ہوگی۔ ان سے کیا کہوں گی۔''

''کچھ بھی کہہ دیں، کسی سہیلی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے یا بینک والوں نے پارٹی دی ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتی۔ کم از کم گھر والوں سے تو بالکل نہیں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوگیا پھر بولا۔ ''یہ تو ہوسکتا ہے کہ میں اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیجوں۔'' اس نے دھما کا سا کیا۔

میں چونک گئی۔ شرم سے پلکیں جھک گئیں۔ میں نے

سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

''یہی کہ آپ ایک پڑھی لکھی اور ویل اسٹیبلشڈ خاتون ہیں۔''

''لیکن آپ میرے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''وہ بھی بتادیں۔''

''کیا میں امید کروں کہ جو کچھ بتانے جارہی ہوں۔ وہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گا؟''

''بالکل آپ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہیں۔''

''تو سنیے شارق صاحب۔'' میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''میرے والد ایک رنگ ساز ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''رنگ ساز ہی ہیں چور ڈاکو تو نہیں۔ وہ مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کماتے ہیں۔''

''پھر بھی رشتہ طے کرتے وقت یہ سب باتیں دیکھی جاتی ہیں۔''

''اس طرح تو میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے دادا پر دادا کیا کام کرتے تھے۔ میری نظر میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''پھر بھی آپ اپنی والدہ کو یہ بات بتا دیں۔ یہ جاننے کے بعد بھی وہ میرے گھر آنا چاہیں تو موسٹ ویلکم۔''

''اگر انہیں میری خوشی عزیز ہے تو وہ ضرور آئیں گی۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور چلا گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ خود آیا اور نہ ہی اس نے فون کیا۔ آٹھویں دن آیا تو اس کے چہرے پر شرمندگی کی چھاپ واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ آہستہ سے بولا۔ ''مس سیما! آپ کا اندیشہ درست نکلا۔ امی کسی طرح راضی نہیں ہورہی ہیں اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

''نو پرابلم۔'' میں نے متانت سے کہا۔ ''ایک سعادت مند بیٹے کو یہی کرنا چاہیے۔''

''یقین جانیے سیما میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔''

''آپ کو شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم لڑکیوں کو ٹھکرائے جانے کی عادت ہوتی ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے کاروباری تعلقات پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں آئندہ بھی ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

اس واقعے کے بعد میں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوگئی۔ یہ تعلیم اور اسٹیٹس میرے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا۔ خاندان برادری کے لوگ میرے قریب آنے سے ڈرتے تھے اور غیروں کو ایک محنت کش کی بیٹی سے رشتہ جوڑنا گوارہ نہیں تھا۔ میں نہ اُدھر کی رہی نہ اِدھر کی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ جاتی اور سال دو سال بعد اپنے ہم پلہ کسی لڑکے سے بیاہ دی جاتی اور میرے بھی نصف درجن بچے گلیوں میں آوارہ گردی کر رہے ہوتے لیکن یہ خود غرضانہ سوچ تھی۔ اگر میں شادی کر لیتی تو میرے بیمار اور بے روزگار باپ کا سہارا کون بنتا۔ میں نے صرف اپنا مستقبل ہی نہیں سنوارا بلکہ انہیں بھی ایک پُرآسائش زندگی دی۔ شادی کا کیا ہے وہ بھی ہو جائے گی۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی نہ کوئی بندہ تو ہوگا جو مجھے میرے بیک گراؤنڈ کے ساتھ قبول کرسکے۔

اگلی بار طاہر چھٹیوں میں آیا تو اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا ہے اور بے جا فرمائشیں پوری کرنے کی بجائے صرف گھر کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتا ہے۔ اس طرح وہ کچھ رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے بلکہ اب اسے اوورٹائم بھی نہیں کرنا پڑتا۔ وہ میرا اپارٹمنٹ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ ''سیما تم دس سال میں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں اور میں ابھی تک وہیں ہوں۔''

''اس میں کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جس برتن کے پیندے میں سوراخ ہو، وہ کبھی نہیں بھر سکتا۔ میں نے زیرو سے اپنا سفر شروع کیا تھا لیکن پیسے کو دانتوں سے پکڑ کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ تم بھی اگر شروع سے کچھ پس انداز کرتے تو تمہارا بھی ایسا ہی ایک فلیٹ ہوتا۔''

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اب کیا ہوسکتا ہے؟''

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم ایڈوانس دینے کی پوزیشن میں ہو تو میں آج ہی تمہارے لیے فلیٹ بک کروا دیتی ہوں۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''اتنا تو کرسکتا ہوں لیکن اس کی بھنک میرے گھر والوں کو نہ پڑے۔ امی کو گاڑی

خریدنے کی دھن سوار ہے۔''

''تم اپنے کان بند کرلو اور وہی کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔''

میں نے دوسرے دن ہاشمی صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ان کے کسی پروجیکٹ میں فلیٹ بک ہونے کی گنجائش ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ فلیٹ مجھے اپنے چچازاد بھائی کے لیے چاہیے۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن کا وقت دیا اور کہا کہ میں اپنے کزن کو ساتھ لے کر آؤں۔

ہاشمی صاحب کا نیا پروجیکٹ شروع ہو چکا تھا لیکن اس میں چند فلیٹ باقی تھے۔ ہاشمی صاحب سے معاملات طے کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ البتہ ایڈوانس کچھ زیادہ تھا۔ کیونکہ فلیٹوں کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور دوسرے الاٹیز نے کچھ قسطیں ادا بھی کر دی تھیں۔ میں نے طاہر سے کہا کہ وہ پیسوں کی فکر نہ کرے اگر ضرورت پڑی تو میں دے دوں گی۔ وہ بعد میں مجھے اپنی سہولت کے مطابق واپس کردے۔

فلیٹ بک ہو جانے پر وہ بہت خوش تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہوسکتا ہے۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ شیڈول کے مطابق ادائیگی کرتا رہے تاکہ وقت پر قبضہ مل جائے۔

''تم فکر ہی نہ کرو۔'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لیے اوور ٹائم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں چچا اور چچی کو بھی بتا دینا چاہیے۔ وہ خوش ہو جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ تمہیں اس کی قسطیں ادا کرنی ہیں تو پھر وہ کسی اور چیز کی فرمائش نہیں کریں گے۔''

''تم کہتی ہو تو بتا دیتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

طاہر کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب اس نے گھر والوں کو بتایا تو چچی بولیں۔ ''اس وقت ہمیں گاڑی کی زیادہ ضرورت ہے۔ فلیٹ کا کیا ہے وہ تو بعد میں بھی ہو جاتا۔''

''یہ کام زیادہ ضروری تھا۔'' طاہر نے جواب دیا۔ ''پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔ پراپرٹی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں دو چار سال بعد تو یہ ہماری پہنچ سے دور ہو جائیں گی۔''

دبئی واپس جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنے آیا۔ امی اور بابا کہیں گئے ہوئے تھے اور اتفاق سے میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی اور ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اچانک ہی اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سیما! تم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور میں بھی ذمے داریوں کے بوجھ سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔''

میرے ہاتھ میں چائے کا کپ لرز کر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ سکے گا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''کیوں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''بھئی میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا تم نے مجھے کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جب چاہا کھیل لیا جب چاہا پھینک دیا۔''

وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''طاہر شاید تمہیں یاد نہیں رہا لیکن میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب تمہارے جانے کے بعد چچی جان نے یہ کہہ کر رشتہ ختم کر دیا تھا کہ تم شادی کے لیے تیار نہیں ہو کیونکہ تمہیں بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ یہ ایک لمبا پروگرام ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ میری شادی کہیں اور کر دیں۔ میں سمجھ گئی کہ امیر اور غریب کے فرق سے وہ رشتہ ختم کر رہی ہیں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اس فرق کو ختم کر کے ہی دم لوں گی۔ آج میرے پاس تعلیم، دولت اور مرتبہ ہے تو تمہیں بھی شادی کا خیال آگیا۔ بھول گئے کہ میں وہی ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہوں۔''

وہ بوکھلا کر صوفے سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''خدا کی قسم میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ دبئی جاتے وقت ہی امی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ پہلے مجھے اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہیں، اس کے بعد میں اپنی شادی کے بارے میں سوچوں۔ میرا خیال تھا کہ پانچ چھ سال میں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مِریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ان ذمے داریوں سے فارغ ہو جاؤں گا لیکن یہ عرصہ طویل ہوتا گیا۔اس دوران جب بھی میری شادی کا تذکرہ ہوا۔ امی مجھے ذمے داریاں یاد دلاتی رہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ وہ میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا چکی ہیں اور انہوں نے یہ کہہ کر رشتہ ختم کر دیا ہے کہ میں شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ چچی کی چال تھی۔ انہیں اپنے کماؤ بیٹے کے لیے کسی امیر لڑکی کی ضرورت تھی جو ان کا گھر جہیز سے بھر دے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ میری شادی ہو جائے تو وہ ہم لوگوں پر کوئی جھوٹا سچا الزام لگا کر طاہر کی شادی کسی امیر لڑکی سے کر دیں گی۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہوا۔ ذمے داریاں پوری کرنے کے چکر میں بیٹا گھن چکر بن گیا۔ دوسری طرف میں ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے ایسے مقام تک پہنچ گئی کہ چچی کے دل میں ایک بار پھر مجھے بہو بنانے کی خواہش جنم لینے لگی لیکن وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہی تھیں کیونکہ میں ہر لحاظ سے طاہر کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

حقیقت کا علم ہونے کے بعد میرا دل طاہر کی طرف سے صاف ہو گیا۔ وہ بے قصور تھا۔ ساری آگ چچی نے لگائی تھی۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے جو زخم لگایا تھا۔ دس سال گزرنے کے بعد بھی اس کی کسک باقی تھی۔ یہ احساس میرے رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا کہ میں ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بھی وہی سلوک کروں جو وہ میرے ساتھ کر چکی تھیں۔ میں بھی طاہر کو یہ کہہ کر ٹھکرا دوں کہ وہ میرے ہم پلہ نہیں لیکن کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ یہ سوچنے کے لیے مجھے مہلت درکار تھی۔

''میرا خیال ہے کہ حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' طاہر پُرامید لہجے میں بولا۔

''مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''کتنا وقت، میں تو کل چلا جاؤں گا۔''

''میں کل صبح تمہیں فون کر کے بتا دوں گی۔''

''فون پر نہیں میں خود آ جاؤں گا۔''

میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ دوپہر میں بینک آ جائے۔ ہم لنچ ایک ساتھ کریں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ میں نے پوری سنجیدگی سے صورت حال پر غور کیا تو بہت کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ میری عمر ستائیس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک میرا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ امی بابا کب تک میرا ساتھ دیتے۔ ایک نہ ایک دن انہیں بھی اس دنیا سے چلے جانا تھا۔ دونوں بھائی باہر جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس کے بعد میں بالکل تنہا ہو جاتی۔ میرے پاس سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود عورت کو اپنے تحفظ کے لیے مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ ایسے میں مجھے طاہر کا دم غنیمت معلوم ہوا۔ میری نظر میں اس کی پوزیشن صاف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

سارا مسئلہ چچی کا تھا۔ میں انہیں کسی صورت بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اچانک میرے دماغ نے پلٹا کھایا اور میں نے دوسرے انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ دس سال پہلے انہوں نے یہ رشتہ ختم کر کے مجھے پیسے کی اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ پیسے کو اپنی طاقت بناؤں گی۔ اسی جذبے کے تحت میں نے سولہ سال کی عمر میں عملی زندگی کا آغاز کیا اور تین ہزار روپے مہینا پر اسکول میں ملازمت کر لی جہاں میں دیگر متفرق کاموں کے علاوہ ہیڈ مسٹریس اور اسکول کی ٹیچرز کے لیے چائے بھی بنایا کرتی تھی۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں چچی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ٹھکراتیں تو میں بھی غربت کی گود میں پڑی سسک رہی ہوتی۔ اس لحاظ سے وہ میری محسن تھیں۔ بہت بڑی محسن انہی کی وجہ سے میں اس مقام تک پہنچی۔ تھینک یو چچی۔

میرے مذہب نے بھی بھول جانے اور معاف کر دینے کی تعلیم دی ہے۔ لہٰذا میں نے ماضی کو بھلا کر چچی کو صدق دل سے معاف کر دیا۔ دوسرے دن طاہر بینک آیا تو میں اسے لے کر قریبی ریسٹوران میں لنچ کے لیے چلی گئی۔ بیرا کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے پوچھا۔ ''تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''تم پاکستان آجاؤ۔ میں اپنی جاب چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

''تمہیں وہاں اس سے اچھی جاب مل سکتی ہے۔''

''نہیں میں اپنے ماں باپ سے دور نہیں جاسکتی۔ اس عمر میں انہیں میری ضرورت ہے۔''

''ان کی دیکھ بھال کے لیے عدنان اور عثمان بھی تو ہیں۔''

''وہ دونوں باہر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ بس تم واپس آجاؤ۔''

''یہاں آکر کیا کروں گا؟''

''تمہیں کوئی نہ کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔ بے شک پیسے وہاں سے کم ملیں گے لیکن تم بھوکے نہیں مروگے ورنہ کوئی کاروبار کرلینا۔''

''مجھے کم از کم دو سال تو وہاں رہنا ہوگا۔ جب تک فلیٹ کی قسطیں ادا نہیں ہوجاتیں۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ میں دے دوں گی۔''

''نہیں میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''وہ میری ذمے داری ہے۔''

''پھر شادی بھی دو سال بعد ہی ہوگی۔'' میں نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔

''ہمیں جلد شادی کرلینی چاہیے ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہوجائے۔''

''یہ تو وہی بات ہوگئی ہم یہاں تم وہاں۔''

''میں آتا جاتا رہوں گا۔ تم بھی بیچ میں ایک دو چکر لگا لینا۔ دو سال تو یوں پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے دو مہینے بعد ایک دن چچی اور چچا ہمارے گھر آئے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں دوبارہ یہ بات زبان پر لانے میں تھوڑی بہت ہچکچاہٹ محسوس ہوگی لیکن وہ تو بہت ہی ڈھیٹ تھیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر ماتھا چوما اور امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ''اللہ نے میری سن لی۔ طاہر شادی کے لیے تیار ہے۔ بس تم جلدی سے شادی کی تاریخ دے دو۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔''

امی نے حیرت سے بابا کو دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے تو رشتہ ختم کردیا تھا۔ اب کس منہ سے سوال کررہی ہو؟''

چچی سٹپٹا گئیں اور انہوں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''خدا گواہ ہے کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ طاہر شادی کے لیے تیار نہیں ہورہا۔ لڑکی کب تک اس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس کی شادی کہیں اور کردو۔''

سچ تو یہ ہے کہ امی اور بابا دونوں ہی میری وجہ سے پریشان تھے لیکن انہوں نے چچی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بولے۔ ''میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سیما سے پوچھ کر جواب دوں گا۔''

''ہاں ہاں ضرور پوچھو۔'' چچی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''اس کا حق تو مذہب نے بھی دیا ہے۔ وہ پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گی۔''

ان کے جانے کے بعد بابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے اس پر رضا مندی ظاہر کردی، وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ چچی کے گزشتہ رویے کے پیش نظر میں انکار کردوں گی اور خوشی اس بات کی تھی کہ میں اپنے گھر کی ہوجاؤں گی۔ پھر سب کچھ میرے اور طاہر کے پلان کے مطابق ہوا۔ ایک سال بعد وہ چھٹیوں میں پاکستان آیا تو ہماری شادی ہوگئی۔ وہ ایک مہینا میرے پاس رہا پھر میں تین مہینے کی چھٹی لے کر دبئی چلی گئی۔

طاہر کو جیسے ہی فلیٹ کا قبضہ ملا وہ ملازمت چھوڑ کر پاکستان آگیا۔ پہلے تو اس نے جاب کرنے کی کوشش کی لیکن پیسے بہت کم مل رہے تھے چنانچہ اس نے آٹو پارٹس کی دکان کھول لی۔ چند ہی مہینوں میں کاروبار چل نکلا اور وہ دبئی سے زیادہ کمانے لگا۔ دونوں بھائی ملک سے باہر جاچکے ہیں لیکن میں نے امی اور بابا کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ روزانہ شام کو ان سے ملنے جاتی اور چھٹی کا پورا دن ان کے ساتھ گزارتی ہوں۔ میں نے طاہر سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنے والدین کا خیال رکھو اور مجھے اپنے ماں باپ کی خبر گیری کرنے دو۔ طاہر میرے کسی معاملے میں نہیں بولتا بلکہ احسان مند ہے کہ میری وجہ سے اسے دبئی کی مشقت سے نجات مل گئی اور وہ ایک پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔

☆☆☆

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں کبھی بدنام زمانہ چور تھا۔ رہزنی، ڈکیتی وغیرہ میرے آمدنی کے ذرائع تھے لیکن ایک چھوٹے سے بچے نے مجھے اس راستے پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے میرے اندر ایک انقلابی تبدیلی لادی اور آج میں ایک دین دار شخصیت کے طور پر پہچانا جارہا ہوں۔ اس بچے نے کس طرح مجھے ایک شریف آدمی کی طرح زندگی گزارنے پر اکسایا، یہی میں بتانا چاہ رہا ہوں۔ یہ واقعہ میں ایک فرضی نام سے لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے قارئین کو بھی یہ واقعہ پسند آئے گا۔

شرجیل

(پشاور)

نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس مکان میں کارروائی کی جائے۔ لیکن میرے ساتھی بالو نے مجھے مجبور کردیا تھا۔

''ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے پوری معلومات کر لی ہیں۔ بہت مال ہے اس گھر میں۔ اور سوائے ایک بچے کے اور کوئی نہیں رہتا۔''

''کیا مطلب؟ صرف ایک بچہ؟''

''ہاں یار۔ یہی تو مزے کی بات ہے۔'' اس نے

کہا۔ ’’صرف ایک بچہ۔ میں ایک مہینا تک جھک مارتا رہا ہوں تب جا کر پتا چلا ہے۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آیا۔ گھر میں صرف ایک ہی بچہ رہتا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟‘‘

’’یار سمجھا کر۔‘‘ اس نے برا سا منہ بنایا۔ ’’اس کا ایک باپ بھی ہے، وہ صبح آفس جاتا ہے۔ اس دوران بچہ قریب کے اسکول چلا جاتا ہے۔ بہت ہی سمجھدار بچہ ہے۔ دوپہر میں اسکول سے واپس آکر بچہ اس وقت تک اکیلا رہتا ہے جب تک باپ کی واپسی نہ ہو۔‘‘

’’اور اس بچے کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟‘‘ مجھے اس بچے سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔

’’میرا خیال ہے کہ اس کا باپ کھانا فریج میں رکھ کر جاتا ہوگا۔‘‘ بالو نے کہا۔ ’’خود ہی نکال کر کھالیتا ہوگا۔ شام کے وقت دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی معمول ہے۔ بچے کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’اگر ایسا ہے پھر تو اوروں نے بھی ٹرائی کی ہوگی کہ اس گھر میں گھس جائیں۔‘‘

’’یہی تو پرابلم ہے کہ اس گھر میں گھس نہیں سکتے۔‘‘ بالو نے کہا۔ ’’دروازہ اندر سے لاک ہوتا ہے۔ اور لاک سسٹم بھی بہت پیچیدہ ہے۔ آسانی سے کھل نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اندر سے آنے والوں کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔ اسی لیے گھر میں گھسنا مشکل ہے۔ لیکن اتنا بتادوں کہ مال بہت ہے اس گھر میں۔ بس کسی طرح ایک بار اندر داخل ہوجائیں۔ اس کے بعد عیش ہوں گے۔‘‘

’’دیکھ لے یار۔ اپنا تو دل نہیں چاہ رہا کہ کسی بچے کو لوٹا جائے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا پاگل پن ہے۔ ہم بچے کو کہاں لوٹ رہے ہیں، اس کے باپ کو لوٹ رہے ہیں۔‘‘

کچھ دیر بحث کے بعد میں نے بھی ہامی بھرلی۔ ویسے بھی ان دنوں ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا بے کار پھر رہے تھے۔

ہم نے اس کام کی ابتدا دو سال پہلے کی تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ جس پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ اصول یہ تھا کہ سال میں بس ایک دو وارداتوں سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے بعد آرام کیا جائے۔ یا دوسرے کام کیے جائیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہوسکے کہ ہم ایسے کام بھی کرسکتے ہیں۔ بالو اور میں، بس ہمارا یہی گروپ تھا۔ ہم نے بہت کھوج لگایا تھا کہ آخر یہ ڈاکو پکڑے کیوں جاتے ہیں۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اپنا بھید کسی پر ظاہر کردینا، خاص طور پر کسی عورت کو بتادینا یا کسی عورت کو اپنے کام میں شامل کرلینا۔

ہم ان دو اصولوں پر سختی سے عمل کرتے رہے تھے۔ ہاں، ایک اور بات بھی تھی۔ ہمارے پاس اسلحہ تو ہوتا تھا لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ صرف دو بار ہمیں استعمال کرنا پڑا تھا۔ ایک بار بالو کو اور دوسری بار مجھے اور دونوں سے دو جانیں چلی گئی تھیں۔ ہم نے خود کو بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ بہت مجبور ہوکر گولیاں چلانی پڑی تھیں۔ تب جا کر ہم خود کو بچا سکے تھے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک ہم نے پھر کوئی واردات نہیں کی تھی۔ ہر دم پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم صاف بچ نکلے تھے۔ پولیس نامعلوم کو ڈھونڈتی رہ گئی تھی۔

وہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ آس پاس والوں کو ادھر ادھر کی کوئی خبر نہیں تھی۔

ہم نے اس مکان کا جائزہ لیا۔ بالو کی بات درست تھی۔ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ اندر داخل ہونا ہی مشکل تھا۔ دروازہ بہت مظبوطی سے بند تھا۔ دیوار بھی ایسی نہیں تھی کہ کود کر اندر جایا جاسکے۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ کسی طرح اس بچے کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ خود ہی دروازہ کھول دے۔

بالو نے دروازے کی گھنٹی بجادی۔ کچھ دیر بعد اندر سے بچے کی آواز آئی۔ ’’کون؟‘‘

’’بیٹا ہم سروے کرنے آئے ہیں۔‘‘ بالو نے کہا۔ ’’گورنمنٹ کی طرف سے۔ مکان کا جائزہ لینا ہے۔‘‘

’’سوری انکل۔ میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ ڈیڈی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آجائیں تو پھر آئیے گا۔‘‘

اس کے بعد میں نے بھی وہی بات کی۔ لیکن اس بچے نے دروازہ نہیں کھولا۔ اسے بہت اچھی طرح سکھا دیا گیا تھا کہ کسی بھی حال میں دروازہ نہیں کھولے گا۔ یہ ترکیب ناکام ہوتی جارہی تھی۔ پھر بالو ہی کے ذہن میں ایک بات آگئی۔ ہم وہاں سے ہٹ کر ایک طرف آگئے تھے۔

’’یار۔ اس گھر میں کوئی کام والی تو آتی ہوگی۔ کوئی تو

ایسی ہوگی جو آکر گھر کا کام کر جاتی ہو۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ کیا ہم اس کو یرغمال بنا کر دروازہ نہیں کھلوا سکتے ؟" میں نے کہا۔" بچہ اس کی آواز سن کر دروازہ ضرور کھول دیتا ہوگا۔"

آئیڈیا اچھا تھا۔ ہم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہیں۔

ہم بہت دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن کوئی نہیں آئی۔ اور نہ ہی وہ دروازہ کھلا۔ پھر بہت دیر بعد ایک عورت دروازے کی طرف جاتی دکھائی دی۔

وہ کام کرنے والی ہی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ہم دونوں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

بالو نے ٹی ٹی نکال کر اس کی کمر سے لگا دی۔ وہ ان معاملات میں مجھ سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ بے چاری عورت بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

"ک۔ کون ہو تم لوگ؟"

"چل دروازہ کھلوا" میں نے کہا۔"کون ہے اندر آواز دے اس کو۔"

"اندر صاحب ہیں۔ ان کے دو بھائی ہیں اور......"

"بکواس مت کر۔" بالو غرایا۔"ہم جانتے ہیں اندر صرف ایک بچہ ہے۔ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کر ورنہ......"

بالو نے اس کی کمر پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ سہم گئی تھی۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ ہم دونوں دائیں بائیں ہوگئے۔ تاکہ اگر وہ بچہ اندر سے شیشے کے ذریعے دیکھے بھی تو ہم دکھائی نہ دیں۔

وہی ہوا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ ہم اس عورت کے ساتھ ہی اندر چلے گئے۔ وہ بچہ سہم کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔" آپ لوگ کون ہیں انکل؟"

"خبردار۔" بالو غرایا۔"شور مت کر ایک طرف بیٹھ جا۔" پھر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا۔"تو بھی چپ کر کے بیٹھ۔ اور یہ بتا کہ تیرا صاحب اپنا مال کہاں رکھتا ہے۔"

میں اتنی دیر میں گھر کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس گھر کی حالت کوئی خاص نہیں تھی۔ بہت عام سا فرنیچر تھا۔ ایک ٹی وی پڑا ہوا تھا۔ وہ بھی پرانا سا تھا۔ نہ جانے بالو کیا سوچ کر اس گھر میں داخل ہوا تھا اور مجھے بھی لے آیا تھا۔

مگر دنیا کے کئی ممالک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو ایک صدی سے بھی زیادہ زندگی جیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماضی میں تو انسان کی زندگی ایک ہزار برس تک بھی ہوتی تھی، مگر آج کل کے زمانے میں اوسط زندگی کم ہوکر 60 سے 80 سال تک محدود ہوگئی ہے لیکن چند ممالک ایسے بھی ہیں، جہاں لوگوں کی زندگی 115 برس تک بھی جاتی ہے۔ اور ماہرین صحت یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ اگر کسی شخص میں جینیاتی طور پر زیادہ عمر کے جینز موجود ہوں اور وہ شفاف ماحول کے حامل ملک میں رہائش پذیر ہو تو اس کی زندگی 115 برس تک بھی جا سکتی ہے۔ مگر حال ہی میں ماہرین صحت کی جانب کیے جانے والے طبی سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ 'اس بات کی کوئی بھی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہوسکتی ہے؟ پہلے کی جانے والی تحقیق کے مطابق انسان 115 سال تک جی سکتا ہے۔ کینیڈا کی مک گیل یونیورسٹی آف مونٹریال کے ماہرین کی جانب سے 'انٹرنیشنل ڈیٹا بیس آف لانگوٹی' اور دنیا کے ماحولیاتی آلودگی کے ڈیٹا کا جائزہ لیا گیا۔ سائنس جرنل نیچر میں شائع رپورٹ کے مطابق ڈیٹا کے جائزے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کے جدید دور میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ کس شخص کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہوسکتی ہے۔ اس سے پہلے ماہرین صحت نے بہتر شفاف ماحول کی وجہ سے طویل اوسط عمر کا درجہ رکھنے والے ممالک کے شہریوں کے لیے کہا تھا کہ وہ 115 برس کی عمر تک جاسکتے ہیں۔ تاہم مونٹریال کی مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین نے ان دعوؤں کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی زندگی کتنی طویل ہوسکتی ہے۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں بہتر شفاف ماحول رکھنے والے ممالک کے شہریوں کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ زندگی کا تعین بھی نہیں کیا، جس وجہ سے ان کی رپورٹ کو نامکمل قرار دیا جارہا ہے۔ مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین کے مطابق انسان کی طویل زندگی کا 25 فیصد تعلق ان کی جینز سے ہوتا ہے، جو اسے خاندان سے ورثے میں ملتی ہے، جب کہ لمبی عمر کا 75 فیصد تعلق موسمی ماحول، صحت اور دیگر عوامل سے ہوتا ہے۔ ماہرین نے بتایا کہ تاہم اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اچھے موسمی ماحول کے حامل ممالک اور بہتر صحت رکھنے والے افراد کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہوگی؟

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

بالو نے سوال دہرایا۔ اس عورت نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''کچھ نہیں معلوم جی۔ میں تو گھر میں کام کرنے والی ہوں۔ مجھے کون بتاتا ہے۔''

''تیرا صاحب کیا کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں جی۔ کسی دفتر میں کام کرتا ہے۔''

''گھر میں الماریاں تو ہوں گی؟'' بالو نے پوچھا۔

''صرف ایک الماری ہے جی۔ وہ اس کمرے میں ہے۔'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس گھر میں شاید تین ہی کمرے تھے۔ ایک تو وہی ڈرائنگ روم جس میں ہم دونوں گھسے تھے۔ اس کے علاوہ دو کمرے اور تھے۔ اگر کوئی مال ہوگا تو وہ الماری ہی میں ہو سکتا تھا۔

''چلو۔ کمرے میں چلو۔'' بالو نے اشارہ کیا۔

''انکل آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟'' اس بچے نے پوچھا۔

''ہوشیار مت بن۔'' بالو نے گھرکی دی۔

بچے کا چہرہ بن گیا تھا۔ خوف نے اس کے اعصاب باختہ کر دیے تھے۔ اس عورت کا بھی اب یہی حال ہو رہا تھا۔ ہم ان دونوں کو لے کر اس دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں ایک الماری تھی۔ ایک مسہری تھی جس پر بستر پڑا ہوا تھا۔

اس کمرے کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ یہ کہا جا سکے کہ اس گھر میں دولت نام کو کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ خود بالو بھی کچھ مایوس نظر آ رہا تھا۔ شاید الماری میں کچھ ہو۔

''اس الماری میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انکل اس میں میرے کھلونے ہیں۔'' بچے نے کہا ''میں دکھاؤں آپ کو۔ بہت اچھے ہیں۔''

''چپ رہ۔'' بالو نے اس کو جھڑک دیا۔ ''یہ بتا تیرے باپ نے پیسے کہاں رکھے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم انکل'' بچے نے رونا شروع کر دیا تھا۔ بہت کوفت سی ہو رہی تھی۔ ہم کیا سوچ کر اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اور ابھی تک کچھ نہیں ملا تھا۔

بالو نے اتنی دیر میں الماری کی تلاشی لینی شروع کر دی تھی۔ اس نے کپڑے نکال نکال کر ایک طرف پھینکنے شروع کر دیے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی خاص چیز نہیں ملی تھی۔ وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔ گالیاں دیتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کی تلاش کے بعد ایک چھوٹا سا بکس مل گیا۔

''ہاں۔ یہ بات ہوئی نا۔'' بالو خوش ہو گیا تھا۔ ''اس میں کچھ ہو سکتا ہے۔''

''نہیں۔ اس کو مت دیکھیں۔'' بچہ اچانک چیخ اٹھا۔ ''اس میں میری امی ہیں۔''

''ارے واہ۔ اس میں تیری امی کیسے بند ہو گئیں؟'' بالو ہنس پڑا تھا۔

''میں بتاؤں جی۔'' ملازمہ نے کہا۔ ''اس میں مالکن کی تصویریں ہیں۔''

''اور خود مالکن کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کا تو پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا جی۔'' ملازمہ نے بتایا۔

بالو نے بھی یہی اطلاع دی تھی۔ اس دوران بچے نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ ''نہیں۔ نہیں۔ میری امی کو کچھ مت کہو۔''

وہ بکس بھی کھلا ہوا تھا۔ بالو نے تلاشی لینی شروع کر دی۔ اس میں واقعی تصویریں تھیں۔ بالو نے ایک ایک تصویر کو باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک تصویر اٹھا لی۔ عام سی گھریلو تصویریں تھیں۔ اس بچے کی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کے باپ کی تھیں اور ماں کی تھیں۔ جو ایک خوبصورت عورت تھی۔

وہ بچہ سسک رہا تھا۔ اب وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ملازمہ اس کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل پسیجا جا رہا تھا جبکہ بالو سخت جھلایا ہوا تھا۔ ''لعنت ہے اس گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اتنے بڑے بڑے فرنیچر ہیں۔ ان کو تو اٹھانے سے رہے۔''

اسی دوران دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم سب چونکنے ہو گئے تھے۔ ''کون آیا ہوگا؟'' بالو نے ملازمہ سے پوچھا۔

''صاحب آئے ہوں گے۔'' ملازمہ نے بتایا۔ ''آج ان کو جلدی آنا تھا۔ نومی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔''

''نومی کون؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ۔'' ملازمہ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان کا نام نومی ہے۔''

''پاپا آئے ہیں'' بچہ اچانک ایکٹو ہو گیا تھا۔

''گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار کچھ دیر تک بجتی رہی تھی۔

"جاؤ۔ دروازہ کھولو۔" بالو نے ملازمہ سے کہا۔

"میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔ اور کوئی اشارہ وغیرہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ سب کو اڑا دوں گا۔"

"اچھا جی۔" سہمی ہوئی ملازمہ نے گردن ہلا دی۔

دونوں دروازے پر گئے۔ بالو ایک سائیڈ میں ہو گیا تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ گھر کا مالک اندر داخل ہوا۔ "کیا بات ہے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟" اس نے پوچھا۔

"اس کو میں نے کہا تھا۔" بالو اچانک سامنے آگیا تھا۔

"ک۔ کون ہو تم؟" وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

"اوہو۔ ابھی بھی نہیں سمجھے کہ میں کون ہوں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس دوران وہ بچہ دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا تھا۔ "ابو۔ یہ لوگ گھر میں آگئے تھے۔"

"کون ہو تم لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کا بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔

ملازمہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔

"واہ میرے بھولے بابو۔" بالو ہنسا۔ "ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہم کون ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔ لیکن اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ شاید اس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہو گا۔ اس نے اپنے بچے کو سنبھال رکھا تھا۔ اسے دلاسہ دے رہا تھا۔

"چلو جلدی کرو۔" بالو نے کہا۔ "ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ باپ بیٹے کی محبت دیکھتے رہیں۔"

"دیکھو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹے کس طرح زندگی گزار رہے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ تھوڑے بہت پیسے گھر میں رکھے ہیں۔ اگر وہ چاہیے تو لے جاؤ۔ بچے کی فیس کے پیسے ہیں۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت فرنیچر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو یہ بھی لے جاؤ۔"

"زیادہ ہوشیار مت بن۔" بالو جھلا گیا تھا۔ "پیسے چھپا کر رکھے ہوں گے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔"

بالو نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

شاید وہ گولی چلا ہی دیتا۔ لیکن اسی وقت وہ بچہ بول پڑا۔ "میرے بابا کو کچھ مت کہو۔ میں پیسے لا کر دیتا ہوں۔"

بالو کے ہونٹوں پہ ایک بے رحمانہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "یہ بات ہوئی نا۔ جا جلدی سے لے کر آ۔ ورنہ تیرے بابا کو گولی مار دوں گا۔"

اس کا باپ بھی یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟"

"ہیں بابا۔" بچے نے کہا۔ "میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ میرے پاس رک گیا۔ "انکل اگر میں پیسے لا کر دوں تو میرے بابا کو چھوڑ دیں گے نا؟"

اس بچے کا والہانہ پن اور اس کی معصومیت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بڑا سا گلک تھا۔

وہ گلک لے کر میرے پاس آگیا تھا۔ "یہ لیں انکل۔ اس میں بہت سے پیسے ہیں۔ سب میں نے جمع کیے ہیں۔ سب لے لیں۔ لیکن میرے بابا کو کچھ نہ کہیں۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور وہ ملازمہ بھی رو رہی تھی۔ حد یہ کہ بالو نے بھی پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔

"بیٹے یہ بتاؤ۔ تم نے کتنے پیسے جمع کیے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ اس وقت میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پورے تین سو ہیں انکل۔" اس نے بتایا۔ "میں نے پرسوں ہی گنے تھے۔"

"بالو۔ اب کیا خیال ہے تیرا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار۔" بالو نے ایک گہری سانس لی۔ "چل یہاں سے چلتے ہیں۔ اس بچے نے تو رلا دیا ہے۔"

جب ہم وہاں سے جانے لگے تو اس بچے نے ہمارے پاس آکر کہا۔ "ایک بات بتاؤں انکل۔ آپ دونوں فرشتے انکل ہیں۔"

میں نے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ہم وہاں سے نکل آئے۔

اس دن کی واردات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے اب یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ شاید خدا ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔ مجھے اور بالو دونوں کو اچھی جاب مل گئی ہے۔

مکرمی مدیر سرگزشت

سلام مسنون

یہ کہانی میری نہیں، میرے ایک دوست کی ہے جس نے عشق کیا اور عشق نبھایا بھی۔ اُمید ہے پسند بھی آئے گی۔

سید محمود حسین
(کراچی)

ہائی وے پر چلتے چلتے بس بند ہوئی تھی۔ رات کے وقت کسی ویرانے میں بس بند ہو جائے تو خوفزدہ ہونا ضروری ہے۔ تقریباً تمام مسافر سہم گئے تھے کہ کنڈیکٹر نے کہا۔ ''آپ لوگ فکرمند نہ ہوں۔ وہ سامنے جو روشنی دیکھ رہے ہیں وہاں سیلانی کا ہوٹل ہے۔ سیلانی سائیں بہت اچھا بندہ ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

ہم سب اس ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ ہوٹل ابھی دور تھا کہ مرزا غالب کی غزل سنائی دی۔ کوئی بڑی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔ میں نے قدم تیز کر دیے کیونکہ مجھے یونیورسٹی کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ یونیورسٹی کا زمانہ اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس دوران اچھے اچھے دوست ملے، جن کے ساتھ گزارے گئے حسین لمحات آج تک روح کو تازگی بخشتے ہیں، وہ شاعری کی محفلیں، وہ کیفے ٹیریا میں چائے کی ٹیبل پر گرما گرم مباحثے اور سموسے، چائے، اور برگر، یونیورسٹی لائف کو شاندار بناتے ہیں۔ ویسے تو تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں بھی فکرِ معاش میں لگ گیا، اور دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے مستقبل بنانے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔

لیکن میں خاص طور پر فیروز کو نہیں بھول سکتا جو کہ شاعری کا شوقین تھا، خصوصاً مرزا غالب کی تو شاعری کا بے حد دیوانہ تھا، غالب کی ہر غزل اسے یاد تھی اور پھر اس کی جادو بھری آواز، جس میں جب بھی وہ کوئی غزل گاتا، تو سبھی مدہوش ہو کر سنا کرتے تھے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی واہ واہ ماحول کو اور بھی گرما رہی تھی، اور فیروز غزل اپنی دل کو لبھاتی آواز میں گا رہا تھا۔ میں بھی انہی اسٹوڈنٹس کی طرح اس کا مداح تھا لیکن اس کا دوست بھی تھا اور میری اس سے دوستی کی وجہ اس کی سادہ طبیعت تھی، اس میں کسی قسم کی چالاکی اور آج کل کے لوگوں کی طرح موقع پرستی نہیں تھی۔

اسی طرح موسم کے حوالے سے مرزا غالب کی پوری غزلیں فیروز کو یاد تھیں، اور ہر موسم اور موقع کی مناسبت سے وہ غزل سنایا کرتا تھا۔

آج بھی موسم خوشگوار تھا، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، اور فیروز یونیورسٹی کے پارک میں گھاس پر بیٹھا، مرزا غالب کی غزل گا رہا تھا، اسٹوڈنٹس اس کے اردگرد بیٹھے تھے، واہ بھئی، واہ واہ، کیا آواز پائی ہے، تمام طلبا ہی اس کی غزل سرائی کو پسند کر رہے تھے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب،
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

میں بنیادی طور پر شاعر تو نہیں، البتہ یہ غزل، مجھے ذاتی طور پر بڑی پسند تھی، اور شاید اسی لیے مجھے یاد بھی ہے، اور میں بھی اکثر اس غزل کو گنگناتا رہتا ہوں۔ اس دن میں بھی اس غزل کے حسن میں گم ہوگیا تھا لیکن فیروز عرف غالب تو تھا ہی جیسے مرزا غالب کا دیوانہ اور اسے شاعری سے بڑا لگاؤ تھا، اور اس پر اس کی جادو بھری آواز۔

شاعری کا دیوانہ کسی نہ کسی سے متاثر تو ہوتا ہی ہے، ایسا ہی کچھ فیروز کے ساتھ ہوا، نمل بھی ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، فیروز اس کا دیوانہ تھا، وہ اس سے پتا نہیں سیریس تھی یا صرف دل لگی اور ٹائم پاس کا ذریعہ سمجھتی تھی اس کا اندازہ نہیں ہورہا تھا۔ نمل کو میں ذاتی طور پر صحیح نہیں سمجھتا تھا، کیوں کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ نظر آتی اور کبھی کسی کے ساتھ، خاص طور پر شہزاد نامی ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ بھی دیکھی جاتی تھی۔

میں چونکہ فیروز کا بہت گہرا دوست تھا، اس لیے وہ اپنی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتا تھا۔ نمل بھی شاید یہ بات جانتی تھی، اس لیے میں بھی کبھی کبھار ان کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا، اگرچہ فیروز کوئی خوش شکل یا گوری رنگت والا نوجوان تو نہیں تھا، البتہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی غزل سرائی کی صلاحیت اور دلوں کو چھو لینے والی آواز تھی۔ مرزا غالب کی شاعری سے تو جیسے اسے عشق تھا۔

یہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جو کہ مفاد پرستوں اور موقع پرستوں سے بھری ہوئی ہے، لوگ دو میٹھے میٹھے بول، بول کر اپنا کام نکالتے ہیں، اور آگے بڑھ جاتے ہیں، میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ یار تو تو فلاسفر ہے، میرا ذہن تیرے جیسا کہاں۔ یہ دنیا صرف پیسے کی ہے۔

اور میں اسے اکثر سمجھاتا کہ یہ لڑکی مجھے بے وفا لگتی ہے، اس کی بھوری آنکھیں بتاتی ہیں کہ یہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے گی۔ لیکن وہ کہتا ابے پاگل، انسان کو خود صحیح ہونا چاہیے، سب اچھے ہوتے ہیں، مگر میں اس کی یہ منطق تسلیم نہیں کرتا۔ پر وہ میری باتوں پر ہنس دیتا۔

"کل میری برتھ ڈے ہے، آپ مجھے کیا گفٹ دیں گے، مجھے تو ڈائمنڈ کی انگوٹھی پسند ہے۔" نمل نے کہا۔

فیروز نے اپنی مہنگی کار بیچ کر سستی کار خرید لی اور اسے ڈائمنڈ کی انگوٹھی گفٹ کردی۔

فیروز آہستہ آہستہ اپنی دولت لٹاتا گیا، کنگال ہوتا گیا،

لیکن اس معاشرے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی تو ضروری ہے، اس لیے سب کے سامنے وہ یہی ظاہر کرتا کہ ایک امیر کبیر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ اس کو جو کچھ ورثہ میں اپنے باپ سے ملا تھا، وہ اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس کے والدین اب حیات تو تھے نہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا جو کہ اس کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتے تھے اور اسے محدود جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا ہی ہوا، وہ آئی اور فیروز کی زندگی کو طوفان میں مبتلا کر کے چلی گئی۔

"میری Engagement ہے، شارق کے ساتھ اور ایک مہینے بعد ہم شادی کر رہے ہیں اور آسٹریلیا جا رہے ہیں، اس کا بزنس وہیں ہے۔ مجھے اس نے میرے گھر والوں سے مانگ لیا ہے۔" نمل نے دوٹوک اسٹائل میں کہا۔

فیروز پر جیسے بجلی سی گر گئی ہو، وہ سُن ہو کر رہ گیا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"لیکن تم نے تو میرے ساتھ، جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہیں، وعدہ کیا ہے۔" فیروز نے بمشکل کہا۔

"لیکن میں اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔" نمل نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ اسے ایک خوش شکل، ہینڈسم آدمی جو مل گیا تھا۔ پھر وہ اس کالے شیدی کو اپنی زندگی کا حصہ کیوں بناتی، یہی تو زندگی ہے اور یونیورسٹی لائف ہے، لوگ ملتے ہی رہتے ہیں، فیروز ایک اچھا دوست ضرور ہے، پر جیون ساتھی نہیں ہو سکتا۔ میرا ہم سفر بھی میری ہی طرح حسین و جمیل ہونا چاہیے، نمل کی فیروز کو اپنا جیون ساتھی نہ بنانے کی وجہ مجھ تک بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی تھی۔ ظاہر ہے یونیورسٹی میں سب کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا اور کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

فیروز جیسے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا، اس کی شاعری اور غزلیں، سب خاموش ہو گئیں وہ ہر وقت گم صم بیٹھا رہتا، ہم سب اسے سمجھاتے لیکن اس کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔ پھر ہمارے فائنل ٹرم بھی ہو گئے، جیسے تیسے فیروز نے بھی اکنامکس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر ہی لی۔ اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ اب وہ جاب کرے، اس مہنگائی کے دور میں ان کا زور بازو بنے۔

اسے اس کے بھائیوں کی کوشش سے ایک جاب تو مل گئی، لیکن جاب میں بھی اس کا دل نہ لگا، یہاں تک کہ اس سے اپنے دیے گئے assignment میں غلطیاں ہونے لگیں، اور پھر ایک دن اسے کمپنی کے ڈائریکٹر نے اپنے کمرے میں طلب کیا اور سخت لہجے میں کہا، مسٹر فیروز، بہت ہو گیا، ہم آپ کو ایک لمبے عرصے سے برداشت کر رہے ہیں، آپ کی غلطیوں کی وجہ سے ہماری کمپنی کو نقصان پہنچ رہا ہے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ ہوں اور اس کے بعد کوئی جاب کریں، اس لیے ہم آپ کو اس جاب سے Terminate کرتے ہیں۔

فیروز نے اپنی صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود ہی رہا اور اسے کمپنی سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے گھر آ گیا، گھر والوں نے اس کا کوئی خاص خیر مقدم نہیں کیا، اور اسے اپنے اوپر بوجھ سمجھنا شروع کر دیا، ایک تو پہلے ہی اس کے دل پر نمل کی بے وفائی کا غم تھا، اُس پر سے اس کی نوکری چلی گئی تھی اور پھر اس کے گھر والوں کی جلی کٹی باتیں، اس نے ایک رات ایک بیگ میں کچھ اپنا ضروری سامان رکھا، اور گھر کو الوداع کہہ کر باہر نکل گیا۔

میں نے اس کے فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا فون بند ملا، جب اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے، گھر والوں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملا۔ صرف ایک پرچہ رکھا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ دل تو میرا اب ٹوٹ گیا ہے، رشتوں پر سے اور محبتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

وہ بستی بستی قریہ قریہ گھومتا رہا، کبھی اس شہر، کبھی اُس شہر، کبھی یہاں، کبھی وہاں، شاید اس اُمید پر کہ اسے کہیں سے خلوص و محبت اور سچا پیار مل جائے، لیکن اُسے تو ہر ایک بے وفا ہی نظر آیا۔ سب مفاد پرست ہیں، برے وقتوں کے لیے اس نے اپنے اکاونٹ میں کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی، اے ٹی ایم کارڈ اس کے پاس موجود تھا، وہ اپنے پیٹ بھرنے کا سامان اس کے ذریعے تو کر ہی لیتا تھا۔

کسی نے اسے فقیر سمجھا تو کسی نے کچھ، کہیں وہ مزدوروں کے ساتھ کام کراتا، تو کبھی سبزی منڈی میں مزدوری کرتا۔

وہ سرد آہیں بھرتا اپنی گم گشتہ محبت کو یاد کرتا کرتا مجنوں ٹائپ ہو گیا تھا، وہ سیلانی کے نام سے مشہور ہو گیا، اس کی آواز اور مرزا غالب کی غزل اس کی پہچان تھی، اور وہ اسے اکثر گاتا رہتا تھا اور جہاں جگہ ملتی سو جاتا، کسی نے کچھ دے دیا تو کھا

لیا۔

یہ سندھ کا ہائی وے پر واقع ایک ہوٹل تھا جہاں پر میری بس خراب ہوگئی تھی۔ ہمیں رات اس ہوٹل میں گزارنا تھی۔

میں بس سے اتر کر اس ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ کنڈیکٹر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ بابا سائیں لوگو، بس میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی ہے، ابھی ایک بس پیچھے آرہی ہے، اس میں فیملی والے افراد کو سوار کرادوں گا، باقی جو افراد ہیں، سنگل ہیں، انہیں رات یہیں گزارنا ہوگی، صبح سات بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔"

ہم سب ڈرائیور اور کوچ سروس والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ ٹیاری کے قریب نیشنل ہائی وے پر موجود اس ہوٹل میں ہم رات گزارنے پر مجبور تھے۔

ہوٹل کا مالک ایک صوفی ٹائپ آدمی لگ رہا تھا، بڑے بڑے بال، داڑھی کھچڑی ٹائپ، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں گٹار، پھر اس نے گانا شروع کیا۔ بہت سے لوگ چارپائیوں پر اس کے اردگرد بیٹھے تھے، واہ سائیں واہ، کیا آواز پائی ہے، اور کیا شاعری ہے، لوگ لہک لہک کر داد دے رہے تھے۔ میں بھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور غزل سننے لگا، اور یہ آواز مجھے کچھ شناسا سی لگی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

یہ آواز تو میں نے ماضی میں کہیں سنی ہے، پھر مجھے فیروز اپنا یونیورسٹی والا پرانا دوست یاد آگیا، جو کہ غالب کا شیدائی تھا، اس کی غزل سرائی یاد آگئی، یہ تو فیروز کی آواز ہے، خیر میں نے پوری غزل سنی، اور دوسری غزلیں بھی۔ پھر میں اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ "تم فیروز ہونا؟"

اس نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ "ہاں ہاں، لیکن تم کون ہو......نہیں۔" وہ اچانک چونک کر بولا۔ "میں فیروز نہیں ہوں۔"

"یار چھپاؤ نہیں، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ یہ تم نے کیا حلیہ بنالیا ہے۔"

پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یار حسن، تم... چونکہ میرے جگری دوست ہو، آؤ کمرے میں چلیں، وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا، اور بیل بجا کر ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا۔

"تمہیں کتنا ڈھونڈا مگر تم مل کر نہ دیے۔ میرا دل تمل نے ایسا توڑا کہ میں پاگل سا ہوگیا تھا کسی کام میں دل نہ لگا نوکری سے بھی نکال دیا گیا۔ دربدر دھکے کھاتا رہا، سیلانیوں کی

کمال احمد رضوی

کمال احمد رضوی ایک ایسے لکھاری ہیں جو 45 سال سے تھیٹر سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ پاکستانی تھیٹر کے ابتدائی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی رویوں کا عکس جھلکتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کردار معاشرے کے عام آدمی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پی ٹی وی سے نشر ہونے والا مشہور ڈراما "الف نون" آج بھی لوگوں کے ذہن میں نقش ہے۔ کمال احمد رضوی نے انتقال سے کچھ پہلے کہا تھا کہ اب وہ لوگ نہیں رہے جو اس کام کی سمجھ رکھتے تھے۔ اس لیے میں نے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کچھ تحریر نہیں کر رہا، میں نے کچھ نئے ڈرامے لکھے ہیں، مستقبل میں کام آئیں گے۔ ان کے خیال میں معاشرہ مادیت پرستی کا شکار ہے۔ کمال احمد رضوی کا کہنا ہے کہ "مزدور پیشہ ادیب، لکھاری یا اداکار جو بھی کچھ ہوں، اپنی محنت سے بنا ہوں جب کہ بیورو کریٹس فنکاروں کو ایسے مواقع چاہئیں۔ بھٹو کے دور میں طائفے بیرونِ ممالک بھیجنے کے لیے کئی فنکاروں کو رکھا گیا، اسی طرح پھر جنرل مشرف کے دور میں بھی کئی لوگ منتخب کیے گئے جو فنونِ لطیفہ سے متعلق شعبہ جات کی نمائندگی کرسکیں اور جس پر ان کی نظر پڑ جائے اس کی تو دنیا بن گئی، چاہے شجاعت حسین ہوں یا پرویز الٰہی یا ضیاء محی الدین ہوں۔ یہ لوگ میری طرح محنت نہیں کر سکتے، میں نے محنت کرکے ایک پروگرام پیش کیا سالہا سال وہ پروگرام ٹی وی پر چلتا رہا، اس پروگرام نے دوسروں کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیے۔ وہ اس وقت ٹی وی کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے "الف نون" جیسا پروگرام کیا اگر میں نہ کرتا تو کوئی دوسرا کرتا کیونکہ وہ وقت کی ضرورت تھی۔

اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے
از: خرم سہیل

طرح شہر شہر قریہ قریہ گھومتا رہا۔ میری ماں تو تھی ہی نہیں، بچپن میں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی، باپ بھی کچھ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا صرف بھائی تھے انہوں نے مجھے کہا کہ میاں کچھ کرو گے تو ہمارے ساتھ رہ سکو گے، ان عاشقی معشوقی کے چکر سے نکلو اور کچھ کام کاج کرو، ہم ویسے بھی ایک اونچی سوسائٹی کے فرد ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ کرسکا اور جب روز بروز گھر میں تلخیاں بڑھنے لگیں تو ایک رات گھر سے کچھ پیسے لیے جو کہ میں نے برے وقتوں کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ ایک بیگ لیا اور گھر سے نکل پڑا۔ قریہ قریہ، بستی بستی، سیلانی کی طرح گھومتا رہا۔

پھر ایک دن میرا اکاونٹ بھی خالی ہوگیا، میرا بھوک کے مارے برا حال تھا، میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی، وہیں قریب دریا نظر آیا تو سوچا کہ اپنی جان اس پانی کے حوالے کردوں، دنیا کے دکھوں سے دور چلا جاؤں، اس مقصد کے لیے میں نے دریائے سندھ کے پل پر پہنچا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا دریا میں چھلانگ لگادی۔

لیکن میری قسمت میں تو شاید کچھ اور ہی لکھا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا، یہ حفیظ بھائی کا گھر تھا۔ حفیظ بھائی ایک انسان دوست آدمی تھے۔ وہاں ایک کشتی میں حفیظ بھائی جن کی دیوار پر تصویر دیکھ رہے ہو، بیٹھے ہوئے تھے، وہ مچھلی کے شکار کے شوقین تھے اور ایک ماہر تیراک بھی تھے، انہوں نے مجھے دریا میں گرتے ہوئے دیکھ لیا اور شور مچادیا، خود بھی دریا میں چھلانگ لگادی اور میری جان بچائی۔

پھر کسی نہ کسی طرح مجھے کشتی میں ڈال لیا اور پیٹ کو دبایا تو مجھے ابکائیاں آئیں اور تھوڑی ہی دیر میں میری طبیعت بحال ہوگئی مجھے ہوش آگیا۔

''او بھائی زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، کیوں اسے ضائع کررہے تھے۔'' حفیظ بھائی نے کہا۔

''میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ہر ایک نے میرے ساتھ بے وفائی کی، اور گھر والے بھی مطلبی نکلے۔''

''تم تو یار مجھے اپنی طرح کے آزاد منش لگتے ہو، چلو میرے ساتھ، میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اکیلا ہوں، ہائی وے کے کنارے ایک ہوٹل ہے، وہ چلاتا ہوں اور آرام سے زندگی گزارتا ہوں۔''

پھر میں حفیظ بھائی کے ساتھ رہنے لگا اور ہوٹل پر ان کی مدد کرنے لگا۔

حفیظ بھائی میری شاعری اور غزل سرائی کے دلدادہ تھے، وہ مرزا غالب کی غزلیں ضرور سنتے اور یہ غزل تو میں روز ان کی فرمائش پر گایا کرتا تھا۔ میری غزل سرائی سن کر بھی لوگ یہاں آتے ہیں۔

ایک سال بعد سردی کے موسم میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے، میں نے ان کی بہت خدمت کی، ان کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا، ہاتھ منہ دھلاتا، اور مرزا غالب کی غزلیں سناتا، انہوں نے ایک دن وکیل کو بلوا کر وصیت نامہ تیار کروایا اور اپنا سب کچھ میرے نام کرگئے، جو ہوٹل جس میں ہم بیٹھے ہیں ان ہی کا دیا ہوا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہوا ہے، مجھے ایسا لگا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا، میں ایک مرتبہ پھر اکیلا ہوگیا لیکن پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے تو روزگار کی فکر ضروری ہے نہ میرے دوست؟'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے میں نے یہ ہوٹل مکمل طور پر سنبھال لیا ہے لیکن غزل سرائی میری فطرت سے نہ گئی اور آج بھی روزانہ رات کو غزل سرائی کرتا ہوں۔ اور لوگ بھی شاید اسی لئے یہاں آتے ہیں۔''

''سندھ کے گاؤں، اور دیہاتوں میں آج بھی لوگ شام کو کچہری کرتے ہیں، یعنی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اپنے دکھ دردوں کو share کرتے ہیں، اس لیے مجھے یہ ماحول بہت پسند ہے، میں بھی لوگوں کی باتیں اور ان کے واقعات سنتا ہوں، اور رات گئے یہ لوگ مجھ سے غزل سرائی کی فرمائش کرتے ہیں، جو کہ میں پوری کرتا ہوں۔ میرے ہوٹل پر اسی لیے زیادہ تعداد میں لوگ آتے ہیں، میں سیلانی کے نام سے یہاں پر مشہور ہوں۔ اب یہی میری زندگی ہے۔''

''تم نے شادی نہیں کی؟''

''ہاں یار میں نے گاؤں کی ہی ایک سادہ اور اچھے گھرانے کی عورت سے شادی کرلی ہے، جس سے میرے دو بچے بھی ہیں۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ اس ماحول میں اپنے آپ کو نہایت پرسکون محسوس کرتا ہوں۔''

میں فیروز کی داستان سن کر بہت خوش تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

سمندر

محترم معراج رسول
السلام علیکم
اس سچ بیانی میں سب کچھ سچ ہے صرف نام اور مقام بدلا ہوا ہے۔
اُمید ہے کہ یہ سچ بیانی آپ کے معیار پر پوری اترے گی اس یقین کی وجہ میرے ساتھ پیش آئے واقعات ہیں جو ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

ذوالفقار
(لاہور)

طوبیٰ میری اکلوتی بیٹی ہے اور میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ ویسے یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے۔ سبھی والدین اپنی اولاد سے اسی طرح محبت کرتے ہیں اگر ان کے دس بچے ہوں تب بھی ان کے دل میں ہر ایک کے لیے ایک جیسے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ ان کی ہر خوشی میں خوش اور ہر تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن طوبیٰ سے میری محبت ان کے مقابلے بالکل منفرد اور مختلف ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے اور دوسرے یہ کہ شادی کے دس سال

بعد ہمارے گھر آئی۔ اسی لیے وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین ہے۔ اس کے آنے سے میرے آنگن کا سونا پن دور ہوگیا۔ ورنہ ہم دونوں میاں بیوی ساری زندگی اولاد کے لیے ترستے رہتے۔

فوزیہ میری بچپن کی محبت تھی۔ وہ میری چچازاد تھی اور شروع سے ہی ہمارے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہوگیا تھا۔ ابو اور چچا جان میں بہت محبت تھی۔ اس لیے دونوں گھروں میں آنا جانا لگا رہتا۔ ایک اتوار ہم لوگ ان کے گھر آتے اور ایک اتوار چچا کی فیملی ہمارے گھر آجاتی۔ خوب رونق رہتی۔ اچھے اچھے کھانے پکتے وی سی آر پر فلمیں دیکھی جاتیں یا پھر کیرم اور لوڈو کی محفل جمتی۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے میں پہلے ہی ویڈیو شاپ سے فلمیں لے آتا لیکن فوزیہ کو فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں جب بھی وی سی آر پر فلم لگاتا، وہ جھلا کرکہتی۔ ”سمیع! ہم یہاں فلمیں دیکھنے نہیں آتے۔ اگر تمہیں فلم دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے کوئی رسالہ دے دو۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر پڑھ لوں گی۔“

میں اسے ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی وی سی آر بند کردیتا۔ پھر میں نے فلمیں لانا بند کردیں۔ وہ مجھ سے رسالے مانگ کرلے جاتی اور پڑھنے کے بعد واپس کردیتی۔ اس طرح ہمارے درمیان ادبی گفتگو ہونے لگی۔ مجھے فلموں کے علاوہ کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ہی کرکٹ کے شوقین تھے۔ جب ٹیلی وژن پر میچ آرہا ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر میچ دیکھتے اور اس پر تبصرہ بھی کرتے جاتے۔

بچپن سے نکل کر جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تب بھی ویسی ہی انسیت اور بے تکلفی برقرار رہی۔ حالانکہ اس کے دوسرے کزن بھی تھے۔ ماموں زاد، خالہ زاد لیکن وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی اور پڑھائی کا بہانہ کرکے کمرے میں گھسی رہتی۔ وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی۔ اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کرسکتی تھی۔ ادب، فلم، ٹیلی ویژن، کھیل اور سیاست جب کہ مجھے گھومنے پھرنے اور کھیلنے کودنے کے علاوہ کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ بحث یا اختلاف کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ میرے پاس اتنا علم ہی نہیں تھا کہ اسے قائل کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔

وہ اپنی ہر بات مجھ پر مسلط کرتی اور مجھے مجبور کرتی کہ میں من وعن اسے تسلیم کرلوں۔ بعض اوقات دل چاہتا کہ صاف انکار کردوں لیکن پھر اس کی ناراضی کے ڈر سے سرتسلیم خم کرلیتا۔ میری تعلیم مکمل ہونے والی تھی کہ اچانک میں اسے پسند کرنے لگا اور میرے دل میں اسے اپنا بنانے کی خواہش جاگ اٹھی لیکن اس کا اظہار کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے انکار کردیا تو پھر اسے منانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گی۔ چنانچہ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچا۔

اتفاق سے انہی دنوں میری بڑی بہن نزہت کی شادی ہوئی تو امی کو گھر میں ایک فرد کی کمی محسوس ہونے لگی۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔ ”نوکری لگ جائے تو سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کردوں۔ نزہت کے جانے سے گھر بہت سونا سونا لگ رہا ہے۔“

”ارے امی، یہ تو میرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ ابھی سے آپ پر میری شادی کی فکر کیوں سوار ہوگئی؟“

”فضول باتیں مت کرو۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اچھا ہے۔ جلدی شادی ہوجائے گی تو بچوں کے فرائض سے بھی جلد ہی سبکدوش ہوجاؤ گے اور بڑھاپا آرام سے گزرے گا۔“

”میری نوکری تو لگ جانے دیں۔“ میں نے مصنوعی احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی لگ جائے گی۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”اور ابھی کون سا شادی کررہی ہوں۔ پہلے بات تو پکی ہو جائے۔ پھر سال دو سال بعد شادی بھی ہوجائے گی اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتادو۔“

میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ ”میں...... میں...... میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے کیا پتا؟“

”دیکھو بیٹا میری نظر میں یوں تو کئی لڑکیاں ہیں لیکن میں تم پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ اس میں شرمانے یا جھجکنے والی کوئی بات نہیں۔“

”اچھا“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”آپ چچا کے گھر چلی جائیں۔“

”کیا؟“ وہ چونکتے ہوئے بولیں۔ ”تم فوزیہ کی بات کررہے ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ ان کی ایک ہی لڑکی ہے فوزیہ۔ میں اسی کی بات کررہا ہوں۔“

"یا اللہ تیرا شکر۔" وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولیں۔ "سچ پوچھو تو میری بھی یہی خواہش تھی۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا۔"

مجھے یقین تھا کہ چچا کو یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوگی اور فوزیہ بھی والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا دے گی۔ اس کے پاس بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن اگر میں اس سے براہ راست بات کرتا تو اس سے کوئی بعید نہیں تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق فلسفہ جھاڑنے بیٹھ جاتی۔ مثلاً یہی کہ ہم اچھے دوست ہیں اور میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا وغیرہ وغیرہ لیکن اگر امی رشتہ لے کر جاتیں تو وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتی تھی۔

نتیجہ میری توقع کے عین مطابق آیا اور چچا جان نے میرا رشتہ قبول کر لیا۔ فوزیہ خالصتاً مشرقی لڑکی تھی۔ اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور والدین کے فیصلے پر راضی ہوگئی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی ہوگی۔ رات کو اس کا فون آیا تو وہ خاصے غصے میں لگ رہی تھی۔

"آپ کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے تو بات کرنی چاہیے تھی۔"

وہ ایک دم ہی تم سے آپ پر آگئی تھی۔ اس پر مجھے تھوڑی سی حیرت اور خوشی بھی ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے مجھے اپنے منگیتر اور ہونے والے مجازی خدا کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ میں نے کہا۔ "دراصل سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"

"ایسی کیا جلدی تھی۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ امی کو اچانک ہی میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ میں نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ یہی کہتی رہیں کہ نزہت کے جانے کے بعد گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ اس لیے وہ میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہ رہی ہیں۔"

"انہوں نے آپ کی مرضی معلوم نہیں کی؟"

"نہیں بس رسماً پوچھا کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ اس پر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اعتراض تو اس وقت کرتا جب تم میں کوئی خامی ہوتی۔"

"گویا اب اس رشتے پر اس لیے تیار ہوگئے کہ مجھ میں کوئی خامی نہیں ہے۔" وہ حسب عادت بحث پر اتر آئی۔

"ورنہ آپ کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے لوگوں کی پریم کہانی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔"

"یعنی آپ شادی کے بعد مجھ سے محبت کریں گے۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"اور اس وقت تک میں کیا کروں گی؟"

"اس محبت کا انتظار۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "اچھا ہوا کہ آپ نے تائی جان والا روٹ استعمال کیا اگر براہ راست مجھے پروپوز کرتے تو شاید میں انکار کر دیتی۔"

میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنی جلدی وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ میرے لیے پریشان کن تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ میں اپنے ماں باپ کے بعد سب سے زیادہ آپ کو ہی پسند کرتی ہوں۔ آپ ایک اچھے دوست اور کزن ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اور کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"اوہ۔" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے ممکنہ انکار کی کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جو میں پریشان ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ "جس کام کی اجازت مذہب اور معاشرہ دیتا ہے۔ اس پر تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شادی کے بعد بھی دوست اور کزن کا کردار نبھاتا رہوں گا۔"

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" وہ ایک بار پھر آپ سے تم پر آگئی۔ "اگر شوہر بن کر حکم چلانے کی کوشش کی تو نقصان میں رہو گے۔ میں کسی کے رعب میں آنے والی نہیں ہوں۔"

فوزیہ سے رشتہ ہو جانے کے بعد میں نے چچا کے گھر جانا کم کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے کی طرح میرے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں نہیں کرتی تھی۔ بس لمحہ بھر کے لیے میرے سامنے آتی اور سلام کر کے چلی جاتی۔ امی بھی اشاروں اشاروں میں کہہ چکی تھیں کہ اب میرا چچا کے گھر زیادہ جانا ٹھیک نہیں۔ اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ رات کو فون پر باتیں کرنے لگے۔ وہ انتہائی غیر رومانی لڑکی

تھی اور فون پر بھی کوئی بحث چھیڑ کر بیٹھ جاتی جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ میری پیار بھری باتوں پر شرمائے۔ لجائے، نخرے دکھائے وغیرہ وغیرہ لیکن لگتا تھا کہ رومانونیت اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزری۔ بعض اوقات تو میرا بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی جب آپ کسی کو اپنا بناتے ہیں تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا ہوتا ہے۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مجھے ملازمت مل گئی اور امی نے زور و شور سے شادی کی تیاری شروع کر دی اور پھر وہ دن بھی آگیا جب فوزیہ دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔ پہلی رات ہی اس نے انکشاف کیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مجھے چاہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ زندگی کا سفر ہم مل کر طے کریں۔ میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ مجھے صرف ایک دوست اور کزن سمجھتی ہو۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''وہ تو میں نے آپ کو چھیڑنے کے لیے کہا تھا اگر فوراً اقرار کر لیتی تو آپ پھول کر کپا ہو جاتے۔''

میں جواب میں کچھ کہتا تو ایک لمبی بحث شروع ہو جاتی اور میں اس یادگار رات کو اس کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ''آج سے ہم اپنی محبت کی اننگ شروع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ صبح کے اختتام پر دونوں ہی ناٹ آؤٹ واپس جائیں گے۔''

''بشرطیکہ کوئی فاؤل پلے نہ ہو۔'' وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے بولی۔

فوزیہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے زندگی کا ہر سکھ دیا۔ شادی کے فوراً بعد اس نے پورا گھر سنبھال لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب گھر والے اپنے ہر کام کے لیے اس کے محتاج ہو گئے۔ وہ نہ صرف گھر کا پورا کام کرتی بلکہ باہر کے مسئلے بھی نمٹاتی۔ بلوں کی ادائیگی، مہینے کا سودا سلف لانا، گوشت سبزی اور ناشتے کا سامان لانا اور گھر کے کاموں کے لیے پلمبر الیکٹریشن کے پیچھے بھاگنا۔ یہ سارے کام اس نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ وہ ایک سگھڑ بیوی ہی نہیں بلکہ ہوشیار منتظم اور میری مشیر بھی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مشورہ دیا کہ مجھے ملازمت چھوڑ کر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا تو وہ بولی۔ ''دیکھیں نا، ملازمت میں تو لگی بندھی تنخواہ ملتی ہے اور اگر سال بعد تھوڑا بہت اضافہ ہوا تو وہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ ابھی تو ہم دو ہیں۔ گھر بھی اپنا ہے۔ کل کو بچے ہوں گے تو اخراجات بھی بڑھیں گے پھر اس محدود تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔''

''بات تو ٹھیک ہے لیکن کاروبار کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟''

''ضروری نہیں کہ آپ کوئی لمبا چوڑا کاروبار کریں۔ کم سرمایہ سے بھی کام شروع کیا جا سکتا ہے۔''

''پھر بھی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے لاکھوں چاہئیں۔''

''سب ہو جائے گا۔ آپ ایک بار ہامی تو بھریں۔''

''کیسے ہو جائے گا۔'' میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے اکاؤنٹ میں تو دو چار لاکھ ہی ہوں گے۔''

''چلیں اچھا ہوا کہ آپ نے بتا دیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ میرا پلان بھی سن لیں۔ میرے پاس جو زیور ہے۔ اس کی مالیت کم از کم دس لاکھ تو ہو گی۔ وہ ہم بینک میں گروی رکھ دیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہوئی تو میں ابو سے مانگ لوں گی۔ آخر ان کی دولت میں میرا بھی تو حصہ ہے۔''

میں قرض ادھار کے سخت خلاف ہوں لیکن فوزیہ کی بات بھی صحیح تھی۔ چند سالوں بعد تنخواہ میں گزارہ مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میں نے اس کے منصوبہ سے اتفاق کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کام شروع کیا جائے۔ فوزیہ نے گارمنٹس کا کاروبار تجویز کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کام سارا سال چلتا ہے اور عید بقرعید پر تو ان لوگوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کی ابتداء کیسے کی جائے۔ فوزیہ نے بتایا کہ اس کی ایک سہیلی کا شوہر یہ کام کرتا ہے۔ ہم اس سے ملتے ہیں۔ وہی ہمیں گائیڈ کرے گا۔

سہیل بہت مخلص اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ کسی مناسب جگہ پر ایک دکان کا بندوبست کر لوں۔ وہ اپنے کارخانہ میں تیار کردہ ملبوسات وہاں رکھوا دے گا اور اگر میں اپنے طور پر ملبوسات بنوانا چاہوں تو وہ تین مہینے کے کریڈٹ پر تھوک مارکیٹ سے کپڑا دلوا سکتا ہے اور ٹھیکے پر سلائی کا کام کرنے والے کاریگروں کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں خود اپنے ملبوسات بنوا کر بیچوں تو زیادہ فائدہ ہو گا اور اگر ایکسپورٹ کی طرف آجاؤں تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں اتنے لمبے چوڑے جھمیلے

میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ فی الحال وہ اپنے کارخانے کا تیار کردہ مال ہمیں دیتا رہے۔ باقی کام بعد میں دیکھے جائیں گے۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ہمیں حیدری کے علاقے میں ایک مناسب دکان مل گئی۔ اس کے ایڈوانس اور تزئین و آرائش پر کافی پیسے لگ گئے لیکن سہیل کے تعاون کی وجہ سے ہمیں سامان کی خریداری پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ اس نے کافی مقدار میں شلوار قمیص کے سوٹ، مردانہ قمیصیں، پتلونیں اور جینز وغیرہ میری دکان میں رکھوا دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں کسی دوسرے کارخانے کا مال بھی اپنی دکان پر رکھنا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سوچنے لگا کہ فی الحال یہی مال نکل جائے تو بہت ہے کیونکہ اس علاقے میں پہلے سے ہی مردانہ گارمنٹس کی کئی چھوٹی بڑی دکانیں موجود تھیں۔ جہاں گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان کے مقابلے میں میری دکان بہت چھوٹی اور گلی کے اندر تھی جہاں کوئی بھولا بھٹکا گاہک ہی آسکتا تھا۔ پہلے تین دن کوئی نہیں آیا تو میرا دل ڈرنے لگا اور مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں سیلزمینوں کو تنخواہ بھی اپنے پاس سے نہ دینی پڑ جائے۔ میں نے فوزیہ کو یہ پریشانی بتائی تو وہ بولی۔

''کاروبار میں صبر اور انتظار کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ مارکیٹ میں بیٹھے ہیں کسی جنگل میں نہیں۔ گاہک آئیں گے اور اتنے آئیں گے کہ آپ سے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔''

اس کی بات درست نکلی۔ اگلے روز دو سوٹ فروخت ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آہستہ آہستہ گاہکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں نے سیل بڑھانے کے لیے قیمتیں کم کر دیں اور معمولی منافع پر مال بیچنے لگا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کا کچھ اور ہی نتیجہ نکلے گا۔ دکان شروع ہوئے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک بارلیش صاحب میرے پاس آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام حاجی منظور ہے اور مین روڈ پر بیوٹی گارمنٹس میری ہی ہے۔''

میں نے وہ دکان دیکھ رکھی تھی۔ وہ بہت بڑی تھی اور وہاں آٹھ دس سیلزمین کام کرتے تھے۔ میں حاجی صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں انہیں دکان کے عقبی حصے میں لے گیا جہاں بیٹھ کر میں حساب کتاب کیا کرتا تھا۔ میں نے ان کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور پوچھا۔ ''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''برخوردار تم ابھی اس میدان میں نئے ہو اور تمہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ میرا... فرض بنتا ہے کہ تمہیں دو چار بنیادی باتیں سمجھا دوں۔''

''جی فرمایئے۔ میں سن رہا ہوں۔''

''دیکھو میاں یہ جو تم نے سستے داموں مال بیچنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے وقتی طور پر تو تمہاری تھوڑی بہت سیل بڑھ جائے گی لیکن آگے چل کر یہ چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''میرا خیال ہے کہ دکان کے اخراجات پر تمہاری نظر نہیں ہے۔ تم صرف یہ دیکھ رہے ہو کہ کتنے میں مال خریدا اور کتنے میں بیچا۔ دیگر اخراجات کا تم نے کوئی حساب نہیں لگایا جن میں دکان کا کرایہ، بجلی اور ٹیلی فون کے بل، انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، ایسوسی ایشن کا چندہ، ٹرانسپورٹ کے اخراجات وغیرہ شامل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری وجہ سے ہماری مارکیٹ خراب ہو رہی ہے۔''

''تو آپ بھی اپنی چیزوں کی قیمتیں کم کر دیں۔'' میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

''اس میں دو مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ میری دکان پر دس سیلز مین ہیں۔ قیمتیں کم کریں تو انہیں تنخواہ کہاں سے دوں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی اخراجات ہیں۔ وہ سب دکان کی آمدنی سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ گاہک کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ وہ سستی چیز کو غیر معیاری اور مہنگی چیز خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے اور وہ فخریہ انداز میں اپنے ملنے جلنے والوں کو اس کی قیمت بتاتے ہیں آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ آپ یہ لوٹ سیل بند کریں اور قیمتوں کو مناسب سطح پر لے کر آئیں تاکہ دوسرے دکانداروں کا کاروبار متاثر نہ ہو۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''تو اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے۔ پہلے مرحلے

میں آپ کا سوشل بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ آپ سے دکان بھی خالی کروالی جائے۔"

ان کی دھمکی سن کر میں سہم گیا اور آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہے حاجی صاحب کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پوری کرسکوں۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے سہیل کو فون کر کے ساری بات بتائی تو وہ بولا۔"وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ان کی دونوں باتیں صحیح ہیں۔ اس لوٹ سیل کی وجہ سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں اپنے پاس سے کچھ دینا پڑ جائے اور وہ یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ گاہک سستی چیزوں کو غیر معیاری سمجھتے ہیں۔ اگر تم اسی طرح کم منافع پر چیزیں بیچتے رہے تو گاہک تمہاری دکان پر آنا چھوڑ دیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"اسی قیمت پر مال فروخت کرو جس پر دوسرے دکاندار بیچ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے دو چار گاہک ٹوٹ جائیں لیکن مجموعی طور پر تم فائدہ میں رہوگے۔ ویسے بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا کوئی عقل مندی نہیں۔"

"کیا مطلب۔"میں نے پوچھا۔

"حاجی صاحب مارکیٹ یونین کے صدر بھی ہیں۔ ان کی مخالفت مول لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کے مشورہ پر عمل کرو۔"

میں نے وہی کیا جو حاجی صاحب چاہتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس سے میری سیل متاثر ہوگی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ پہلے لوگ چیزیں خریدتے وقت بھاؤ تاؤ کیا کرتے تھے لیکن اب وہ منہ مانگی قیمت دے کر اپنی پسند کی چیز لے جاتے۔ میری دکان دن بہ دن ترقی کررہی تھی۔

ایک سال بعد میں نے سہیل کے مشورہ پر اپنا مال تیار کروانا شروع کردیا۔ اب میں اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ مجھے مارکیٹ سے ادھار کپڑا خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سہیل نے چند کاریگروں کا انتظام کردیا تھا جو ٹھیکے پر سلائی کا کام کرتے تھے۔ میں نے ایک سپروائزر رکھ لیا تھا جو مارکیٹ سے کپڑا اٹھا کر کاریگروں کے اڈے تک پہنچاتا اور وہاں سے تیار مال لے کر دکان پر آجاتا۔ اس کام میں مجھے بہت فائدہ ہوا اور صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک چھوٹی سی گارمنٹ فیکٹری کا مالک بن گیا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود زندگی میں ایک کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ ہماری شادی کو چھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا تھا لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ امی ابو پوتے کو کھلانے کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ فوزیہ کے میکے میں بھی کوئی نہیں رہا۔ چچا چچی کا انتقال ہوچکا تھا اور بہن بھائی اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ شروع کے دو تین سال تو ہم نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ ہم دونوں نے اپنا طبی معائنہ کروایا لیکن کسی میں کوئی نقص نہیں تھا اور ہم اولاد پیدا کرنے کے قابل تھے بس اوپر سے ہی دیر ہورہی تھی۔

میں تو اپنی قسمت پر صابر شاکر تھا لیکن فوزیہ سے یہ کمی برداشت نہیں ہورہی تھی اور کبھی کبھی تو اس کا یہ احساس جنون کی حد کو چھونے لگتا۔ وہ بات بات پر مجھ سے لڑتی اور کہتی۔

"مجھے بچہ چاہیے، ہر قیمت پر۔ کہیں سے بھی لے کر آؤ۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بچہ چاہیے۔"اس کا انداز ایسا تھا جیسے بچے بازار میں ملتے ہیں اور میں کنجوسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچہ لانے سے گریز کررہا ہوں۔

میں جب بھی اسے کوئی نیا آرڈر ملنے کی خبر سناتا یا مجھے کسی سودے میں منافع ہوتا تو وہ خوش ہونے کی بجائے مجھے طعنے دینے لگتی۔"کس کے لیے جمع کررہے ہو۔ اتنی دولت تمہارا کون سا وارث بیٹھا ہوا ہے۔ سب ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔"اس کی یہ باتیں سن کر میں بھی سوچنے لگ جاتا کہ واقعی میں یہ سب کس کے لیے کررہا ہوں۔ محنت میں کروں اور میرے بعد دوسرے لوگ عیش کریں۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ سارا کاروبار بند کرکے گھر بیٹھ جاؤں۔ بینک سے ملنے والا منافع اتنا ہوتا کہ ہم دونوں کا آرام سے گزارہ ہوسکتا تھا لیکن میری نظر میں چلتے ہوئے کاروبار کو بند کرنا کفران نعمت تھا۔ میں نے ابھی تک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر ہماری ضرور سنی جائے گی۔

جب فوزیہ کا جنون حد سے بڑھ گیا تو میں نے تجویز پیش کی کہ ہم یتیم خانہ سے کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں لیکن وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئی اور کہنے لگی۔"پرایا بچہ کبھی اپنا نہیں ہوسکتا۔ میں کبھی اسے سگی اولاد جیسی محبت نہیں دے سکوں گی اور ہر وقت یہی سوچتی رہوں گی کہ کسی غیر کے بچے کو پال رہی ہوں۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ آپ اسے اپنا نام دے سکیں گے نہ جایداد میں سے کوئی حصہ۔ پھر ہم کیوں بلاوجہ اپنے گلے میں ڈھول ڈالیں۔

پھر ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں دوسری شادی کرلوں شاید اس دوسری عورت کے بطن سے ہمارے گھر میں بہار آجائے۔ میں نے کہا۔ ''اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو کیا تم مجھے تیسری شادی کا مشورہ دو گی؟''

وہ بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ دوسری شادی کر کے آپ ضرور صاحب اولاد ہو جائیں گے۔ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی لیکن دوسری بیوی سے بچوں کی لائن لگ گئی۔''

''کیا تم اپنے سہاگ میں شراکت برداشت کرلو گی؟''

''ہے تو بہت مشکل لیکن آپ کی خوشی کی خاطر یہ بھی کرلوں گی۔''

''میری خوشی اسی میں ہے کہ آیندہ تم یہ بات نہ کرنا۔ میں ذہنی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

اس کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ منہ پھیر کر لیٹ گئی لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی بات کیوں کی۔ کہیں اسے اصل حقیقت تو معلوم نہیں ہوگئی۔ وہ بات جو میں نے اس سے اب تک چھپائی ہوئی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم تھی لیکن میں نے لیڈی ڈاکٹر کی منت سماجت کر کے اسے راضی کرلیا تھا کہ وہ فوزیہ کو یہ خوفناک حقیقت نہ بتائے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے پرواہ عورت ہے اور کبھی رپورٹ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گی بلکہ میرے بتائے ہوئے پر یقین کرلے گی اور ایسا ہی ہوا جب میں رپورٹیں لے کر گھر آیا تو اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دونوں رپورٹیں ٹھیک ہیں۔''

وہ مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگ گئی۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً وہ رپورٹیں ایسی جگہ چھپا دیں جہاں اس کی نظر نہ پڑے۔ بالفرض محال اگر وہ رپورٹ دیکھ بھی لیتی تو اس کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہو۔ وہ پہلے ہی اولاد نہ ہونے کے غم میں پاگل ہو رہی تھی۔ یہ خبر سن کر بالکل ہی ٹوٹ جاتی اور کچھ بعید نہیں کہ جذبات میں آکر کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی اسی لیے اس خبر کو اس سے چھپانا بہت ضروری تھا۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے وہ رپورٹیں کہاں رکھ دی تھیں۔

فوزیہ نے دوسری شادی کا ذکر چھیڑ کر مجھے ایک نئی کشمکش سے دوچار کردیا۔ اس سے تو میں نے کہہ دیا کہ ذہنی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کافی دنوں سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے شدت سے اولاد کی آرزو تھی جو میری دولت اور جائیداد کی وارث بن سکے لیکن یہ خواہش فوزیہ پوری نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے لیے دوسری شادی کرنا ضروری تھا۔ میں کسی غریب اور بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا جو کبھی فوزیہ کے مقابلے پر نہ آئے اور ہمیشہ اس سے دب کر رہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ادھر میں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور ادھر وہ لڑکی مجھے مل گئی۔

زرینہ میری فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ ویسے تو وہاں اور بھی کئی عورتیں تھیں جن میں سے زیادہ تر کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ ان کا واسطہ اپنے سپروائزر یا فیکٹری مینیجر سے پڑتا تھا لیکن زرینہ سے میری ملاقات بڑے ہی عجیب انداز میں ہوئی۔ میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ سیکریٹری نے انٹرکام پر کہا۔ ''سر ایک ورکر آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' میں چونک گیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی ورکر براہ راست مجھ سے ملنے آئی ہو۔ وہ اپنے معاملات کے سلسلے میں سپروائزر یا مینیجر سے رجوع کرتی تھیں۔ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوگی۔ میں نے سیکریٹری سے کہا کہ وہ اسے اندر بھیج دے۔

چند سیکنڈ بعد وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ جھیل جیسی گہری آنکھیں۔ ستواں ناک، رسیلے ہونٹ، سیاہ گھنے بال اور بھرا بھرا جسم لیکن غربت نے اس کی خوب صورتی کو گہنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور اس نے پورے جسم کو ایک چادر سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی زرینہ، زرینہ ذوالفقار۔''

''کیا مسئلہ ہے؟''

''جی میں لون کے سلسلے میں حاضر ہوئی تھی۔''

''اس کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت

تھی۔تم مینیجر سے کہتیں۔''
''جی کہا تھا بلکہ درخواست بھی دی تھی لیکن انہوں نے منع کر دیا۔''
''کیوں منع کر دیا۔کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔''
''جی وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کی پالیسی نہیں ہے۔''
مجھے لڑکی کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔جی میں آیا کہ اسی وقت مینیجر کو بلا کر پوچھوں کہ یہ پالیسی کب بنی۔کس نے بنائی اور یہ میرے علم میں کیوں نہیں لیکن اس معاملہ کو میں نے کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔پہلے اس لڑکی کا مسئلہ حل کرنا ضروری تھا۔''کتنے پیسے چاہئیں۔''
''جی دس ہزار۔''
''کیا کروگی؟''
یہ سنتے ہی وہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اسے روتا دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیسے چپ کراؤں پھر میں نے سخت لہجے میں کہا۔''دیکھو بی بی تم میرا وقت ضائع کر رہی ہو اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ تاکہ میں کچھ سوچ سکوں۔''
''سر بات یہ ہے۔''وہ چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔''ابھی چند ماہ قبل میری ماں کا انتقال ہوا ہے۔اب میں ماموں کے پاس رہ رہی ہوں۔یہ پیسے انہی کو دینا ہیں۔''
''کیا مطلب؟ کیا تمہارے ماموں کی اتنی استطاعت بھی نہیں کہ وہ تمہیں دو وقت کی روٹی کھلا سکے۔''
''وہ تو میں ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے دیتی ہوں۔یہ وہ پیسے ہیں جو انہوں نے میری ماں کی تجہیز و تکفین پر خرچ کیے تھے۔اس وقت تو انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے یہ خرچا کر دیا۔اب مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔''
''بڑی عجیب بات ہے۔کیا تمہاری ماں ان کی سگی بہن نہیں تھیں؟''
''جی نہیں وہ میرے سوتیلے ماموں ہیں۔''
''اوہ آئی سی، اب میں سمجھا۔''میں نے کہا۔''اس کے علاوہ تو وہ تمہیں تنگ نہیں کرتے۔''
''سر کیا بتاؤں۔ماموں اور ممانی نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔یہاں سے جانے کے بعد گھر کا سارا کام کرتی ہوں۔چھٹی والے دن پورے گھر کے کپڑے دھوتی ہوں۔اس کے باوجود ممانی کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے۔ہر وقت میرے مرحوم والدین کو کوسنے اور بد دعائیں دیتی رہتی ہیں۔یقین جانیے سر کہ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اب تک اپنی جان دے چکی ہوتی۔''
''تمہارا کوئی اور عزیز یا رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس تم چلی جاؤ۔''
''جی نہیں، اگر ہوں گے تو بھی میں نہیں جانتی۔ہم سوات کے رہنے والے ہیں۔میں بہت چھوٹی تھی جب ابا ہمیں لے کر مزدوری کی تلاش میں کراچی آئے تھے۔اس کے بعد یہیں کے ہو کر رہ گئے۔''
''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔شکل و صورت کی اچھی ہو۔تم سے شادی کرنے کے لیے تو بہت لوگ تیار ہو جائیں گے۔''
اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔''ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ میری شادی کے بارے میں سوچتے۔ماموں ممانی کو میری کیا فکر، انہیں تو ایک مفت کی نوکرانی ملی ہوئی ہے۔''
''اچھا، اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔فی الحال تم کیشیئر سے دس ہزار روپے لے لو۔میں مینیجر سے کہہ دیتا ہوں۔اپنا خیال رکھنا اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو مجھے فوراً بتا دینا۔تم کسی بھی وقت میرے پاس آسکتی ہو۔''
''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔''آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔آپ نے مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا۔میرا ماموں اتنا ذلیل انسان ہے کہ دس ہزار کی خاطر مجھے کسی کے ہاتھ بیچ بھی سکتا ہے۔''
''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔اس سے پہلے ہی تمہارا کوئی بندوبست کر دوں گا۔''
اس پہلی ملاقات کے بعد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہی لڑکی میرے لیے بہترین انتخاب ہو سکتی ہے۔وہ ہر اعتبار سے میری دوسری بیوی بننے کے لائق تھی۔وہ لاوارث اور غریب تھی۔اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔اس لیے وہ دب کر رہتی اور کسی اونچ نیچ کی صورت میں مجھے اس کے رشتے داروں کا سامنا کرنے کا خطرہ نہیں تھا۔وہ جن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی اس کے پیشِ نظر اسے میری پیشکش قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔جب میں اسے ایک محفوظ پناہ گاہ اور ایک پُرآسائش زندگی فراہم کرنے کا وعدہ کرتا تو وہ میری ہر شرط ماننے پر تیار ہو جاتی۔

اصل مسئلہ تو مجھے اپنے گھر میں تھا۔ گو کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سوکن کو قبول نہیں کرے گی۔ اس نے محض وقتی جوش میں آکر ایسا کہہ دیا تھا۔ جو عورت عام گفتگو میں اپنی بات اوپر رکھنا چاہتی ہو وہ اپنے سہاگ میں شراکت کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ فی الحال اس شادی کو خفیہ رکھنا ہی بہتر ہوگا اگر دوسری بیوی سے بچہ ہوگیا تو میں کسی مناسب موقع پر اسے بتا دوں گا۔ اس وقت وہ دفاعی پوزیشن میں ہوگی اور بچے کی خاطر اسے سوکن کو قبول کرنا پڑے گا۔

زرینہ نے جو کچھ مجھے اپنے ماموں کے بارے میں بتایا اس کے پیشِ نظر مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ بدطینیت انسان پیسوں کی خاطر اپنی بھانجی کا سودا نہ کردے، اگر وہ کسی ہوس زدہ بوڑھے یا بردہ فروش کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ اس لیے اسے جلد از جلد ماموں کے چنگل سے آزاد کرانا ضروری تھا۔ میں اس سے اس سلسلے میں بات کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی مجھ سے ملنے چلی آئی۔ سیکریٹری نے انٹر کام پر اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں نے فوراً ہی اسے بلا لیا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

میں اسے روتا دیکھ کر پریشان ہوگیا اور بولا۔ ”کیا ہوا زرینہ پھر کوئی بات ہوگئی؟“

اس نے جواب دینے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ کرایا تو وہ بولی۔ ”اب میں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ خبیث ماموں میرا سودا کر رہا ہے۔ اگلے جمعہ کو ایک ستر سالہ بوڑھے سے میرا نکاح ہے۔ آپ مجھے دارالامان یا کسی ہوسٹل میں جگہ دلوا دیں۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی میرے خدشات حقیقت بن کر سامنے آجائیں گے۔ میں نے زرینہ کو تسلی دی اور کہا۔ ”ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور میں نے بھی یہ حل سوچ لیا ہے۔ بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ۔“

”میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔“

”میں نے جو کچھ سوچا ہے اس میں میری غرض بھی شامل ہے۔“ پھر میں نے اسے مختصراً اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اگر وہ چاہے تو میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن یہ شادی خفیہ رہے گی جب تک میں چاہوں گا۔ میں اسے ایک الگ گھر میں رکھوں گا اور اسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کروں گا۔“

اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور جانتی ہوں کہ آپ سے شادی کر کے کم از کم مجھے اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے دو دن کا وقت دو تاکہ میں تمہارے رہنے کے لیے گھر کا بندوبست کرسکوں۔ فی الحال تمہیں اپنے آپ کو سب سے چھپا کر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ماموں تمہاری تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان مارے گا۔ تم یہ ملازمت چھوڑ دوگی اور نقاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ اگر تم نے اپنے آپ یا اس شادی کو خفیہ نہ رکھا تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کرسکوں گا۔“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔“

اس کے بعد سب کچھ اسی طرح ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ میں نے اس کے لیے شہر کے دور دراز علاقے میں ایک فلیٹ کا بندوبست کیا۔ اسے ضروری سازوسامان سے آراستہ کیا۔ جمعرات کے دن میں نے فوزیہ سے کہا کہ دو تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے زیادہ دن لگ جائیں۔ اس نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا کیونکہ میں کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر بلکہ بیرونِ ملک بھی جاتا رہتا تھا۔

لنچ کے وقفے میں، میں نے زرینہ کو بلایا اور کہا کہ وہ سپروائزر سے چھٹی لے کر چلی جائے اور اگلے چوک پر میرا انتظار کرے۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی فیکٹری سے باہر آگیا۔ وہ مقررہ جگہ پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اسے لے کر بازار گیا۔ اس کے لیے کپڑے، جوتے۔ جیولری اور میک اپ کا سامان خریدا پھر اسے لے کر اسی فلیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے پہلے ہی ایک ادھیڑ عمر عورت کا بندوبست کرلیا تھا جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی۔ پھر میں نے ایک دوست کو فون کر کے قاضی اور گواہوں کا انتظام کرنے کے

لیے کہا اور عصر کے بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔
میں تین دن اس کے پاس گزارنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ میں نے ملازمہ کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ پڑوسیوں یا محلے کے لوگوں سے زیادہ میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی پھر بھی میں اسے دن میں دو تین مرتبہ ضرور فون کرتا اور شام میں اس سے ملنے بھی جاتا۔ کبھی کبھی اسے شاپنگ کرانے یا کھانا کھلانے بھی لے جاتا۔
دو ماہ بعد ہی اس نے مجھے وہ خوش خبری سنائی جس کا میں عرصہ دراز سے منتظر تھا۔ یہ خبر سنتے ہی میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ جی چاہا کہ سڑک پر نکل جاؤں اور چلا چلا کر کہوں۔ ''لوگوں میں باپ بننے والا ہوں۔ میں باپ بننے والا ہوں، اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس خوشی میں فوزیہ کو بھی شریک کرلوں لیکن یہ قبل از وقت ہوتا۔ میں نے سوچا کہ بچہ خیریت سے اس دنیا میں آجائے تو اسے بھی بتادوں گا۔
اس کے بعد زرینہ میرے لیے اور اہم ہو گئی۔ میں اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔ باقاعدگی سے اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس کی دواؤں اور غذا پر بہت زیادہ توجہ دیتا کیونکہ ڈاکٹر نے بہت زیادہ احتیاط کرنے کے لیے کہا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی سے اس کی یا بچے کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی پائنتی سے لگ کر بیٹھ جاتا لیکن ایسا عملاً ممکن نہیں تھا۔
بالآخر وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ زرینہ کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں نے فوزیہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ فیکٹری میں کام زیادہ ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ مجھے گھر آنے میں دیر ہو جائے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ معمول کی بات تھی۔ زرینہ کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ نارمل ڈیلیوری کیس نہیں ہے۔ اس کے لیے آپریشن کرنا ہو گا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذات پر دستخط کر دیے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔
ایک طویل صبر آزما انتظار کے بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''مبارک ہو بیٹی پیدا ہوئی ہے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' میں نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ ''زرینہ تو ٹھیک ہے؟''
''سوری سر۔ ہم آپ کی مسز کو نہیں بچا سکے۔''
مجھے یوں لگا جیسے آسمان میرے سر پر آن گرا ہو۔ لمحہ بھر پہلے ملنے والی خوشی غم کی دبیز تہہ میں چھپ گئی۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ زرینہ تو چلی گئی۔ اب اس بچی کو کس کے حوالے کردوں۔ اگر گھر لے کر جاتا ہوں تو فوزیہ کو کیا بتاؤں گا۔ کیا وہ اس بچی کو قبول کرلے گی یا اسے یتیم خانے میں داخل کرادوں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا میرے جیتے جی یہ بچی یتیم خانے میں نہیں جائے گی۔ میں اسے ہر قیمت پر گھر لے کر جاؤں گا۔ فوزیہ سے کچھ بھی کہہ دوں گا۔ اگر وہ مان گئی تو ٹھیک ورنہ اس کے لیے ایک آیا رکھ لوں گا۔ بہرحال اس بچی کی پرورش میری ذمے داری تھی۔
میں بچی کو لے کر گھر پہنچا تو فوزیہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ ''بالآخر آپ نے اپنی خواہش پوری کرلی۔ اگر کوئی بچہ گود لینا تھا تو لڑکا لے کر آتے جو بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنتا۔''
''جو تم سمجھ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔'' میں نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ جس میں اسپتال کے کاغذات اور بچی کا برتھ سرٹیفکیٹ تھا۔ ''اسے میں اسپتال سے لایا ہوں۔ یہ میری ایک ورکر کی بیٹی ہے۔ فیکٹری میں ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی چنانچہ ہم نے اسے اسپتال بھیج دیا۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا ہے اور ہمارے پاس اس کے کسی قریبی عزیز یا رشتے دار کا پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسپتال سے سپروائزر نے فون کر کے بتایا کہ اس عورت کا آپریشن ہو گا چنانچہ میں اسپتال چلا گیا۔ اس عورت کا آپریشن ہوا اور وہ اس بچی کو جنم دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب یہ بچی لاوارث ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اس کی پرورش کریں گے۔ اللہ میاں نے اس ننھی پری کی صورت میں ہمیں تحفہ دیا ہے لیکن اگر تم نہیں چاہتیں تو میں اسے صبح یتیم خانے میں داخل کرا دوں گا۔''
فوزیہ نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ اس کہانی میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ پھر بچی کو گود میں لیتے ہوئے بولی۔ ''اے اللہ کتنی پیاری ہے۔ یہ یتیم خانہ نہیں جائے گی۔ میں اسے پالوں گی۔''
یہ کہہ کر اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی سوئی

ہوئی ممتا جاگ گئی تھی۔ وہ بچی کو دیوانہ وار چوم رہی تھی پھر اس نے بچی کے لیے دودھ کا انتظام کیا اور بولی۔ ''آپ کو بازار جانا ہوگا۔ اس کے لیے کچھ چیزیں لانی ہیں۔''

پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ یہ سامان لے کر آئیں۔ میں اس کے لیے کسی آیا کا بندوبست کرتی ہوں۔''

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ فوزیہ نے نہ صرف اس بچی کو قبول کرلیا تھا بلکہ جی جان سے اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی جیسے وہ اسی کی بیٹی ہو۔ میں نے باہر آکر سپروائزر کو فون کیا کہ وہ زرینہ کی ڈیڈ باڈی ایدھی ہوم میں رکھوا دے۔ صبح اس کی تدفین کردی جائے گی۔

ہم نے اس بچی کا نام طوبیٰ رکھا۔ میرا تو خیر وہ خون تھی لیکن فوزیہ بھی اسے سگی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔ جب وہ بڑی ہوئی تو میں نے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا دیا۔ فوزیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''یہ آپ کیا کررہے ہیں؟''

''مجھے اس کے باپ کا نام معلوم نہیں۔ اس خانے میں کسی نہ کسی کا نام تو لکھنا ہوگا۔''

''آپ جانتے ہیں کہ یہ غیر شرعی اور غیر قانونی ہے۔''

''مجبوری میں سب جائز ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

طوبیٰ بہت ذہین تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے تعلیمی مدارج طے کیے اور یونیورسٹی میں پہنچ گئی۔ سب لوگ اسے ہماری سگی اولاد ہی سمجھتے تھے لیکن جب اس کے لیے ایک رشتہ آیا تو فوزیہ نے مجھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ لڑکے والوں کو بتا دیں کہ طوبیٰ ہماری سگی بیٹی نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے پالا ہے۔''

''اگر انہیں یہ بات بتا دی گئی تو وہ پلٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ جاننے کے بعد شاید طوبیٰ کو کوئی بھی قبول نہ کرے۔''

''ان سے چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا اگر بعد میں انہیں یہ بات معلوم ہوگئی تو طوبیٰ کے لیے پریشانیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور نکاح نامہ میں آپ کیا لکھوائیں گے؟''

''وہی جو ہر جگہ لکھوایا ہے۔ ب فارم، شناختی کارڈ، اسکول کے رجسٹر میں ہر جگہ ولدیت کے خانے میں میرا نام ہی لکھا ہے۔''

''لیکن یہ جھوٹ ہے۔ دنیا میں تو آپ نے جھوٹ بول لیا لیکن نکاح نامہ ایک شرعی دستاویز ہے۔ اس میں جھوٹ نہیں چلے گا۔''

''یہ سچ ہے۔'' میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کیا مطلب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں فوزیہ یہی سچ ہے۔ میں ہی طوبیٰ کا باپ ہوں۔''

پھر میں نے اسے الف سے لے کر ی تک پوری کہانی سنا دی۔ وہ دم سادھے سنتی رہی پھر بولی۔ ''اور آپ نے اتنے برسوں تک یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔''

''ہاں فوزیہ مجھے ڈر تھا کہ تم اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کروگی۔''

''اس حقیقت کو تو میں نے اسی وقت قبول کرلیا تھا جب آپ اسے لے کر گھر آئے تھے۔ میں جان گئی تھی کہ یہ آپ ہی کی اولاد ہے۔ اس کا پتا مجھے اس فائل سے چلا جو آپ بے دھیانی میں میز پر چھوڑ کر بازار چلے گئے تھے۔ اسپتال کے کاغذات اور برتھ سرٹیفکیٹ سے مجھے حقیقت کا پتا چل گیا تھا اور اسی لیے میں نے اس بچی کو آپ کی اولاد سمجھ کر قبول کرلیا اور اسے سگی بیٹی کی طرح پالنے لگی لیکن میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی تھی اور آپ نے اس حقیقت کو بتانے میں اتنے برس لگا دیئے۔''

''مجھے تمہاری ناراضی کا خوف تھا۔''

''کیوں؟ میں نے تو خود آپ کو دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔''

''کہنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے فوزیہ۔ میں جانتا تھا کہ تم سوکن کا وجود برداشت نہیں کرسکوگی۔''

''مجھے اسی بات کا افسوس ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کیا۔ آپ یہ کیوں بھول گئے کہ عورت کا دل ایک سمندر کی مانند ہوتا ہے اور وہ بہت کچھ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر میں کم ظرف ہوتی تو کبھی طوبیٰ کو سگی بیٹی کی طرح نہ چاہتی۔ قانون بھی یہی کہتا ہے کہ میاں بیوی کی جائیداد، اثاثے سب مشترکہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے طوبیٰ صرف آپ ہی کی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ کیا ہوا، اگر میں نے اسے اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی عورت کا دل واقعی سمندر کی مانند ہوتا ہے جسے سمجھنے میں مجھے اتنے برس لگ گئے۔

جذبہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام تہنیت

ہم جنت نظیر ملک میں آزادی سے رہ رہے ہیں، اس لیے ہمیں آزادی کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس بارے میں غلامی کی زنجیروں سے جکڑے مقبوضہ کشمیر کے کسی فرد سے پوچھیے۔ جب مجھے زیبی کے بارے میں بتایا گیا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ سچ بیانی اسی زیبی کی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

افتخار حسین اعوان
(مظفر آباد آزاد کشمیر)

یہ مہینے کی آخری جمعرات تھی۔ ہر دوسری اور آخری جمعرات کو یہاں میلے جیسا سماں ہوتا تھا۔ جی ہاں!! لوگ اسے میلہ ہی کہتے ہیں۔ اور میلہ کسی قسم کی خرید و فروخت یا موج مستی کا نہیں ہوتا تھا اس میلے میں صرف آہیں اور سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتے دریا کے آر پار مرد، عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کا ایک بہت وسیع ہجوم ہوتا تھا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ دریا کے ایک طرف شگفتہ اور اجلے چہرے اپنی چھب دکھلاتے تھے تو دوسری طرف

پریشانی سے اٹے، مرجھائے ہوئے غمگین چہرے نظر آتے تھے۔ ہاں البتہ ایک قدر دونوں طرف مشترک تھی کہ سبھی آہ و زاری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سبھی روتے بلکتے ایک دوسرے کو صدائیں دیتے ہلکان ہوتے تھے۔

یہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا کراسنگ پوائنٹ تھا۔ جس کے آر پار ہر دوسری اور چوتھی جمعرات جمع ہونے والے لوگ اپنے رشتہ داروں کو دور سے دیکھتے ہوئے نیر بہاتے تھے۔ شاہ زیب عرف زیبی بھی اپنے والدین اور بہن کے ساتھ اس پار کے رشتہ داروں کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔

جب برصغیر کی جغرافیائی حدود کے بٹوارے کا اعلان ہوا تو کشمیر پر اس وقت ڈوگرا راجا کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے انگریزوں نے کشمیر کے عوام کو حق خود ارادیت کا اختیار دینے کا اعلان تو کر دیا لیکن ابھی بہت سی تباہی پردۂ غیب سے نمودار ہونی تھی۔ کشمیر کی 80 فیصد مسلم آبادی کا فیصلہ یقینی طور پر پاکستان کے حق میں ہوتا۔ ہندو بنیے کو یہ بات قطعی گوارا نہ تھی۔ راجا ڈوگرہ نے بھارتی فوج کو کشمیر میں داخل کروا دیا۔ پاکستانی فوج کی جوابی کارروائی اب لازم تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی غیور پاکستانی عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرحد (کے پی کے) سے قبائلی معمولی ہتھیار لے کر اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کو آپہنچے اور سری نگر تک جا پہنچے۔

ہندو قوم فطری طور پر بزدل اور سازشی واقع ہوئی ہے جب بازی پلٹتے دیکھی تو مظلومیت کا لبادہ اوڑھے عالمی امن کے ٹھیکیدار اقوام متحدہ کے در پر جا بیٹھے۔ جہاں ایک متفقہ قرداد کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں ریفرنڈم کروایا جائے گا۔ اقوام متحدہ نے فوری جنگ بندی کرواتے ہوئے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں حد بندی کر دی۔ یہ اچانک ہونے والا فیصلہ دونوں اطراف کے عوام کے لیے ناگہانی آفت ثابت ہوا۔ اور خاندان و رشتے حد بندی کی نادیدہ تلوار نے دو حصوں میں تقسیم کر دیے۔ جو جہاں تھا، واپس اپنوں سے جا کر نہ مل سکا۔ شوہر ایک طرف تو اس کی یاد میں تڑپتے بیوی بچے دوسری طرف رہ گئے۔ بلکتے والدین اور دیگر بہن بھائی کشمیر کے ایک حصے میں تو ان کا جگر گوشہ، دوسری طرف۔ غرض جو جدھر تھا وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ حد بندی کی اس لائن کو "لائن آف کنٹرول" کا نام دیا گیا۔

زیبی کے دادا بھی یونہی آزاد ہونے والے خطے میں رہ گئے تھے جبکہ ان کا تمام تر خاندان مقبوضہ کشمیر میں تھا۔ تب وہ جوان تھے۔ انھوں نے وہیں شادی کر لی اور ان کے ہاں دو بیٹوں کی ولادت ہوئی۔ زیبی کے والد اور اس کے تایا۔ تایا نے شادی نہیں کی تھی۔ انہوں نے نوعمری میں ہی قسم کھالی تھی کہ وہ اپنی سرزمین کو آزاد کرا کر دم لیں گے اسی لیے وہ بچپن ہی میں ایک جہادی تنظیم سے منسلک ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے کئی ایسے معرکے سر کیے کہ تنظیم کی کمانڈ انہیں دے دی گئی۔ کمانڈر بن کر انہوں نے بھارتیوں کو خوب ناکوں چنے چبوائے اور بالآخر جام شہادت نوش کر گئے۔

☆☆☆

یہ ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ دیوار کے ساتھ بڑی سی میز کی پیچھے کرخت صورت ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ یہ انڈین آرمی کا کرنل مہتا تھا۔ اس کے سامنے کرسی پر براجمان شخص قدرے جواں سال تھا۔ اس کے چہرے مہرے پہ بھی خباثت ثبت تھی۔ آنکھوں میں شاطرانہ چمک لیے مجسم خبیث وہ شخص کرنل کے سامنے بہت ادب سے بیٹھا تھا۔ میجر راون نامی اس خون آشام بلا کی تعیناتی آج ہی پرموشن کے بعد مقبوضہ کشمیر میں ہوئی تھی۔ راون کا سابقہ ریکارڈ اس کی بدخصلتی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ اپنے شکار کو بھگا بھگا کر اور تڑپا تڑپا کر مارنے کا عادی تھا۔ اس کا خمیر جبر، کمینگی اور ظلم سے گندھا تھا۔ جوان لڑکیاں اس کی مرغوب غذا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کے انھی اوصاف کے پیشِ نظر اس کی تعیناتی مقبوضہ کشمیر میں کی گئی تھی۔

اس وقت میجر راون اپنے سینئر کرنل مہتا سے بریفنگ لے رہا تھا۔

☆☆☆

اس رات زیبی سو نہیں سکا تھا۔ کراسنگ پوائنٹ پر اس کی آنکھوں نے جو مناظر دیکھے تھے، وہ اس کے اندر حد درجہ بے چینی جگا کر اس کی نیند غائب کر چکے تھے۔ رہ رہ کر اس کے پردہ بصارت پر وہی مناظر گردش کر رہے تھے۔ رونا دھونا تو دریا کے شور میں دب گیا تھا لیکن ایک بجے کے لگ بھگ چند بھارتی فوجی جانے کہاں سے وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔ مردوں پر لاٹھیاں برسائی گئیں تو عورتوں اور بچوں کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا۔ زیبی ان لوگوں کی بے بسی پر تڑپ کر رہ گیا۔ اس پار کے لوگوں کی آنکھوں میں لہراتے حسرت، غلامی اور بے بسی کے مہیب سائے وہ بھول نہیں پا رہا تھا۔ ان سب میں اس کا اپنا خاندان بھی تو موجود تھا۔

بے چینی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

اپنی سوچوں سے نبرد آزما اس کے ذہن میں بارہا ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ جانے کب تک وہ سب اس غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے۔ آزادی کا خواب آنکھوں میں سجائے جانے کب تک وہ اس ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے۔ تبھی زیبی کے دل میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا۔ اس نے اپنے تایا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مجاہد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی طرح وہ کشمیری بھائیوں کے مصائب ختم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا تھا۔ اس سوچ اور فیصلے نے اس کے رگ و پے میں سکون اور طمانیت کی لہریں دوڑا دیں اور دھیرے دھیرے نیند نے اسے اپنی مہربان آغوش میں بھر لیا۔

☆☆☆

میجر راون اسم با مسمّی ثابت ہوا تھا۔ مسلمانوں سے نفرت اس کی گھٹی میں شامل تھی۔ چارج سنبھالتے ہی اس نے اپنی خباثت دکھانی شروع کر دی تھی۔ آغاز اس نے اسکولوں سے کیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے کسی بھی اسکول میں جا گھستا اور ننھے ننھے معصوم بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتا۔ بچوں کی ہراساں، وحشت زدہ نظریں اس کے حیوانی جذبے کو تسکین دیتی تھیں، آسودہ کرتی تھیں۔ کالجز میں جا کر مسلمان طالبات کو علیحدہ کر لیتا اور ان سے بے سروپا سوالات کرتا بہانے بہانے سے اس کے ناپاک ہاتھ جسارت کرتے۔ اس نے وادی کے کئی مسلم گھرانوں میں پوچھ تاچھ کے بہانے جا کر کئی خواتین کی آبروریزی کی تھی۔ اس کے شکاروں میں بعد ازاں اس کے ہرکارے بھی اپنا حصہ ڈالتے۔

قانون اندھا بھی تھا اور بہرا بھی قانون کے لمبے ہاتھ میجر راون جیسے لوگوں کی حمایت کرتے تھے کئی دہائیاں پہلے ہی رہن رکھوا چکے تھے۔ اجتماعی آبروریزی کے بعد کئی خواتین کو گاؤں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ ان کے گھروں میں موجود معمولی مالیت کے سامان سے لے کر ان کے ڈھور ڈنگر تک لوٹ لیے تھے۔ مسلم عوام کا جینا دوبھر ہو چکا تھا۔ میجر راون ایک عذاب کی مانند ان پر مسلط تھا۔ اس کے شکار اسے خدا کا واسطہ دیتے رحم مانگتے تو وہ زہریلے انداز میں کہتا

"تم مسلوں کا خدا بھی تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتا۔ ایک ایک کو روند کے رکھ دوں گا۔ ابھی تو تمہاری مسجدوں میں مجرے کرواؤں گا تم لوگوں سے۔"

عوام کے پاس صرف ایک اللہ کا ہی آسرا تھا جس کے

آریائوں کی آمد

1750ء اور 1200ء قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں آریائی وادی سندھ میں نقل مکانی کر کے آئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس خطے کی اعلیٰ تہذیب یافتہ شہری ثقافتیں ختم ہو چکی تھیں کیونکہ انہیں آریاؤں نے بہ آسانی فتح کر کے اپنی ثقافت میں جذب کر لیا تھا۔ ابتدائی آریاؤں کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ ویدی ادب میں بکھرے ہوئے حوالہ جات اشارہ کرتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر آوارہ خانہ بدوش تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ریوڑ کے پیچھے جاتے تھے۔ بظاہر ان کی کوئی مستقل بنیادیں یا شہر نہیں تھے۔ اس عرصے کے آریا قبیلوں کی صورت میں رہتے جن کی سربراہی سردار کرتے تھے جنہیں راجا کہا جاتا تھا۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا الیوس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

وید

ہندومت کا بنیادی مقدس صحیفہ وید ہیں۔ یہ کتابیں ہندو نظریہ کائنات کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ وید بنیادی طور پر چار ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم رگ وید ہے (وید لفظ کا اصل مطلب "علم" ہے) یہ آریائی دیوتاؤں کے لیے ایک ہزار سے زائد مناجاتی گیتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں کئی دوسرے مواد بھی موجود ہیں۔ یہ دیوتاؤں کی بنیادی اساطیر پر مشتمل ہے۔ دوسری ویدی کتب زیادہ تر اسی مواد پر مشتمل ہیں جو اصل میں رگ وید میں موجود ہے۔ دوسری کتاب یجروید (رسومات کا علم) ہے۔ یہ دیوتاؤں کے حضور قربانی کے دوران گائے جانے والے مواد کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب سام وید بنیادی مناجاتی گیتوں میں سے اشعار کا مجموعہ ہے جو پروہتوں کی طرف سے قربانی پر پڑھے جاتے تھے۔ چوتھی کتاب جو رگ وید کے بعد دوسری اہم کتاب ہے۔ اتھر وید ہے (رشی اتھرو کی طرف سے دیا جانے والا علم) یہ دیوتاؤں کے لیے کی جانے والی مقبول عبادتوں میں استعمال کی جانے والی رسومات پر مشتمل ہے اس کے ساتھ ہی برائی کو بھگانے کے لیے سحر اور جادو کا طریقہ کار بھی ہے۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا الیوس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

آگے وہ گڑگڑا کر اپنی عافیت کی بھیک مانگ سکتے تھے۔مظلوم کی آہیں ہمیشہ عرش ہلا دیا کرتی ہیں۔ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا جاتا ہے۔راون کو بھسم کرنے کا فیصلہ لوحِ تقدیر پر لکھا جاچکا تھا۔

☆☆☆

''ابا جی! میں مجاہد بننا چاہتا ہوں۔''

یہ الفاظ ایٹم بم کی طرح زیبی کے والد کی سماعت پر گرے تھے۔وہ ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے۔لیکن ان کی پدرانہ شفقت ان پر حاوی ہو کر ان کے ملی جذبے کو کمزور کردیتی تھی۔زیبی ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی بقا پر ان کی آنے والی نسل منحصر تھی۔بیٹی تو پرایا دھن تھی اور اکلوتا بھائی پہلے ہی جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ان کے بشری تقاضے ان کو اپنے بیٹے کی بقا پر اکسا رہے تھے۔''میں تمہارے جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں زیبی! لیکن تمھیں اس فیصلہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''لیکن کیوں ابا جی! میرا وطن لہولہان ہے۔اس کی پکار مجھے بے چین رکھتی ہے۔میں اس پاک دھرتی پر دشمنوں کے ناپاک قدموں کا قلعہ قمع کرنا چاہتا ہوں۔''

''وطن کا حق اپنی جگہ مسلّم! لیکن بوڑھے والدین کے بھی تو کچھ حقوق ہیں ناں۔''

ان کی ہزار ہا منتوں واسطوں اور جذباتی استحصال کے باعث زیبی نے وقتی خاموشی اختیار کر لی۔لیکن اس کا جذبہ جہاد کسی آہنی چٹان کی طرح اب بھی قائم ودائم تھا۔

اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا جو ہر ظلم کو اپنے ساتھ خس وخاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتا تھا۔اسے معلوم تھا کہ اگر اس کا جذبہ صادق ہے تو اسے ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ مل جائے گا۔بالآخر اس کی دعائیں رنگ لائیں۔

کالج کی سالانہ تقریب انعامات میں اسے تقریر کرنے کا موقع ملا۔اس تقریب میں کشمیر کی جہادی تنظیم کے کئی مجاہدین بھی شامل تھے۔اس کی تقریر کا موضوع بھی آزاد.. کشمیر تھا۔جب وہ اسٹیج پر آیا تو اس کا جنون سر چڑھ کر بولنے لگا۔

''اے میرے پیارے کشمیر!! میں کہاں سے شروع کروں جو یہ بتا سکوں کہ تو نے کتنے سیاہ باب دیکھے۔700 سے شروع کروں جب یہاں مسلم حکومت تھی یا اس وقت کا نوحہ پڑھوں جب ڈوگروں نے تجھ پہ تسلط جمایا اور اس پاک دھرتی پہ اپنے ناپاک قدم رکھے۔تاریخ گواہ ہے کہ میرے کشمیر جنت نظیر نے بہت ظلم سہے ہیں۔سولہ سو عیسوی سے لے کر اگلی اڑھائی صدیوں تک ظلم کا وہ کون سا پہاڑ تھا جو میری دھرتی پر توڑا نہ گیا۔ڈوگرہ حکمرانوں نے ستر لاکھ میں تجھے فروخت کیا۔کیا تیرا مول بس اتنا تھا؟ بٹوارے کے بعد یہاں کے عوام کو حق خود ارادیت کا ڈھکوسلا دیا گیا۔تیری سہانی فضاؤں میں بارودی ذرات اڑائے گئے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی افواج یہاں بھیج کر تیرا تقدس پامال کیا۔ہر طرح کا گھناؤنا جرم سرزد ہوا یہاں۔باپردہ خواتین کو گلیوں میں برہنہ گھسیٹا گیا۔ہزاروں نوجوان جیلوں میں قید ہیں نہتے افراد پر گولیاں چلائی گئیں۔میں کس کس المیہ کا نوحہ پڑھوں۔84000 مربع میل میں سے صرف 4000 مربع میل پاکستان کے حصے میں آیا۔کشمیر کے اس ٹکڑے میں ہونے والے مظالم بیان کرنے لگوں تو دل پھٹ جائے گا۔مگر میرے لہو رنگ کشمیر کے آزاراں کہے رہیں گے۔اس دھرتی پر ایک لاکھ سے زائد افراد کا لہو بہایا جا چکا ہے۔اگر مزید قربانیاں درکار ہیں تو ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔جسم کے آخری قطرہ خون تک تیری حرمت کے بچاؤ کے لیے لڑیں گے۔''

زیبی کے جذبے نے تنظیم کے اراکین کو بہت متاثر کیا۔تقریب کے بعد کالج کے خفیہ تہ خانے میں انہوں نے زیبی سے ملاقات کی۔ایک سرکردہ لیڈر کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔

زیبی بڑے اعتماد سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔لیڈر کا بارعب چہرہ اور آہنی عزم کی آئینہ دار آنکھیں زیبی کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔انہوں نے چند ثانیے بعد سوال کیا۔''جہاد کا عزم رکھتے ہو؟''

زیبی مضبوط لہجے میں بولا۔''جی ہاں۔''

''یہ راہ بہت پُرخطر ہے اور تم ابھی نوجوان ہو۔''

''جہاد میرا جنون ہے۔اور بھارتیوں کو نیست و نابود کرنا میرا مقصد۔جتنی بھی دشواریاں آئیں سہہ لوں گا۔زندگی کی بھی پرواہ نہیں۔''

''جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

لیڈر کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہلکا سا تبسم نظر آیا اور انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔

زیبی کے والد سے تنظیم کے افراد نے خود رابطہ کیا اور انہیں واضح کر دیا کہ زیبی اب بہت دور نکل چکا ہے۔لہٰذا

اسے بخوشی اس کارِ خیر کی اجازت دے دیں۔

اس کے والد نے نم آنکھوں سے ڈھیروں دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کر دیا۔ پہلے چند ماہ زیبی کو اسلحہ چلانے کے ساتھ ساتھ سخت جسمانی تربیت بھی دی گئی، کئی بار وہ مشقت سے چور ہو کر گرتا لیکن ایک الوہی جذبہ پھر سے دامن گیر ہو کر اسے ایک نئی توانائی عطا کر دیتا تھا۔

ٹریننگ کے بعد زیبی اور اس جیسے دیگر ٹیم ممبران کو خاموشی سے بارڈر پار کروا دیا گیا۔ ان لوگوں کو جس گاؤں میں پہنچایا گیا یہ وہی گاؤں تھا جہاں میجر راون نے انت مچا رکھی تھی۔

☆☆☆

زیبی کے دل و دماغ میں ایک آگ روشن تھی۔

اس کے سامنے دو ہی منزلیں تھیں۔ غازی یا شہید۔ پہلا دن ایک جنگل میں روپوش رہ کر گزارا جہاں سے ایک گائیڈ انہیں اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ اسی گائیڈ نے انہیں میجر راون کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ زیبی سے ظلم کی یہ داستان برداشت کرنی محال تھی اس نے فوری فیصلہ کیا کہ ان کا پہلا ٹارگٹ راون ہی ہوگا۔

اس نے اپنے مشن کے تمام تر پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے ایک پلان مرتب کیا۔ اگلے چند دن وہ میجر کی ریکی کرواتے رہے تاکہ اس پر مکمل ہاتھ ڈالا جا سکے۔ مخبر سے انہیں معلوم ہوا کہ رواں ہفتے میں انڈین آرمی کے چیدہ افسران نے عیش سرور کی ایک محفل جمانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ شراب کباب کا دور دورہ ہوگا اور کئی مسلمان گھرانوں کی مغوی لڑکیاں وہاں لائی جائیں گی۔

زیبی کے خون میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ اس نے اپنی ٹیم ممبرز کے ساتھ ایک مکمل منصوبہ بنایا اور اسی دن آرمی چوکی پر حملہ کر دیا۔ چند سپاہی باہر موجود تھے لیکن وہ بھی مکمل طور پر الرٹ نہ تھے زیبی کے ساتھیوں نے پوری قوت سے ان پر حملہ کیا اور انہیں سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ انھیں جہنم واصل کر کے انھی کے یونیفارم میں وہ آرمی جیپ میں کچھ آگے واقع ہیڈ کوارٹر کی طرف آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوئے۔

زیبی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا جبکہ باقی دو کو باہر رکنے کا حکم دیا گیا۔ آرمی یونیفارم کی وجہ سے انھیں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اندر عیش و نشاط کا ماحول تھا۔ افسران بدمست ہاتھیوں کی طرح سہمی ہوئی لڑکیوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

زیبی نے اپنی رائفل سیدھی کر کے انھیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر برسٹ کھول دیا۔ آن کی آن میں وہاں خون کا ایک تالاب سا بن گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر باہر سے چند افسران نے اندر آنا چاہا لیکن زیبی کے دونوں ساتھیوں نے ایسا کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

میجر راون کا یومِ حساب آ چکا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن زیبی نے اس کی دونوں ٹانگیں چھلنی کر دیں۔ اس کے اندر غیض و غضب کا ایک آتش فشاں دہک رہا تھا۔ اپنے ساتھ موجود مجاہد کو اس نے لڑکیوں کو لے کر عقبی سائڈ سے بھاگنے کا حکم دیا اور خود میجر راون کے سر پر بندوق تان کر کھڑا ہو گیا۔ یقینی موت سامنے دیکھ کر راون بکری کی طرح منمنا رہا تھا۔ ”مجھے چھوڑ دو مورکھ! میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر راون! میرا جذبہ ہی میرے لیے سب سے بڑی متاع ہے۔“ زیبی نے پھنکار کر کہا۔

”تم مسلے کبھی کامیاب نہیں ہو پاؤ گے۔ ہماری طاقت تمھیں مسل کر رکھ دے گی۔“ راون ہذیان بکنے لگا۔

”یہ خواب تم اور تمھاری غاصب قوم جانے کب سے دیکھ رہی ہے۔ مسلم قوم ایک چٹان ہے راون! ہمارا جذبہ بہتی ہوا ہے جسے کبھی قید نہیں کیا جا سکتا۔“ زیبی نے بلند آواز سے نعرہ تکبیر ادا کرتے ہوئے میجر کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد وہ باہر چھپے اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور جیپ میں سوار ہو رہا تھا ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور زیبی کے گلے کو پھاڑ کر نکل گئی۔ کوئی بدبخت شاید زندہ بچ گیا تھا اور موقع پا کر چھت سے اس نے وار کر دیا۔ گولی چلنے کے فوری بعد دستی بم جیپ پر گرا اور باقی دو مجاہدین کے بھی پرخچے اڑ گئے۔

زیبی کے جذبہ صادق نے اس کی دلی تمنا پوری کر دی۔ اسے شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا اور گاؤں والوں کو شیطان ابنِ شیطان میجر راون کے چنگل سے بھی آزادی دلوا دی تھی۔

آج بھی آزاد کشمیر کے اس گاؤں میں لوگ زیبی کے قصے بچوں کو سناتے ہیں۔

مکرمی
السلام علیکم
ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی اریشہ کی ہے۔ اریشہ جو ایک عام سی گھریلو عورت ہے۔ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس نے سب کو حیران کردیا۔ اس کے فیصلے کو سراہنا ضروری ہے۔

عاطر شاہین
(ملتان)

کال بیل کی آواز سن کر کچن میں کرسی پر بیٹھی آلو کاٹتی اریشہ نے چھری میز پر رکھی اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بچے اسکول سے آئے ہوں گے کیونکہ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا اور اس کے بچے ایک بجے ہی اسکول سے آتے تھے۔ اریشہ نے دروازہ کھولا تو باہر اس کے بچے نہیں بلکہ اس کا چھوٹا بھائی ارسلان کھڑا تھا۔ ارسلان کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اریشہ بے اختیار چونک پڑی کیونکہ ارسلان خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بیگ تھا اور نہ ہی کوئی سوٹ کیس۔ وہ کافی عرصے کے بعد اس کے گھر آیا تھا۔

''السلام علیکم باجی۔'' ارسلان نے سلام کرتے ہوئے کہا۔

’’وعلیکم السلام۔‘‘ اریشہ نے خوشگوار حیرت سے جواب دیا۔

ارسلان اندر آ گیا تو اریشہ نے دروازہ بند کر دیا اور پھر اسے لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ارسلان، اریشہ سے چار سال چھوٹا تھا اور بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ اریشہ کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کا شوہر ریلوے میں جاب کرتا تھا اس لیے جب اس کا ملتان سے لاہور تبادلہ ہوا تو اریشہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ اب وہ چار کمروں پر مشتمل چھ مرلے کے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ اریشہ کے دو بچے تھے چھ سالہ منیب اور چار سالہ مہک۔ اریشہ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن بھائیوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا جبکہ ارسلان چوتھے نمبر پر تھا۔ ان کا بڑا بھائی شادی شدہ اور علیحدہ رہتا تھا جبکہ اس کے والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ اریشہ سے چھوٹا بھائی حسام پرائیویٹ ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جبکہ ارسلان، اس سے چھوٹی بہن پلوشہ اور سب سے چھوٹا بھائی حبیب ابھی پڑھ رہے تھے۔

ارسلان کی اچانک آمد پر وہ حیران ہوئی تھی کیونکہ ارسلان جب بھی لاہور آتا تھا تو اریشہ کو کال کر کے اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کر دیتا تھا اور وہ اس کے لیے ایک کمرا صاف کر دیتی تھی۔ آج سے دو ماہ قبل ہی ارسلان لاہور آیا تھا تو وہ ان کے ہاں ایک ہفتہ رہا تھا۔

’’بیٹھو۔‘‘ ڈرائنگ میں پہنچنے کے بعد اریشہ نے کہا تو ارسلان طویل سانس لیتے ہوئے یوں صوفے پر بیٹھ گیا جیسے بے حد تھکا ہوا ہو۔

’’باجی۔ بچے نہیں آئے؟‘‘ ارسلان نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں۔ آنے والے ہیں۔‘‘ اریشہ نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ’’آج کیسے اچانک آ گئے۔‘‘

’’بس باجی، میں نے سوچا آج آپ کو سرپرائز دوں گا۔‘‘ ارسلان نے کہا۔ ’’میں کچھ دن یہاں رہنے آیا ہوں۔ دراصل میرا دوست عامر بھی میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں آیا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے آیا ہے۔‘‘

’’تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟‘‘

’’میرا بیگ ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔ شکر ہے اس میں قیمتی سامان نہیں تھا۔‘‘

اریشہ نے ارسلان کے لہجے سے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے تاہم اس نے کوئی بات نہ کی۔ اسی لمحے کال بیل ایک بار پھر بج اٹھی تو اریشہ سمجھ گئی کہ اب منیب اور مہک آ گئے ہوں گے۔ چنانچہ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو منیب اور مہک تھے۔ انہوں نے امی کو سلام کیا اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ انہوں نے جب اپنے ماموں ارسلان کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئے۔ پھر ارسلان ان کے ساتھ گھل مل گیا۔

شام کو اریشہ کے شوہر ریحان گھر آئے تو وہ بھی ارسلان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اریشہ نے ارسلان کے لیے ایک کمرا صاف کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری صبح اریشہ کے شوہر جاب پر اور بچے اسکول چلے گئے تو وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی جبکہ ارسلان ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ تقریباً صبح کے نو بج رہے تھے کہ اس کی امی کی کال آ گئی۔ سلام دعا کے بعد امی نے پوچھا۔

’’اریشہ! کیا ارسلان تمہارے گھر ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اریشہ نے جواب دیا۔ ’’کیا وہ آپ کو بتا کر نہیں آیا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ امی کی آواز سنائی دی۔ ’’ہم نے اس کے بارے میں کہاں کہاں معلوم نہیں کیا۔ ساری رات ہم پریشان رہے۔ اس کے دوست بھی غائب ہیں۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا تو فون کر دیا۔‘‘

’’وہ آپ کو بتا کر کیوں نہیں آیا؟‘‘

’’پتا نہیں بیٹی۔‘‘ اریشہ کی امی نے کہا۔ ’’اب وہ کہاں ہے؟ میری بات کراؤ اس سے۔‘‘

’’وہ سو رہا ہے۔‘‘

’’اس نے تمہیں کیا بتایا ہے کہ وہ لاہور کیوں آیا ہے؟‘‘

’’امی! ارسلان بتا رہا تھا کہ وہ اپنے دوست عامر کے ساتھ لاہور آیا ہے۔ لاہور میں عامر کی خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ ارسلان کا بیگ بھی ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔‘‘ اریشہ نے بتایا۔

’’اس کا بیگ تو گھر میں ہے۔‘‘

’’کیا۔‘‘ اریشہ ٹھٹکی۔ ’’پھر اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔‘‘

’’پتا نہیں۔‘‘ امی کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ’’اچھا وہ جاگ جائے تو اس سے میری بات کرا دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے امی۔‘‘

رابطہ منقطع ہو گیا تو اریشہ نے اپنا سیل فون میز پر رکھ دیا

اور سوچنے لگی کہ ارسلان نے اس سے جھوٹ کیوں بولا، جب ارسلان جاگے گا تو وہ اس سے پوچھے گی۔ پھر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ دن کے گیارہ بجے ارسلان جاگا تھا۔ اس نے جب اریشہ سے ناشتے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ''تم منہ ہاتھ دھولو میں ناشتا بنادیتی ہوں۔''

ارسلان منہ ہاتھ دھو کر کچن میں ہی آگیا تھا۔ اریشہ اسے ناشتا دینے کے بعد اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''ارسلان۔ امی کا فون آیا تھا۔''

اریشہ کی بات سن کر ارسلان ناشتا کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر یکلخت پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''کیا کہہ رہی تھیں امی؟''

''تم انہیں بتا کر کیوں نہیں آئے تھے۔'' اریشہ نے کہا۔

''باجی! جب میں لاہور آنے کی تیاری کررہا تھا تو امی گھر پر موجود نہیں تھیں اس لیے میں انہیں بتائے بغیر ہی آگیا۔'' ارسلان نے جواب دیا۔

''امی تو یہ بھی بتا رہی تھیں کہ تمہارا بیگ گھر پر ہے جبکہ تم نے کہا کہ تمہارا بیگ ٹرین میں چوری ہوگیا ہے۔'' اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی جیسے وہ تفتیش کررہی ہو۔ اس کی بات سن کر ارسلان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا:

''باجی۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جو بیگ ٹرین میں چوری ہوا ہے وہ عامر کا تھا اور اسی میں میرے اور عامر کے کپڑے تھے۔''

اریشہ کو لگا کہ ارسلان اب بھی اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے جس کے بارے میں اس کی امی بھی لاعلم ہیں۔

''ناشتا کرکے امی سے بات کرلو۔''

''جی اچھا۔''

اریشہ وہاں سے اٹھ گئی تو ارسلان ناشتا کرنے میں مصروف ہوگیا تھا لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات بدستور موجود تھے۔

☆......☆......☆

دوپہر کو اریشہ کے بچے اسکول سے گھر آگئے تو ارسلان ان میں گھل مل گیا جبکہ اریشہ دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ اس کا سیل فون کچن میں ہی پڑا ہوا تھا کہ اس کی امی کی پھر کال آگئی۔ جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی تو اس کی امی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اریشہ!''

''کیا ہوا امی؟'' اریشہ چونکی۔

''ارسلان کہاں ہے؟''

''ڈرائنگ روم میں بچوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ کیوں کیا ہوگیا ہے۔''

''پولیس اس کی تلاش میں ہے؟''

''کیوں؟'' اریشہ حیران رہ گئی۔ ''کیا کیا ہے اس نے؟''

اس کی امی جواب دینے کی بجائے ہچکیاں لینے لگیں۔ ماں کی ہچکیاں سن کر اریشہ بے چین ہوگئی۔ ''امی! آپ کیوں رورہی ہیں۔''

''روؤں نہ تو اور کیا کروں۔''

''آخر ہوا کیا ہے امی۔''

''اس پر الزام ہے کہ اس نے......'' اریشہ کی امی اتنا ہی کہہ سکیں۔ وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔

''بتایئے امی۔''

''ارسلان نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی کی عزت پامال کی ہے۔''

''کیا؟'' اریشہ کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اسی لیے وہ لاہور تمہارے پاس آیا ہے۔ اس کا دوست بھی روپوش ہے۔'' اریشہ کو امی کی آواز سنائی دی۔ ''پولیس ان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ تم ارسلان کو کہیں چھپا دو تاکہ اگر پولیس تمہارے گھر آئے تو وہ ارسلان کو نہ پکڑ سکے۔''

''امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' اریشہ نے جلدی سے کہا۔ ''ارسلان نے اگر جرم کیا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' امی نے کہا۔ ''لیکن جانتی ہو ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔''

''امی۔ جس لڑکی کی زندگی ارسلان اور اس کے دوستوں نے برباد کی ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔ کیا اس کی بدنامی نہیں ہوئی۔'' اریشہ نے کہا۔

''ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلیں گے۔'' امی نے کہا۔ ''فی الحال تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔''

امی نے اتنا کہہ کر کال منقطع کردی تو اریشہ نے غصے سے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ ساری

بات واضح ہوگئی تھی کہ ارسلان اچانک اس کے گھر کیوں آیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے کچن سے نکل کر ارسلان کو آواز دی۔ ”ارسلان۔ ارسلان۔“

”جی باجی۔“ ارسلان نے دروازہ کھول کر جواب دیا۔

”ادھر آؤ۔“

ارسلان کچن میں آگیا۔ اریشہ اپنے بچوں کے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے کچن میں بلالیا تھا۔

”مجھے امی نے بتا دیا ہے کہ تم کیا کارنامہ انجام دے کر آئے ہو۔“ اریشہ کا لہجہ تلخ تھا۔ ارسلان یوں چونک پڑا جیسے اس کے سر پر بم پھاڑ دیا گیا ہو۔

”بج۔ بج۔ جی۔“ ارسلان کا لہجہ کھوکھلا ہو رہا تھا۔

”تمہیں شرم نہیں آئی تھی کسی لڑکی کی زندگی برباد کرتے ہوئے۔“

ارسلان کا شرم سے سر جھک گیا۔

”غلطی ہوگئی ہے باجی۔“

”غلطی۔“ اریشہ نے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔ ”ایک لڑکی کی زندگی برباد ہوگئی اور تم اسے غلطی کہتے ہو۔“

ارسلان اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

”سوچو۔ اگر کوئی تمہاری بہن کی زندگی برباد کردے تو تم کیسا محسوس کرو گے۔ کیا تم سر اٹھا کر معاشرے میں جی سکو گے؟ جس لڑکی کی تم نے زندگی برباد کی ہے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔“

ارسلان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتا۔ اسی لمحے کال بیل بجی تو اریشہ کا دھیان بیل کی طرف چلا گیا۔ وہ کچن سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر چار نوجوان موجود تھے۔

”جی فرمائیے۔“ اریشہ نے دروازے کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کہا۔

”بی بی۔ کیا آپ کا نام اریشہ ہے؟“ ایک نوجوان نے پوچھا۔

”جی۔“

”ہم پولیس والے ہیں۔“ اسی نوجوان نے کہا۔ ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کا بھائی ارسلان آپ کے گھر میں موجود ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

پولیس کا سن کر اریشہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے مڑ کر کچن کے دروازے پر کھڑے ارسلان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے بہن سے کہا کہ وہ انکار کردے کہ ارسلان یہاں نہیں ہے۔ لیکن وہ فیصلہ کرچکی تھی۔ ایسا فیصلہ جس سے اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائی نے اگر گناہ کیا ہے تو اسے اس کی سزا بھی ملنی چاہیے۔ گو اسے ماں کی بات بھی یاد تھی کہ اگر پولیس وہاں آئے تو وہ ارسلان کی موجودگی سے صاف انکار کردے۔ اریشہ چاہتی تو بھائی کو گھر کے پچھلے دروازے سے بھی بھگا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

”بی بی۔ میں نے کچھ پوچھا ہے۔“ اسی لمحے پولیس والے نے دوبارہ پوچھا۔

”جی۔ میرا بھائی یہیں ہے۔ آپ اسے گرفتار کر لیں۔“ اریشہ نے دھیمے لہجے میں کہا اور دروازہ کھول دیا پولیس نے گھر میں داخل ہو کر ارسلان کو گرفتار کرلیا۔ ارسلان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی بہن اسے گرفتار کرا دے گی۔ پولیس اس کے دوست عامر کو پہلے ہی گرفتار کرچکی تھی اور اسی کی نشاندہی پر پولیس نے ارسلان کو اریشہ کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔ پولیس ارسلان کو لے کر ملتان روانہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

عدالت میں کیس چلا تو ارسلان اور اس کے دوست عامر پر... الزام ثابت ہوگیا ان دونوں کو سزا ہوگئی۔ متاثرہ لڑکی، جس کا نام راشدہ تھا کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی اور تھرڈ ائیر کی طالبہ تھی۔ عامر اسے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن راشدہ اسے پسند نہیں کرتی تھی اس لیے اس نے عامر کو صاف انکار کردیا تھا۔ پھر عامر نے ارسلان سے مل کر راشدہ کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا۔ ارسلان پہلے تو راضی نہیں ہوا مگر بعد میں مان گیا اور یوں دونوں نے راشدہ کو اغوا کرا کے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا لیکن انہیں اپنی ہوس کا صلہ قید کی صورت میں ملا۔ ارسلان بہت پچھتا رہا تھا کہ کاش وہ عامر کا ساتھ نہ دیتا تو آج وہ جیل میں نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اریشہ کے فیصلے سے اس کی امی تو ناراض ہوگئی تھیں کہ اس نے خون کا رشتہ پس پشت ڈال دیا تھا لیکن اس کے والد مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اریشہ نے ارسلان کو گرفتار کرا کر اچھا اقدام کیا ہے تاکہ اسے اس کے گناہ کی سزا ملنی چاہیے۔

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں لیکن اب تک کوئی تخلیق بھیجی نہیں، پہلی بار ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ کہانی میرے دوست کی ہے۔ مجھے اتنی سبق آموز لگی کہ اسے شائع کرانا ضروری سمجھا تاکہ دوسرے لوگ بھی سبق حاصل کرسکیں۔

خورشید شاہ

(کراچی)

یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کو پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد بہت سوں کو فائدہ ہوسکتا ہے۔ بگڑتے ہوئے گھر پھر سے اپنی بنیاد پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔

یہ کہانی میرے ایک کزن سلیم اور اس کی بیوی اسماء کی ہے۔ سیدھے سادے لوگ تھے۔ میرے سامنے شادی ہوئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا جس طرح نارمل گھروں میں ہوا کرتا ہے۔

سلیم اور ان کی بیوی دونوں ایک ہی جیسے تھے۔

میرا مطلب ہے کہ دونوں عام سی صورت کے تھے۔ دونوں کے رنگ بہت زیادہ دبے ہوئے تھے۔ یعنی کالے ہی تھے۔

سلیم کے ابو یعنی میرے خالو خود بھی اسی قسم کے تھے۔ اس لیے سلیم بھی ایسا ہی ہوا تھا اور دوسری طرف اس کا گھرانا بھی ایسا ہی تھا۔

میں اس کے تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی سب کی سب معمولی شکل وصورت کی تھیں۔ شاید اس قسم کا گڈنڈ جینز میں ہوا کرتا ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات ہوگی۔

سلیم میرا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ اس لیے ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی تھی۔ ہم دونوں اپنے مسائل ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ میرے پاس بہت الجھا ہوا آیا۔ اس کی الجھن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''خیریت تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔''

''یار خورشید! تم کو تو معلوم ہے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں جانتا ہوں میں لیکن بات کیا ہے۔''

''بات ایسی ہے کہ میں کسی اور سے اس کا ذکر بھی نہیں کرسکتا۔'' اس نے کہا۔ ''سوائے تمہارے کیونکہ کسی اور سے بات کی تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو تو موقع چاہیے۔''

''بتاؤ تو سہی کیا مسئلہ ہے۔''

''اس شرط پر کہ تم کسی سے نہیں کہو گے کیونکہ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔''

''چلو اب بتا بھی دو۔''

''یار اس کی حرکتیں مشکوک ہو گئی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''میں سمجھا نہیں، کیسی مشکوک حرکتیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔'' اس نے بالآخر بتا ہی دیا۔ ''اس کے تعلقات کسی اور سے بھی ہیں۔''

''خدا کا خوف کرو۔ تم بھابی پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔''

''بہت مجبور اور پریشان ہو کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر حال میں گزارا کرنا جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ کیا بتاؤں۔''

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کیسی بات کردی تھی۔ میں اسماء کو بھی جانتا تھا۔ بہت مہذب اور خوش اخلاق عورت تھی۔

لیکن سلیم نے جو الزام لگایا تھا وہ تو بہت حیرت انگیز تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔''

''نہیں کسی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن اس کی حرکتیں ایسی ہیں۔''

''خدا کے بندے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔ کیسی حرکتیں؟''

''اس کے پاس کسی کا فون آیا کرتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھ سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں اس کے موبائل پر آنے والی کال کا نمبر چیک کروں۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ کس کا نمبر ہے، کون ہے؟''

''چلو یہ تو ایک بات ہوگئی۔ اس کے علاوہ۔''

''اس کے علاوہ یہ کہ وہ اکثر کسی سے ملنے جایا کرتی ہے۔'' سلیم نے بتایا۔ ''یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس کے پاس اور کہاں گئی ہے۔ جب پوچھتا ہوں تو اِدھر اُدھر کا بہانہ کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اپنی ایک سہیلی نمرہ کا نام لے دیتی ہے کہ نمرہ کے پاس جا رہی ہوں۔ نمرہ کو میں بھی جانتا ہوں۔ اچھی لڑکی ہے۔ سوشل کاموں میں مصروف رہتی ہے تو اسما بھی یہی کہتی ہے کہ وہ نمرہ کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔''

''تو کیا ایسا نہیں ہوتا؟''

''پہلے سنو تو پچھلے ہفتے یہ ایک دن نمرہ کے پاس گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میری بہن اور بہنوئی آ گئے۔ وہ چونکہ بہت دنوں کے بعد آئے تھے اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کو بلالوں۔ اس کے موبائل پر فون کیا تو اس کا موبائل بند ملا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود نمرہ کے گھر جا کر اس کو لے آؤں۔ نمرہ کے گھر پہنچا تو نمرہ نے بتایا کہ میں تو پچھلے ایک مہینے سے اس سے نہیں ملی۔ وہ اس کے پاس آتی ہی نہیں ہے اب بتاؤ اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔''

''ہاں یہ ذرا تشویش کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم

نے اسماء سے پوچھا نہیں۔"
"پوچھا تھا۔ لیکن اس نے بڑی ڈھٹائی سے نمرہ ہی کا نام لیا۔ میں نے اسے جھوٹا کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ خوامخواہ اس کی عزتِ نفس مجروح ہو جاتی۔"
"یار سلیم۔" میں اب پھٹ پڑا۔ "تم کس مزاج کے آدمی ہو۔ کتنی قوتِ برداشت ہے تم میں۔"
"کیا کروں یار۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔
"اور خود سوچ سوچ کر نفسیاتی مریض بن جاؤ گے۔"
"میں لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے تو میں اسے زبردستی اپنی بیوی بنائے رکھوں لیکن میں پورے ثبوت کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک ثبوت تو کوئی نہیں ملا ہے۔ صرف اندازے ہیں۔"
"پاگل ہو تم۔" مجھے اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ "اب اور کیا ثبوت چاہیے۔"
"یار! کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے گا تو پھر کوئی اسٹیپ اٹھالوں۔"
"اور یہ ٹھوس ثبوت کہاں سے آئے گا۔"
"یار اس لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم یہ کام کر سکتے ہو۔"
"کیا مطلب ہے۔ میں کہاں سے ثبوت لاؤں گا۔"
"دیکھو وہ تم پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ تمہاری ہر بات مان لیتی ہے۔ تم کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔ تم کھلے دل سے اس سے بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے کچھ نہیں چھپائے گی اور تم کو سب کچھ بتا دے گی۔"
"فرض کرو، اگر ایسی کوئی بات ہے تو پھر تم کیا کرو گے۔"
"کرنا کیا ہے یار۔ میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ اگر اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسا رکھا ہے تو خوش دلی کے ساتھ الگ ہو جائیں گے۔"
"یہ تو تم نے بہت بڑی بات کہہ دی۔"
"ہاں یار! اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔"
"او کے! میں اس سے بات کروں گا۔" میں نے کہا۔ "بلکہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ گھر سے نمرہ کے پاس جانے کا کہہ کر نکلے تو تم مجھے فون کر دو۔"
"اس سے کیا ہوگا۔"
"میں فوراً پہنچ کر اس کا تعاقب کروں گا۔" میں نے بتایا۔ "دیکھوں تو سہی۔ وہ کہاں جاتی ہے۔ پھر جب ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو اس سے کھل کر بات کرلوں گا ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی چھپ جائے۔"
"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔"
یہ بالکل ایک نئے انداز کا کیس سامنے آیا تھا۔ میرے خاندان میں ابھی تک ایسی کوئی کہانی نہیں ہوئی تھی اور ہوئی بھی تو بے چارے سلیم کے ساتھ۔ جو ایک سیدھا سادا آدمی تھا اور اپنے انداز کی زندگی گزار رہا تھا۔
کئی دنوں کے بعد سلیم کا فون آگیا۔ "خورشید آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہ نمرہ کے یہاں جانے والی ہے۔" اس نے بتایا۔
"ارے یہ نمرہ رہتی کہاں ہے؟"
"پاپوش نگر میں۔" اس نے بتایا۔ "تم آسکتے ہو تو آجاؤ۔"
"میں تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔ بلکہ بائیک پر تمہارے گھر کے سامنے چھپ کر کھڑا رہوں گا اور جب اسماء نکلے گی تو اس کا تعقب شروع کر دوں گا۔"
"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بس تم آجاؤ۔"
میں پندرہ منٹ کے اندر اندر بائیک لے کر سلیم کے مکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسماء گھر سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔
اس نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر آکر اس نے رکشا کرلیا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ بائیک کی وجہ سے ایسے کاموں میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔
سلیم نے بتایا تھا کہ نمرہ پاپوش نگر میں رہتی ہے جب کہ رکشے کا رخ بالکل مخالف سمت میں تھا۔ یعنی نیو کراچی کی طرف۔ رکشا چلتا رہا اور میری بائیک اس کے ساتھ لگی رہی۔
نیو کراچی سے آگے سرجانی ٹاؤن ہے۔ وہ رکشا سرجانی ٹاؤن کے بھی آخری سرے پر جا کر رکا تھا۔ اسماء نے رکشے کا کرایہ ادا کیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی۔
یہ ایک خستہ حال سا مکان تھا۔ دو کمروں کا۔ سلیم کے اندیشے صحیح ہو رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر سے جھوٹ بول کر کہیں اور آتی تھی۔ کسی اور کے پاس۔
مجھے اس سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ وہ ایسی عورت تو نہیں

جبل الطارق Gibralter

اسپین کے جنوب میں بحیرۂ روم کے ساحل پر ایک چھوٹی سی برطانوی نو آبادی اور اہم بحری اور ہوائی اڈا۔ رقبہ 205 مربع میل یا 505 مربع کلومیٹر، آبادی 2000ء میں 35000 سطح سمندر پر بڑھی ہوئی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ ڈیڑھ میل لمبا ریگستانی قطعہ پہاڑی کو اسپین سے ملاتا ہے۔ اس کے قریب ہی آبنائے جبل الطارق ہے، جو یورپ کو افریقا سے جدا کرتی ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ برطانوی حکومت کا ملازم ہے۔ مقامی ضروریات کے لیے چند صنعتیں بھی ہیں۔ زراعت نہ ہونے کے برابر ہے تقریباً تمام غذائی اشیاء درآمد کی جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم سے یہ پہاڑی اسپین کا حصہ رہی ہے اس لیے اسپین اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ 711ء میں شمالی افریقا کے عرب مسلمانوں نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین پر حملہ کیا تو سب سے پہلے یہی پہاڑی ان کے قبضے میں آئی اور طارق کے نام پر اس کا نام جبل الطارق رکھا گیا۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد اس پر اسپین نے قبضہ کرلیا لیکن 1333ء میں یہ پھر شاہ مراکش کے زیرِ نگیں آگئی اور 1462ء تک سلطنت مراکش کا حصہ رہی بعدازاں اس پر پھر اسپین کا قبضہ ہوگیا اور اس دفعہ

تھی لیکن انسان کا کیا بھروسا ہوتا ہے لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ وہ سلیم جیسے آدمی کو دھوکا دے رہی تھی۔

میں اس کوارٹر سے کچھ فاصلے پر بائیک کھڑی کر کے اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اس کو باہر آنے کے بعد پکڑنا چاہتا تھا کیونکہ اب ایک مکمل ثبوت میرے پاس آگیا تھا۔

کم از کم اس سے بات کر کے میں اسے شرمندہ تو کر ہی سکتا تھا۔ یا کچھ نہیں تو احساس دلا سکتا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے۔ کن راہوں پر چل پڑی ہے۔

وہ اس گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تھی۔ وہ رکشے کے انتظار میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ میں اپنی بائیک لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''بیٹھ جاؤ اسماء بھابی۔ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ پکڑی گئی تھی۔

''خورشید تم!'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں آگئے۔''

''میں آپ کی تلاش میں۔ سلیم آپ کی سہیلی نمرہ کے یہاں گیا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ آپ یہاں آئی ہیں۔ تو میں یہاں آگیا۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔'' اسماء نے کہا۔

''بھابی! کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرلیں۔ یہاں کھڑے رہ کر بات کرنا مناسب نہیں۔''

اسماء نے چند لمحے سوچنے کے بعد گردن ہلادی۔

میں اسے اپنی بائیک پر نیو کراچی سے آگے ایک فیملی ہوٹل میں لے آیا۔ دیکھنا اور سننا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کہتی ہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔

''ہاں تو اب بتائیں یہ کیا سلسلہ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''سلسلہ یہ ہے کہ میں اپنے آئیڈیل اپنے محبوب کے پاس آیا کرتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو بے چارے سلیم کے ساتھ آپ بے وفائی کررہی ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔ میں ایک وفادار بیوی ہوں۔ سلیم میرے شوہر ہیں۔ میں ان سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر محبوب اور آئیڈیل میں کیا فرق ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''خورشید! کیا تم نے کبھی محمود شیروانی کا نام سنا ہے؟''

''کیوں نہیں اس ملک کا ہر پڑھا لکھا آدمی محمود شیروانی کے نام سے واقف ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ہر حال میں حق کا پرچار کیا۔ حکمرانوں کے تعاقب میں رہا۔ اپنی شاعری سے آگ لگا دی تھی۔ وہ ایسا شخص ہے جو ہزاروں لاکھوں کا محبوب اور آئیڈیل رہا ہے۔ لیکن آپ کے کیس سے محمود شیروانی کا کیا تعلق ہے۔''

''وہی میرے محبوب اور آئیڈیل ہیں۔'' اسماء نے

ہسپانوی یہاں دو سو سال سے زائد عرصے تک جمے رہے۔ 1704ء میں وائس ایڈمرل آف انگلینڈ سر جارج روک نے سہ روزہ جنگ کے بعد ہسپانیوں کو یہاں سے مار بھگایا اور اس پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ 1713ء میں ہسپانیہ نے اٹریخت کے معاہدے کی رو سے جبل الطارق پر برطانیہ کا اور سسلی پر سیوائے کا اقتدار تسلیم کر لیا۔ 13 ستمبر 1779ء کو ہسپانوی فوجوں نے جبل الطارق پر حملہ کر دیا اور تین سال، سات ماہ اور بارہ دن اس کا محاصرہ کیے رکھا لیکن برطانوی گورنر جنرل آگسٹس ایلیٹ کے کامیاب دفاع کے سبب ہسپانیہ کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔

1965ء میں ہسپانیہ نے دوبارہ جبل الطارق کی جزوی ناکہ بندی کر دی۔ 1967ء میں یہاں ریفرنڈم کروایا گیا جس میں آبادی کی غالب اکثریت نے برطانوی اقتدار کے حق میں ووٹ دیے۔ اسی سال نئے آئین کا نفاذ ہوا جس کی رو سے مقامی آبادی کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی۔ 1968ء میں اقوام متحدہ نے برطانیہ کو ہدایت کی کہ وہ یہ نو آبادی اسپین کے حوالے کر دے۔ برطانیہ کے انکار پر اسپین نے اس کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ 1985 تک ناکہ بندی جاری رہی۔

مرسلہ: احمد توفیق۔ میر پور خاص

بتایا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھ سکا۔''

''ارے میں ان ہی کے پاس جاتی ہوں۔ تم نے سرجانی میں جس گھر کو دیکھا ہے محمود صاحب اس گھر میں موجود ہیں۔ ان کی صحت اس قابل نہیں کہ وہ اپنا کوئی کام کر سکیں۔ اس لیے میں یہاں آ کر ان کے لیے کھانے بنا دیتی ہوں۔ ان کے برتن وغیرہ دھو دیتی ہوں۔''

''خدا کی پناہ۔ یہ تو عجیب انکشاف کیا ہے آپ نے۔''

''ہاں اس لیے سلیم کو بھی نہیں معلوم کہ میں کس کے پاس جاتی ہوں۔'' اسماء نے کہا۔

''لیکن محمود صاحب سے آپ کا ایسا کیا تعلق ہے؟''

''ایک باپ اور بیٹی کا۔''

''کیا!'' یہ ایک دوسرا انکشاف تھا۔ ''کیا محمود صاحب آپ کے والد ہیں؟''

''ہاں۔''

''حیرت کی بات ہے۔ سلیم نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھایا ہے۔'' اسماء نے بتایا۔ ''میں ان کی سب سے چہیتی شاگرد تھی۔ کیا استاد باپ کا درجہ نہیں رکھتا۔''

''بالکل رکھتا ہے۔ خاص طور پر محمود شیروانی جیسا استاد لیکن آپ کو یہ سب سلیم سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔''

''خورشید، سلیم بہت اچھے انسان ہیں۔'' اس نے کہا۔

''بہت اچھے لیکن یہ مرد کی نیچر ہے کہ وہ کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کرتا اگر میں کسی پرچھائیں کو بھی اپنا آئیڈیل کہوں تو سلیم کہتے تو کچھ نہیں۔ لیکن کہیں نہ کہیں حاسد ضرور ہو جاتے۔''

اسماء صحیح کہہ رہی تھی۔ مرد کی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے۔ خاص طور پر شوہر کی۔

''کیا تم محمود صاحب سے ملنا چاہو گے؟'' اسماء نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ میں بھی ان کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''حالانکہ انہوں نے قسم دی تھی کہ ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہو لیکن اب بات میری وفا اور عزت کی آ گئی ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ان سے مل لو۔ تاکہ سلیم کو یقین دلا سکو کہ میں ایسی ویسی نہیں ہوں۔''

کچھ دیر بعد ہم پھر سرجانی کے اس مکان کے سامنے تھے۔ اسماء نے دستک دی۔ اندر سے کچھ کہا گیا جس کا جواب اس نے دیا تھا۔ پھر اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔

اسماء اندر چلی گئی، جب کہ میں اس دوران باہر کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی۔ اس نے پہلے اشارہ کیا تو میں بھی اس مکان میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔

میرے سامنے محمود شیروانی صاحب کھڑے تھے۔ وہ شخص جن کی شاعری میں پڑھتا چلا آیا تھا۔ جن کے تقریریں

وڈیوز پرسنی تھیں۔ اخباروں میں پڑھی تھیں۔
وہ حق گو تھے، ایسے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ ان کو دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا اور اس وقت اندازہ ہوا کہ وہ کتنے وجیہہ اور خوب صورت انسان تھے۔
عمر کا اندازہ پچاس اور پچپن کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ بیسا کھی پر تھے۔ ان کی ایک ٹانگ پولیس تشدد کے نتیجے میں ضائع ہوگئی تھی۔ یہ خبر بہت پہلے میں نے اخباروں میں پڑھی تھی۔
''خوش آمدید۔'' شیروانی صاحب نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اسماء بیٹی نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔''
''سر! میں بھی آپ کے بے شمار عقیدت مندوں میں سے ایک ہوں۔'' میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
''آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اسماء نے کہا۔
ہم ایک کمرے میں آگئے۔ یہ کمرا شاید بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا اور شیروانی صاحب جیسوں کا کمرا ایسا ہی ہونا چاہیے۔
ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بے شمار مسودے بھی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ جو شاید ان کی تقریروں کے ہوں گے۔
''معاف کرنا میاں یہ کمرا اس سے بھی کہیں زیادہ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اسماء بیٹی نے آکر بڑی حد تک اس کو سیٹ کر دیا ہے۔ یہ قابلِ فخر شاگردوں میں سے ایک ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ایسی شاگرد ہر استاد کو دے۔''
''جناب! ایسی شاگردی کو پروڈیوس کرنے کے لیے آپ جیسا قابلِ فخر استاد بھی چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''اسماء بھابی کمرے سے باہر چلی گئیں۔
شیروانی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں ان کی باتیں پوری توجہ اور عقیدت سے سنتا رہا۔ ان کی باتوں میں وہی ملک اور قوم کے لیے دردمندی تھی جو شیروانی صاحب جیسے آدمیوں کا مزاج ہوتا ہے۔ جس طرح علامہ اقبال اس امت کے لیے تڑپا کرتے تھے۔ اس طرح شیروانی صاحب تڑپ رہے تھے۔
شیروانی صاحب تو اپنی جگہ تھے لیکن اسماء کا کردار بھی کم نہیں تھا۔ وہ جس طرح اپنے استاد اور ایک بڑے انسان کی خدمت کر رہی تھی وہ جذبہ قابلِ قدر تھا۔
اس وقت میں نے مناسب سمجھا کہ سلیم کے بارے میں بھی بات کر لی جائے۔ میں نے اسماء سے کہا۔ ''بھابی! اب میں خود اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ آپ ایک باوفا خاتون ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شیروانی صاحب کی خدمت کر کے آپ نے خود کو بہت عظیم ثابت کر دیا ہے تو کیوں نہ سلیم کو بھی اس راز میں شامل کر لیا جائے۔''
''کیا مطلب؟'' شیروانی صاحب چونک پڑے۔
''آپ کس راز کی بات کر رہے ہیں۔''
''اسماء بھابی نے آپ کے بارے میں اپنے شوہر کو بھی نہیں بتایا ہے۔ یہ ان سے چھپ کر آپ کے پاس آیا کرتی ہیں۔''
''ارے یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔'' شیروانی صاحب جلدی سے بولے۔ ''اس طرح تو شوہر کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔''
''یہی تو پرابلم ہوگئی ہے۔''
''میں نے یہ سوچا کہ آپ اگر کسی کے سامنے نہیں آرہے تو سلیم کو بھی نہ بتایا جائے۔'' اسما نے کہا۔
''نہیں بیٹی ایسا مت کرو۔'' شیروانی صاحب نے کہا۔
''اچھا ہوا جو آج یہ بات میرے سامنے آگئی۔ تم اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دو۔ میں تم پر کوئی حرف برداشت نہیں کروں گا۔''
''جناب میں ان کے شوہر کو خود آپ کے پاس لے کر آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو جائے۔''
ہم کچھ دیر اور بیٹھ کر واپس آگئے۔ میں اس کو لے کر سیدھا سلیم ہی کے گھر گیا تھا۔
سلیم گھر پر ہی موجود تھا۔
وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
''سلیم آج میں بھابی کا معما حل کر کے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے شک کے لیے ان سے معذرت کرو۔ ان کے کردار کا ایک زبردست پہلو ہمارے سامنے آیا ہے۔''
''وہ کیا ہے۔''
''تم نے محمود شیروانی صاحب کا نام تو سنا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم بھی ان کا ذکر کرتے ہو۔ خود میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔''
''اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ کسی زمانے میں وہ

اسماء کے استاد رہ چکے ہیں۔‘‘
’’ہاں یہ معلوم ہے لیکن وہ تو پرانی بات ہوگئی۔‘‘
’’اسماء اپنے استاد کی خدمت کے لیے جایا کرتی ہے۔‘‘ میں نے بتایا۔
’’کیا مطلب؟‘‘
میں نے سلیم کو سب کچھ بتا دیا۔ میری بات سن لینے کے بعد سلیم اسماء پر برس پڑا۔ ’’بے وقوف عورت تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپالی۔‘‘
’’میں ڈرتی تھی کہ کہیں تم ان کا راز فاش نہ کردو۔‘‘
’’ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ میں تو خود ان کا عقیدت مند ہوں۔‘‘ سلیم نے کہا۔
’’اب یہ بتاؤ تمہارا شک دور ہوا یا نہیں۔‘‘ میں نے پوچھا۔
’’یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یار۔ اب تو میں اپنی بیوی کا مرید بھی ہوگیا ہوں۔‘‘
’’شیروانی صاحب تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔‘‘ اسماء نے بتایا۔
’’میں تو سر کے بل جاؤں گا۔‘‘ سلیم نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ’’یار تمہارا بہت شکریہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میں تو نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔‘‘
میں اور اسماء ایک دن سلیم کو بھی شیروانی صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ سلیم ان کا معتقد ہو کر واپس آیا تھا۔
بظاہر تو یہ کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ ابھی اور بھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔ اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آنے والا تھا۔
اور وہ موڑ اس وقت سامنے آیا جب ان کے یہاں پہلی اولاد ہوئی۔
پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے لیکن میں اسے دیکھنے اسپتال نہیں جاسکا تھا اور نہ ہی گھر جاسکا۔ کئی دنوں کے بعد میں نے سلیم کو مبارک باد کا فون کیا۔
’’کس بات کی مبارک باد۔‘‘ سلیم نے کہا۔
’’کمال کرتے ہو، بیٹی ہونے کی مبارک باد دے رہا ہوں۔‘‘
’’تم یہ مبارک باد اس شیروانی کو دو۔‘‘ سلیم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
’’یہ کیا بکواس ہے۔‘‘
’’بکواس نہیں ہے یار۔ حقیقت ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

> جگر مراد آبادی لاہور تشریف لائے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ تک پہنچے۔ جگر صاحب نہایت اخلاص اور تپاک سے ہر ملاقاتی کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ ایک دم سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’قبلہ! اگر آپ مراد آباد کے جگر ہیں تو یہ خاکسار لاہور کا گردہ ہے۔‘‘
>
> ****
>
> سعادت حسن منٹو جب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے رک گئے۔ پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ’’راشد صاحب! ذرا جلدی سے باہر تشریف لایئے۔‘‘
> یہ شور سن کر ن۔ م۔ راشد کے علاوہ کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے پاس جمع ہوگئے۔
> ’’راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔‘‘ منٹو نے سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل خدا کی قسم سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔‘‘

’’اس کی آواز بہت تھکی ہوئی اور افسردہ تھی۔‘‘ ان دونوں نے مل کر گل کھلا دیا ہے۔
’’کن دونوں نے۔‘‘
’’اسماء نے اور اس دانشور شیروانی نے۔‘‘
’’بھائی صاف صاف بتاؤ۔ کیا سلسلہ ہے۔‘‘
’’تم ہمارے گھر آؤ۔ یہاں آکر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ تم جو ثبوت کی بات کرتے تھے نا تو ایک جیتا جاگتا ثبوت تمہارے سامنے ہوگا۔‘‘
اب تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اس کی آواز بتا رہی تھی کہ معاملہ واقعی بہت سیریس ہے لیکن کیا معاملہ تھا یہ اس کے گھر جا کر ہی معلوم ہوسکتا تھا۔
میں جلدی جلدی تیار ہوا۔ اپنی بائیک سنبھالی اور سلیم کے گھر پہنچ گیا۔
گھر پر سوگواری کی کیفیت تھی۔ اسماء ایک طرف بیٹھی ہوئی رو رہی تھی جب کہ سلیم غصے اور پریشانی سے ٹہل رہا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی اسماء نے کہا۔ ’’خورشید! اچھا ہوا تم آگئے۔ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا تھا۔ اب مجھ پر بدکاری کا بھی لگ گیا ہے جب کہ خدا گواہ ہے کہ میں بے گناہ اور بے قصور ہوں۔‘‘

''خورشید تم ثبوت کی بات کرتے تھے نا جاؤ کمرے میں جا کر دیکھ لو۔ بچی سو رہی ہے تم خود سمجھ جاؤ گے کہ بدکاری کس کو کہتے ہیں۔''

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کمرے میں آ گیا۔ ان دونوں کی نوزائیدہ بچی بستر پر سو رہی تھی۔ میں خود اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

وہ تو ہو بہو محمود شیروانی جیسی تھی۔ ویسا ہی خوب صورت چہرہ اور ویسا ہی رنگ۔ جب کہ یہ دونوں میاں بیوی گہرے سانولے تھے اور بچی بہت خوب صورت۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ وہ بچی میرے سامنے تھی۔ ایک واضح ثبوت بچی کی صورت میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے۔'' سلیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ہاں دیکھ لیا۔'' میری آواز بھی نڈھال ہو رہی تھی۔

سلیم میرے پاس آ گیا۔ ''جانتے ہو یہ سب کیا ہے۔ یہ تنہائی ہے۔ ایک عورت جب ایک تنہا شخص سے ملنے جاتی ہے تو شیطان ان کے درمیان آ ہی جاتا ہے۔ اب وہ شخص چاہے محمود شیروانی ہی کیوں نہ ہو یہ سب تو ہونا تھا۔''

اس دوران اسماء بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے سلیم کی باتیں سن لی تھیں۔ ''میں کس طرح یقین دلاؤں۔ کس طرح۔ اگر میں نے ذرا برابر بھی بے وفائی کی ہو تو میرے لیے جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں۔''

''وہ تو کھل ہی چکے ہیں۔'' سلیم کا لہجہ بہت سرد ہو رہا تھا۔ ''تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔'' وہ بولتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اسماء نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''خورشید! خدا کے لیے سلیم کو یقین دلاؤ کہ میں ایسی نہیں ہوں۔''

''میں کیسے یقین دلاؤں بھابی کیونکہ آج خود میں بہت کمزور پڑ گیا ہوں۔''

میں بھی اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ جہاں سلیم ایک کرسی پر نڈھال بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

''کیا سوچا ہے تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ۔ کیا میں غلطی پر ہوں۔ لیکن اس عورت نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی ہے؟ کیا اس سے بڑا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے؟''

''اب میرے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو بھی یقین ہے۔''

''اب میں کیا کہوں۔ ہاں بھابی سے غلطی ہو گئی ہو گی۔ انسان کو بہکتے دیر نہیں لگتی لیکن اچھا ہے کہ درگزر کر جاؤ۔''

''خورشید! تم میری نیچر جانتے ہو میں ہر معاملے میں درگزر کرنے والا انسان ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اندر سے کمزور پڑ گیا ہوں۔ برباد ہو گیا ہوں میں۔''

''تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔''

''اب یہی بہتر ہو گا کہ راستے الگ کر لیے جائیں۔'' اس نے کہا۔

''دیکھو یہ بہت بڑا فیصلہ ہو گا۔''

''اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خورشید اب تم ذرا اس معاملے کو... دوسرے اینگل سے دیکھو۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس انداز سے انوالو ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے شوہر میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ اس سے خوش نہیں تھی۔ اس لیے اس نے کسی اور کو اپنا سہارا بنا لیا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟''

''ہاں شاید ایسا ہی ہے۔''

''شاید نہیں یقیناً۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ کسی اور کے پاس جانے کا جواز ہی نہیں بنتا۔ وہ اس دوسرے مرد کے پاس جا کر خوش رہتی ہے تو مہذب طریقہ یہی ہے کہ شوہر اس کے راستے سے ہٹ جائے۔''

''لیکن اگر وہ عورت اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی ہو تو؟''

''یہی تو پرابلم ہے کہ وہ اپنی غلطی نہیں مان رہی۔'' سلیم نے کہا۔ ''تم نے خود دیکھ لیا۔ وہ ہٹ دھرم ہو گئی ہے۔ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ کہتی ہے اس نے کچھ نہیں کیا۔''

''میں کوشش کروں گا کہ بھابی اپنی خطا مان لیں۔ پھر تو تم اپنا فیصلہ بدل لو گے نا۔''

''بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔''

''سلیم یہ تو سوچو کہ تمہاری ایک بچی بھی ہے۔''

''میری بچی یا......!''

"اب جس کی بھی ہو۔ یہ بہر حال بچی ہے۔"
یہ جان لینے کے باوجود کہ اس بچی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس کی پرورش کے اخراجات برداشت کرتا رہوں گا۔" اس نے کہا۔ "چاہے اسماء کہیں بھی رہے۔ کسی کے ساتھ بھی رہے۔"
اس نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے بھی اسماء کی غلطی نے کوئی گنجائش کہاں رہنے دی تھی۔
میں نے اتمام حجت کے طور پر ایک بار پھر اسماء کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اگر اپنی غلطی مان لے تو ہوسکتا ہے کہ سلیم معاف ہی کردے۔ کیونکہ وہ ایک بڑے دل کا انسان ہے۔
لیکن اس کی وہی رٹ تھی کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔
میں ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آگیا۔
کچھ دنوں کے بعد خبر مل گئی کہ سلیم نے اسماء کو طلاق دے دی ہے اور اسماء اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی گئی ہے۔
مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ محمود کے پاس کیوں نہیں گئی۔ کیسی عجب سچویشن تھی۔ حالانکہ ان دونوں میں عمر کا بہت فرق تھا۔ لیکن اس گندے فعل کو انجام دیتے ہوئے یہ فرق کہاں دیکھا گیا تھا اور اب تو وہ سلیم سے آزاد ہوچکی تھی اب اس کو کون روک سکتا تھا۔
وہ اب محمود شیروانی سے شادی بھی کرسکتی تھی لیکن وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ بہر حال یہ اس کا اپنا معاملہ تھا۔
اس کے بعد پھر میری اسماء سے ملاقات نہیں ہوئی اور آج تک نہیں ہوسکی۔ جب اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آچکا ہے۔
کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ایک خبر پڑھنے کو ملی کہ سرجانی ٹاؤن کے ایک گھر سے مشہور دانشور اور شاعر محمود شیروانی کی لاش ملی ہے۔
خبر کے مطابق شیروانی صاحب وہاں روپوشی اور تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک رات ان پر دل کا دورہ پڑا۔ چونکہ وہ بالکل تنہا تھے۔ اس لیے کوئی ان کی مدد نہیں کرسکا اور اسی عالم میں ان کا انتقال ہوگیا۔
لاش اس وقت دریافت ہوئی جب آس پاس کے گھروں کو سخت بدبو محسوس ہونے لگی۔ پولیس کو بلوا کر دروازہ

انور شعور

انور شعور غزل کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات کے تین مجموعے آچکے ہیں، جن کے نام بالترتیب اندوختہ، مشقِ سخن اور می رقصم ہیں۔ یہ تقریباً 15 سال سے معروف روزنامہ میں مسلسل "قطعہ" لکھ رہے ہیں۔ انور شعور کے ہاں دو موضوعات واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں رومان اور حالات و واقعات ہیں۔ ان کی شاعری کا محور بالخصوص یہ دو موضوعات رہے۔ انکساری اور عاجزانہ طبیعت کے مالک انور شعور نے اس عہد کے تمام لوگوں سے روابط رکھے جن میں رئیس امروہوی، فیض، جون ایلیا، احفاظ الرحمن اور دیگر کئی لوگ شامل رہے۔ آپ سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے خیال میں حالات کی خرابی کے پیچھے ایک اجالا ہے جس کا اپنے وقت پر ظہور ہوگا اور پاکستانی عوام کے لیے اچھا وقت لے کر آئے گا۔

عزم بہزاد

اچھا مصرعہ کہنے کی جستجو دل میں لیے ایک شاعر تمام زندگی بھی گزار سکتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ آج کے دور میں شعرا مشق کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عزم بہزاد نے ایک خصوصی نشست میں کیا۔ ان کا شعری مجموعہ 1997 میں "تعبیر سے پہلے" شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اشتہاری کمپنی میں بحیثیت "کونسپٹ رائٹر" اس فانی دنیا سے کوچ کرنے تک وابستہ رہے۔ مختلف اشتہارات کے لیے بے شمار گیت اور لازوال مصرعے تخلیق کرچکے ہیں، عزم بہزاد کے خیال میں شاعری کے علاوہ تمام اصناف میں اظہار، صرف کسب معاش کی سبیل ہے، اس کو ہم تخلیق نہیں کہہ سکتے تخلیق ہمارے اندر کو دریافت کرتی ہے جب کہ کمرشل ازم میں ہم "ماسز" کو دریافت کرتے ہیں۔ دل سے جنم لینے والی خواہش تخلیق کہلاتی ہے اور تقاضے کے تحت کچھ لکھا جائے تو وہ کمرشل ازم کہلاتا ہے۔

اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے
از: خرم سہیل

توڑا گیا تو محمود صاحب مردہ پڑے ہوئے تھے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ بتا دیا کہ ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہیں اسپتال میں ان کو محمود شیروانی کے طور پر پہچان لیا گیا۔

جب یہ خبر پھیلی تو بے شمار لوگ اسپتال آ گئے اور انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ محمود صاحب ہی تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر کو پڑھ کر یا سن کر اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔ سلیم نے صرف اتنا کہا تھا اب میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔ خس کم جہاں پاک۔

کچھ اور دن گزر گئے۔

سلیم نے ایک اور شادی کر لی جب کہ وہ اس دوران ہر مہینے باقاعدگی سے اس بچی کے لیے پیسے بھجوا رہا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے یہی وعدہ کیا تھا۔

اور ویسے بھی ایسے معاملات میں پیدا ہونے والے بچے کا کیا قصور ہوتا ہے وہ معصوم تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ اصلی باپ کون ہوتا ہے اور ماں کس کو کہتے ہیں۔

بہرحال ایک دن ایسا ہوا کہ شہر کی ایک تعلیمی سرگرمیاں کرنے والی تنظیم کا ایک دعوت نامہ مجھے موصول ہوا۔

وہ دعوت نامہ ایک سیمینار کا تھا۔

اس سیمینار کا موضوع تھا۔ ''بچے کی پیدائش کا حیاتیاتی پہلو'' بہت ہی خشک قسم کا موضوع تھا لیکن میری دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ اس سیمینار کے مقرر ڈاکٹر زین صاحب تھے۔ انہوں نے سماجی اور بائیولوجیک فیلڈ میں بہت کام کیا تھا۔

میں ان کی دو کتابیں پڑھ چکا تھا۔ بہت گہری نگاہ رکھنے والے دانشور تھے۔

میں نے وہ سیمینار اٹینڈ کیا۔

اور وہیں سے اس کہانی کا تیسرا موڑ سامنے آ گیا جس کے بعد میں آج تک رو رہا ہوں۔ پچھتا رہا ہوں۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ کچھ اور ہو گیا ہے۔

تقریریں ہو رہی تھیں۔ کچھ کو دل سے سنا۔ کسی کو نیم دلی سے۔ لیکن جب زین صاحب آئے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ میں ان ہی کو سننے کے لیے تو آیا تھا۔

زین صاحب نے اپنی تقریر کرتے ہوئے ایک اچھی بات کی۔ جس نے مجھے اڑا کر رکھ دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''بچہ جس وقت رحمِ مادر میں پرورش پا رہا ہوتا ہے اس وقت بچے کی ماں اپنے ماحول سے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ماں کو خوب صورت بچوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ماں کا کوئی آئیڈیل ہو اور وہ اس آئیڈیل کے بارے میں سوچتی رہتی ہو تو اس آئیڈیل کے نقوش اس کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے میں چلے جاتے ہیں۔'' جب میری تخلیق ہوئی تو میری ماں کی آنکھوں میں کس مرد کا چہرہ تھا۔''

''ہمارے یہاں چونکہ اس سبجیکٹ سے آگاہی نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے گھروں میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بیوی نے شوہر کے ساتھ بے وفائی کی ہے (زین صاحب جیسے سلیم اور اسماء کا کیس بتا رہے تھے) حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ حمل کے دوران وہ عورت اپنے آئیڈیل سے متاثر ہوتی رہتی ہے بس۔''

اس کے بعد بھی وہ بہت کچھ بتاتے رہے لیکن مجھے جو کچھ سننا تھا وہ سن چکا تھا۔ شاید قدرت مجھے اسی لیے اس سیمینار میں لائی تھی کہ میری آنکھوں کی پٹیاں اتر جائیں۔

وہ پٹیاں اتر چکیں۔ اس لیے پھر بے پناہ شرمندگی۔

اسماء کو طلاق دلوانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ میں اس کی وکالت نہیں کر پایا تھا۔ میں نے بھی اسے گناہ گار سمجھ لیا تھا۔

اب اس کا تدارک کرنا لازمی تھا۔

اور تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں خود اسماء کو اپنا لوں۔ شادی کر لوں اس سے۔ وہ ایک پاکباز اور گریٹ عورت تھی۔ اس سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی اور لے کر نہیں جاتی تھی۔ اسلام نے صاف بتایا ہے کہ دو نامحرم مرد عورت ایک چھت کے نیچے اکیلے نہ ملیں اس لیے کہ ان کے درمیان تیسرا شیطان آ جاتا ہے۔ یہاں شیطان تو نہیں آیا، بدنامی کا سامان ضرور آ گیا۔

اس کے کردار کے دونوں پہلو سامنے آ گئے تھے۔

ایک تو اپنے استاد کی خدمت، پھر اپنے شوہر سے وفا۔

میں نے اس کے گھر اپنا رشتہ بھیج دیا۔ جو ذرا سی دشواری کے بعد قبول کر لیا گیا۔ اسماء اب میری بیوی ہے اور میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بہت سے لوگ جو اس سچائی سے واقف نہیں ہیں واقف ہو جائیں اور گھر ٹوٹنے سے بچ جائیں۔

لبِ بام

جناب ایڈیٹر

السلام علیکم

ایک بار پھر میں ایک سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت میری ایک دیرینہ دوست کی ہے جسے میں نے کہانی کا رنگ دیا ہے۔ کچھ تبدیلی بھی کی ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔

راحت وفا راجپوت
(لاہور)

میں اپنے آفس میں بیٹھی تھی کہ چپڑاسی نے کسی آدمی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے دوپٹا سلیقے سے سر پر اوڑھ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد ایک جوان آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ اس نے مجھے سلام کیا مگر میں تو جیسے سحر زدہ سی ہوگئی تھی۔ اس شخص میں عجیب سی کشش تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے اس طرح دیکھنے سے اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے ایک بار پھر سلام کیا تو میں

ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

''جی بیٹھیے۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بچے اس کے قریب کھڑے تھے۔

''جی۔'' میں نے کہہ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''اپنے دونوں بچوں کو آپ کی اکیڈمی میں داخل کروانے آیا ہوں۔ ہم اس محلے میں نئے شفٹ ہوئے ہیں۔'' اس کی آواز بھی بہت سحر انگیز تھی۔

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد بچوں کا داخلہ ہو گیا۔ اس نے فیس ادا کی اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ دل و دماغ میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ میری ذات کے سمندر میں بھنور ڈال گیا تھا۔ پتا نہیں اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اب تک میں نے کبھی کسی مرد کے لیے اپنے اندر کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ پھر کیا ہوا یہ بتانے سے پہلے میں اپنے ماضی کا تعارف کرادوں۔

میرا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ بھائی بڑا تھا اور اس سے پانچ سال چھوٹی میں یعنی آمنہ اور مجھ سے چھ سال چھوٹی رابعہ تھی۔ اولاد میں اتنا وقفہ قدرتی طور پر ہی تھا۔ ابا ایک پرائمری اسکول میں پی ٹی ٹیچر تھے۔ محدود آمدنی میں امی جان بہت سلیقے سے گھر چلا رہی تھیں۔ ندیم بھائی نے میٹرک کرنے کے بعد ٹیکنیکل کالج سے الیکٹریشن کا ڈپلوما کورس کیا تھا اور انہیں ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری مل گئی تھی۔ ان کا افسران پر بہت مہربان تھا۔ اس کے گھر میں جب بھی بجلی سے متعلق کوئی کام نکلتا تو وہ بھائی کو بلایا کرتا تھا۔ یہ روز روز کا جانا رنگ لے آیا۔ افسر کی بیٹی نے ندیم بھائی کو پسند کر لیا۔ ندیم بھائی خوب صورت اور اونچے لمبے قد کے جوان تھے۔ وہ لڑکی عمر میں ان سے بڑی تھی اور صحت مند بھی تھی۔

پتا نہیں اس نے کیسا چکر چلایا کہ ندیم بھائی امی جان کے سامنے تن گئے کہ شادی کروں گا تو فرزانہ سے۔ امی ابو نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے تو ہم سب بھائی کا رشتہ لے کر فرزانہ کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے والدین نے رسماً بھی وقت نہیں مانگا اور فوراً ہی ہاں کر کے دو ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی دے دی۔ امی نے جو پیسے جمع کر رکھے تھے وہ سب لگا دیئے۔ بھائی کا کہنا تھا کہ ولیمہ کسی بہت اچھے ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ ان کی یہ ضد پوری کرنے کے لیے ابا نے کچھ دوستوں سے قرض لیا۔ امی نے محلے کی کمیٹی قبل از وقت لی اور شان و شوکت سے شادی کرادی۔

فرزانہ بھابی چڑچڑی سی تھیں، پہلے دن سے ہی انہوں نے ہم گھر والوں کو کوئی لفٹ نہیں کرائی اور شادی کے ایک ماہ بعد ہی اپنے گھر چلی گئیں۔ بقول ان کے یہاں چھوٹے سے گھر میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ بھائی نے بھی اس کی تائید کی اور یوں وہ اپنے والدین کے گھر ہی رہنے لگیں اور پھر بھائی بھی ہفتے میں چار دن ادھر گزارنے لگے۔ شادی کے بعد تنخواہ لے کر آئے تو آدھی امی کو دی ساتھ ہی یہ کہا کہ اب بیوی کو خرچا بھی دینا ہے۔

امی پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ کمیٹیاں اور قرضے سب منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد کمیٹی دیتا رہے گا۔ ابا بھی فکر مند تھے اور اسی فکر مندی میں وہ بلڈ پریشر کے مریض بن گئے۔ ستم در ستم یہ کہ شادی کے تین ماہ بعد بھائی کا سالا جو کہ دبئی میں ہوتا تھا اس نے ندیم بھائی کو دبئی بلوانے کا کہہ دیا۔ بھائی دل و جان سے تیار ہو گئے۔ امی نے کہا۔ دو بیٹیوں کے ساتھ ہم بوڑھے ماں باپ کیا کریں گے مگر ہوا وہی جو بھابی کی مرضی تھی۔ بھائی دبئی چلے گئے ہم حیران اور بے بس تھے۔ ابا دنوں میں بوڑھے لگنے لگے تھے۔ امی روتی رہتیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھی اور میرا ارادہ کسی اچھے کالج میں داخلہ لینے کا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بند گلی میں آگئے ہوں فکر سے ابا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ قرضہ دینے والے اب واپسی کا تقاضا کر رہے تھے۔ دو ماہ تک تو بھائی نے دو چار بار تسلی کا فون کیا اور اپنے سیٹ ہونے کے بعد کچھ پیسے بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔

تقدیر نے ایک اور کاری وار کیا۔ ایک رات ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ ہم تینوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم پر تو جیسے دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ماں کا ویران چہرہ ہم بہنوں کو دہلائے دیتا تھا۔ امی گم صم ہو گئی تھیں۔ بھائی کا فون آیا تھا، وہ بھی رو رہا تھا۔ باپ کا آخری بار منہ نہ دیکھنے پر غم زدہ تھا۔

صدمہ کچھ کم ہوا تو اردگرد دیکھا کہ اب زندگی کیسے گزرے گی۔ امی سیدھی سادی عورت تھیں۔ ابا ہی گھر اور باہر کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ اب ہم تین عورتیں تھیں۔ رابعہ چوتھی جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ اسے اس سنگین حالات کا ادراک نہیں تھا۔ ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کی غم گسار تھیں۔ ابا کی تنخواہ بند ہو گئی۔ ان کی پنشن اور بقایا جات کے ملنے میں ابھی کچھ عرصہ لگنا تھا۔ جمع پونجی کچھ نہیں

تھی۔ بھائی نے ابھی تک ایک روپیا بھی نہیں بھیجا تھا۔ بھابی اور اس کے گھر والے ابا کے مرنے پر تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے پھر دوبارہ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا۔

میں بہت پریشان تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون نہیں آئے تھے۔ میں نے ایک دن بھائی کو امی سے چھپ کر فون کیا اور گھر کے حالات بتائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی کچھ کریں گے۔ چند دن بعد بھائی کا فون آیا کہ انہوں نے فرزانہ بھابی کو پیسے بھیجے ہیں وہاں جا کر پانچ ہزار روپے لے لیں۔ امی بہت خوش ہوئیں مگر مجھے اس بات کا شدید دکھ ہوا کہ ماں کو پیسے بھیجنے کی بجائے بیوی کو بھیجے ہیں اور اب ماں وہاں جا کر بہو سے پیسے مانگنے گی مگر امی اسی بات پر خوش ہو گئی تھیں کہ چلو آمدنی کا کوئی سلسلہ تو ہوا۔ اگلے دن امی بھابی کے میکے جا پہنچیں اور پیسے لے آئیں۔ ہم نے کچھ راشن اٹھایا فون اور بجلی، گیس کے بل ادا کیے۔

میرا رزلٹ آ گیا تھا۔ میں نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ کالج کا خیال تو کب کا بھول چکی تھی۔ پرائیویٹ ایف اے کرنے کی تیاری شروع کر دی اس طرح تین ماہ اور گزر گئے۔ امی بھابی کی طرف اکیلی ہی جاتی تھیں۔ ایک بار میں نے کہا تو ٹال گئیں اور پھر ان کی واپسی بھی کافی دیر بعد ہوتی تھی۔ اگلے ماہ جب بھابی سے پیسے لینے جانا تھا تو امی کو بہت تیز بخار ہو گیا ہر ماہ پانچ تاریخ کو وہ جاتی تھیں۔ بخار کی وجہ سے دو دن نہ بستر سے اٹھ سکیں پھر رابعہ کو ساتھ لے کر چلی گئیں۔ واپسی پر ان کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ پریشانی یہ ہوئی تھی کہ بھابی نے کہہ دیا کہ آپ مقررہ دن نہیں آئیں تو پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔ اب اگلے ماہ ملیں گے۔

''مجھے شدید غصہ آیا۔ بھائی کا فون آیا تو میں نے شکایت کی تو وہ الٹا مجھے ڈانٹنے لگے اور بھابی کی طرفداری کرتے رہے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔''

اگلے ماہ میں نے فیصلہ کیا کہ امی کے ساتھ خود جاؤں گی۔ امی مسلسل انکار کرتی رہیں مگر میں بھی ڈٹ گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹیاں صبح دس بجے بھابی کے گھر پہنچے۔ رابعہ کو ہم نے ہمسائی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ بہت بار بیل دینے کے بعد ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ملازمہ نے پانی تک کا نہ پوچھا۔ امی کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ ملازمہ صفائی کر رہی تھی۔ بھابی اور ان کی والدہ سو رہی تھیں۔ میں نے پانی مانگا تو سادہ پانی لے کر آئی۔ میں نے کہا۔ ''بھابی کو بتاؤ ہم آئے ہیں۔''

وہ کہنے لگی۔ ''مالکن بہت ناراض ہوتی ہیں اگر سوتے میں اٹھایا تو۔'' تب میں نے سمجھا کہ ہر بار یہاں سے واپسی پر امی اتنی نڈھال کیوں ہوتی ہیں۔ بہو کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت، بھوک اور پیاس کی اذیت۔ اپنی بے بسی اور کمتری کا احساس لے کر وہ یہاں سے لوٹتی تھیں۔

دوپہر کا ایک بج گیا ہم بیٹھے رہے۔ آخر بھابی اپنے کمرے سے باہر نکلیں اور بغیر کسی سلام دعا کے کچن میں چلی گئیں۔ توہین کے احساس نے میری رگوں میں دوڑتے لہو کو گرما دیا۔ میں نے بھابی کے پاس جا کر کہا۔ ''ہم دس بجے کے آئے ہوئے ہیں۔ امی آپ کے شوہر کی ماں ہیں اور ان کی ذرا برابر عزت نہیں آپ کے دل میں۔''

بھابی بھڑک گئیں اور کہنے لگیں۔ ''شکر نہیں کرتیں تم کو میرا شوہر اب بھی اپنی کمائی کھلا رہا ہے، احسان ماننے کی بجائے بدتمیزی کر رہی ہو۔ چلو کوئی پیسے نہیں ہیں، آ جاتی ہیں فقیرنیاں میرے دروازے پر۔''

امی مجھے روکنے لگیں۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے بھی بہت سنائیں بھابی کی والدہ بھی باہر آ گئیں۔ وہ بھی بیٹی کو شہہ دینے لگیں۔ امی نے بھابی کے آگے ہاتھ جوڑے کہ آمنہ کی جگہ میں معافی مانگتی ہوں۔ بھابی نے امی کو غصے سے پیچھے دھکا دیا۔ امی نیچے گر پڑیں۔ غصے سے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں نے امی کو اٹھایا اور بھابی سے کہا۔ ''تمہارے شوہر کا فون آئے تو اس سے کہنا اس کی ماں اور بہنیں آج سے مر گئی ہیں۔ اب یہ پانچ ہزار بھی وہ اپنے سسرال والوں کو ہی کھلائے۔'' یہ کہہ کر میں امی کو لے کر باہر آ گئی۔

گھر سے نکلتے ہی ہم ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ گلی میں آتے جاتے لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رکنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے دوپٹے سے امی کا چہرہ صاف کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر آ گئی۔

''میں ندیم کو بتاؤں گی کہ اس کی بیوی نے میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ میں ہر بار چپ چاپ بے عزتی کروا کر آ جاتی تھی کہ میرا بیٹا پردیس میں ہے وہ پریشان ہو گا۔''

میں ماں کی سادہ دلی پر ہنس دی۔ رات کو ندیم بھائی کا فون آ گیا اور ہماری کوئی بات سنے بغیر انہوں نے امی اور مجھے وہ سنائیں، بیوی کے آنسوؤں نے انہیں مشتعل کر دیا

تھا۔ میں نے بتانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ عادت کی وجہ سے ریسیور نہیں اٹھایا تھا اسپیکر آن کر دیا تھا کہ امی بھی سن سکیں وہ گم صم سب باتیں سن رہی تھیں پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور سیٹ کے قریب جا کر کہا۔ ”آج کے بعد تم میرے لیے مر گئے ہو، میرا اور میری بیٹیوں کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں آج یہ کہہ دیتی ہوں کہ میرے جنازے پر بھی تمہیں نہ آنے دیا جائے۔“ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں خود ہکا بکا رہ گئی۔ امی کے چہرے پر اب سکون تھا۔ ایک ماں کا دل ہی جانتا ہے کہ اس پر کیا طوفان گزر گیا ہے مگر باہر سے امی پُرسکون تھیں۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اُمید تھی کہ چند دن تک ابا کی پنشن شروع ہو جائے گی اور کچھ رقم بھی مل جائے گی۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری اور آیندہ کے لیے پلاننگ کرتی رہی۔ وقت نے مجھے بڑا کر دیا تھا۔ ابا کی پنشن لگ گئی جو کہ بہت معمولی سی رقم تھی۔ بہرحال نہ ہونے سے تو بہتر تھی جو پیسے ملے ان سے بھائی کی شادی پر لیا ہوا قرضہ واپس ہوا۔ کمیٹیوں کا حساب کیا گیا۔

ہمارا گھر اپنا تھا۔ نیچے دو کمرے باورچی خانہ اور چھوٹا سا صحن تھا اور ایک کمرا اور باتھ روم تھا جو کہ بھائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ امی سے مشورہ کر کے میں نے اوپر ایک اور کمرا، باورچی خانہ بنوانے کا فیصلہ کیا۔ مناسب پیسوں میں یہ کام ہو گیا تو ہم اوپر شفٹ ہو گئے اور نیچے والا حصہ کرائے پر دے دیا۔

ہماری گلی سے ذرا ہٹ کر ایک پرائیویٹ اسکول کھلا تھا۔ میں نے وہاں جاب کر لی۔ میرے میٹرک کے بہترین نمبر میرے کام آئے اور چھوٹی کلاسز کو پڑھانے کے لیے مجھے رکھ لیا گیا۔ شام کو محلے کے بچے مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو مشین بنا لیا۔ دن رات محنت، بھائی نے کئی بار فون کیا۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر ہم لائن کاٹ دیتے۔ گھر میں بھائی کا ذکر بھی نہیں ہوتا تھا۔ زندگی آسان ہونے لگی۔ میں ایف اے کر کے بی اے کر رہی تھی۔ جب سنا کہ بھابی کو بیٹا ہوا ہے اور وہ ندیم بھائی کے پاس دبئی چلی گئی ہیں۔ اس خبر کو ہم نے بڑی بے نیازی سے سنا مگر چھپ کر ہم تینوں ہی روئے تھے اور پھر جب میں نے بی اے کر لیا تو ٹیوشن والے بچے اتنے ہو گئے کہ میں نے نیچے والا حصہ خالی کروا کر امی کے نام سے اکیڈمی بنا لی۔ چند سالوں میں ہی اللہ کی مہربانی اور ہماری محنت سے حالات بدل گئے۔ آہستہ آہستہ میں نے چند لڑکیوں کو ٹیچر رکھ لیا۔ رابعہ بھی پڑھاتی تھی۔ میں بھی بڑی کلاسز کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ارد گرد میری اکیڈمی کا نام مشہور ہو گیا۔ پہلے مڈل تک تھی پھر میں نے میٹرک تک کر لی۔ اب امی چاہتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے ہر ماں کی طرح انہیں میری فکر تھی مگر میں اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی تھی، جب امی نے زیادہ اصرار کرنا شروع کیا تو میں نے کہا۔ ”میری شرط ہے کہ کوئی ایسا بندہ ڈھونڈیں جو میرے گھر میں رہے۔“

امی خاموش ہو گئیں مگر وہ میرے لیے رشتہ دیکھتی رہتی تھیں۔ اتنے سالوں میں ندیم بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ انہوں نے گویا ہمیں بھلا دیا تھا۔ ہم نے بھی ان سے رابطے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک بار ایک محلے دار نے بازار میں انہیں دیکھا تھا، ان سے ملا بھی تھا۔ پتا چلا کہ دو بچے ہیں تین ماہ کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ بقول اس محلے دار کے کہ ندیم نے ایک بار بھی ماں اور بہنوں کا نہیں پوچھا تھا۔ شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ بیٹے اور مال اللہ کی آزمائش ہیں۔

ہم نے بھی صبر کر لیا تھا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ میری عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ میں بہت خوب صورت اسمارٹ تھی مگر اب تک کسی کو دیکھ کر دل دھڑکا نہیں تھا پہلی بار جمال کو دیکھا تو دل میں چھپے خواب یکا یک بیدار ہو گئے۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ اعیال دار ہے۔ اسی لیے تو دل کو پاگل کہا گیا ہے۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا جو مجھے پاگل بنائے دے رہا تھا۔

جمال اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں کرائے پر شفٹ ہوا تھا۔ یہ مکان دو سال سے خالی تھا۔ مالک مکان کہیں اور چلے گئے تھے۔ اب جمال کو کرائے پر دیا تھا۔ جمال کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ کسی سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر ملازم تھا۔ جو بات اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی وہ اب سر چڑھ کر محسوس ہونے لگی تھی۔ بالکل فلموں جیسی سچویشن ہو گئی تھی۔

بچوں کا داخلہ ہو گیا تھا۔ اگلے دن وہ اکیڈمی آ گئے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

انہیں جمال ہی چھوڑنے آیا تھا۔ ایک بار پھر اسے سامنے دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ دو دن گزرے تھے کہ امی نے مجھے بتایا کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے، بیوی آج ملنے آئی تھی۔ گاؤں کی ہے۔ ادھر کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔ میں نے جمعہ والے دن ان کو اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔

میرا تو خوشی سے دل ہی کھل گیا۔ جمال سے ملاقات کا راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ جمعہ والے دن میں نے بہت اہتمام سے شاندار کھانا بنایا۔ بہترین برتن نکالے۔ اپنے نئے اسٹائلش ریڈی میڈ سوٹ کا انتخاب کیا۔ میرے بال بہت لمبے اور سیاہ تھے۔ اسے میں نے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ میں ایسا کیوں کر رہی تھی مجھے خود پتا نہیں تھا۔ مقررہ ٹائم پر وہ لوگ آ گئے۔ جمال بلیک نیٹ اور سرخ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ سیاہ بال اس کی پیشانی پر بکھرے بکھرے تھے۔ وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ مجھے اس کی بیوی کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک کم صورت اور دیہاتی سی لڑکی تھی۔ اتنی گرمی میں بھی اس نے ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ بچے بھی عام سی شلوار قمیصوں میں تھے۔ مجھے جمال کی بیوی عابدہ پر بہت رشک آیا۔ اس عام سی لڑکی کی قسمت کتنی اچھی تھی۔

انہیں کھانے کی دعوت دی تو جمال نے کہا۔ ''آپ نے تو بہت تکلف کر لیا ہے۔''

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ عابدہ بہت اناڑی پن سے کھا رہی تھی۔

بچوں کو کھانا میں نے ہی کھلایا۔ کھانے کی جمال نے بہت تعریف کی۔ میری تو جیسے محنت ہی وصول ہو گئی۔ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں عابدہ سے کہا۔ ''باجی! بہت گرمی ہے آپ موسم کے کپڑے پہنیں۔ ریشمی کپڑوں میں آپ کو گرمی لگ رہی ہو گی۔''

''ہاں لے لوں گی۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ عابدہ کو بازار سے کچھ اچھے کپڑے دلا دیں۔ اسے فیشن اور کلرز کا کچھ پتا نہیں ہے۔'' جمال نے مجھ سے کہا۔

''جی ضرور۔ جب آپ کہیں۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ رات گئے تک ان کا ہمارے گھر رہنا میری زندگی کا خوب صورت لمحہ تھا۔ عابدہ نے امی کو کہہ دیا کہ آپ میری امی ہیں تو میری امی نہال ہو گئیں۔ امی کو جمال میں

ٹوانہ

شاہ پور کوہستان نمک کے دامنی علاقہ میں ٹوانہ آباد ہیں اور انہوں نے پنجاب کی تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ نمایاں کردار ادا کیا جو محض ان کی تعداد دیکھتے ہوئے مشکل نظر آتا ہے۔ انہیں پنوار راجپوت اور سیال و گھسیا والے مورث اعلیٰ کی نسل سے ہی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں غالباً سیالوں کے ساتھ ہی آئے اور یقیناً پندرہویں صدی ختم ہونے سے پہلے۔ وہ سب سے پہلے دریائے سندھ پر جہانگیر کے مقام پر آباد ہوئے لیکن انجام کار شاہ پور تھل میں اپنے موجودہ مسکن کو چلے گئے جہاں مٹھا ٹوانہ میں اپنا مرکزی قصبہ تعمیر کیا۔ اس سے بعد کی تاریخ ''دی چیفس آف پنجاب'' کے صفحات 519 تا 534 اور کرنل ڈیویز کی شاہ پور رپورٹ کے صفحہ 40 سے آگے بیان کی گئی ہے۔ باقی کا ضلع سکھوں کا مطیع ہو جانے کے لیے کافی عرصہ بعد تک ٹوانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اب وہ ایک نیم گلہ بان، نیم کاشتکار قبیلہ، سپاہی پیدا کرنے والے مضبوط آدمیوں کی نسل ہیں۔ تاہم ان کے اوصاف افسوس ناک طور پر ان کی انتہائی جھگڑالو افتاد سے داغدار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندرون خانہ اور جس کسی کے ساتھ بھی واسطہ پڑا ان کی غیر مختتم شورش جاری ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں
از: سر ڈینزل ابٹسن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

شاید اپنا بیٹا نظر آ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں جب امی ندیم بھائی کے بارے میں بتاتے ہوئے آبدیدہ ہوگئیں تو جمال نے کہا۔ ”آنٹی آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں اور عابدہ کو بہو اور بچوں کو اپنے پوتے۔“

امی خوشی سے رو پڑیں۔ اگرچہ وہ میرے سامنے ندیم بھائی کا کبھی نام نہیں لیتی تھیں مگر میں جانتی تھی کہ بیٹے کی جدائی کا دکھ انہیں اندر سے کھا رہا ہے۔ اس دن کے بعد عابدہ بے تکلفی سے ہمارے گھر آنے جانے لگی۔ جمال کم ہی آتا تھا۔

میرے کمرے کی کھڑکی سے جمال کے گھر کا صحن صاف نظر آتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے وہ لوگ صحن میں سوتے تھے۔ ایک بچہ جمال کے ساتھ اور دوسرا عابدہ کے ساتھ سوتا تھا۔ میں رات گئے تک اسے دیکھتی رہتی تھی۔ کھاتے پیتے ہنستے مسکراتے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

اسی کشمکش نے مجھے بیمار کر دیا۔ بہت تیز بخار تھا۔ گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے اکیڈمی میں بچوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ رابعہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بھی کالج سے آ کر بچوں کو پڑھاتی تھی۔ دو دن سے مجھے بخار تھا۔ عابدہ کئی بار میری خبر لینے آ چکی تھی مگر وہ ستم گر نہ آیا نہ حال پوچھا۔ تیسرے دن بخار کچھ ہلکا ہوا۔ امی میرے لیے کھچڑی بنا رہی تھیں۔ رابعہ نیچے اکیڈمی میں تھی کہ جمال آ گیا۔ امی نے کمرے میں آ کر مجھ سے کہا کہ میں دوپٹا وغیرہ درست کر لوں۔ جمال میری خبر لینے آیا ہے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑے غور سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو جیسے دل میں طوفان سا آ گیا۔ میں نے جلدی سے نگاہ جھکا لیں۔ پھر اسے پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

بیماری کے دوران بھی میں رات کو کھڑکی سے ان کے صحن میں ضرور دیکھتی تھی۔ اگرچہ دماغ مجھے سمجھاتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ مرد اور دو بچوں کا باپ ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ جمال کی بہن کی شادی عابدہ کے بھائی سے ہوئی ہے یعنی وٹے سٹے کا معاملہ ہے۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ جمال ساری زندگی عابدہ کے ساتھ رہنے کا پابند تھا۔ مگر دل یہ ساری باتیں نہیں مانتا تھا۔ وہ تو ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا کہ جمال ہی چاہیے۔ جب بھی عابدہ اور جمال ہمارے گھر آتے یا ہم ان کے گھر جاتے، میں جان بوجھ کر عابدہ پر ہمدردی کے انداز میں تنقید کرتی تو جمال کے ماتھے پر بل گہرے ہو جاتے۔ عابدہ گاؤں کی لڑکی تھی۔ اس کی چال ڈھال رہن سہن سب میں گنوار پن جھلکتا تھا۔ یہی ایک بات تھی جس کا میں نے فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ جمال سب کے سامنے ہی عابدہ سے بے زاری اور انسلٹ کا انداز اختیار کرنے لگا۔ دوسری طرف میں نت نئے لباس خوب صورت ہیئر اسٹائل اور اپنے ہر انداز سے جمال کو متاثر کرنے میں لگی ہوئی تھی جس طرح عورت کو خدا نے ایک خاص حس دی ہے کہ وہ مرد کی نگاہ کو سمجھ جاتی ہے اسی طرح مرد کے پاس بھی وہ نظر ہوتی ہے جس سے عورت کی نظر پہچان لیتا ہے کہ اس میں نفرت ہے یا محبت۔

عابدہ اور جمال کی شادی کی سالگرہ تھی۔ یہ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ فضا میں ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس رچا ہوا تھا۔ شام کو ہلکی سی خنکی محسوس ہونے لگی تھی اور موسم بے حد دلکش ہو گیا تھا۔ امی کے کہنے پر میں نے عابدہ کے لیے خوب صورت سا جیولری سیٹ اور جمال کے لیے پینٹ شرٹ خرید لی تھی۔ بچوں کے لیے بھی گفٹ تھے۔ شام کو ہم ان کے گھر گئے۔ میں ہمیشہ کی طرح اسٹائلش کپڑوں میں ملبوس تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جمال کی آنکھوں میں پسندیدگی اتر آئی جس نے میری دھڑکن تیز کر دی۔ عابدہ تیار ہو رہی تھی۔ میرون رنگ کا سلمے ستارے سے سجا سوٹ اس نے پہن رکھا تھا۔

”آج آپ کو ساڑی باندھنی چاہیے تھی۔“ میں نے جمال کے سامنے ہی اسے کہا۔

”مجھے نہیں پہننی آتی۔“ وہ بولی۔

”آمنہ جی آپ اسے ساڑی باندھنا سکھا دیں اس جاہل کو تو کچھ پتا نہیں ہے۔“ جمال تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ”میں دو ساڑیاں لایا تھا۔ ایک بھی نہیں پہنی اس نے۔“

”کوئی بات نہیں میں سکھا دوں گی۔ میں آپ کے لیے پینٹ شرٹ لائی ہوں۔ آپ یہ پہنیں تب تک میں عابدہ کو تیار کراتی ہوں۔“

ایک ہلکے رنگ کا سوٹ اور اپنی لائی ہوئی جیولری عابدہ کو پہنا کر اس کا میک اپ کیا تو وہ ایک دم بدلی ہوئی

لگنے لگی۔ جمال بھی تیار ہو کر باہر آیا تو بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

''شکریہ۔'' وہ میری طرف جھک کر آہستگی سے بولا۔ ''یہ میرا بھی فیورٹ کلر ہے۔ ہم دونوں کی پسند کتنی ملتی ہے۔''

میں خاموش رہی۔ امی اور رابعہ، عابدہ کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں۔

''آپ کو پسند آیا مجھے خوشی ہوئی۔''

''کاش کبھی عابدہ میرے لیے شاپنگ کرتی مجھے تو حسرت ہی رہی۔''

''ایک بات پوچھوں۔'' میں نے کہا۔

''جی ضرور۔''

''آپ اتنے پڑھے لکھے ہیں تو آپ کے والدین نے کوئی پڑھی لکھی لڑکی کیوں نہ دیکھی۔''

''بس آمنہ جی، میری بہن جو مجھ سے بڑی ہیں عابدہ کے بھائی کے گھر ہے۔ وہ بے اولاد ہیں ان کا گھر نہ اجڑے اس لیے مجھے یہ قربانی دینا پڑی۔''

''ہنہ!'' میں نے ہنکارہ بھرا۔

''مگر زندگی کا ساتھی ہم مزاج نہ ہو تو سفر بہت مشکل لگنے لگتا ہے۔ میں عابدہ کو کسی دوست کے گھر نہیں لے جاسکتا۔ وہ اپنی زندگی میں مگن ہے مگر میرے اندر کا انسان ناآسودہ ہے۔ میں زندگی گزار نہیں گھسیٹ رہا ہوں۔'' پہلی بار جمال نے تفصیل سے بات کی اور اپنے دل کا درد بتایا۔ میں اسے تسلی دینے لگی۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

''آپ سے بات کر کے دل کو عجیب سا سکون ملا ہے، اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کو فون کرلیا کروں۔'' اس نے پوچھا۔

''مجھے برا نہیں لگے گا۔'' یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

اس دن کے بعد سے تواتر سے اس کے فون آنے لگے۔ کافی دیر دیر تک باتیں ہونے لگیں۔ پھر ایک دن جمال نے مجھ سے اظہار محبت کردیا۔ اس نے کہا۔ بہت عرصے سے جس خوشی کی مجھے تلاش تھی وہ تم سے ملی ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں بھی تو یہی چاہتی تھی، سو ہواؤں میں اڑنے لگی۔

دوپہر میں اکیڈمی کے فون پر اس سے بات ہوتی بہانے بہانے سے ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے موقع تلاش ہونے لگے۔ پھر کبھی کبھار باہر بھی ملنے لگے۔ میری بے رنگ اور سپاٹ زندگی میں بہار آگئی۔ ادھر عابدہ سارا وقت امی کے ساتھ لگی رہتی۔ کبھی کھانا پکانا سیکھتی کبھی کپڑوں کی سلائی، بچے بھی امی کو دادو کہنے لگے تھے۔ میں نے صاف طور پر جمال سے کہہ دیا کہ مجھے اس کا عابدہ کو چھونا بھی پسند نہیں۔

اس نے کہا۔ ''جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صرف میرے بچوں کی ماں ہے۔''

ہماری محبت کو سات ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے لیے کئی رشتے آئے مگر میں نے امی کو صاف منع کردیا۔ جمال نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مناسب طریقے سے امی سے میرا ہاتھ مانگے گا۔ مجھے اس کی بیوی کا تعلق بھی منظور تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ عابدہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ میں اسے گاؤں میں رکھوں گا اور ہم دونوں یہیں رہیں گے۔

جمال سے میری محبت عشق کا روپ دھار چکی تھی۔ وہ بھی میرے لیے جنونی ہو رہا تھا۔

ایک شام عابدہ اور جمال آئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ امی نے گجریلا بنایا تھا اور انہیں دعوت پر بلایا تھا۔ بچے رابعہ کے ساتھ شرارتوں میں لگے ہوئے تھے۔ عابدہ اور امی باتیں کررہے تھے۔ جمال سے بھی بات ہو رہی تھی۔ سب کی نظر بچا کر وہ مجھے کوئی اشارہ کرتا یا ذومعنی بات کہتا تو میرا دل دھڑک اٹھتا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک عابدہ اٹھی اور بھاگ کر واش روم کی طرف چلی گئی۔ امی بھی اس کے پیچھے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد امی عابدہ کو پکڑے واپس آئیں اور اسے صوفے پر لٹا دیا۔

''کیا ہوا امی۔'' میں نے پوچھا۔

جمال بھی عابدہ کے پاس جا کر پوچھنے لگا۔ ''کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟''

''اس حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔'' امی نے محتاط الفاظ میں جمال سے کہا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں بچی نہیں تھی۔ سب سمجھ گئی۔ مارے طیش کے میری رگوں میں خون ابلنے لگا۔ وہ تو کہتا تھا جب سے تم ملی ہو میں نے عابدہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اب عابدہ کیسے اُمید سے ہو گئی۔ میں نے بڑی کاٹ دار نظروں سے جمال کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے نظر چرا گیا۔ میں

غصے سے باہر آگئی۔ پھر وہ لوگ اپنے گھر چلے گئے۔ میں ساری رات غصے سے کھولتی رہی کہ وہ کس قدر دھوکے باز ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ کبھی روتی کبھی ہنستی عجیب پاگلوں جیسی حالت ہوگئی تھی۔

دوسرے دن میں نیچے اکیڈمی میں بھی نہیں گئی کیونکہ میں جانتی تھی وہ ضرور آئے گا۔ رابعہ نیچے چلی گئی۔ اگلے دن آفس میں جا کر بیٹھی تھی کہ اس کا فون آگیا۔ سی ایل آئی میں نمبر دیکھ کر میں نے ریسیور ہی نہیں اٹھایا۔ بیل پر بیل ہوتی رہی۔ شام کو دونوں میاں بیوی گھر آئے، میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کمرے میں لیٹی رہی۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ساتویں دن وہ آفس میں آگیا۔ عجیب اجڑی سی حالت ہو رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہم کئی بار تنہائی میں ملے تھے مگر اس کی اس بات نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا تھا کہ وہ کبھی تنہائی کا فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ کبھی کبھار ہاتھ تھامنے کے علاوہ اس نے میرے قریب ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت میں اکیلی تھی کوئی ٹیچر یا بچہ کسی ٹائم بھی آسکتا تھا۔

”چھوڑیں میرا بازو آپ بہت......“ میری بات مکمل نہ ہوئی اور آنسوؤں نے روک لی۔

”مجھے معاف کردو آمنہ میری جان۔ بس مجھ سے غلطی ہوگئی۔ شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں کمزور پڑ گیا۔ مجھے معاف کردو۔ چلو اسی وقت میں تمہاری امی سے تمہارا ہاتھ مانگتا ہوں۔“

”نہیں مجھے اب آپ کا اعتبار نہیں آپ نے میری توہین کی ہے۔“ میں بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

اس نے جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔

”نہیں آپ جائیں میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اچانک وہ میرا بازو چھوڑ کر میرے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ”صرف ایک بار مجھے معاف کردو۔“

میں ششدر رہ گئی۔ وہ میرے دل کا مکین تھا۔ میری پہلی محبت۔ میرا عشق تھا۔ میرا جنون تھا۔ میں اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ اسے اپنے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر تڑپ گئی۔ ”پلیز ایسا نہ کریں۔“ میں دور ہوگئی۔ میرے دل میں فخر کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ ایک مرد اپنا وقار کسی عورت کے سامنے اسی وقت کم کرتا ہے جب اس کے دل میں محبت کا طوفان اٹھتا ہے۔ اب میں اور کتنا ناراض رہتی۔ اس کی اس ادا نے میرا دل پانی پانی کردیا۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا۔ ”آمنہ تم مجھے دھوکے باز اور جھوٹا نہ سمجھو۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اور اپناؤں گا بھی۔ اس بار میں گاؤں جاؤں گا تو ابا اور امی سے بات کروں گا۔ پہلے تمہاری امی راضی ہو جائیں۔ میں اور وہ مل کر پھر خواب بننے لگے۔ امی اب عابدہ کا اور بھی خیال رکھنے لگی تھیں۔ اکثر کھانا ہمارے گھر سے ہی جاتا۔ جمال امی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے خود ہی منع کردیا کہ عابدہ کی ڈلیوری میں تین چار ماہ ہیں وہ فارغ ہو جائے تو پھر بات کرنا۔“

دن گزر رہے تھے ہماری وہی روٹین تھی۔ فون اور باہر ملنا۔ میری برتھ ڈے آرہی تھی اور میری خواہش تھی کہ ہم دونوں باہر جائیں کیک بھی کاٹیں اور کھانا بھی کھائیں۔ جمال نے وعدہ کرلیا۔ اکیڈمی سے اس دن میں جلدی اٹھ گئی اور نہا دھو کر بہترین سوٹ پہنا۔ امی سے ایک دوست کی طرف جانے اور شاپنگ کا کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ مقررہ جگہ پر میں شام چھ بجے پہنچ گئی تھی۔ جمال نے بھی چھ بجے آنا تھا۔ مگر وہ نہ آیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ سات بجے، آٹھ بجے اور آخر نو بج گئے رات ہوگئی تھی۔ لوگ جو مجھے کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔ شرمساری اور اذیت سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ گھر پہنچی تو امی گھر پر نہیں تھیں۔ رابعہ نے بتایا کہ عابدہ کو لے کر اسپتال گئی ہیں جمال کے ساتھ۔

”تو یہ بات ہے بیوی کی تیمارداری میں ایک اکیلی جوان لڑکی کو وعدے کا پابند بنا کر انجان جگہ پر بٹھا کر بھول ہی گئے کہ میں کتنی پریشان ہوئی۔ کیسے لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کیا اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ دوسری بار اس نے میری توہین کی تھی۔ میں کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ صبح امی آئیں تو پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے۔ امی بہت خوش تھیں۔ وہ عابدہ کے لیے یخنی بنا رہی تھیں انہیں دوپہر کو پھر اسپتال جانا تھا۔ عابدہ کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ مجھے کوئی خوشی نہ تھی۔ میرے دل پر اوس پڑ چکی تھی۔ بے حسی کا احساس سارے وجود پر چھا چکا تھا۔ دوپہر کو رابعہ بھی امی کے ساتھ اسپتال چلی گئی۔ اکیڈمی کے ٹائم پر میں نیچے آگئی۔ شام کو امی واپس آئیں۔ بتانے لگیں کہ عورتوں کے وارڈ میں مرد نہیں رہ سکتا۔ اس لیے رات کو جمال مجھے لے جائے گا۔ تم دونوں بہنیں دروازہ اندر سے بند کرلینا۔ جمال بھی خیال رکھے گا۔ جمال کو کھانا دے

دینا۔“

رات آٹھ بجے امی پھر چلی گئیں۔ رابعہ نے دال چاول بنائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹ گئی۔ رابعہ نے بتایا کہ ”جمال بھائی آئے ہیں آپ کو بلا رہے ہیں۔ آپ جائیں اور انہیں کھانا بھی دے دیں۔“

”نہیں رابعہ! مجھے بخار ہو رہا ہے تم انہیں جلدی سے کھانا کھلا کر فارغ کرو اور دروازہ بند کر کے آجاؤ۔“

وہ چلی گئی۔ میں گم صم سوچتی رہی کہ جمال کی زندگی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس لیے ابھی بھی وقت ہے پلٹ جانا ہی بہتر ہے۔ چار دن عابدہ اسپتال میں رہی۔ میں ایک بار بھی نہیں گئی۔ جمال سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ شاید وہ جان بوجھ کر میرا سامنا نہیں کر رہا تھا۔ عابدہ گھر آ گئی تھی۔ امی اور رابعہ کا زیادہ وقت اسی کے گھر گزر رہا تھا۔ جمال کی غیر موجودگی میں عابدہ سے مل آئی تھی۔ بچی بہت پیاری تھی۔ مجھے بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ کتنی دیر اسے گود میں لے کر بیٹھی رہی۔

یہ میری سالگرہ والے دن کے سات دن بعد کی بات ہے۔ رابعہ عابدہ کے پاس تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ امی کھانا بنا رہی تھیں۔ میں اکیڈمی کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اچانک جمال آ گیا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے مجھے دیکھا اور سلام کیا۔ میں جواب دیئے بغیر کمرے میں آ گئی۔ وہ امی کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امی نے مجھے آواز دی۔ میں باہر آئی تو دیکھا کہ امی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور جمال سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”آمنہ، جمال نے جو ابھی بات کہی ہے۔ تمہاری شہ پر کہی ہے یا اس کا اپنا دماغ خراب ہے۔“ امی نے غصے سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں گھبرا گئی۔

”میں نے آنٹی سے کہا ہے کہ میں آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ جمال نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ میں حیران پریشان رہ گئی۔

”بولو آمنہ کیا تم بھی جمال سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ امی کی آواز شعلہ بار تھی۔

میں نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ ”جی امی۔“

”آمنہ!“ امی لڑکھڑا گئیں۔ جمال تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دینے لگا۔

”ہٹ جاؤ پیچھے۔“ امی چلائیں۔ وہ وہیں رک گیا۔

”میں نے تمہیں بیٹا سمجھ کر اپنے گھر میں آنے کی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم میرے ہی گھر نقب لگاؤ گے۔“ امی رونے لگیں۔

”آنٹی پلیز! میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”آپ جانتی ہیں عابدہ سے میرا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میں آمنہ کو رانی بنا کر رکھوں گا۔ سارے حقوق ادا کروں گا۔ کوئی کمی نہ ہوگی۔ آمنہ سے پوچھیں ہم نے ایک ساتھ رہنے کے خواب دیکھے ہیں۔“

میں بے آواز رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جمال آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دے کر چلا گیا۔ امی سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

”میں عابدہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اسے بیٹی بنایا تھا۔ اب اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کے لیے اس کا گھر اجاڑ دوں۔ آمنہ تم تو بہت سمجھ دار ہو، کس راستے کا انتخاب کرلیا تم نے؟“ وہ پھر رونے لگیں۔ جب کافی دیر رونے کے بعد وہ چپ ہوئیں تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”امی جمال میری کانٹوں بھری راہ میں ایک خوش رنگ امید پھول ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو سن لیں جمال میری خوشی ہے۔ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلی اور آخری بار مانگ رہی ہوں۔ جمال سے میری شادی کے لیے مان جائیں۔“

وہ چپ چاپ میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ جمال نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے تو میرا ہاتھ مانگ لیا اس نے، اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا اور اب میں کیسے پیچھے ہٹ جاتی جب کہ میری خواہش بھی یہی تھی۔ اگلے دن امی نے جمال کو بلوایا اور کافی دیر اس سے نہ جانے کیا باتیں کرتی رہیں۔ جب جمال باہر آیا تو بہت خوش تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”میری جان! ایک مرحلہ تو طے کرلیا ہے، آنٹی مان گئی ہیں۔ اب ابا اماں کو منانے گاؤں جا رہا ہوں۔ دعا کرنا۔ کامیاب لوٹوں پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔“ میں شرما گئی۔

جمال گاؤں چلا گیا۔ عابدہ کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ امی اس کی پہلی جیسی تیمارداری کرتی رہیں۔ جمال کو گئے تیسرا دن تھا کہ عابدہ کا بھائی اسے لینے آ گیا۔ عابدہ بھی چلی گئی۔ دن پہ دن گزرتے رہے۔ جمال ابھی تک نہ لوٹا تھا۔

میرے تو دن رات انگاروں پر گزر رہے تھے۔ امی سے نظریں چرائے پھرتی تھی۔ رابعہ تمام باتوں سے لاعلم تھی۔

پندرہ دن کے بعد جمال آیا تو میری سانس میں سانس آئی۔ وہ بہت کمزور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ بہت بڑی جنگ لڑ رہا ہوں۔ عابدہ کا بھائی جمال کی بہن کو میکے چھوڑ گیا تھا اور اپنی بہن عابدہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ جمال نے بتایا کہ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس بار میں کسی قسم کی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔

میں پُرسکون ہوگئی۔ کافی دن گزر گئے۔ جمال مطمئن تھا کہ امی اس بار میرا ساتھ دیں گی۔ امی خاموش تھیں۔ جمال آتا میرے ساتھ باتیں کرتا۔ کھانا کھاتا امی خاموش دیکھتی رہتیں۔ پھر جمال گاؤں چلا گیا اور جب لوٹا تو اس خوشخبری کے ساتھ کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے ہیں۔ اس کی بہن اپنے گھر چلی گئی تھی۔ عابدہ کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جمال کے امی ابا آئے اور باقاعدہ میرا رشتہ طلب کیا اور تین ماہ بعد شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ امی مان گئیں مگر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آمنہ! میں صرف تمہاری خاطر راضی ہوئی ہوں تم نے بہت دکھ میرے ساتھ اٹھائے ہیں۔ بیٹا بن کر میرا ساتھ دیا ہے۔ اللہ کرے جمال تمہیں ساری خوشیاں دے۔ کوئی محرومی نہ رہے۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ ہم دونوں ماں بیٹی گلے لگ کر رونے لگیں۔

بھائی نے تو مڑ کر خبر نہ لی تھی۔ اب کون ہاتھ بٹاتا اس لیے امی میرے جہیز کی تیاری کرنے لگیں۔ عابدہ گاؤں سے آچکی تھی۔ میں شرمندہ سی تھی مگر اس نے مجھے گلے لگا کر کہا۔ ”میں تو شروع سے جانتی ہوں کہ جمال کو میری جیسی بیوی نہیں، کوئی خوب صورت پڑھی لکھی بیوی چاہیے تھی۔ تم میری بہن ہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ خوش رہیں گی اس لیے کہ ہم دونوں کی خوشی ایک ہی شخص ہے۔“

کتنا بڑا ظرف تھا اس کا، میں پُرسکون ہوگئی۔

جمال نے سارے کپڑے جوتے میری پسند سے خریدے۔ ہم دونوں نے اکٹھے شادی کی شاپنگ کی۔ شادی میں پندرہ دن تھے۔ میرا سرخ رنگ کا لہنگا آچکا تھا۔ امی نے اب جمال اور میرا پردہ کرا دیا تھا۔ عابدہ نے مجھے بلوایا تھا کہ ایک بار لہنگا اور اس کی قمیص چیک کرلوں کہ فٹنگ ٹھیک ہے۔ رابعہ نے بتایا کہ جمال گھر پر نہیں ہے۔ میں امی سے اجازت لے کر عابدہ کے پاس آگئی۔ لہنگا دیکھا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ میں واپس آنے لگی تو چائے کے لیے روک لیا۔ کہنے لگی اب تو تم نے دلہن بن کر ہی ادھر آنا ہے۔ میں شرما کر چپ رہی۔

چائے پیتے ہوئے عابدہ نے کہا۔ ”آمنہ تم واقعی جمال سے بہت سچی محبت کرتی ہو۔ ورنہ کوئی بھی لڑکی اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔“

”میں سمجھی اس کا اشارہ اپنی طرف ہے کہ بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے جمال کو قبول کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ میں خاموش رہی۔ میں مسکرا کر بات سنتی رہی۔ پہلے تو جمال اس شرط پر راضی نہیں ہوتا تھا اسے اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔ اسی لیے مان گیا مگر میرا خیال تھا کہ تم نہیں مانو گی۔“ عابدہ نے مسکرا کر کہا۔ اب ذرا میں نے دھیان دیا اس کی بات پر۔ کون سی شرط۔ مجھے تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔

”اچھا کیا جمال نے تمہاری رضامندی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کرلیا ہے۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”کیسا فیصلہ باجی پلیز کھل کر بتائیں۔“ میرا دل ایک دم گھبرانے لگا۔

”نہیں جب جمال نے تمہیں نہیں بتایا تو میں کیوں بتاؤں۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔

میں نے اصرار کیا قسم دی تو تب اس نے جو انکشاف کیا اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے بتایا کہ جمال کو شادی کی اجازت اس شرط پر دی گئی ہے کہ چونکہ جمال کے بچے ہی خاندان کے اصلی وارث ہیں ان کے ساتھ کوئی حصہ دار نہ ہو۔ ان کے ساتھ کوئی حق تلفی نہ ہو اس لیے جمال کی ضد پر گھر والوں کو ماننا پڑا۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ شادی سے پہلے ہی جمال ایک آپریشن کروائے گا جس سے اولاد نہ ہوگی اور اس طرح میں صرف جمال کی بیوی تو بن جاؤں گی لیکن اس کے بچوں کی ماں نہیں بن سکوں گی۔ تاکہ صرف عابدہ کے بچے ہی ہر چیز کے حقدار رہیں۔ پہلے تو جمال نہ مانا پھر شادی اسی صورت میں ہونے کی وجہ سے اس نے رضامندی دے دی۔

میرے سر پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ میری حالت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔ ”یہ شرط کسی بھی لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے مگر تم بہت اعلیٰ ظرف ہو اور واقعی جمال سے پیار کرتی ہو۔“

میں نے کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر چلی آئی۔

جگمگاتی جھلملاتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا دلہن نمبر
ماہنامہ پاکیزہ کراچی
سیما رضا ردا نے اپنے منی ناول
ہم کو عبث بدنام کیا
میں دکھائے کرداروں کے نت نئے رنگ
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے خوب صورت سلسلے وار ناول...... نئی اقساط لیے
سحرش فاطمہ کے سحرانگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول...... میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں
عالیہ حرا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول...... اشک ' جگنو اور ستارے
نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور حج کی باسعادت مناسبت سے اختر شجاعت کا پُرشکوہ مضمون
وہ آئے بزم میں......
ہماری سینئر رائٹر صبیحہ شاہ
کی صباحت بھری آمد
شائستہ زریں کا سنہرا روپہلا روپ لیے ایک جامع سروے
اس کے علاوہ
دلہن نمبر کے لیے شوخ وشنگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد،
اُمِ ثمامہ، حنادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار و دیگر ہنرمند لکھاریوں کی حسین تحریریں
اُس کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور پُرتحقیق کارنرز، سحرانگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان،
قابلِ عمل نسخے اور بہت بہت پُرلطف احوال...... صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

گھر آئی تو سامنے ہی امی میرے لیے لائے گئے پتھر کے برتن کا سیٹ رابعہ کو دکھا رہی تھیں۔

''امی جی!'' میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی اور اونچی آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ اور امی گھبرا گئیں۔ مجھے سنبھالنے لگیں۔ میں روتے روتے نڈھال ہو کر گر پڑی۔ امی محلے کے ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ اس نے انجکشن لگایا اور میں سو گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر سوتی رہی۔ جب اٹھی تو سامنے امی کو دیکھ کر پھر زخم تازہ ہو گیا۔ پھر رونے لگی۔

''کیا بات ہے بیٹی۔ مجھے بتاؤ۔''

''امی! میں جمال سے شادی نہیں کروں گی۔ خدا کے لیے انہیں منع کر دیں۔''

امی تو پریشان ہو گئیں۔ ''کیا بات ہے آمنہ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔ عابدہ نے کچھ کہا ہے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگیں۔

''نہیں امی کسی سے کچھ نہ کہیں۔ آپ منع کر دیں اور جمال سے کہہ دیں میرے سامنے نہ آئے۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیے امی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا۔ میری محبت اور اعتماد کے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیلا جمال نے۔ ہر لڑکی پیدائشی ممتا کے جذبے سے پُر ہوتی ہے اور میں تو بچوں کی دیوانی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا میرے اپنے بچے تو ہیں اور نہ بھی ہوئے تو کیا فرق پڑے گا۔ نئی عورت مل رہی ہے یہی بہت ہے۔ میری ہی ممتا کو تو اس نے زندہ درگور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اعتماد میں لیتا تو میں اس کی محبت میں اندھی ہو کر مان بھی جاتی۔ کیونکہ میں تو اس کے لیے پاگل تھی۔ اتنی بڑی قیمت محبت کو پانے کے لیے میں ادا کر دیتی اور میں ساری عمر خالی ہاتھ رہ جاتی۔ ایک ویران باغ جیسی زندگی ہو جاتی میری۔ میں سوچتی رہی روتی رہی۔

''باجی دروازہ کھولیں۔'' باہر سے رابعہ کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔ اس نے میری طرف بڑھایا۔ جمال کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''آمنہ! ایک بار صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔ خدا کے لیے ایک بار سامنے آ کر میری بات سن لو۔''

میں نے خط ٹکڑے ٹکڑے کر کے رابعہ کو دیا۔ ''اسے کہہ دو تم ایک کمزور مرد ہو۔ دوسروں کے اشاروں پر چلنے والا مرد نہیں ہوتا ہے۔ میں ساری زندگی تمہاری شکل نہ دیکھنے کی دعا کرتی ہوں۔''

اگلے ہی دن جمال، عابدہ کے ساتھ وہ مکان چھوڑ گیا۔

مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ جو رشتے میرے لیے آئے ہیں ان میں سے جو مناسب ہو منتخب کر لیں مگر شرط یہ ہے کہ میں اکیڈمی چلاتی رہوں گی۔ امی نے دور پرے کے ایک رشتے دار خاور سے رشتہ طے کر دیا۔

چھ ماہ بعد میری شادی ہو گئی۔ خاور میرے لیے بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ وہ پڑھے لکھے، باوقار شخص تھے۔ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ مجھے انہوں نے عزت محبت سب کچھ دیا مگر جب میرا بیٹا میری بانہوں میں آیا تو لگا کائنات میرے قدموں میں آ گئی ہے۔ میری بے چینی کو قرار آ گیا۔ ایک بار پھر سجدہ شکر ادا کیا کہ میں جمال کی شرط کا شکار نہیں ہوئی۔ آج میری شادی کو چوبیس سال ہو چکے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں دو بیٹے دو بیٹیاں۔ میری کل کائنات میری ہستی کا غرور ہیں۔ میں اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی۔

امی کی وفات ہو چکی ہے۔ رابعہ اپنے گھر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ پندرہ سال پہلے ندیم بھائی آئے تھے۔ ماں سے معافی مانگنے مگر معاف کرنے والی جا چکی تھی۔ بہت روئے، مجھ سے معافیاں مانگتے رہے۔ میں نے کہا ماں روتی چلی گئی۔ آپ کی اولاد جب آپ سے ایسا سلوک کرے گی تب پتا چلے گا۔ گویا میں نے انہیں دھتکار دیا تھا۔

خاور اور بچوں کے ساتھ میں ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہوں۔ اکیڈمی کے ساتھ ساتھ ہم نے اسکول بھی شروع کر دیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ جمال کا کبھی بھولے بھٹکے تصور آتا ہے تو بے اختیار شکر ادا کرتی ہوں۔ بعض اوقات محبت میں ہمیں لگتا ہے کہ ایک شخص ہی ساری زندگی ہے، اس کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت ہمیں بتاتا ہے کہ جس کے لیے ہم نے ساری دنیا سے ٹکر لی ہے اس کے علاوہ بھی ہمیں بہت کچھ چاہیے۔ کوئی بھی شخص ساری دنیا نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے لیکن اس دن سر راہ عابدہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بالکل شہری ماحول میں ڈھلی لگ رہی تھی۔ مجھے کھینچ کر ایک بڑے ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ وہیں اس نے بتایا کہ اپنے ٹوٹتے گھر کو بچانے کے لیے اس نے جھوٹ بولا تھا کہ جمال نے گاؤں میں کس شرط پر ہامی بھری ہے۔

محترم مدیر
السلام علیکم
میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق صحافت سے ہے۔ اس پیشے کی وجہ سے لاتعداد واقعات میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ رانو سے بھی میری ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ لوگ اسے خونی، سزا یافتہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں لیکن میں جب اس سے ملا اور اس پر گزرے واقعات سنے تو حیران رہ گیا۔ آپ خود بھی اس کی خود بیتی پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔

وسیم بن اشرف
(ملتان)

''اے کیا گُل کھلا کے آئی ہے۔'' ایک خرانٹ عورت رانو سے مخاطب تھی، رانو ہر ذی نفس سے بے خبر بیرک کی چھت کو گھور رہی تھی۔

''اے گلابو میں تیرے سے پوچھ رہی ہوں۔'' قریب آ کر اس نے رانو کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا، رانو اس اچانک پڑنے والی افتاد سے گھبرا گئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکالنے والی کے گال پر بائیں ہاتھ کا ایسا تھپڑ مارا کہ وہ دو قدم دور جا کر سنبھلی۔

"اری، تھپڑ وہ بھی بانو کو۔" وہ گرجی اس کا نام شاید بانو تھا جس نے رانو کا آتے ہی انٹرویو شروع کر دیا تھا۔ "اے تو جانتی نہیں مجھے۔" یہ کہتے ہی بانو نے لات گھمائی جو رانو کے پیٹ میں لگی۔ وہ تکلیف سے دوہری ہوگئی، سیدھی ہونے سے پہلے ہی بانو نے اس کی چوٹی پکڑ کر جو زور کا جھٹکا دیا تو رانو کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ بری طرح بوکھلا گئی، یہ کیا آفت اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ رانو بھی دیہات کی پلی بڑھی تھی، موقع ملتے ہی بانو کو ایک اور تھپڑ جو رسید کیا تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا، اب بیرک میں باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو چکی تھی، کبھی رانو نیچے اور بانو اوپر، کبھی رانو کا پلڑہ بھاری اور بانو زمین بوس، دوسری قیدی عورتیں بیرک کی دیوار سے جا لگی تھیں اور تماشا دیکھ رہی تھیں۔ پھر رانو کا جو داؤ چلا تو اس نے بانو کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ بیرک کے جنگلے سے بری طرح ٹکرائی اور اس کی پیشانی سے خون لکیر کی صورت میں بہتا اس کے رخسار تر کرتا گردن گیلی کر گیا۔

"تیرا خون نہ پی جاؤں تو بانو نام نہیں۔" وہ دھاڑی اور رانو کی طرف لپکی، رانو نے جھکائی دی تو اپنے ہی زور میں وہ دیوار سے جا ٹکرائی، چوٹ پر چوٹ کھانے سے وہ نیم پاگل ہو گئی اور ڈکراتی ہوئی بدمست گائے کی طرح پھر رانو کی طرف بڑھی۔ شور شرابہ سن کر جیل کا عملہ بید کی چھڑیاں لہراتا آیا، دروازہ کھولا اور بنا قصور پوچھے بانو کو کم مارا، رانو کو دھنک کر رکھ دیا۔ بید کی چھڑیاں پے در پے پڑنے سے رانو کے منہ سے سسکاریاں نکلنے لگیں، دو چار بانو کو بھی پڑیں، تھوڑی دیر کی پٹائی نے سب شانت کر دیا، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی بید لہراتی پہنچ گئی۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔" اس کا رعب اور دبدبہ دیدنی تھا، چھوٹا عملہ الرٹ کھڑا تھا۔ "میں پوچھتی ہوں یہ کیا اودھم مچا رکھا تھا؟" اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چلائی پھر وارڈرز کو گھورا تو ایک لیڈی وارڈر نے کہا میڈم ہم بھی شور سن کر یہاں پہنچے تھے، دیکھا تو آج آنے والی نئی قیدی رانو اور بانو گتھم گتھا تھیں، بانو کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔"

"دونوں کو لاؤ نا ذرا میرے کمرے میں، وہاں ان کی خدمت کرتی ہوں۔" وارڈرز نے سیلوٹ کیا، دونوں کو اپنے حصار میں لے کر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کی طرف چل پڑیں، 2 لیڈی وارڈرز آگے، پیچھے رانو، پھر دو وارڈرز اور پیچھے بانو، آخر میں بھی دو لیڈی وارڈرز، چھ اہلکاروں کی نگرانی میں انہیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لایا گیا، رات کے 9 بجنے والے تھے، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے معاملے کی چھان بین کی ضرورت بھی محسوس نہ کی اور رانو پر پل پڑی، بدمعاش، قاتلہ، آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں نے تو بڑی بڑی خرانٹ قیدیوں کو سیدھا کر دیا۔ تیری اوقات ہی کیا ہے؟"

رانو کے اوسان خطا ہو گئے، وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ یہ آتے ہی اس پر کیا عذاب نازل ہو گیا، پانچ چھ بید، دو چار تھپڑ کھانے کے بعد رانو کی آنکھیں چھلک پڑیں، بمشکل اس کے لب ہلے "بی بی صاحبہ یہاں بھی ناانصافی۔"

"ناانصافی، تو نے بانو کا سر پھاڑ دیا، تھپڑے مارے اس کے گال لال کر دیئے اور بات انصاف کی کرتی ہے۔" آفیسر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے کیا کیا۔ میں تو خاموش بیٹھی تھی، اسی نے بدتمیزی کی، جس سے بات بڑھ گئی، کیا میں اس کے ہاتھوں ذلیل ہوتی، مار کھاتی اس سے، اس کے تلوے چاٹنے لگ جاتی۔" رانو بولی۔

"بھاشن نہ بگھار، جو ہوا وہ بتا۔" آفیسر نے اسے ڈانٹا۔

"بی بی وہی بتا رہی ہوں۔ آپ افسر ہیں انصاف آپ خود کرنا، پہلے اس نے مجھے چکنی کہہ کر پکارا، میں نے جواب نہ دیا تو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا، غصے میں میرا بھی ہاتھ چل گیا، اس نے بھی مارا اور میں نے بھی۔"

"ہوں!" اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ہنکارا بھرا اور حکم دیا رانو کو فی الحال دوسری بیرک میں بند کر دو، وارڈرز اسے لے گئیں۔ بانو کمرے میں ہی رہ گئی، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تجھ سے دو روز بھی صبر نہ ہوا، آج ہی وہ جیل آئی اور تو اس سے بھڑ گئی، بانو اس طرح نہیں چلے گا، کسی نے اوپر شکایت کر دی تو میں انکوائریاں بھگتتی پھروں گی، تیرا کیا ہے تو دوسروں پر دھونس جما کر اپنا اُلو سیدھا کیے رکھے گی، یہ رانو ایک بدمعاش کا قتل کر کے آئی ہے اور تو نے پہلے ہی روز اس سے پنگا لے لیا، ہوش کے ناخن لے، یہ نہ ہو جو چھوٹ میں نے تجھے دے رکھی ہے وہ واپس لے لوں، اور باقی کی قید تو مشقت کر کے گزارے۔ جا چلی جا موقع محل، اونچ نیچ دیکھ کر قدم اٹھایا کر، سیر کو سوا سیر سے کبھی بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔"

بانو جیل کی غنڈی تھی، خواتین قیدی اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں، افسروں کی آشیرباد سے اس نے وہاں اپنی دھاک بٹھائی ہوئی تھی، جیل کے باہر کئی بڑی شخصیات سے اس کے مراسم تھے۔ قیدی عورتوں سے پیسے بٹورنا، زور زبردستی،

سہولیات کے عوض رشوت لے کر جیل حکام تک پہنچانا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا، بدلے میں اسے جیل میں ہر سہولت میسر تھی۔

رانو کو دوسری بیرک میں پہنچا دیا گیا، یہ جیل میں اس کا پہلا دن تھا، پہلے ہی روز اس کے ساتھ جو بیتی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی ظلم و جبر سہتے، زمانے کی ٹھوکریں اور اپنوں کے لگے گھاؤ کھا کر یہاں پہنچی تھی۔ جیل میں پہلے ہی دن جو کھیل کھیلا گیا وہ سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ زندان میں تھی، پابہ زنجیر تھی، زمانے کی زنجیر توڑ کر زندگی کے زندان میں ایک جنگ لڑ کر بھی وہ بظاہر ہار گئی تھی لیکن اپنے جیسی کئی لڑکیوں کو یہ خاموش پیغام دے آئی تھی کہ سسک سسک کر مرنے سے، جبر کے سامنے سرنگوں ہونے سے بہتر ہے ظلم کے سامنے سر اٹھا کر چلا جائے، موت تو آنی ہے پھر روز روز مر کے کیوں جیا جائے، اس نے بھی اپنے زور بازو سے ان بدمعاشوں کو وہ سبق سکھا دیا تھا کہ آئندہ کوئی اس جیسی لاچار رانو پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہزار بار سوچے گا۔"

یہ سوچتے سوچتے اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ٹانگیں پساریں، جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا، جلد ہی اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، سچ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

دوسرے روز منہ اندھیرے سب کو اٹھانے کا عمل شروع ہوا، یہ سب اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ زندان کی زندگی کا ہر دن اس کو نیا سبق پڑھا رہا تھا، گن گن کر قیدی عورتوں کو نکالا گیا، سارا دن ان سے مختلف کام کرائے جاتے رہے، شام کو بھیڑ بکریوں کی طرح گنتی کر کے پھر بھانے میں بند کر دیا گیا، اسے یہ جیل بھی بھانہ ہی لگی تھی۔ روزانہ مشقت، بیماروں جیسا کھانا اور مچھروں سے بھری بیرک، خواتین، بچے، شور شرابہ، رونا دھونا، مصائب و آلام، دکھڑے، ماتم، یہ سب دیکھتے تین دن گزرے تو ایک رات ایک قیدی عورت اس کے پاس چلی آئی، دیکھنے میں ادھیڑ عمر لگتی تھی، لب کھولے تو لگا گویا پھول جھڑنے لگے ہوں، اتنا میٹھا لہجہ تھا۔ وہ قریب آئی اور بولی۔ "بیٹی نہ جانے کون سی خطا تجھے اس جہنم زار میں لے آئی ہے۔ نصف شب کو تو میرے بستر کے پاس آنا۔" چند جملے کہہ کر وہ دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی، بیرک کے باہر وارڈرز الرٹ تھیں، چکر پہ چکر لگا کر سب پر ایسے نظر رکھی ہوئی تھیں جیسے ان میں سے کوئی نظر بچا کر بھاگ کھڑی نہ ہو، حالانکہ اس زندان سے نکلنا مشکل تو کیا ناممکن تھا۔ رات آدھی بیت گئی، کسی شرمیلی دلہن کی طرح

چاند نے بدلیوں کی چادر اوڑھ لی۔ بیرک کے سامنے درختوں کے سائے معدوم ہو گئے، بیرک کے اندر اور باہر ہلکی روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے۔ نگران عملے کی ڈیوٹی تبدیل ہو چکی تھی، چاق و چوبند نئی وارڈرز نے راؤنڈز شروع کر دیے تھے، رانو کو اس خاتون میں کچھ خاص نظر آیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے لب و لہجے میں اسے اپنائیت محسوس ہوئی تھی، نصف شب کو اسی خاتون نے رانو کو دیکھا، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس خاتون نے رانو کو خفیف سا اشارہ کیا، رانو غیر محسوس انداز میں کھسکتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کسی اور کے لیٹنے کی گنجائش تو نہ تھی لیکن کچھ حرکت برکت سے انہوں نے جگہ بنا ہی لی، وارڈرز کی نظر ان پر نہ پڑی تھی، خاتون نے آہستہ سے پوچھا۔ "بیٹی کون سی افتاد آن پڑی جو تو اس بھری جوانی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے زنگ لگانے چلی آئی ہے۔"

"میں آپ کو کیا کہوں؟ کس نام سے پکاروں؟"

"آپا کہہ لو۔"

"آپا! پہلے آپ بتاؤ آپ یہاں کیسے؟"

"بتاؤں گی اپنوں کے زخم بھی دکھاؤں گی، کچھ نہیں چھپاؤں گی؟ لیکن تم اتنی خوبصورت ہو، کس کے ستم کا نشانہ بنی ہو، یہ جیل نہیں عقوبت خانہ ہے، دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔"

"میں اپنے باپ کے پاپ کے نتیجے میں یہاں ہوں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں، مجھے اپنا سمجھو تو تفصیل سے سب بتاؤ، شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"آپ تو خود یہاں بے بس ہیں، میری کیا مدد کریں گی۔"

"اس کی فکر نہ کرو، اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

"تو ٹھیک ہے آپا، نہ جانے کیوں مجھے آپ میں اپنی ماں کا عکس دکھتا ہے، کل رات کو میری زندگی کے اوراق پڑھ لینا جن پر جبر اور ظلم، کڑوے کسیلے، حالات، دکھ بھرے واقعات کی تازہ داستان رقم ہے۔ زمانے کے فرعونوں سے لڑتی لڑتی اس چار دیواری میں آئی ہوں جسے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا، جیل کے بارے میں کسی سے سنا تھا نہ کبھی سوچا تھا، نام پوچھ سکتی ہوں آپ کا؟"

"ثمر نام ہے میرا، لیکن ہمیشہ بے ثمر ہی رہی، خیر تم مجھے آپا ہی کہنا، مجھے اس بے ثمر نام سے نفرت ہو گئی ہے، کوئی مجھے ثمر کہے تو میرے اندر آگ کا الاؤ روشن ہو جاتا ہے، میں اندر ہی

اندر بھسم ہونے لگتی ہوں۔"

"آپا زندگی تو میری بھی دہکتے کوئلوں جیسی ہے، محبت نفرت میں بدلی، نفرت نے انتقام کو جنم دیا، انتقام پیار کو نگلنے لگا تو ہوس کے آسیب نے ایسا سحر پڑھ کر پھونکا کہ زندگی تتر بتر کر کے رکھ دی، میں نے اس آسیب کا قصہ تمام کر دیا۔ لالچ نے خون کے رشتوں کو اندھا گونگا بہرہ کر دیا تو مجھ سے قتل ہو گیا۔"

"قتل......" آپا بھونچکی رہ گئی۔

"ہاں آپا قتل۔"

"کسے قتل کیا؟"

"اسے جسے ظالم رسم ورواج اور مکروہ روایات کے علمبر دار میرا سرتاج بنانا چاہتے تھے، ساٹھ سال کا بوڑھا سرتاج، ہونہہ۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"اس داستان الم کا نقطۂ نظر مجھے سناؤ۔" آپا اس کی باتیں سن کر بے تاب ہو گئی تھی۔

"کل سناؤں گی اپنی زندگی کا نوحہ۔ اب سوتے ہیں۔" رانو یہ کہہ کر آپا کا جواب سنے بغیر کھسکتی ہوئی اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

اگلا روز بھی معمول کے مطابق تھا۔ اس نے جیل میں قیدی اور حوالاتی عورتوں کی بے عزتی کرنے کے لیے انتہائی شرمناک ہتھکنڈوں کا استعمال دیکھا، اسے لگا جیسا زنانہ اسٹاف احترام خواتین، عزت نفس، اخلاق اور شرافت کے اصولوں سے بے بہرہ ہے۔ اس نے خواتین کو کرسیاں، بیڈ شیٹ، کڑھائی والی شالیں، ڈوپٹے، کشن، ٹی کوزی کور، ٹی ٹرالی سیٹ، سینریوں والے فریم بھی بناتے دیکھا۔ کھلے ہاتھوں پیروں اور بھرپور جسم والی رانو کو بھی جیل کا مخصوص لباس پہنا دیا گیا تھا، اس لباس میں وہ یوں پھنس کر رہ گئی تھی کہ جسم کے بعض اعضاء برانگیختہ کرنے کی حد تک نمایاں ہو گئے تھے، شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی، بازو بھی چھوٹے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی لباس پہنایا گیا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی، اسے یہ لباس زبردستی ہی پہنایا گیا تھا، لگ رہا تھا جیل میں تمام خواتین کے لیے ایک ہی سائز کا لباس ہوتا ہے۔

موقع پاتے ہی آپا اس کے قریب چلی آئی اور اسے دوسری عورتوں سے تھوڑا دور لے گئی۔

"رانو یہ قتل تو نے اپنی آبرو اور جان بچانے کے لیے کیا ہے ناں۔" آپا نے تصدیق چاہی۔

"ہاں آپا۔"

"تو پھر تو زیادہ دیر جیل میں نہیں رہے گی۔"

"وہ کیسے، رانو دیدے پھاڑے آپا کو تکنے لگی۔"

"تو قاعدہ قانون نہیں جانتی، اگر مناسب وکیل تیرا کیس لڑے تو اگلی پیشی پر تیری ضمانت اور چند مزید پیشیوں کے بعد تو باعزت بری ہو جائے گی۔"

"آپا گھر میں چولہے آگ نہ گڑھے پانی، وکیل کون کرے گا؟" وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

"اچھا میں کچھ کرتی ہوں، تو فکر نہ کر، میں تیری جوانی کو یہاں کی دیمک نہیں لگنے دوں گی، خیر سے چار دن یہاں کاٹ لے، جب بھی تجھ سے ملاقات کے لیے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔" آپا نے اسے تسلی دی۔

"مجھ سے کون ملاقات کے لیے آئے گا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"کیوں، کیا اس جہان میں تیرا کوئی نہیں؟" آپا کو حیرانی ہوئی۔

"ہے آپا لیکن صرف سرور۔"

"سرور کون؟"

"وہی جو مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔"

"اوہ میں سمجھی!" آپا کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"چلو! جو بھی آئے اسے ایک خط دینا، جو میں کسی کے نام لکھوں گی، بس تیرا کام ہو جائے گا اور تو ان سلاخوں سے باہر ہو گی۔" آپا نے اسے تسلی دی۔

"لیکن آپ سب یہ......"

آپا نے اسے ٹوکا اور بات جاری رکھی "تجھے پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ حیران ہونے کی، کبھی این جی اوز کا نام سنا ہے؟"

"نہیں آپا یہ کیا چیز ہے؟"

"چیز نہیں پگلی!" آپا نے اسے ہلکی سی چپت لگائی۔ "یہ ایسی تنظیمیں ہوتی ہیں جو سماج میں بھلائی کے کام کرتی ہیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیتیں، ایسی ہی ایک تنظیم میں میرے جاننے والے اہم عہدیدار ہیں، تیرا ملاقاتی جب میرا خط ان تک پہنچائے گا تو وہ تھانے سے ایف آئی آر کی نقل لے کر وکیل کا بندوبست بھی کریں گے، تیرا کیس بھی مفت لڑیں گے اور تو ایک دو ماہ میں ہی بری ہو جائے گی۔"

"آپا یہ آپ کیسے سہانے سپنے دکھا رہی ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ اب تک اس جہنم میں کیوں جل رہی ہیں۔" وہ مخمصے کا شکار تھی۔

''سن میری بچی! سانپ کا ڈسا تو شاید بچ جائے، لیکن انسان اتنا زہریلا ہے کہ اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں۔''

''کیا اپنی مرضی سے؟'' آپا کی بات سن کر اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''ہاں! کبھی آزاد فضاؤں میں ملاقات ہوئی تو تفصیل بتاؤں گی۔'' آپا نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''رانو بھی ششدر تھی کہ قیدی عورتوں پر بے پناہ سختی کے باوجود اس نے کسی کو بھی آپا سے بدتمیزی کرتے یا سخت رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا تھا، وہ سوچنے لگی آپا کی حقیقت کیا ہے؟ شاید آپا کے نہ بتانے میں کوئی مصلحت تھی۔''

''اچھا سنو۔'' آپا نے اسے سوچوں کے سمندر سے نکالا، یہ سب تبھی ممکن ہوگا جب تو مجھے اپنی ساری داستان سنائے گی، اور آج کی رات کا تو نے وعدہ بھی کر رکھا ہے۔

''ہاں آپا آج کی رات میں تجھے وہ سب بتاؤں گی جو مجھ پر بیتی۔ دل میں پیوست ظلم کا ایک ایک تیر نکال کر سارے گھاؤ تمہیں دکھاؤں گی۔ تو سچ کہتی ہے انسان بہت زہریلا ہے۔''

دن ڈھلنے لگا تو آواز پڑ گئی خواتین کو قطاروں میں بیرکوں میں جانے کا حکم ملا، ایک ایک کو گنتی کے بعد بیرکوں میں ٹھونس دیا گیا۔

☆......☆

سردیوں کے دن تھے سورج ڈوبتے ہی رات کا راج ہوگیا، قیدی عورتیں، غلیظ بستروں پر میل سے اٹے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی تھیں، جاگ رہی تھیں تو صرف رانو اور آپا، تھوڑی سردی بڑھی اور کچھ اندھیرا مزید گہرا ہوا تو رانو آپا کے کمبل میں تھی، رانو اپنی زندگی کے اوراق پلٹنے لگی۔

''احمد پور شرقیہ سے کوئی 20 میل کی دوری پر چولستان سے کچھ پہلے بمشکل 20 سے 22 گھروں پر مشتمل بستی آباد تھی۔ دس بارہ جھونپڑے، سارے گھر کچے تھے، چھوٹی چھوٹی دیواریں مکینوں کی غربت کو بے پردہ کیے ہوئے تھیں، کوئی مکان ایک کمرے کا، کسی کے دو تو شاید ہی کسی کے تین ہوں گے، البتہ ہر گھر کا چھوٹا یا بڑا صحن ضرور تھا، کئی گھروں میں درختوں کی اٹھان اس قدر تھی کہ گویا دوسرے گھروں میں جھانک کر وہاں کی خیر خبر لے رہے ہوں۔ اسی بستی میں دو گھر پختہ تھے، ایک وہاں کے چودھری فواد کا اور دوسرا بدقماش، منشیات فروش، عورتوں کے شکاری اور بیوپاری نذیرے کا، کئی مربع اراضی کا مالک چودھری فواد وہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ پنچایت کا سرپنچ وہ ہوتا، ہر کس و ناکس کی زندگی اس کی مرضی کے مطابق بسر ہوتی تھی، بستی کے بیشتر افراد تو اس کے کھیتوں میں ہی اپنا خون پسینا ایک کر کے پیٹ کا جہنم سرد کرتے تھے، کچھ بستی کے باہر محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کا بندوبست کر لیا کرتے۔ اس بستی سے ایک کلومیٹر دور بھی چند گھروں پر مشتمل ایک بستی اور تھی، کچے مکانوں کے مکینوں کا جو بھٹہ خشت پر مزدوری کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ کچھ میلوں ٹھیلوں پر کھیل تماشے دکھا کر جسم اور روح کا ناطہ برقرار رکھے ہوئے تھے، چند ایک ایسے بھی تھے جو چودھری کے ظالمانہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھنے کے بعد بستی سے نکال دیے گئے اور یہاں آ بسے تھے۔ یوں یہاں دس پندرہ گھروں کی ایک بستی آباد ہوگئی تھی۔ یہاں بمشکل ہی کوئی مکان دو کمروں کا تھا ورنہ ایک کچا کمرا صحن اور صحن میں جانور باندھنے کے لیے لکڑی اور گھاس پھونس سے چھپر ڈال رکھے تھے۔ جس گھر میں بھی نظر ڈالیں اس کی کل متاع دو تین چارپائیاں، ایک آدھ جستی ٹرنک یا پیٹی تھی، دونوں بستیوں میں کوئی اسکول تھا نہ ہی اسپتال، چودھری نے تو اپنی بستی تک سولنگ لگوا رکھی تھی تاکہ اس کی شاہی سواری آرام سے آجا سکے۔ دوسری بستی کی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ سڑک تو دور کی بات انہیں پینے کا پانی بھی قریباً دو کوس دور سے گھڑوں میں بھر کر لانا پڑتا تھا۔ زیر زمین پانی زہریلا تھا، ان کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ وہاں سے گزرنے والی نہر تھی۔ اکثر اوقات یہ نہر خشک رہتی، تب مکین چودھری کے پاؤں پڑتے۔ اس کی اجازت سے اس کی زمینوں پر نصب ٹیوب ویل سے کڑوا پانی بھر لاتے اور پیاس بجھاتے۔ یہ اس زہریلے پانی کا شاخسانہ تھا کہ وہاں کے متعدد مکین یرقان کے موذی مرض کا شکار تھے۔ چودھری اور نذیرے منشیات فروش کے گھروں میں بجلی تھی۔ باقی غربت کے مارے اس قابل ہی نہ تھے کہ بجلی کا کنکشن لیتے اور بل بھرتے۔ ان کے گھروں میں دو وقت کی روٹی پک جائے یہی بہت تھا۔ چند ایک کے پاس بکری، بھینس اور گائے یا بار برداری کے لیے گدھے تھے۔

بستی کے آدھے سے زیادہ مکین چودھری فواد کے مقروض اور باقی کے سود خور نذیرے کے ڈسے ہوئے تھے، وہی صبح، وہی شام، وہی کام۔ بس لوگ جی رہے تھے، اس بستی میں شروع کا تیسرا گھر رانو کا تھا۔ دو کمرے، صحن، گھر میں نیم کا درخت، کمرے کچے، سامان اتنا کہ گزر بسر ہو سکے، بوڑھا فیقی باپ، ماں، ایک بھائی جو شہر میں کسی موٹر مکینک کے پاس مزدوری کرتا اور رات گئے لوٹتا تھا، رانو اور اس کی ماں چودھری

کے کھیتوں میں کام کرتیں، بوڑھا گھر پڑا چارپائی توڑتا رہتا، یوں اس گھرانے کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ چودھری کے ظلم اور نذیرے کی چیرہ دستیوں کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی، دونوں اس قدر بااثر تھے کہ علاقے کی پولیس بھی ان کے ٹکڑوں پر پل رہی تھی، گاڑی خراب ہو گئی تو پیسے چودھری نے دے دیے، کسی کے بچے کی شادی ہوتی تو وہ چودھری کے در پر آ جاتا، قریبی پولیس چوکی میں کسی میز، کرسی یا پنکھے کی ضرورت پڑتی تو چودھری کام آتا، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ چودھری کی مرضی ومنشاء کے بغیر علاقے میں پرندہ بھی پر مار سکے۔

بستی چونکہ صحرا کے قریب تھی اس لیے رات کا منظر بہت مسحور کن ہوتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے پرندے جو سارا دن جھاڑیوں میں چھپے رہتے تھے باہر نکل آتے اور ان کے چہچہوں سے بستی کی فضاء میں ایک رومانوی گونج پیدا ہو جاتی، افق کی سرخی خاکستری رنگ میں بدل جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا اور دن کے پرندے اور انسان شب باشی کے لیے گھونسلوں اور گھروں میں چلے جاتے اور ان کی جگہ رات کے پرندے اپنا راگ الاپنے لگتے یا پھر نذیرے کے کارندے مکروہ دھندے کا آغاز کرتے، چاند نکل کر درختوں کی چوٹیوں سے سرکتا ہوا کھلے آسمان پر آ جاتا اور جب اس کی روشنی چھن چھن کر نیچے آتی تو زمین پر روشنی اور سائے مل کر عجیب نقش و نگار بناتے تھے پھر طلوع سحر کی گھڑیوں میں چڑیاں چہچہاتیں، فاختائیں امن کے سریلے گیت چھیڑتیں، کبھی کبھار کوئل کی کوک نغمہ سرا ہوتی، لہلہاتے کھیتوں کے آخر میں آسمان جھک کر زمین سے گلے ملتا تھا، یہاں باہمی محبتیں کچے گھروں کا خاصہ تھیں، گھنے درختوں کی مہربان چھاؤں سخت تپتی دوپہر کو یہاں کے مکینوں کے لیے نعمت سے کم نہ تھی، اس بستی کی بدقسمتی تھی کہ چودھری فواد اور نذیرے جیسی چمگادڑیں آزادانہ ہر طرف گھومتی پھرتی تھیں۔

☆......☆

سردیوں کے دن تھے، ایک دوپہر کو مچنے والے شور نے وہاں کے مکینوں کو حیران و پریشان کر دیا کہ نذیرے کے ڈیرے پر چوری کی واردات ہو گئی، بستی کے کسی مکین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ چوروں کو مور پڑ گئے ہیں، لیکن نذیرے اور اس کے کارندوں نے یہ باور کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ ڈیرے سے چور ایک ٹیپ ریکارڈر، ایک استری اور چند دوسری اشیاء چرا کر لے گیا ہے، کھوجی کو بلایا گیا، کھرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سرور ساربان کے دروازے پر رک گئے، بجائے پولیس کارروائی کے نذیرے نے سرور ساربان کو اپنا ملزم قرار دے دیا، سرور اپنی غربت کی دہائیاں دیتا رہا، چور نہ ہونے کی یقین دہانیاں کراتے کراتے رو پڑا، غریب کے پاس ایک ہی سوفٹی تھی، اس جوتے کو کھوجی نے اتروا کر دیکھا، سرور کو چلنے کو کہا گیا، اس نے دو چار چکر لگائے، کئی لوگوں نے دیکھا کہ جوتے کے تلوے کے نشان ہو بہو ویسے ہی تھے جیسے نذیرے کے ڈیرے سے سرور کے چھپر نما مکان تک آئے تھے، نذیرے کے کارندوں نے دھونس اور دھاندلی سے سرور سے سامان کی برآمدگی کا مطالبہ کیا، ”میرے خلاف الزام ہے، میں نے چوری نہیں کی، میرے گھر کی تلاشی لے لو۔“ سرور نے بے بسی سے کہا۔

”چور تو تو ہی ہے، مان یا نہ مان، کھرا تیرے دروازے تک آیا، نشان بھی تیرے جوتوں کے ہیں، ہماری مان، سامان دے دے ورنہ پھر پولیس کا مہمان بننے کے لیے تیار ہو جا۔“ نذیرا دھمکیوں پر اتر آیا۔

بات چودھری فواد تک پہنچ گئی، پنچایت بلا لی گئی، دو چارپائیاں، دو کرسیاں چودھری کے گھر کے وسیع وعریض لان میں موجود تھیں، کرسیوں پر چودھری فواد اور نذیرا فرعون بنے بیٹھے تھے، چارپائیوں پر ان کے کارندوں کا قبضہ تھا، بستی کے چند بوڑھے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور بائیں جانب مبینہ چور سرور ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”حالات و واقعات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوری تم نے کی ہے۔“ چودھری سرور سے مخاطب ہوا۔

”مائی باپ! اگر میں چور ثابت ہو جاؤں تو میرا سر آپ کے جوتے، یہ مجھ پر الزام ہے۔“ سرور نے صفائی پیش کی۔ غریب شاید جانتا نہیں تھا کہ اندھوں کی بستی میں آئینہ کون خریدتا ہے۔

”کھرا تمہارے گھر تک گیا، واردات میں جو جوتا چور نے پہنا وہ تم نے پہن رکھا ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ چور نہیں ہو۔“ چودھری بولا۔

”سرکار! یہ میرے خلاف کوئی سازش ہے، میں تو صبح اپنا اونٹ لے کر نکلتا ہوں، دن بھر کبھی باربرداری، کبھی سواری، اور کبھی کھیل تماشا دکھا کر چند روپے کما کر رات گئے گھر آ کر سو جاتا ہوں، مجھے کسی نے پھنسایا ہے۔“ سرور نے بھینس کے آگے بین بجائی۔

”سنو بستی والو!“ سرپنچ چودھری فواد بولا ”میں نہیں چاہتا بات پولیس تک جائے وہ اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں

گے، یہ وہ چوریاں بھی تسلیم کرلے گا جو اس نے کی بھی نہیں ہوں گی، نذیرا اس کو اپنا چور قرار دے رہا ہے اور یہ بضد ہے کہ اس نے چوری نہیں کی، رسم و رواج کے مطابق کھرا اس کے گھر تک نکلا ہے، لہٰذا چور سرور ہی ہے، سامان برآمد کرادے تو سزا میں کمی کردیں گے ورنہ اسے بستی سے نکال دیا جائے گا اور بطور جرمانہ اس کا گھر نذیرے کے حوالے کردیا جائے گا۔''

بستی کے کسی شخص کی مجال تھی جو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا، سرور نے پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تو چودھری نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور حکم دیا کہ کل وہ اپنا اونٹ لے کر بستی سے چلا جائے۔

سرور دوسرے روز پنچایتی فیصلے کا پھندا گلے میں ڈالے بستی چھوڑ گیا اور ایک میل کے فاصلے پر دوسری بستی میں چلا گیا۔ رانو کو سارے واقعہ کا پتا چلا تو چلّا اٹھی، سرور چور نہیں ہے، اسے پھنسایا گیا ہے۔

''تو بڑی اس کی طرفداری کررہی ہے۔'' اس کا باپ بولا۔

''باپو، بات طرفداری کی نہیں، وہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے اونٹ کا پیٹ پالتا تھا، اس بستی میں پلا بڑھا، والدین کے مرنے کے بعد ورثے میں ملے اونٹ کو اس نے روزی روٹی کا ذریعہ بنایا، آج تک اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے بستی والوں کو کوئی شکایت ہوئی ہو، ایک دم سے وہ چور کیسے بن گیا؟'' رانو نے اس کی صفائی دی۔

''چپ بیٹھی رہ۔'' باپ نے ڈانٹا۔ ''چودھری کے کانوں میں بھنک بھی پڑگئی تو ہمارا جینا حرام کردیں گے۔''

''باپو! بات کچھ کچھ میری سمجھ آرہی ہے، تیرے کان اور آنکھیں بند ہیں میرے نہیں۔'' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''رانو کی ماں اسے چپ کرائے گی یا میں پھر......'' باپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''رانو چل میری بیٹی کمرے میں جا، کیا ہوا، کس کے ساتھ ہوا، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔'' ماں کے سمجھانے پر وہ خاموش ہوگئی۔

ساتھ والے گھر میں اس کی بچپن کی سہیلی اور ہم راز خالدہ رہتی تھی، وہ ماں کو بتا کر خالدہ سے ملنے چلی گئی۔

☆......☆

رات کسی گناہگار کے دل کی طرح انتہائی تاریک تھی، آسمان گھرے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، طوفانی بارش نے ہر طرف جل تھل کردیا تھا، دونوں بستیوں میں کئی مکان پانی سے بھر گئے، چھتیں ٹپک پڑیں، غریبوں کے لیے رحمت بھی زحمت ثابت ہورہی تھی، ایک طرف سردی دوسری طرف بارش، ہر طرف گھٹاٹوپ تاریکی کا راج تھا۔ بارش تھم گئی لیکن کچے راستوں پر آمدورفت انتہائی دشوار ہوکر رہ گئی تھی۔ سرور کے راستے میں تاریکیاں حائل تھیں نہ کسی سانپ بچھو کے خوف نے اس کا راستہ کھوٹا کیا، سرشام ہی خالدہ کے ذریعے رانو کا پیغام ملتے ہی وہ بے چینی سے رات کا انتظار کررہا تھا، بارش بھی دونوں کے ارادوں میں رکاوٹ نہ بن سکی تھی، محبت کا جوش اور پیار کی لگن ہر خطرے کو دل و دماغ سے محو کردیتی ہے، رانو نے اسے دونوں بستیوں کے درمیان ٹیلے کے پیچھے ملنے کا پیغام بھجوایا تھا، اندھیری رات میں وہ تیز تیز قدموں سے ٹیلے کی جانب جارہا تھا۔ کئی بار اس کا پاؤں چھوٹے موٹے گڑھوں میں بھی پڑا، لیکن وہ سب سے بے پروا اپنی لگن میں چلا جارہا تھا، اس سردی میں اس نے لنڈے کا ایک پھٹا پرانا سویٹر پہن رکھا تھا، دل میں جب محبت کا الاؤ روشن ہو تو باہر کی سردی وجود پر اثر نہیں کرتی، وہ دیوانہ وار ٹیلے کی جانب بھاگنے لگا، کسی پتھر کی ٹھوکر لگی تو شڑاپ سے پانی میں گرا، کپڑے کیچڑ میں لت پت ہوگئے، اس نے وہیں پر جمع پانی سے کچھ کیچڑ صاف کیا اور پھر چل پڑا کہ کہیں رانو مایوس ہوکر واپس نہ چلی جائے، ٹیلے کے قریب پہنچ کر اس نے دو تین بار آہستہ سے رانو، رانو پکارا۔ رانو ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگئی، سرور کو دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''میں تو سرور سے ملنے آئی تھی کسی بھوت سے نہیں۔''

اس کی بات سن کر سرور نے رخ پھیر لیا۔ ''تو ٹھیک ہے بھوت واپس چلا جاتا ہے۔'' اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ رانو نے پیار سے پکارا۔

''اے سرور، تو بھوت بھی دکھتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔''

دونوں یونہی چھیڑ چھاڑ کرتے گیلی ریت ہٹا کر خشک ریت پر بیٹھ گئے۔ رانو نے سرور کا ہاتھ پکڑا اپنے سر پر رکھ لیا ''کھا قسم میری اور بتا تو نے چوری کی یا نہیں۔''

''تیری قسم رانو! یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے، مجھے بستی سے نکالنے کے لیے سازش کی گئی ہے۔''

''مجھے پتا ہے لیکن میں ایک بار تجھ سے یقین دہانی چاہتی تھی۔''

''کس نے کیا یہ سب؟''

''میں جانتی ہوں، تو بھی غور کرے تو سب سمجھ جائے گا۔''

"تمہارا مطلب نذیرا؟"

"صرف نذیرا نہیں بلکہ چودھری کا بیٹا نواز بھی اس سازش میں ملوث ہوگا۔"

"مگر کیوں اور کس لیے؟" سرور کو حیرانی ہو رہی تھی۔

"بڑا بھولا ہے تو بھی، جب سیانوں نے کہہ دیا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، تو تیری اور میری محبت کی تھوڑی بہت خبر تو کسی کو ہوگی ناں۔"

"کھل کر بتا، بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔"

"مٹی کے مادھو سن، جب میں اماں کے ساتھ اور دوسری عورتوں کے ہمراہ چودھری کے کھیتوں میں کپاس کی چنائی کے لیے گئی تھی تو نواز بہانے سے میرے قریب آیا اور عشق جھاڑنے لگا، میں نے سخت لہجہ اپنایا تو پتا ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟"

"مجھے کیا پتا تو ہی بتا۔"

"اس نے کہا تھا ہم چودھریوں سے تو ساربان اچھے ہیں جو دودھ ملائی کھاتے ہیں۔" بات آئی تیرے کھوپڑے میں یا نہیں۔

"ہوں تو یہ بات ہے، اس کا مطلب ہے باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہم میں دوریاں پیدا کی گئیں۔" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"کیا ہم دور ہو گئے ہیں۔" رانو مصنوعی غصے سے بولی۔

"نہیں بلکہ چاہت میں اور شدت آ گئی ہے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے میرا جوتا چرا کر کسی کو پہنا کر نذیرے کے ڈیرے سے میرے گھر تک لایا اور لے جایا گیا، پھر جوتا صحن میں رکھ کر چوری کا ڈراما رچا کر مجھے بستی بدر کر دیا گیا، دیکھ لوں گا میں ان بدقماشوں کو۔" سرور کا چہرہ سردی میں بھی تپتپانے لگا تھا۔

"نہ، بے وقوفی نہیں کرنی، اب تک چند ایک کو پتا ہے پھر پورا جگ ہماری محبت کا بیری ہو جائے گا۔" رانو نے اسے سمجھایا۔ "اچھے وقت کا انتظار کر، رانو تیری ہے اور تیری ہی رہے گی چاہے جان نہ چلی جائے۔"

"جھلی نہیں کی، جان جانے کی بات پھر نہ کرنا، تو جانتی ہے میں تیرے بغیر نہیں جی سکتا، رانو! زندگی گزرے گی تو تیرے سنگ، نہیں تو محبت کے دشمنوں پر زندگی تنگ کر دوں گا، بغاوت پر اکسایا گیا تو پھر دشمنی کی آگ میں سب جھلسیں گے۔" سرور جذباتی ہو رہا تھا۔

رانو نے اسے پیار سے چپت لگائی۔ "تیرے مغز میں میری بات نہیں بیٹھی، میں کہہ بھی رہی ہوں کہ کچھ وقت کے لیے خاموشی سادھ لے، اپنے کام سے کام رکھ، مناسب موقع ملتے ہی میں خود ماں سے بات کروں گی۔"

"اور وہ تیرا بابو، وہ کسی جلاد سے کم تو نہیں۔"

"شرم کر میرے باپ کو جلاد کہہ رہا ہے، افیون کے نشے نے اسے ناکارہ کر دیا ہے، اس کی فکر نہ کر، ہاں بھائی رکاوٹ نہ ڈالے تو ہماری شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔"

"تو پھر ملا ہاتھ اور کر وعدہ کہ مریں گے تو ساتھ اور جئیں گے تو ساتھ۔" سرور نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"مریں ہمارے دشمن۔" رانو نے اس کا ہاتھ لیا، اور پھر جلدی سے چھڑا کر بولی "خود بھی مرے گا مجھے بھی مروائے گا، سویرا ہونے میں دیر کتنی ہے، چل اٹھ چلیں، اندھیرا ہمارا رازدار ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو مرمٹنے والی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔

شیراز نے نفرت اور غصہ سے رانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے لگتا ہے تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، تو اس چور ساربان سے اب بھی ملتی ہے۔"

سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رانو ایک دم سے بولی۔ "یہ تجھ سے کس نے کہا؟ کسی پیر فقیر نے تیرے کان میں کچھ پھونک دیا ہے۔"

"بکواس کرتی ہے میں تجھے ٹوٹے ٹوٹے کر کے پھینک دوں گا۔" وہ پھنکارتے ہوئے بولا، اسی اثناء میں ماں اور بابو آ گئے۔

"اماں اس کو سمجھا لو، یہ ہر وقت میرے پیچھے پڑا رہتا ہے، ایسا نہ ہو میں اپنی جان دے دوں۔" رانو منہ بسورنے لگی۔

"بات کیا ہے؟" بابو نے پوچھا۔

"یہ اب بھی اس ساربان سے ملتی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے بابو۔"

"بابو! یہ کوئی گل کھلائے گی، ہمیں سر اٹھانے کے قابل بھی نہ چھوڑے گی۔"

"اچھا تو جا کام پر دیر ہو جائے گی۔" بابو نے اسے ڈانٹا۔

"ٹھیک ہے بابو میں جاتا ہوں جس دن کوئی چاند چڑھا دیا ناں تو یاد کرے گا...." شیراز پاؤں پٹختا چلا گیا۔

''سر پر چڑھا رکھا ہے تو نے رانو کو۔'' ماں نے باپ بیٹی کو زہر آلود نظروں سے گھورا اور پھر، بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے روز ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ نذیرے کا کارندہ رانو کے گھر آیا، اللہ رکھا کو بلایا اور نذیرے کا پیغام دیا کہ آج دوپہر کو اس سے ملے۔

''پہنچ جاؤں گا۔'' اللہ رکھا نے جواب دیا، کارندہ چلا گیا۔ دوپہر کو رانو کا باپو اللہ رکھا نذیرے کے ڈیرے پر پہنچ گیا، نذیرا اسے علیحدگی میں لے گیا، ایک نوکر سے چائے لانے کو کہا اور اللہ رکھا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''اللہ رکھا تو جانتا ہے اب تک کتنے پیسے مجھ سے سود پر لے چکا ہے، اور کئی ماہ سے سود بھی نہیں دیا۔''

''نذیرے بھائی میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں، آپ ہی بتا دو۔'' اللہ رکھا نے پوچھا۔

''تھوڑے تھوڑے کر کے ایک لاکھ لے چکا ہے تو۔ اور سود ملا کر ڈیڑھ لاکھ سے اوپر بنتے ہیں۔'' نذیرے کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

اللہ رکھا کا رنگ پیلا پڑ گیا، اتنی رقم وہ لے چکا تھا، جوئے اور افیم نے سارا پیسا نگل لیا تھا۔

''نذیرے بھائی! میں تیرے آگے ہاتھ باندھتا ہوں، میرے گھر والوں کو پتا نہ چلے، میں تیری رقم لوٹا دوں گا۔'' وہ گڑگڑایا۔

''کیسے لوٹائے گا، تیرے گھر میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، ہاں اگر تو میری ایک بات مان لے تو سارے پیسے چھوڑ دوں گا۔'' نذیرا اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''کک، کون سی بات؟'' اللہ رکھا کو تعجب ہو رہا تھا کہ نذیرے جیسا کمینہ اتنی بڑی رقم معاف کرنے کے عوض کون سی بات منوانا چاہتا ہے۔

''رانو کی شادی مجھ سے کر دے۔'' نذیرے نے جیسے بم پھوڑ دیا ہو۔ اللہ رکھا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''یہ کیا کہہ دیا ہے تو نے نذیرے بھائی۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

''تو میری عمر کا ہے، رانو تو ابھی چوبیس کی بھی نہیں ہوئی۔''

''میں سودا نہیں کر رہا، شرعی بات کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں، نہیں، رانو، شیراز، اس کی ماں کوئی بھی میری نہیں مانے گا۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔''

''دیکھ لے! سوچ لے، ورنہ ڈیڑھ لاکھ، میرے پاس ایک ایک پیسے کا حساب اور تیرے انگوٹھے لگے کاغذ اور گواہ موجود ہیں۔'' سب کچھ بیچ کر بھی تو میرے پیسے ادا نہیں کر پائے گا۔

''میں کچھ سوچتا ہوں۔'' اللہ رکھا کے اوسان خطا ہو رہے تھے، پیسے لیتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ وقت بھی آئے گا! بیوقوف جانتا نہ تھا نذیرا جس کی گندی نظر ایک عرصہ سے رانو پر تھی وہ تو اسے پھانستا رہا تھا، پیسے بھی دیتا، وہی پیسے واپس لے کر اسے افیم بیچتا، اس کے اڈے پر جوا ہوتا، اور اس سے پیسے لے کر اس کے اڈے پر ہار جاتا۔ نذیرا اسے بدھو بناتا گیا اور وہ بنتا گیا۔

''سن میں تجھے ایک تجویز بتاتا ہوں۔'' نذیرا کہنے لگا، اللہ رکھا کے کان کھڑے ہو گئے، نذیرا اسے ڈھیرے ڈھیرے کچھ بتانے لگا، وہ سر ہلاتا رہا، چائے پینے کے بعد نذیرے نے چند کاغذ منگوائے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا، اللہ رکھا کو کیا پتا کہ ان پر کیا لکھا ہے، جہاں جہاں نذیرے نے کہا وہ انگوٹھے لگاتا گیا، بات طے ہو گئی۔ نذیرے نے بوڑھے کو برے طریقے سے پھانس لیا تھا، اسے واپسی کے وقت 5 ہزار روپے دیئے، اللہ رکھا کے چہرے پر اب اطمینان تھا، غیرت اور بے غیرتی کا فرق وہ مٹا چکا تھا، ڈیڑھ لاکھ میں وہ بیٹی بیچ چکا تھا، نذیرے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

☆......☆

معاہدے کے مطابق اللہ رکھا نے ٹھیک ایک ماہ بعد رانو کو نذیرے کے نکاح میں دے دینا تھا۔

تین ہفتے آناً فاناً گزر گئے، دسمبر کا آخری عشرہ تھا، رانو، شیراز، اس کی ماں اور باپو روکھی سوکھی کھا چکے تو اللہ رکھا نے یہ بتا کر سب کو حیران کر دیا تھا کہ اس نے رانو کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اسی مہینے کے آخر میں رخصتی ہے۔

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا، رانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، حوصلہ کر کے بولی۔ ''باپو! یہ تیرا فیصلہ ہوگا، میرا نہیں، کسی سے شادی نہیں کروں گی میں، اس سے تو بہتر تھا تو مجھے دیوار میں چنوا دیتا۔''

''تو اپنا منہ بند رکھ، جو کر رہا ہوں تیرے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔''

شیراز سے رہا نہ گیا بولا۔ ''باپو تو نے اکیلے ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا، کون ہے وہ؟''

''نذیرا بھٹے والا۔''

سب کو زور کا جھٹکا لگا، ایسے لگا جیسے اللہ رکھا نے نام

نہیں بتایا بلکہ ان کو آگ کے الاؤ میں دھکا دے دیا ہو۔

"باپو! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا، اس بدنام زمانہ سے بیٹی بیاہے گا، اس ساٹھ سال کے بھیانک بوڑھے سے، اس منشیات فروش اور سود خور سے۔" شیراز سے غصہ ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

ماں بھی اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ بالآخر حواس میں آتے ہوئے بولی۔ "تو میرے سر کا سائیں ہے تو رانو میرا خون ہے، نہ جانے تو کیا کرتا پھرتا ہے، اپنی چارپائی اٹھا اور جا کسی درخت کے نیچے بچھا کر دن رات افیم کھایا کر، دماغ تو تیرا ویسے ہی ٹھکانے پر نہیں ہے، اب جو تو نے رانو کے بارے میں کوئی بات کی تو ہم تجھے اس گھر سے دھکے دے کر نکال دیں گے، شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے، دنیا سنے گی تو ہم سب پر تھو تھو کرے گی۔" ماں نے دل کا غبار نکالا۔

رانو کمرے میں بیٹھی تھی، آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے، شیراز نے ایک قہر آلود نظر باپو پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا، ماں روتی رہ گئی، باپ کی اس بے غیرتی پر اسے کسی پل چین نہ آ رہا تھا، جوان خون تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ غربت سے تنگ باپ کے اس فیصلہ نے زہریلے خنجر کی طرح اس کے دل پر گھاؤ لگایا ہے، اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو بے دھڑک، ہر خوف و ڈر کو بالائے طاق رکھ کر نذیرے کے ڈیرے کی طرف چل دیا، دو روز قبل ہونے والی موسلا دھار بارش کے باعث ابھی بھی کہیں کہیں کیچڑ تھا، اسے لگا باپو نے رانو، ماں اور اس کے منہ پر بھی بے غیرتی کا کیچڑ مل دیا ہے۔

نذیرے کے ڈیرے کے مرکزی دروازے پر کھڑے بندوق بردار نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ "کہاں منہ اٹھائے جا رہا ہے؟"

"نذیرے سے ملنا ہے۔"

"احترام سے نام لے، چودھری نذیر بول۔"

"چودھری ہو گا تمہارا، مجھے کھانے کو نہیں دیتا۔ جا بول اسے جا کے اللہ رکھا کا بیٹا آیا ہے۔"

"اگر نہ بولوں تو۔"

"تو مجھے دوسرا راستہ آتا ہے۔" شیراز پھنکارا۔

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی ایک کار آ کر رکی، نذیرا بڑی شان سے اترا۔ "کیا لفڑا ہے؟" اس نے چوکیدار اور شیراز کو تناؤ کی حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

"آپ سے ملنے آیا ہے لیکن بدتمیزی کر رہا تھا جناب!" چوکیدار بولا۔

"یہ وقت تو نہیں ہے کسی سے ملنے کا خیر تو اسے اسٹور کے ساتھ والے کمرے میں لے جا۔" نذیرا رعب سے بولا۔

"جا بھی بیٹھ، میں اپنے مہمانوں کی تھوڑی خاطر داری کر کے آتا ہوں۔" نذیرا بولا۔

کار میں دو خواتین اور ایک لڑکا پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ شیراز نے جلتے کڑھتے ایک گھنٹا انتظار کیا تب نذیرے کو آتے دیکھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کمینہ پی پلا کر آیا ہے۔

"ہاں بول کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ جو میرا وقت برباد کرنے آ گیا۔" نذیرے نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"کیا پٹی پڑھائی ہے تو نے میرے باپ کو، کیوں ہمارا گھر جلانے پر تل گیا، کیا بگاڑا ہے ہم غریبوں نے تیرا۔" شیراز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"سیدھی بات کر جو میری کھوپڑی میں بھی آئے، بجھارتیں نہ بجھا۔" نذیرا بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تو میری بہن کے قابل ہے؟ ہم غریب ہیں، بے غیرت نہیں۔ ہماری غربت کو ہماری کمزوری نہ سمجھ، دوبارہ میری بہن کا نام بھی لیا تو بستی والے وہ ہوتا دیکھیں گے جو اس سے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہو گا۔" شیراز کا غصہ عروج پر تھا۔

"ذرا چھری تلے سانس تو لے بچہ۔" نذیرے کے بھدے لبوں پر وہی مکروہ مسکراہٹ تھی جو اس کے بدنما چہرے کو اور بھیانک بنا دیتی تھی۔

"اچھو، اچھو۔" اس نے کسی ملازم کو پکارا۔

"جی مائی باپ۔" ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ "بات سن، نذیرے نے اس کے کان میں کچھ کہا، وہ چلا گیا، دس منٹ بعد 20,15 کاغذ اٹھائے آ گیا، نذیرے کو تھمائے اور چلا گیا، نذیرے نے وہ کاغذ شیراز کے سامنے میز پر پھینک دیئے اور بولا "دیکھ ان کو، پڑھ ان کو، پھر بات کرنا۔"

"میں کیا پڑھوں؟ کیا ہے یہ سب؟" شیراز نے کاغذات کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تیرا باپ میرا ڈیڑھ لاکھ کا مقروض ہے، اس نے سودا کیا ہے میرے ساتھ، ڈیڑھ لاکھ کے عوض بیٹی کے رشتے کا، نہیں یقین، تو لے جا، کسی وکیل سے پڑھوا لے میں نے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔" شیراز کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، اسے اپنا باپ گدھ لگا جو مردار کھاتا ہے۔

"اگر تم لوگوں کو یہ سب نہیں منظور تو پھر فیصلہ پنچایت

میں ہوگا؟'' شیراز کے سینے میں انگارے دھک رہے تھے، دماغ میں خوفناک خیالات کا بسیرا تھا۔

سرور ساربان کو رانو نے ملاقات کرکے سب بتا دیا تھا۔

''ہم اس بدقماش کے پیسے لوٹا دیں گے۔'' سرور نے بڑے عزم سے کہا۔ ''مجھے گاؤں بدر کرنا بھی اسی سازش کا حصہ تھا، خیر، میں اپنا اونٹ بیچ دوں گا۔ باقی کی ادائیگی کے لیے وقت لے لیں گے۔''

''کیا میرے گھر والے تیری اس قربانی کو قبول کر لیں گے، میں مرجاؤں گی، کنویں میں چھلانگ لگا دوں گی، رانو تیری نہیں ہوگی تو پھر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔'' اس کی آنکھیں نم اور لہجہ جذباتی تھا۔

''پگلی کہیں کی، رب سب کا ہے، کچھ نہیں ہوگا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا، سرور جان تو دے دے گا لیکن یہ برداشت نہیں کرے گا کہ تیرے وجود کو کوئی اوباش چھوئے۔'' وہ جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

☆......☆

رانو نے گھر آکر ماں سے بات کی، ماں نے شیراز کو بتایا، تینوں خاموش بیٹھے تھے، اللہ رکھا نے انہیں جس دلدل میں دھکا دیا تھا وہ اس میں ڈوبنا نہیں چاہتے تھے، بے بسی کی آگ انہیں جھلسائے دے رہی تھی۔ شیراز نے سرور ساربان کی پیشکش پر غور کیا، وہ جانتا تھا کہ سرور اور رانو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی اسے خوب معلوم تھا کہ سرور میں اس نے بھی کوئی برائی نہیں دیکھی تھی، چوری کے الزام میں سرور کو بستی بدر کرنا بھی اب اسے اسی سازش کا ایک حصہ لگ رہا تھا، نذیرے منشیات فروش نے انہیں ایک ایسے جال میں جکڑ دیا تھا بظاہر جس سے رہائی ناممکن نظر آرہی تھی، لیکن ساربان کا احسان انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتا تھا، بالآخر اس نے خود سرور سے ملنے کا وعدہ کیا، اگلے ہی روز وہ سرور سے ملا، سرور نے اسے احترام سے اپنے چھپر نما گھر میں اکلوتی چارپائی پر بٹھایا، محبوبہ کا بھائی آیا تھا، احترام تو واجب ہوگیا تھا۔

''سرور ہوشیار رہنا۔'' شیراز نے کہا۔ ''ہمارا واسطہ جن سے پڑا ہے وہ بڑے عیار اور مکار ہیں۔ اپنا اور اپنے اونٹ کا خاص خیال رکھنا۔ وہ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ پہلے پنچایت ہوجائے، پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

دونوں کے پیار کا دشمن دوست بن کر آیا تھا، سرور کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی، اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب تو خود کو بھی بیچنا پڑا تو بیچ ڈالے گا لیکن شیراز اور اس کے گھر والوں کی ان جرائم پیشہ کے آگے نظریں نہیں جھکنے دے گا، دونوں نے کچھ اہم فیصلے کیے اور شیراز گھر چلا آیا۔

☆......☆

دسمبر کی 28 تاریخ تھی، دھوپ نے ہر چیز کو روشن کر رکھا تھا لیکن دل سیاہ تھے تو ان کے جو سرپنچ اور اس کے ساتھی تھے، جنہوں نے من مرضی کا فیصلہ ٹھونس کر غریب کی عزت کو اپنے کوٹھوں کی زینت بنانا تھا، غلیظ لوگوں کی کوٹھیاں بھی کوٹھے ہی ہوتے ہیں، جہاں وہ خود بھی غلاظت کا ناچ ناچتے ہیں اور دوسروں کا تماشا بھی دیکھتے ہیں۔

منظر چودھری کی کوٹھی کا لان تھا، دسمبر کی دوپہر کی دھوپ سکون دے رہی تھی، لان میں دو کرسیاں، ایک بنچ، تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر چودھری فواد بڑے طنطنے سے پھیل کر بیٹھا تھا، دوسری کرسی پر بستی کا نام نہاد معزز بوڑھا بیٹھا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ چودھری کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے، بنچ پر نذیرے کے حواری اور ایک چارپائی پر شیراز اس کا باپ اور ان کے دو تین حامی بیٹھے تھے۔ بستی کے کچھ لوگ آلتی پالتی مارے گھاس پر بیٹھے تھے۔

''ہاں تو نذیر بتا کیا معاملہ ہے؟'' چودھری نے پنچایت کا آغاز کیا۔ نذیرے نے اللہ رکھا کے وقتاً فوقتاً ڈیڑھ لاکھ قرض لینے، اور پھر قرض معافی کے عوض بیٹی کا نکاح اس سے کرنے کی تفصیل بتا دی، ساتھ ہی کاغذوں کا ایک پلندہ بھی چودھری کے آگے رکھ دیا۔

''اللہ رکھا تم کیا کہتے ہو؟''

وہ کیا کہتا، خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھا رہا، شیراز باپ کے دفاع میں بولا ''چودھری صاحب! ہمارے باپو سے جو کرتوت سرزد ہوئے، اس کی سزا اولاد کو کیوں دی جائے، باپو نے سب قبول کرلیا، ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ساتھ ایک التجا بھی کرتے ہیں۔''

''بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' چودھری نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہم نذیرے کے ڈیڑھ لاکھ لوٹا دیں گے' اپنی بہن فروخت نہیں کریں گے۔''

''کیسے لوٹاؤ گے؟''

''ہمیں ایک ماہ کا وقت دے دیں۔''

''نذیرے تم کیا کہتے ہو؟''

''چودھری صاحب ایک ماہ بہت زیادہ ہے'یہ میری رقم لوٹا دیں، میں ان کو معاف کر دوں گا لیکن ایک شرط پر۔''

''ٹھیک ہے اپنی شرط بتاؤ۔''

''انہیں ادائیگی کے بعد یہ بستی بھی چھوڑنا پڑے گی ورنہ کسی بھی وقت کوئی لفڑا ہو جائے گا۔''

''تم انہیں کتنے دن کی مہلت دینا چاہتے ہو؟''

''صرف پانچ دن۔''

''یہ ظلم ہے، صرف پانچ دن۔'' شیراز کا ایک حامی بولا۔

''مدعی پانچ دن کا کہتا ہے اور ملزم ایک ماہ مانگتے ہیں' تو فیصلہ ہم کر دیتے ہیں۔'' چودھری بولا۔

''آپ سرپنچ ہیں، آپ کا فیصلہ سب کو قبول ہوگا۔ عدم قبولیت پر وہ سزا کا حق دار ہوگا۔'' ملی جلی آوازیں گونجیں۔

''ٹھیک ہے! دس دن کا وقت دیتا ہوں، اللہ رکھا کے گھر والے اس دوران رقم کا بندوبست کر لیں بصورت دیگر اسی سودے پر عملدرآمد ہوگا جو اللہ رکھا نذیرے سے کر چکا ہے۔''

چودھری نے کمینگی کا مظاہرہ کر دیا۔ طوعاً کرہاً یہ فیصلہ سب کو قبول کرنا پڑا، پنچایت ختم ہوگئی۔

چودھری اور نذیرے نے گہری چال چلی تھی، دس دن میں وہ ڈیڑھ لاکھ تو کیا دس ہزار کا بندوبست بھی نہ کر سکتے! سراسر گھاٹے کا فیصلہ تھا، فریقین میں ایک کا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور دوسرا پریشانیوں کی مالا گلے میں ڈالے، کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر آ گیا۔

☆......☆

سرور نے رانو کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اگلے دس پندرہ روز کہیں نہیں آئے جائے گی، رانو نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر وعدہ کیا تھا کہ جیسے وہ کہے گا اسی طرح کرے گی، اس نے چھپ کر کانچ کی ایک بوتل کہیں سے ڈھونڈ کر اسے توڑا اور کمرے میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی یہی سوچ پنہاں تھی کہ اگر برا وقت نہ ٹلا تو اپنی جان تو لے ہی سکتی ہے، عزت گنوانے سے بہتر ہے سرور اور گھر والوں کو ایک بے جان جسم دے جائے جس پر گندگی کا ایک دھبا بھی نہ ہو، اجلے کفن میں اجلا جسم ہی اس کے گھر والوں کی عزت کو قائم رکھ سکتا تھا۔

☆......☆

آج پھر بادل جو برسے تو رکنے کا نام نہ لیا، جگہ جگہ کئی فٹ پانی جمع ہو گیا، غریبوں کے جھونپڑے اور مکان ٹپک پڑے، نذیرا ایک کمرے میں بیٹھا کھڑکی کھولے موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا، ام الخبائث بھی پاس پڑی تھی، اس کا سر چڑھا گرگا لطیف بھی قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔

''سائیں! بڑی زوردار تجویز ہے میرے ذہن میں، سانپ بھی مر جائے گا لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔''

''اگر تیرا مشورہ کام کا نہ ہوا تو لاٹھی ٹوٹے نہ ٹوٹے تیرا ایک آدھ ہاتھ پیر ضرور توڑ دوں گا۔'' نذیرا ترنگ میں بولا۔

''سائیں، سننے سے پہلے تو سزا نہ سنائیں۔'' وہ گڑگڑایا۔

''اچھا اب بک جو بکنا ہے۔''

''نہ سائیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' پھر وہ نذیرے کے قریب ہوا اور بڑبڑانے لگا۔

''شاباش او لطیفے۔'' نذیرے نے زور کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا۔ محبت کے اس تھپڑ سے لطیف زمین پر گرتے گرتے بچا۔

''واہ سائیں، تیریاں تو ہی جانے۔'' نذیرے نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا اور حکم دیا پاؤں ذرا زور سے دبائے۔

☆......☆

سرور اور شیراز میں پھر ایک طویل ملاقات ہوئی، دونوں اونٹ لے کر منڈی گئے، نوے ہزار ریٹ لگا، دونوں بیوپاری سے سوچ بچار کا وقت لے کر واپس آ گئے، شیراز اپنے مالک کے پاس بھی گیا، اسے تمام بات بتا دی، مالک نے رحم کھاتے ہوئے اسے دس ہزار بطور قرض دینے کا وعدہ کیا، جو اس کی تنخواہ میں سے کٹتا رہے گا۔ ایک لاکھ ہو چکے تھے، پچاس ہزار کے بندوبست کی کہیں آس امید نظر نہیں آ رہی تھی، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، سازشیوں کو سازش سے مات دی جاتی ہے، دونوں نے گھنٹوں کی ملاقات میں ایک بے عیب منصوبہ بنایا جس پر مشکل ترین وقت میں عمل کرنا تھا۔ کھولتا ہوا جوان لہو اور غربت، تخریب کاری کو جنم دے رہی تھی، چودھری فواد یا نذیرا بدمعاش، دونوں میں سے کسی ایک کو اس جوڑی کے ہاتھوں لٹنا تھا لیکن یہ سب انہوں نے رانو سے پوشیدہ رکھا تھا۔

☆......☆

ادھر دارو کے دھندے کا بادشاہ نذیرا اللہ رکھا سے ایک خفیہ ملاقات کر رہا تھا، اس نے دس ہزار اللہ رکھا کے ہاتھ پر رکھے، آنے والے وقت میں اس کے نشہ پانی کا وعدہ کر کے محلول سے بھری چھوٹی سی شیشی اسے دی۔ اللہ رکھا سر ہلاتا رہا اور شیشی دھوتی کی ڈھب میں مضبوطی سے اُڑس لی اور گھر کی راہ لی۔

☆......☆

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، ایک کمرے میں شیراز، رانو، ان کی ماں بے سدھ سو رہے تھے دوسرے اندھیرے کمرے میں اللہ رکھا جاگ رہا تھا، لالچ اور بے غیرتی کے نشے نے نیند کو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور بھگا رکھا تھا، وہ ننگے پاؤں چارپائی سے اترا، آواز پیدا کیے بغیر دوسرے کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھولا، شیشی والا سارا محلول وہ رات کو سالن میں انڈیل چکا تھا۔ بہانے سے اس نے کھانا نہیں کھایا، جن تینوں نے کھایا تھا، وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے، چند منٹوں کے بعد بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، اللہ رکھا دھیرے سے بیرونی دروازے پر گیا، کواڑ کھولے، ڈھاٹا باندھے چار آدمی کھڑے تھے۔

''سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' وہ بولا، میں کمرے میں جا رہا ہوں، تم بھی اپنا کام کر کے نکلنے کی کرنا، کوئی دیکھ نہ لے۔

چاروں اندر آگئے، ایک ہٹے کٹے آدمی نے آگے بڑھ کر رانو کو کندھے پر ڈالا۔ پھر وہ دبے پاؤں گھر سے نکل گئے، لالچ کی پٹی اللہ رکھا کی آنکھوں سے نہ اتر سکی تھی۔ اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار میں رانو کو نذیرے کی ''دلہن'' بنا کر رخصت کر دیا تھا۔

☆......☆

رانو کو ہوش آیا تو وہ یکبارگی تڑپ کر اٹھ بیٹھی، حواس ذرا ٹھکانے پر آئے تو ماحول کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک سجا سجایا کمرا تھا، اس نے بار بار آنکھوں کو ملا، وہ بڑبڑائی۔ ''یہ کیسا سپنا ہے مالک۔'' اور پھر دم بخود رہ گئی۔

نذیرا اس کے سامنے ہی کمرے کے کونے میں کھڑا اسے تکے جا رہا تھا، وہ مکروہ ہنسی ہنسا۔

''چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا ''تیرے باپو نے تجھے مجھ سے بیاہ دیا ہے، نوٹ کھرے کیے ہیں اس نے، تو میری زر خرید ہے۔''

رانو لرز کے رہ گئی، سہمی نظروں سے نذیرے کی طرف دیکھ کر گھگیاتے ہوئے کرب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''میرے کو چھوڑ دے چاچا، تم میرے باپ کی عمر کے ہو، جانے دے مجھے، زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گی، رحم کر میرے پر۔''

''پاگل تو نہیں ہوگئی، کب سے تیرے لیے تڑپ رہا ہوں، ہاتھ آئی پری کو جانے دوں۔'' وہ شیطانی ہنسی ہنستا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

''سار بان کی دلہن بننا چاہتی تھی نا، سب جانتا ہوں، آج ہم دونوں سہاگ رات منائیں گے۔''

''دور ہٹ۔'' رانو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''میں سرور کے لیے جان پہ کھیل جاؤں گی۔''

وہ پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن نذیرا نشے میں دھت آگے بڑھ رہا تھا۔

''تو میری بیوی ہے، نکاح بھی ہو جائے گا۔''، وہ بہکی بہکی باتیں کرتا رانو کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔

''بس اور آگے نہ بڑھنا، خدا قسم......''

''چپ رہ کمی کمین۔'' بدمعاش نذیرا اسے اپنی جانب گھسیٹتے ہوئے بولا۔ ''دور دور تک تیری آہ سننے والا کوئی نہیں۔''

رانو نے اسے زور کا دھکا دیا اور دروازے کی طرف لپکی، دروازہ باہر سے بند تھا، وہ گھبرا کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی، کھولو دروازہ کھولو، خدا کے لیے، رحم کرو، دروازہ کھولو۔'' وہ چیخ رہی تھی، لیکن صدا بہ صحرا، اس کی آواز کون سنتا، وہ تو آبادی سے دور ایک بھٹہ خشت پر ایک کمرے میں تھی، جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا، وہ بھاگ جانے کی جدوجہد میں پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ پیچھے سے نذیرے نے دبوچ لیا، دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی، رانو نے بھی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا، نذیرے نے تیز پھل والا چاقو نکالا اور اس کی نوک رانو کے سینے میں چبھو دی، رانو کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

''سیدھی طرح بات مانتی ہے یا اتاروں چاقو سینے میں۔'' وہ گرجا۔

''مر جاؤں گی لیکن اپنی عزت پہ حرف نہیں آنے دوں گی۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

''چپ رہ۔'' نذیرے نے چاقو پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا۔ ''ساتھ اس کے گال پر زور سے گھونسا مارا۔''

رانو نے دانت بھینچ کر ایک زوردار دھکا دیا، نذیرا چھرے سمیت دور جا گرا، رانو بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی، اس کھینچا تانی میں چاقو رانو کے ہاتھ لگ گیا، اس نے ایک پل ضائع کیے بغیر پورے زور سے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ایک دل دوز چیخ، خون کا ابلتا فوارہ، رانو نے اس پر ہی بس نہ کی چاقو کھینچ کر نکالا اور اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ دو تین وار کیے، نذیرے کا سینہ چاک ہو گیا، کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح ڈکراتا، ہاتھ پاؤں مارتا، لوٹنیاں لگاتا زندگی کی بازی ہار گیا، کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا، رانو بھی خون میں لت پت تھی۔

''کون ہے اندر، دروازہ کھولو'' دروازہ اب پیٹا جانے لگا۔ رانو نے چیختے ہوئے کہا دروازہ باہر سے بند ہے، میں یہاں قید ہوں، پھر دروازہ باہر سے کھلا، چار پولیس والے اندر گھس آئے، ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں، اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کون ہو تم؟ یہ کون ہے؟ کس کو قتل کر دیا۔'' ایک پولیس والا بولا، پتا نہیں وہ رات کو گشت پر تھے یا پھر نذیرے کی حفاظت پر مامور تھے۔ حالات بگڑتے دیکھ کر آ دھمکے تھے، لیکن نقشہ بدل چکا تھا۔

''یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا، چھرے کی نوک میرے کلیجے پر رکھ کر مجھے برباد کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی آبرو بچانے کے لیے اسی کے چھرے سے وار کر دیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆

رانو کی ساری، امنگیں، آرزوئیں اور تمنائیں خاک اور خون میں لتھڑ کر رہ گئیں، اس کی مسرتوں پر اس کے بے رحم باپ کی کمینگی کا کفن پڑ چکا تھا۔ پولیس نے 302 کا کیس بنا دیا، سرور، شیراز، اس کی ماں، آنکھوں میں آنسو اور چہروں پر بدحواسیاں لیے بیٹھے تھے، رانو ملزموں کے کٹہرے میں بت بنی کھڑی تھی۔

سرکاری وکیل نے جرح شروع کی۔ ''تم نے نذیر احمد کو جان بوجھ کر قتل کیا۔''

''اس کا جواب میں دے چکی ہوں۔'' رانو نے اسے نفرت سے دیکھا۔ ''بار بار مجھ کو کیوں دکھ دیتے ہو۔''

''تم نے قانون کو کیوں ہاتھ میں لیا۔''

''قانون تب کہاں تھا جب وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے رہا تھا۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ تم نے ایک انسان کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں، تم نے بہت بڑا جرم کیا، قانون اور انصاف کی توہین کی ہے۔'' سرکاری وکیل دلائل کم دے رہا تھا گرج زیادہ رہا تھا، شاید چودھری فواد نے اچھی خاصی ''سرمایہ کاری'' کی تھی، اس سے قبل کہ وکیل وہی گھسے پٹے دلائل دہراتا رانو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور بولی۔

''حضور! بڑے صاحب، مائی باپ، میں غریب، ان پڑھ، جاہل، قانون تو نہیں جانتی، لیکن جب مجھ پر ظلم ہو رہا تھا، جب ایک بھیڑیا میرے جسم پر اپنے پنجے گاڑنے والا تھا، اس وقت یہ پولیس والے کہاں تھے؟ جب مجھے اغوا کیا گیا تب یہ

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کہاں تھے؟ میں چیخی، چلائی، دہائی دی، لیکن اس منشیات فروش، عورتوں کے بیوپاری کو رحم آیا نہ کسی نے میری چیخ و پکار پر کان دھرے جب اس بھیڑیے نے میرے سینے میں چاقو کی نوک چبھوئی تو میری سسکاریاں کسی نے نہیں سنیں، کمرا اندر سے نہیں باہر سے بند تھا، میرا وار چل گیا، میں نے اس ناسور کو ختم کر دیا تو پولیس بھی آ پہنچی۔ اگر کمرا اندر سے بند ہوتا تو میں اس کو قتل نہ کرتی بلکہ بھاگ نکلتی۔ یہ پولیس والے بھرا اس سے ملے ہوئے تھے، صاحب! مائی باپ، انصاف آپ کریں۔ میں نے اپنی آبرو بچائی ہے، اپنے دفاع میں وار کیا تھا۔ حضور! شاید آپ کو میری بات بری لگے، اگر ان پولیس والوں کی بہن بیٹی یا آپ میں سے کسی کی آبرو کسی غنڈے کے ہاتھوں پامال ہو تو کیا آپ خاموش بیٹھے رہیں گے، قانون کی مدد کا انتظار کریں گے؟ بتائیں حضور؟“

عدالت میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا، اس سے پہلے کہ سرکاری وکیل کچھ بولتا وہ پھر دکھی لہجے میں بولی۔ ”اگر سزا دینی ہے تو میرے اس پاپی باپ کو دو اور دنیا کے ایسے تمام باپوں کو سولی چڑھا دو جو اپنی بیٹیوں کا سودا کرتے ہیں“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

”آرڈر آرڈر......“ جج نے سب کو متوجہ کیا اور کہا کہ ”کیس کی باقاعدہ سماعت سے قبل ملزمہ کو وکیل کرنے کا قانونی حق ہے۔“

”لیکن حضور! اپنے گھر میں تو ایک روز کھانا پکتا ہے اور دو روز پیاز یا گڑ سے روٹی کھانا پڑتی ہے۔“ وہ جج سے مخاطب تھی۔

”اگر تم وکیل نہ کر سکی تو ریاست تمہیں وکیل فراہم کرے گی، جج نے اسے 14 دن کے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کا حکم دیتے ہوئے عدالت برخاست کر دی۔“

لیڈی پولیس نے اسے ہتھکڑی پہنائی اور جیل پہنچانے کے لیے گاڑی کی طرف لے کر چل پڑی، اسی دوران جب ضروری قانونی کارروائی ہو رہی تھی تو ماں اور بھائی شیراز کو اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”رانو فکر نہ کرنا، ہم وکیل کریں گے چاہے کچھ بھی ہو۔“

ایک کونے میں سرور کھڑا تھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، وہ ٹکٹکی باندھے رانو کو تکے جا رہا تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وکیل کیسے کرنا ہے؟ بستی میں یہ بات پھیلی تو سب غنڈے نذیرے پر تھو تھو کر رہے تھے اور رانو کی بہادری کے گن گا رہے تھے، ایک شیطان سے سب کو امان مل گئی تھی، اگر کوئی بحالت مجبوری چہرے مہرے سے خوشی کا اظہار نہیں بھی کر رہا تھا تو دل میں ضرور خوش تھا کہ ایک گناہ گار سے تو کمینوں کو نجات ملی۔

☆......☆

آپا رانو کی دکھ بھری کہانی سن کر دل میں بہت دکھ محسوس کر رہی تھی، نہ جانے روزانہ حوا کی کتنی بیٹیاں، کاروکاری، کالا، کالی، ونی اور دیگر مکروہ رسموں کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں، وہ دل میں اٹل فیصلہ کر چکی تھی کہ رانو کو ہر صورت باعزت بری کرائے گی، وہ سمجھ گئی تھی کہ کیس بہت کمزور ہے، اس نے اپنے دفاع میں قتل کیا تھا، اغوا بھی ملزم نے کیا، ٹھکانا بھی اس کا، مجرمانہ حملہ بھی اس نے کیا، دروازے کی چٹخنی بھی باہر سے اس نے لگوائی، ایک دو چھتر تھانے میں لگتے تو اس کا باپ بھی سب بک دیتا کہ اس نے نذیرے سے مل کر کیا گل کھلایا تھا، اگلے

روز آپا نے ایک طویل خط لکھا اور رانو کے حوالے کرتے ہوئے اسے سمجھا بھی دیا کہ شیراز اور سرور کو کیا کہنا ہے۔

☆......☆

ایک دو روز بعد شیراز، اس کی ماں اور سرور تینوں اس سے ملاقات کو آئے، رانو نے حال احوال کے بعد وہ خط انہیں دیا اور انہیں سب سمجھا بھی دیا، یہ آپا کا جیل میں اثر ورسوخ ہی تھا کہ خط لکھنے سے پہنچانے تک کوئی ملازمہ رکاوٹ نہیں بنی تھی، دوسرے روز ہی بہاولپور کی ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کے وکیل نے جیل پہنچ کر وکالت نامے پر اس کے انگوٹھے لگوائے۔

کیس کی باقاعدہ سماعت کے پہلے ہی روز رانو کے وکیل کے سامنے سرکاری وکیل کی ایک نہ چلی، عدالت نے پچاس پچاس ہزار کے مچلکوں کے عوض اس کی ضمانت منظور کر لی، اس روز سبھی خوش تھے، بس ایک معما تھا تو آپا کا کردار؟ اسی روز روبکار جیل پہنچی اور شام کو اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

☆......☆

دن ڈوب چکا تھا، ملتان جیل سے رہائی کے بعد وہ اڑھائی سے تین گھنٹے وکیل کی کار میں سفر کر کے بستی پہنچے تھے۔

ایک پرچہ نذیرے اور رانو کے باپ کے خلاف بھی درج ہو چکا تھا۔ پولیس نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ ایف آئی آر درج نہ ہو لیکن رانو کے وکیل ارشد ایڈووکیٹ نے عدالت سے رجوع کیا، عدالت کے حکم پر نذیرے کے خلاف اغوا، حبس بے جا، قتل کی کوشش، عزت لوٹنے کا مقدمہ درج ہوا اور رانو کے باپ کے خلاف نذیرے کا ساتھ دینے، ان سب کو کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملانے اور بیٹی بیچنے کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا تھا۔

چودھری فواد نے اس دوران کئی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کی لیگل ٹیم سارے معاملے کو دیکھ رہی ہے تو اس نے دم دبا کر روپوش ہونے میں عافیت سمجھی۔ اس لیگل ٹیم نے رانو سے مشورہ کیا تھا کہ وہ لوگ چاہیں تو اس معاملے میں نام نہاد سرپنچ چودھری فواد کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں، لیکن رانو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے کرموں کی سزا رب اسے دے گا، ایک نہ ایک روز وہ ضرور رب کی پکڑ میں آئے گا، رانو کے باپ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا، اسے بھی اس کے سیاہ کرتوتوں کی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔

☆......☆

بمشکل چار پیشیوں کے بعد عدالت نے رانو کو باعزت بری کر دیا۔ سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ ماں نے رانو کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما، شیراز نے بھی بہن کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو ایک بہادر بہن ہے، ہمیں تم پر ناز ہے۔ جان پر کھیل گئی لیکن عزت پہ حرف نہ آنے دیا، پھر از راہ مذاق کہنے لگے بیچارے سرور کا اونٹ دو بار بکتے بکتے بالا خرچ بچ گیا، رانو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ سرور نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اب اسے اور رانو کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

☆......☆

کوئی ایک ماہ بعد رانو نے ماں، بھائی اور سرور کو ساتھ لیا، ملتان جیل میں آپا سے ملاقات کرنے، شکریہ ادا کرنے اور لڈو دینے گئی، جیل انتظامیہ کا کہنا تھا کہ یہاں تو آپا نام کی کوئی قیدی یا حوالاتی نہیں۔

"میرے ساتھ ہی تو چھ نمبر بیرک میں تھی۔" رانو حیرت سے بولی۔

"لیکن اب نہیں ہے۔ کل رات ہی اسے موت لے گئی ۔" جیل ملازمہ کا جواب تھا۔

ان تینوں کو حیرت کا جھٹکا لگا، رانو کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

پھر تینوں اداسی کے عالم میں اپنی کچی بستی کی جانب لوٹ گئے، رانو محسوس کر رہی تھی آپا کو وہ کبھی نہیں بھول پائے گی، آپا نہ ہوتی تو نہ جانے وہ کہاں ہوتی۔